منتخب سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم



دارُالسّلام

کتاب وسُنّت کی اشاعت کا عالمی اِدارہ

جُملہ حقوقِ اشاعت بحقِ دارُالسّلام محفوظ ہیں

سعُودی عرَب (ہیڈ آفس)

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس:22743 الرّیاض:11416 سعودی عرب

فون: 00966 1 4043432-4033962 فیکس:4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الرّیاض ● العُلیا۔فون: 4614483 1 00966 فیکس:4644945 ● الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس:4735221

● سویدی فون: 4286641 1 00966 ● سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدّہ فون: 6879254 2 00966 فیکس:6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس:8151121 04

الخُبر فون: 8692900 3 00966 فیکس:8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ ● نیویارک فون:5925 625 718 001 ● ہوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا ● نصیرالدین الخطاب فون:4186619 416 001

لندن ● دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 ● دارالسلام انٹرنیشنل: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات ● شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس:5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033

انڈیا ● دارالسلام انڈیا فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 ● اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 4180 2373 22 0091

● ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 ● ایم ایس براک انٹر پرائزز فون: 42157847 44 0091

سری لنکا ● دارالکتاب فون: 358712 115 0094 ● دارالایمان ٹرسٹ فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 00 324 372, 24 400 372, 34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

www.darussalam.pk

اُردو بازار: غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

ڈیفنس: Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان:2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

گلبرگ: دُکان نمبر2، گراؤنڈ فلور، بِگ سٹی پلازہ لبرٹی گول چکر، گلبرگ III لاہور فون: 50 738 357 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دُوسری گلی، کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر فون: 13 15 228 51 0092 islamabad@darussalampk.com

ملتان 995-انکم ٹیکس آفیسر کالونی، بوسن روڈ۔ملتان فون: 24 00 622 61 0092

فیصل آباد کوہ نور سٹی (پلازہ نمبر:1، دکان نمبر:15) جڑانوالہ روڈ، فیصل آباد فون: 44 19 850 41 0092

مُنتخب سیرتِ مُصطفیٰ ﷺ



پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم العمری

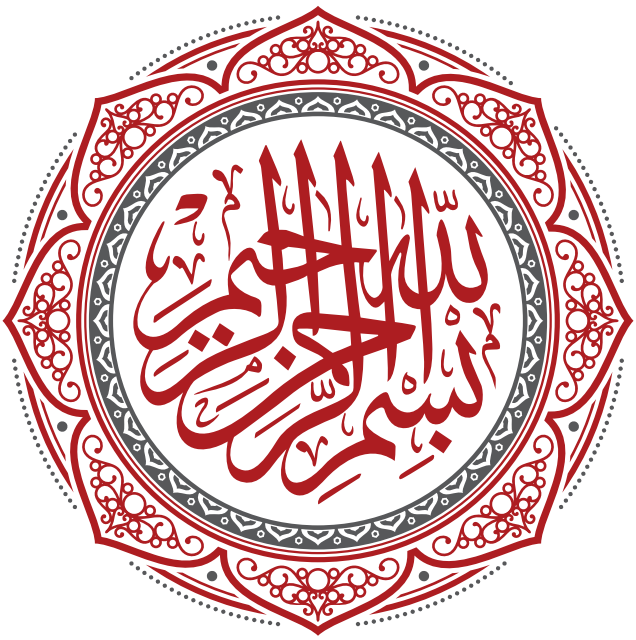
(جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض)

سابق پروفیسر سیرت

جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض

دارالسلام

DARUSSALAM



اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

فہرست

- اِھداء ____ 14
- مقدمہ ____ 15
- سیرت نبویہ کے مطالعہ کے مقاصد وفوائد ____ 19
- سیرت طیبہ کا مطالعہ درحقیقت محبتِ رسول ﷺ کی دلیل ہے ____ 24
  - سیرت نبویہ کے مطالعہ کی کیفیت ____ 30
  - سیرت نبویہ کی خصوصیات ____ 35
- دورِ جاہلیت میں عربوں کے حالات ____ 38
  - دینی صورتِ حال ____ 38
  - عربوں کی اجتماعی زندگی ____ 39
  - دورِ جاہلیت میں دیگر دنیا کے دینی حالات ____ 40
  - یہودیت ____ 41
  - عیسائیت ____ 42
  - مجوسیت ____ 42
  - بدھ مت ____ 43
  - دورِ جاہلیت میں سیاسی حالات ____ 44
  - عرب کے سیاسی حالات ____ 45

- اَعراب ____ 45
- مکہ اور مدینہ ____ 46
- عراق ____ 48
- شام ____ 48
- یمن ____ 48
- فارس ____ 48
- روم ____ 49

❀ دنیا جہان رسول کریم ﷺ کے انتظار میں ____ 50

- یہودی ____ 50
- عیسائی ____ 54

❀ دورِ حاضر کے مغربی محققین کے آپ ﷺ پر تبصرے ____ 77

- دورِ نبوی ____ 86
- رسول کریم ﷺ کا وطن مبارک ____ 86
- مصطفیٰ ﷺ کا نسب ____ 90
- حبیب مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش ____ 90
- ایک دریتیم جسے اللہ نے سنبھالا ____ 93
- آپ ﷺ کی نوجوانی ____ 93
- آپ ﷺ کی جوانی ____ 95
- سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی ____ 97
- تعمیرِ کعبہ کا واقعہ ____ 99

❀ بعثت سے قبل علاماتِ نبوت ____ 102

❀ بعثت اور انتخاب ____ 105

- وحی کیا ہے؟ 105
- نزولِ وحی 105
- دعوت کی ابتدا 111
- مشرکین کی طرف سے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف 117
- ظلم کا اولین شکار بننے والے اور شہداء 123
- حبشہ کی طرف پہلی ہجرت 125
- حبشہ کی طرف دوسری ہجرت 128
- ظالمانہ بائیکاٹ 130
- سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات 132
- جناب ابوطالب کی وفات 133
- اسراء ومعراج 135
- قبائل کے سامنے پیشکش 140
- انصار کے ساتھ پہلی ملاقات 142
- بیعتِ عقبہ اولیٰ 144
- بیعتِ عقبہ ثانیہ 146
- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت 151
- اہلِ صفہ 154
- نبیٔ اکرم ﷺ کی ہجرت 156
- سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے گھر والوں کا ہجرت میں کردار 156
- نبی ﷺ کی خاطر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قربانی اور امانتوں کی ادائیگی 163
- مدینہ منورہ کا راستہ 164
- مدینہ تشریف آوری 167

◎ مدینہ اور اس کے باسی ____ 172
◎ تعمیرِ مسجدِ نبوی ____ 174
◎ مؤاخات اور بھائی چارا ____ 175
◎ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ____ 176
❀ مدینہ اور مدنی معاشرہ کی ترقی ____ 178
① شہر کے نام کی تبدیلی ____ 178
② مدینہ سے محبت واحترام ____ 179
③ آبادی میں اضافہ ____ 180
④ روحانی ترقی ____ 181
⑤ علمی ترقی ____ 182
⑥ معاشرتی ترقی ____ 187
⑦ صحت کی ترقی ____ 194
⑧ اقتصادی ترقی ____ 196
❀ کافروں سے لڑائی کی اجازت ____ 198
❀ رمضان کی فرضیت ____ 205
❀ قبلہ کی تبدیلی ____ 207
❀ غزوات وسرایا کی ابتدا ____ 209
◎ اولین سرایا ____ 210
① سریّۂ حمزہ بن عبدالمطلب (سیف البحر) ____ 210
② سریہ عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب ____ 210
③ سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ____ 211
❀ اولین غزوات ____ 215

① غزوۂ اَبواء 215
② غزوۂ عشیرہ 216
③ غزوۂ سفوان 216
◎ غزوۂ بدر 216
◎ بدر اور احد کے درمیانی حالات 229
◎ غزوۂ بنوقینقاع 230
❀ سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کی شادی 234
❀ غزوۂ اُحد (شوال 3 ہجری) 240
❀ رجیع کے مقام پر شہید ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم 249
◎ واقعۂ بئر معونہ 252
❀ غزوۂ بنی نضیر (ربیع الاوّل 4 ہجری) 255
❀ غزوۂ احزاب یا خندق (شوال 5 ہجری) 266
❀ غزوۂ بنی مصطلق (مریسیع) شعبان 6 ہجری 279
❀ واقعۂ اِفک 281
❀ غزوۂ حدیبیہ شوال 6 ہجری 299
◎ بیعتِ رضوان 305
❀ بادشاہوں اور امراء کے نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط 311
◎ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہِ روم کے نام خط 314
◎ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فارس کے کسریٰ کے نام خط 332
◎ کسریٰ کے نام نامۂ نبوی 333
◎ 9 ہجری کے اہم واقعات 336
◎ مصر کے قبطی حکمران مقوقس کے نام نبوی مکتوب 339

- حبشہ کے حکمرانوں کے نام نبی ﷺ کے خطوط 345
- رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی حنفی کے نام 353
- حاکم بحرین منذر بن ساویٰ کے نام خط 358
- رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک فروہ بن عمرو جذامی کے نام 360
- عمان کے دو فرمانرواؤں کے نام آپ ﷺ کا خط 361
- حارث بن ابی شمر غسانی کے نام نامۂ مبارک 365
- جبلہ بن ایہم غسانی کے نام نامۂ مبارک 366
- یحنہ بن روبہ اور سردارانِ ایلہ کے نام نامۂ مبارک 368
- فتح خیبر ربیع الاول 7 ہجری 373

❀ عمرۃ القضاء 380

❀ غزوۂ مؤتہ (جمادی الاولیٰ 8 ہجری) 385

❀ فتح مکہ (20 رمضان 8 ہجری) 390

- غزوۂ حنین و طائف (شوال 8 ہجری) 399

❀ غزوۂ تبوک (رجب 9 ہجری) 409

❀ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں حج کی ادائیگی (9 ہجری) 421

❀ مختلف قبائل کے وفود کی آمد 428

- قبیلۂ دوس کے نمائندے طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی آمد 431
- وفد عبدالقیس 435
- وفد ثقیف 437
- وفد بنی تمیم 442
- وفد بنی عامر 446
- وفد بنی حنیفہ 448

- یمن سے وفود کی آمد 453
- اشعریوں کا وفد 453
- قبیلۂ مراد کے نمائندے فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ کی آمد 455
- وفد ہمدان 456
- وفد کندہ 457
- وفدِ اَزد و جرش 458
- وفد حارث بن کعب 460
- عرب نصرانیوں کے وفود 462
- وفد الداریین (قبیلۂ دار کے لوگوں کا وفد) 463
- وفد تغلب 464
- بنو طے کے وفود 465
- فروہ بن عمرو جذامی کا وفد 466
- وفد غسان 466
- وفد عدی بن حاتم الطائی 467
- نجران کے عیسائیوں کا وفد 476

❀ بتوں کی شامت 488

- ''عزیٰ'' کا انہدام 489
- سواع بت کا انہدام 490
- منات کی تباہی 490
- سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بنو طے کے بت خانے ''الفلس'' کا انہدام 491
- سیدنا طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قبیلۂ دوس کے بت ''ذوالکفین'' کا انہدام 491
- ذوالخلصہ کی تباہی 492

- حجۃ الوداع ____ 494
  - حجۃ الوداع کے بعض اہم نکات ____ 517
  - واقعہ غدیر خم ____ 524
- سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے لشکر کی روانگی ____ 527
- حکومتِ اسلامیہ کا قیام ____ 530
  - باقاعدہ مملکت اور صوبوں کی تشکیل ____ 536
  - عدل ومساوات ____ 540
- امن وسلامتی کے احکام ____ 552
- اخلاق وآداب کی تعمیر وترقی ____ 564
- فوج کی بنیاد ____ 603
- نبوی ریاست اور عالمی امن ____ 615
- وفات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ____ 618
  - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری ____ 622
  - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی شدت ____ 623
  - رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری دن ____ 635
  - مسواک ____ 637
  - رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین اور تدفین ____ 647
  - سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ____ 655
  - سقیفہ بنی ساعدہ ____ 656
  - سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی وجوہات ____ 666
- خاتمہ ____ 675

مدحت النبی ﷺ

واحسن منک لم ترقط عینی

واجمل منک لم تلد النساء

خلقت مبرأ من کل عیب

کانک قد خلقت کما تشاء

اور آپ کی ذاتِ اَقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اَقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

اِھداء

میں اپنی اس محنت کو اس شخص کی خدمت میں بطورِ تحفہ پیش کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں وارِد شدہ حکم پر عمل کرے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝﴾

’’بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیٔ کریم ﷺ پر خصوصی رحمت و نوازش فرماتے ہیں تو اے ایمان والو! تم بھی آپ پر خوب درود و سلام پڑھا کرو۔‘‘ (الأحزاب 56:33)

مقدمہ

ألحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام علىٰ أشرف الأنبياء والمرسلين سيدنا محمد بن عبدالله وعلىٰ آلهٖ وصحبهٖ ومن والاه، وبعد!

میں اعتراف کرتا ہوں کہ سیرتِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے بارے میں تالیفات بے شمار ہیں اور اس بارے میں عظیم الشان کوششیں کی گئی ہیں۔ مختلف زمانوں میں اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ گنتی و شمار سے کہیں زیادہ اور بے انتہا فضیلت کا حامل ہے۔ درسی، ادبی اور علمی لحاظ سے تو سیرت کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں رہا اور اس عظیم خدمت میں یقیناً وہ تمام حضرات شریک ہیں جنھوں نے اس بارے میں کوئی بھی کتاب تالیف کی ہے یا کچھ بھی لکھا ہے کیونکہ وہ سب لوگوں کو بہت پسند ہیں اور انھیں مختلف انداز و اسلوب اور بہت سی زبانوں، نیز متعدد پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

میں اس سب کا اعتراف کرتا ہوں اور ان سب کا شکر گزار ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں کیونکہ سیرت کے میدان میں وہ مجھ سے سبقت لے جا چکے ہیں۔ اب میرا بھی ارادہ ہے کہ میں بھی ان کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ شاید مجھے بھی امام المرسلین ﷺ کے پیچھے کھڑا ہونے والوں میں کچھ جگہ نصیب ہو جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سیرت مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں کچھ بھی لکھنا سعادت کا باعث ہے جس سے امید کی جاسکتی ہے کہ مجھے بھی ان طویل صفوں میں ضرور کچھ نہ کچھ جگہ مل جائے گی جو جناب مصطفیٰ ﷺ کی اقتدا میں قائم ہو چکی ہیں، نیز مجھے آپ ﷺ کی زیارت و شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ یقیناً میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ امید رکھنے میں حق بجانب ہوں۔

بلاشبہ سیرت نبویہ کا مطالعہ اور اس بارے میں تصنیف و تالیف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی محبت کی نعمت حاصل ہوتی ہے اور آپ کے احوال و افعال کے ساتھ عقیدت پیدا ہوتی ہے جس سے ہر دم محبت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور روحِ ایمانی قوی ہوتی جاتی ہے، نیز ایمان و یقین مضبوط ہوتے رہتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی سیرت انسانیت کے انتہائی قریب ہے۔ اسے سیکھنا اور اس پر عمل کرنا انتہائی آسان ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اس کی اقتدا کر سکتا ہے۔ وہ نہ کسی مخصوص قوم کے ساتھ خاص ہے اور نہ کسی محدود دور اور زمانے کے ساتھ نتھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے سیرتِ طیبہ کے بارے میں لکھنے پر مجبور ہی آپ ﷺ کی محبت نے کیا ہے، نیز یہ کہ میں اس طرح اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکوں۔ یقیناً یہ ایسا شرف ہے جس پر میں فخر کرتا رہوں گا، اس کا تذکرہ کرتا رہوں گا، اسے طلب کرتا رہوں گا اور اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ اس سے میرا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کی محبت ہے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے آپ ﷺ کے حوضِ کوثر پر پہنچ کر اپنی پیاس بجھا سکوں۔

میں سیرت کے قاری کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اس کتاب میں ایک مخصوص انداز اختیار کروں جو ہر وقت میرے مدنظر رہے اور وہ یہ کہ میں سیرت نبویہ کے قاری کو صرف حقائق ہی بتلاؤں اور وہ بھی بغیر کسی اضافہ کے۔

یہ کتاب دراصل ''رسول اللہ و خاتم النبیین'' کے نام کے ساتھ پانچ جلدوں میں تیار ہوئی تھی۔ جس میں مکمل سیرت آ گئی تھی اور ہر جلد کا الگ عنوان تھا، پھر میرے بہت سے احباب نے مجھ سے اس کے اختصار کا تقاضا کیا تاکہ اسے پڑھنا اور اس کا ترجمہ کرنا آسان ہو، لہٰذا میں نے پوری کوشش اور محنت کے ساتھ یہ اختصار آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میں نے اس میں خوب سوچ بچار کی ہے کہ کن باتوں کو حذف کیا جا سکتا ہے اور کن کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں میں نے کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔

میں نے اس اختصار میں بھی وہی انداز اختیار کیا ہے جو اپنی اصل کتاب میں اختیار کیا تھا کہ حدیث کی اصل کتابوں سے سیرت سے متعلقہ روایات اخذ کی جائیں اور تعارض کے وقت ان روایات کو تاریخی روایات

سے مقدم رکھا جائے، خصوصاً جن باتوں کا تعلق شرعی احکام سے ہو۔ بہت سے مقامات پر میں نے حاشیے میں اس کی تفصیل کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

نیز میں نے واقعات ذکر کرتے وقت ان سے اخذ شدہ فقہی مسائل اور انسانی زندگی سے متعلق حاصل ہونے والے اسباق وفوائد بھی ذکر کر دیے ہیں اور سیرت نبویہ میں موجود تمدنی، معاشرتی، انتظامی اور سیاسی پہلو بھی واضح کر دیے ہیں۔ اسی طرح میں نے دورِ نبوی میں نظامِ اسلام، دولتِ اسلامیہ کی تشکیل اور اسلام کی معاشرتی نشو ونما اور ارتقاء کی اقدار کا بھی ضمناً ذکر دیا ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے انسانی معاشرے میں خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ اور انتہائی کامیابی کے ساتھ ان امتیازات کو نافذ بھی فرمایا ہے اور اب وہ اقدار انسانیت کے لیے مشعل راہ بن چکی ہیں اور انسانیت اجتماعی طور پر ان کی محتاج ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے دیدار کا شرف تو حاصل نہیں کر سکا لیکن مجھے پختہ امید ہے کہ میں آپ کی سیرت طیبہ اور پاکیزہ زندگی کی صحبت کے شرف سے محروم نہیں رہوں گا کیونکہ میں گزشتہ کتابوں اور قلمی نسخوں سے محبت اور جذبات کا فیضان کشید کر کے آپ سے محبت رکھنے والے اور آپ کی حیات طیبہ کی معرفت کا شوق رکھنے والے احباب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

عرصۂ دراز گزر جانے کے باوجود میں خود کو آپ ﷺ اور اس دور کے بہت قریب محسوس کر رہا ہوں جس میں انسانیت بت پرستی کے بندھن سے آزاد ہوئی اور لوگ اللہ تعالیٰ کی خالص توحید وعبادت کے عادی بنے۔ میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام بھی اس احساس وشعور میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ گرامی قدر ڈاکٹر علی بن ابراہیم بن حمد النملہ کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں میری بہت حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں اصل کتاب ''رسول اللہ اور خاتم النبیین'' پانچ جلدوں میں منصۂ شہود پر آئی اور اب اس کا یہ اختصار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ سب ان کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ ہے۔ نیز میں نے ان کے مشوروں سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ جزاہ اللّٰہ عنی خیر الجزاء۔ اسی طرح میں عمومی طور پر ان تمام حضرات کے لیے دعا گو ہوں جنھوں نے اس کام کی تکمیل اور اشاعت میں میری کچھ بھی مدد کی۔

اس اختصار کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے بعد اب یہ دوسرا ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ میں نے اس میں مزید تحقیق کے بعد کئی مقامات پر تصحیح بھی کی ہے اور کہیں کہیں مزید اختصار بھی، جس کی طرف بعض قارئین نے میری توجہ مبذول کرائی تھی۔ میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور سب قارئین کے لیے علمِ نافع اور عملِ صالح کا خواستگار ہوں کیونکہ وہی ہر چیز کا مالک ومختار ہے اور ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

عبدالعزیز بن ابراہیم العمری

رمضان 1438ھ

سیرت نبویہ کے مطالعہ کے مقاصد وفوائد

نبیٔ کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کو سب مخلوق سے زیادہ محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوقات میں سے منتخب فرما کر اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت اور نبی ﷺ سے ہماری محبت کا تقاضا ہے کہ ہم آپ کا تفصیلی تعارف حاصل کریں اور آپ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں۔ یہ تو اس حق کا معمولی حصہ ہے جو آپ کو ہم پر حاصل ہے اور آپ سے محبت اور محبتِ الٰہی کی حقیقی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (آل عمرٰن 31:3)

سیرت مصطفیٰ ﷺ کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اسلام کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویر تھے کیونکہ آپ ﷺ دنیوی اور اُخروی تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کے بندے بن کر رہے۔ اس طرح آپ نے اسلامی شریعت، احکام اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان و مال کی قربانی کی عملی تصویر اپنے طرزِ عمل میں پیش کی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی سیرت درحقیقت سب سے بڑے اور افضل انسان کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔ لوگ عموماً اپنے سرداروں اور بزرگوں کی سیرت کو پڑھنے کے فطری طور پر شائق ہوتے ہیں تاکہ ان کی زندگی کے اہم واقعات وتفصیلات سے واقف ہوسکیں۔ اسی طرح ہر قوم اور امت اپنے بزرگوں اور ان کی تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے بلکہ ملمع سازی کے ذریعے سے ان کی شخصیت کے اردگرد جھوٹے واقعات کا تانا بانا بُنا جاتا ہے اور انھیں دیومالائی شخصیت ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ثابت کرسکیں کہ ہمارے پاس بھی قابل فخر شخصیات موجود ہیں۔

جبکہ ہم مسلمانوں کے محبوب قائد اور سردار تو حقیقتاً افضل ترین اور خوبصورت ترین شخصیت ہیں جو کہ نسل انسانی کے سردار ہیں، اس لیے ہم سیرت مصطفیٰ ﷺ کے مطالعہ کے ذریعے سے اس جبلی وفطری خواہش کو پورا کر رہے ہیں لیکن سو فیصد سچی اور صحیح معلومات کے ساتھ جو کہ سلیم الفطرت اشخاص کی خواہش ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ فرض بھی ہے تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کر سکیں۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں نے بھی نبیٔ کریم ﷺ کو انتہائی نامور شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہم تو رسول اللہ ﷺ کے متبع اور امتی ہیں۔ ہم کیسے کسی دوسری شخصیت کو آپ سے افضل سمجھ سکتے ہیں؟ ہمارے لیے تو بہت ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے آپ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں اور آپ سے پہلے کسی بھی شخصیت کی سیرت اور تاریخ کا مطالعہ نہ کریں، خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا وزیر، عالم ہو یا سردار۔

ایک بہت بڑا امریکی مؤرخ مائیکل ہارٹ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں انسانی تاریخ کی انتہائی مؤثر ایک سو شخصیات کا تذکرہ کرے گا۔ اس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''میں نے سیدنا محمد (ﷺ) کو اس فہرست میں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ ممکن ہے بہت سے قارئین میرے اس انتخاب پر حیران ہوں اور انھیں واقعتاً اس کا حق ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سیدنا محمد (ﷺ) تاریخ انسانی میں واحد شخصیت ہیں جو دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے کامیاب ترین ہوئے۔ انھوں نے اسلام کی طرف دعوت دی تو اسلام کو ایک عظیم دین کے طور پر قائم کر کے دکھا دیا۔ وہ نہ صرف دینی قائد بنے بلکہ وہ ایک عظیم سیاسی رہنما اور فوجی کمانڈر بھی ثابت ہوئے۔ آج ان کی وفات پر تیرہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا اثر نہ صرف باقی ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہا ہے اور مسلسل قوی ہو رہا ہے۔'' (أعظم مائة رجل في التاريخ، ص: 14)

حقیقتاً مائیکل ہارٹ کا یہ اعلان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی واضح تصدیق ہے:

﴿ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ ﴾ ''اور ہم نے آپ کا ذکر انتہائی بلند کر دیا۔'' (الم نشرح 4:94)

اسی طرح مشہور مؤرخ گستاؤلی بون نے اپنی کتاب ''حضارة العرب'' میں لکھا ہے: ''اگر شخصیات کا مقام و مرتبہ ان کے کارناموں کے لحاظ سے متعین کیا جائے تو تاریخ کی عظیم ترین شخصیت سیدنا محمد (ﷺ) کی ہوگی۔ (حضارة العرب، ص: 14)

ولیم میور، مشہور مؤرخ لکھتا ہے: ''جس قدر بھی ہم آپ کی زندگی اور سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں ہم اسے ہر

دم مجسمۂ فضائل اور مجموعۂ محاسن پاتے ہیں۔ نیز پاک طینت اور خلق عظیم کا اعلیٰ نمونہ دیکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ سب فضائل ومحاسن اپنی نظیر آپ ہیں۔ کسی دور میں بھی ان کی نظیر نہیں ملتی۔

(نبي الإسلام شخصيته حياته رسالته في عرض جديد، ص: 6)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر فرض کیا ہے کہ وہ سابقہ انبیاء کی حیاتِ طیبہ اور گزشتہ امتوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ انھوں نے انبیاءﷺ کی دعوت کے مقابلے میں کیا موقف اپنایا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا سلوک کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاریخ کو روشن چراغ بنا دیا جس سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے اور ان کے واقعات کو قرآن مجید میں ذکر کر کے تلاوت کا ذریعہ بنا دیا، نیز رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی، اطمینان اور اتباع کا سامان مہیا کر دیا۔ اسی طرح نبیٔ کریم ﷺ کے واقعات اور آپ کی سیرت طیبہ بھی بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے تسلی اور ثابت قدمی کا بہترین ذریعہ ہیں کیونکہ وہ کتاب اللہ اور سنت نبویہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) آپ کی طرف یہ قرآن وحی کر کے ہم آپ کو ایک بہترین بیان سناتے ہیں، جبکہ یقیناً اس سے پہلے آپ بے خبروں میں سے تھے۔'' (یوسف 3:12)

نیز فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''البتہ یقیناً ان کے بیان (واقعات) میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ (قرآن) گھڑی ہوئی بات نہیں بلکہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔'' (یوسف 111:12)

مزید فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝﴾

''(اے نبی!) یہ کچھ خبریں ان (تباہ شدہ) بستیوں کی ہیں جو ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو

قائم ہیں اور کچھ تہس نہس کر دی گئی ہیں۔'' (ھود 11:100)

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) یہ وہ بستیاں ہیں جن کی کچھ خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تو جس چیز کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اس پر ایمان لانے کے روادار نہ ہوئے۔ اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔'' (الأعراف 7:101)

ایک اور فرمان ہے:

﴿كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝﴾

''اسی طرح ہم آپ کو کچھ وہ احوال سناتے ہیں جو یقیناً (پہلے) گزر چکے اور یقیناً ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ذکر (قرآن) دیا۔'' (طٰہٰ 20:99)

اس قسم کی آیات واضح کرتی ہیں کہ گزشتہ انبیائے کرام کے واقعات کا مطالعہ قرآن، دین اور شرعی علم کا لازمی جز ہے جو سیدنا محمد ﷺ اور آپ کی امت کی زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ امت مسلمہ کی تربیت کا ذریعہ ہے اور ایسا علم ہے جس سے ہم قیامت تک بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾

''بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول (کی ذات) میں ہمیشہ سے بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔'' (الأحزاب 33:21)

گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آپ ﷺ ہمارے اولین استاد اور معلم ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''جیسے ہم نے تم میں ایک رسول تمھی سے بھیجا ہے، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

(البقرة 151:2)

اور یہ قطعی بات ہے کہ آپ کی اقتدا تبھی ہوسکتی ہے جب آپ کی سنت کا علم ہو۔ اور آپ کی سیرت اور اخلاق عالیہ آپ کی سنت ہی کا حصہ ہیں جن میں مسلمانوں کے لیے ہر حالت میں اعلیٰ نمونہ ہے۔ غرض آپ ﷺ داعیانِ دین کے لیے فکر وغم کو برداشت کرنے، مسلسل محنت، بلند حوصلگی، اعلیٰ مقاصد اور لوگوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنے میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ خاوندوں کے لیے باہمی تعاون، شفقت، رحم، پیار اور حقیقی محبت کرنے میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ قائدین کے لیے انتظامی معاملات، مصلحت امت، عوام الناس پر شفقت، انانیت اور تکبر سے لاتعلقی، امانت، خلوص، بے لوث سیاست اور عوام کی خیر خواہی میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ پڑوسیوں کے لیے پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھنے، ان کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کرنے، ان کی رہنمائی کرنے اور ان سے صلہ رحمی کرنے میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اصلاح کرنے والوں کے لیے صبر وتحمل، مقاصد کی بلندی، ترتیب وتنظیم، سکون ودلجمعی سے تبدیلی کی کوشش، انسانی ترقی کے لیے جدوجہد اور انسانی حقوق کی حفاظت میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ باپوں کے لیے شفقت، تربیت، رحمت، حقیقی محبت اور تعلیم وتربیت میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ فقراء کے لیے صبر، پاکبازی، خودداری اور امانت داری میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مالداروں کے لیے صدقہ، تواضع، ایثار، امانت، ایفائے عہد اور کفایت شعاری میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بیماروں کے لیے اجر وثواب کی نیت رکھنے، علاج ودوا میں حلال پر اکتفا کرنے اور دوسروں پر بوجھ نہ بننے میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اور عمومی طور پر آپ ہر اس شخص کے لیے اعلیٰ نمونہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور یوم آخرت کے اجر وثواب کا امیدوار ہے۔

یاد رہے کہ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل علم کے بغیر ناممکن ہے۔

سیرت طیبہ کا مطالعہ درحقیقت محبت رسول ﷺ کی دلیل ہے

رسول اللہ ﷺ کی محبت اپنی ذات سے بھی مقدم ہے۔ اور آپ ﷺ سے محبت کا مطلب آپ ﷺ کے اخلاق و عادات اور فضائل سے محبت کرنا ہے۔ محسن سے محبت یہ ہے کہ اس کی تعریف و تعظیم کی جائے اور اس کا شکریہ ادا کیا جائے، لہٰذا آپ ﷺ سے محبت کیوں نہ کی جائے؟ جبکہ آپ ﷺ کے احسانات تو نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک قائم و دائم رہیں گے۔ آپ ﷺ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت لے کر تشریف لائے، لہٰذا آپ سے محبت مرتبہ کے لحاظ سے ہر قسم کی محبت سے بے انتہا اعلیٰ اور بالا ہے کیونکہ ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اثر آپ ﷺ ہی کا ہے، لہٰذا ہم تو ہر چیز سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کریں گے حتی کہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر تا کہ ہم آپ ﷺ سے کچھ حاصل کر سکیں اور آپ ﷺ کے احکام کو ہر چیز پر مقدم کر سکیں۔ اس طرح بھی ہم آپ ﷺ کا کچھ حق ہی ادا کر سکیں گے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾

''جو کچھ رسول کریم (ﷺ) تمھیں دیں اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔'' (الحشر 7:59)

رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

«فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ»

''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ بن جاؤں۔'' (صحيح البخاري، حديث: 14، 16)

سیرت کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہمارے نبیٔ کریم ﷺ اور ہم پر اللہ کے کس قدر احسانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۧ﴾

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ آگاہ رہو! اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں۔'' (الشوریٰ 53,52:42)

انبیاء کی تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت مسلمانوں کے نزدیک تو مسلمہ ہے لیکن سابقہ امتیں بھی اس کی اہمیت سے غافل نہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۧ﴾

''البتہ یقیناً ان کے بیان (واقعات) میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ (قرآن) گھڑی ہوئی بات نہیں بلکہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔'' (یوسف 111:12)

سیرت نبویہ کے تعارف سے ہمیں مختلف امتوں اور نظاموں کا تعارف بھی حاصل ہو جاتا ہے جنھوں نے اسلام سے قبل اس جہان پر حکومت اور سرداری کی، خواہ سیاسی طور پر یا فکری طور پر۔ دینی طور پر یا اخلاقی طور پر۔ اسی طرح ہمیں اس نعمت کا بھی پوری طرح احساس ہو جاتا ہے جو اسلام کی بدولت لوگوں میں پیدا ہوئی۔ جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

(لَا یَعْرِفُ الْإِسْلَامَ مَنْ لَّا یَعْرِفُ الْجَاهِلِیَّةَ)

''جو شخص دور جاہلیت سے واقف نہیں وہ اسلام (کا احسان) نہیں سمجھ سکتا۔''

لیکن سیرت مصطفیٰ ﷺ میں جو صداقت پائی جاتی ہے وہ کسی بھی طور پر کسی دوسری شخصیت کی سیرت میں نہیں ملتی، خواہ وہ کتنی ہی عظیم شخصیت کیوں نہ ہو، لہٰذا ہمیں سیرت نبویہ کے مطالعہ سے خالص سچ ہی ملتا ہے جس میں کوئی جعلسازی نہیں جیسی کہ بعض دیگر شخصیات میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کی سیرت کے مطالعہ سے ہمیں ایسی تفصیلات اور حقائق معلوم ہوتے ہیں جو کسی اور جگہ نہیں ملتے۔

یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ آپ ﷺ کا ذکر آپ ﷺ کے دور سے بہت پہلے مشہور ہو چکا تھا۔ گزشتہ امتوں میں بھی آپ کا تذکرہ موجود تھا، مثلاً: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝﴾

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں۔ وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔'' (الصف 6:61)

اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں آپ ﷺ کا ذکر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ ۡ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾

''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات

اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' (الأعراف 157:7)

سیدنا محمد ﷺ کی صفاتِ عالیہ اور آپ ﷺ کے بارے میں خبریں آپ کی پیدائش سے صدیوں پہلے مشہور ومعروف ہوگئی تھیں۔ اہل کتاب علماء آپ ﷺ کی نبوت کا انتظار کرنے لگے تھے۔ عیسائیوں کی کتابوں میں نبیٔ آخرالزماں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں واضح اور قوی اشارے مسلسل پائے جاتے رہے۔

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے کتاب اللہ کے بارے میں صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جن کے بارے میں کتاب اللہ میں آیات نازل ہوئیں، نیز قرآن مجید کی بعض سورتوں کے نام سیرت طیبہ کے واقعات کے ساتھ منسلک ہیں، مثلاً: سورۂ انفال، توبہ، بنی اسرائیل، قریش، کوثر، کافرون، نصر اور فلق وغیرہ۔ علاوہ ازیں دیگر سورتوں میں بھی ایسی آیات بکثرت پائی جاتی ہیں جن کا سیرت طیبہ کے واقعات سے گہرا تعلق ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کتاب اللہ کی بہت سی آیات کی شانِ نزول کے بارے میں صحیح تصور پیدا کرتا ہے اور ایک خاص تاثر کا موجب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان نزول قرآن کے دور میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ چیلنجز جن کا رسول اللہ ﷺ، صحابۂ کرام اور اسلامی معاشرے کو سامنا کرنا پڑا، ان کی صحیح کیفیت بھی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ ہی سے واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو کس قدر مضبوط کر دیا تھا کیونکہ وہ اس دور میں اس قسم کے واقعات قرآن کریم کی معرفت جان چکے تھے۔

سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے صحابۂ کرام کے مناقب وفضائل بھی معلوم ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت میں اضافہ ہوتا ہے، نیز ان کے درجات معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارات فرمائے ہیں، مثلاً:

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ جبکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا یہ (ان لوگوں کے) برابر نہیں ہیں (جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام کیے۔) یہ (پہلے کرنے والے) لوگ درجے میں ان لوگوں سے عظیم تر ہیں جنھوں نے اس (فتح) کے بعد خرچ کیا اور لڑائی کی اور اللہ نے ہر ایک سے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔'' (الحدید 10:57)

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ان صحابہ کے مناقب وفضائل تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔

دیگر مؤرخین ومحدثین نے بھی اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

یہ تھے سیدنا محمد ﷺ کے شاگردانِ کرام جن میں خلفائے راشدین بھی شامل ہیں اور بڑے بڑے تجربہ کار قائدین، سیاستدان، عظیم جنگی جرنیل اور بے نظیر عالم بھی۔ان لوگوں نے ایک دنیا کی قیادت کی اور زمین میں عدل وانصاف، توحید اور رحمت وشفقت کا دور دورہ ہوا۔

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے ہمیں ان ''خصائص نبویہ'' کا بھی پتہ چلتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مصطفیٰ ﷺ پر انعام کیے تھے۔ (خصائص کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الخصائص النبوية للإمام السيوطی رحمہ اللہ اور ڈاکٹر ابوبکر جزائری کی کتاب: هٰذا الحبيب يا مُحب)

آپ ﷺ کے خصائص بہت زیادہ ہیں، ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور بلاشبہ ہم نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔'' (الأنبیاء 107:21)

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝

''اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ ایسی ہی چیز خود ہمیں بھی دی جائے جیسی رسولوں کو دی گئی۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔ جن لوگوں نے جرم کیے انھیں جلد ہی اللہ کے ہاں بڑی ذلت ملے گی اور اس مکروفریب کی وجہ سے شدید عذاب ہوگا جو وہ کرتے رہے۔'' (الأنعام 124:6)

لہٰذا آپ ﷺ عظیم ترین انسان ہیں جنھیں رب العالمین نے علم وادب سکھایا جیسا کہ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

«أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي» ''مجھے میرے رب نے ادب سکھایا اور بہت اچھا سکھایا۔''

(سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني، حديث: 72)

آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے چنا اور منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾

''وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بلاشبہ اس سے پہلے تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔'' (الجمعة 2:62)

آپ خاتم النبیین تھے، سب لوگوں سے زیادہ رحم کرنے والے، سب سے زیادہ سخی، سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ صاف ستھرے اور سب سے زیادہ پاکباز ﷺ۔

آپ ﷺ کی تائید معجزات سے بھی ہوئی اور واضح دلائل سے بھی۔ کرامات سے بھی ہوئی اور ناقابل تردید شواہد سے بھی۔ جن کو آپ ﷺ کے دور کے لوگوں نے دیکھا، علماء نے ان کو بالیقین جانا اور آپ ﷺ سے محبت کرنے والوں نے انھیں اپنے دلوں میں بٹھایا۔ آپ ﷺ کی شہرت تمام مخلوق سے بڑھ کر ہوئی اور آپ واقعتاً اس کے حق دار تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی نوازشیں آپ ﷺ پر خوب ہوئیں اور انسانوں کو بھی آپ پر درود پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾

''بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت و درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود وسلام بھیجو اور خوب خوب سلام بھیجو۔'' (الأحزاب 56:33)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتوحات عطا فرمائیں، آپ کی مدد فرمائی اور آپ کی مغفرت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝﴾

''(اے نبی!) بلاشبہ ہم نے آپ کو فتح دی، کھلی فتح تاکہ اللہ آپ کے لیے آپ کی اگلی پچھلی ہر کوتاہی معاف کر دے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کرے اور آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے۔'' (الفتح 2,1:48)

سیرت نبویہ کا مطالعہ اہل ایمان کے عزم کو مضبوط کرتا ہے، ان کو صبر کرنا سکھاتا ہے اور ان کے دلوں میں امید روشن کرتا ہے کہ ضرور حق کو باطل پر غلبہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا دین دوسرے ادیان پر غالب ہوگا۔ کمزوری کے بعد قوت حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ قیامت تک اپنے دین، اپنے نبیٔ کریم اور آپ ﷺ کی امت مسلمہ کی ضرور مدد فرمائے گا۔

یاد رہے کہ سیرت نبویہ بذاتِ خود ایک علم ہے اور بہت سے علوم کی چابی ہے، مثلاً: اس کے مطالعہ سے ایک مسلمان شخص اخلاق، اخلاق کے نفاذ، عقیدہ، اصولِ عقیدہ، شرعی احکام، ضروری آداب، عدل و انصاف، اسلامی نظام، شرعی سیاست اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے محنت جیسے بہت سے علوم حاصل کرسکتا ہے، اسی طرح سیرت کے قارئین بہت سے حقائق سے واقف ہوتے ہیں جن کا سیرت کے واقعات سے تعلق ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قاری رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کے مختلف مراحل اور دعوت کے سلسلے میں تدریج سے واقف ہوتا ہے۔

سیرت نبویہ کے مطالعہ کی کیفیت

سیرتِ نبویہ کے ہر قاری اور محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، آپ کے حقوق اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ خصائص کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی وحی اور رسالت

کے لیے سب لوگوں میں سے منتخب فرمایا اور آپ کو ایسا تحفظ عطا فرمایا جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ آپ ﷺ کو یہ تحفظ دینی مسائل میں بھی حاصل ہے اور اخلاق میں بھی، نیز اللہ تعالیٰ کی خالص توحید میں بھی۔ آپ ﷺ نبی بننے سے قبل بھی اور بعد میں بھی شرک اور جھوٹ سے محفوظ رہے۔ اسی طرح نبی بننے سے پہلے بھی آپ عدل، انصاف، امانت اور لوگوں پر شفقت جیسے اخلاقِ عالیہ سے متصف تھے اور بعد میں بھی ان پر کاربند رہے، حتیٰ کہ آپ اپنی پیدائش کے وقت ہی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی، حفاظت اور تربیت میں رہے اور یہ سلسلہ نبوت سے قبل اور بعد مسلسل چلتا رہا۔ لہٰذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی غلطی نکالے، علاوہ ان چند باتوں کے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ادب سکھاتے ہوئے قرآن مجید میں کر دیا ہے، مثلاً: سورۂ عبس میں ایک نابینا صحابی کے سلسلے میں یا بدر کے قیدیوں کے بارے میں یا وہ باتیں جو آپ ﷺ نے خود ذکر کر دی ہیں ان کے علاوہ کسی شخص کا کوئی اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ سیرتِ طیبہ کا قاری آپ ﷺ اور آپ کی سیرت کے متعلق بات کرتے ہوئے ادب کو ملحوظ خاطر رکھے۔ آپ ﷺ کے خصوصی حق و احترام کو ذہن میں رکھے۔ آپ ﷺ سے محبت کا حق ادا کرے اور آپ ﷺ کے دلی احترام کو فراموش نہ کرے، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم شرعی حدود کی پابندی کریں اور کتاب اللہ میں آپ ﷺ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے تجاوز نہ کریں، مثلاً: آپ کو قرآن مجید میں اللہ کا بندہ کہا گیا ہے۔ اور آپ نے خود بھی اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول قرار دیا ہے، یعنی آپ ایک انسان اور بشر ہیں اگرچہ افضل ترین بشر ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِيَدِي لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ، آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا تَحْتَ لِوَائِي، وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْأَرْضُ وَلَا فَخْرَ»

''قیامت کے دن میں سب اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔ یہ میں فخر کے طور نہیں کہہ رہا۔ میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا۔ یہ میں بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ ہر نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا اور میں پہلا وہ شخص ہوں گا جو زمین، یعنی اپنی قبر سے نکلے گا۔'' (جامع الترمذي، حديث: 3615)

گویا اتنے عظیم لوگوں میں بھی آپ ﷺ ہی ''اول'' ہوں گے۔ کوئی آپ سے آگے نہ بڑھ سکے گا لیکن اس سب کے باوجود آپ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، جیسا کہ یہ بات کتاب اللہ کی کئی آیات میں صراحتاً بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾

''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اردگرد کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔'' (بنی إسراء یل 1:17)

یعنی آپ ﷺ کے معراج و اسراء کو بیان کرتے وقت آپ کے بندے ہونے کی خصوصی تاکید کی گئی تاکہ کوئی شخص عیسائیوں کی طرح آپ ﷺ کو بشریت سے نکال کر آپ کے بارے میں غلو شروع نہ کر دے، جیسا کہ انھوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا، لہٰذا آپ ﷺ کی اس بے نظیر کرامت کا ذکر کرتے وقت بھی آپ کے مقام عبودیت (بندہ ہونے) کو پوری تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا جو درحقیقت آپ ﷺ بلکہ ہر بشر کے لیے باعث تکریم وعزت ہے، حالانکہ اگر آیت میں اَسْرٰی بِرَسُوْلِہٖ کہا جاتا تب بھی سو فیصد درست ہوتا، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ایک اور فرمان ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پھر جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔'' (الکھف 110:18)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بندہ ہونے کی یاد دہانی کرائی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی شخص آپ ﷺ کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ کسی بھی بشر کو، خواہ وہ اس کی آل و اولاد

ہی کیوں نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی محبت سے مقدم نہ رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی و رسالت کے لیے منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ مقام عبودیت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی توہین نہیں نہ اس سے آپ کا مرتبہ کم ہوا ہے بلکہ یہ تو آپ ﷺ کا کمال ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے کامل بندے ہیں اور آپ دوسرے بندوں کی طرح نہیں بلکہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے انتہائی شکر گزار بندے تھے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ جب ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اتنی لمبی نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ کے مبارک پاؤں بہت زیادہ سوج جاتے تھے، انھوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ کو اتنی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! تو کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' (صحيح البخاري، حديث: 4837، وصحيح مسلم، حديث: 2820) آپ ﷺ نے شکر گزار نبی یا شکر گزار رسول کے الفاظ نہیں فرمائے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اللہ کا بندہ بننا ہی آپ ﷺ کی نبوت کا کمال ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی اطاعت بھی مقصود تھی: ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''بلکہ آپ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے کامل شکر گزار بندوں میں شامل ہو جائیں۔'' (الزمر 66:39)

آپ چونکہ تمام انسانیت کے سردار ہیں اور سب لوگوں کے لیے نمونہ اور امام ہیں۔ آپ اس لیے تشریف لائے ہیں کہ ان کو ایک اللہ تعالیٰ کی سچی عبادت اور غلامی کی طرف لے چلیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے متعلق معاملات میں آپ ہی لوگوں کے امام اور سردار ہیں۔ آپ عام انسانوں جیسی زندگی گزارتے تھے۔ کھاتے پیتے تھے، سوتے جاگتے تھے، شادیاں کرتے تھے، خرید و فروخت کرتے تھے اور دوستی و دشمنی بھی کرتے تھے۔ آپ کا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شامل و داخل تھا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے، بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت خالص اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔'' (الأنعام 162:6)

سیرت نبویہ کے قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس زمانے اور دور کے حالات و امکانات پر بھی نظر رکھے

جو نبیٔ کریم ﷺ نے گزارا تا کہ اسے ان مشکلات کا اچھی طرح احساس ہو سکے جن کا آپ اور آپ کے صحابۂ کرام کو سامنا کرنا پڑا، نیز اسے اس علاقے اور درجہ حرارت کا پتہ چلے۔ اس علاقے کے زرعی، حیوانی پیداوار اور اقتصادی حالات کا اندازہ ہو سکے اور وہ اس ماحول کے مادی اور انسانی امکانات اور طبعی وسائل کا دیگر علاقوں سے موازنہ و مقابلہ کر سکے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس وقت کے جغرافیائی حالات اور قبل از اسلام کے عربوں کے رسوم و رواج اور حالات سے بھی واقفیت حاصل کر لے تا کہ اسے ان حالات کا صحیح تصور حاصل ہو سکے جن میں رسول کریم ﷺ نے زندگی گزاری۔ اس طرح وہ آپ اور آپ کے صحابہ کرام کو ان کا صحیح حق اور مقام و مرتبہ دے سکے گا، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کی سیرت اور دعوت کے مختلف مراحل کو مدنظر رکھے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سیرت کے واقعات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی متعلقہ آیات کے ساتھ ملا کر پڑھے اور اگر ضرورت پڑے تو تفسیر کی کتابوں اور اسبابِ نزول کی طرف بھی رجوع کر لے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ سیرت طیبہ کو اس زمانے میں ہونے والے واقعات سے بھی ملا کر دیکھا جائے، خواہ وہ اسلامی معاشرے میں وقوع پذیر ہوئے یا دیگر انسانی معاشروں میں۔ (تدريس السيرة النبوية في مناهج التاريخ المدرسية، ص: 35) نیز یہ بھی دیکھا جائے کہ دورِ نبوی کا ہمارے اس زمانے میں ہم پر کیا اثر پڑا ہے؟

یہ بات ہر وقت مدنظر رہنی چاہیے کہ ہم ایسی شخصیت کے بارے میں لکھ پڑھ رہے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے اور ان کے بارے میں جھوٹ بولنا قطعاً حرام ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا ہے:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

''جس شخص نے میرا نام لے کر جان بوجھ کر جھوٹ بولا، اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 107، وصحيح مسلم، حديث: 3)

حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی حمایت میں آپ کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے بارے میں علمی بحث و تحقیق کرنے والا شخص اس حقیقت کو پالے گا کہ وہ انتہائی باریک اور تفصیلی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بہت سے اہل علم حضرات نے سیرت طیبہ کے علم کو ایک مستقل علم شمار کیا ہے، نیز وہ سمجھتے ہیں کہ یہ علم سنت نبویہ ہی کی ایک اہم قسم ہے۔

سیرت نبویہ کی خصوصیات

یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ سیرت نبویہ ایسی شخصیت کے بارے میں ایک عظیم علم ہے جنھیں رب العالمین کی طرف سے منتخب کیا گیا تھا۔ اس میں ایسے واقعات آتے ہیں جن کی تائید قرآن مجید کی آیات مبارکہ کرتی ہیں جو قیامت تک پڑھی جائیں گی۔ مختصر یہ کہ سیرت طیبہ چند خصوصیات کے ساتھ ممتاز ہے، مثلاً:

① یہ ایسی شخصیت کی سیرت ہے جو افضل ترین انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر بلند کر دیا اور انھیں خود آداب سکھائے اور ان کی تربیت فرمائی۔ نتیجتاً آپ پوری نسل آدم کے سردار بن گئے۔ ابتدائے آفرینش سے قیامت قائم ہونے تک۔

② سیرت نبویہ کا ماخذ و مصدر بہت اعلیٰ ہے، یعنی اکثر واقعات، جنگی حالات، نیز آپ کے اخلاق و عادات قرآن مجید میں مذکور ہیں یا ان کی طرف واضح اشارات ہیں۔

③ سیرت نبویہ دیگر انبیاء و صالحین کی سیرتوں کے مقابلے میں انتہائی باریک اور تفصیلی ہے کیونکہ صحابۂ کرام نے آپ کی شخصی اور عوامی زندگی کے تمام پہلوؤں کا بخوبی جائزہ لیا اور انتہائی باریکی اور تفصیل کے ساتھ ہم تک منتقل کر دیا۔ آپ سے پہلے کسی انسانی شخصیت کی سیرت اس طرح منتقل نہیں ہوئی۔

④ یہ صحیح ترین سیرت ہے جو کسی انسان کے بارے میں لکھی گئی۔ نیز یہ سیرت صادق اور امین ﷺ شخصیت کی ہے جسے آپ ﷺ کے سچے صحابہ نے نقل کیا ہے۔ اس سیرت کے ناقلین انتہائی مشہور و معروف تھے اور سندیں بھی صحیح ہیں۔

⑤ اس سیرت میں رسول اللہ ﷺ کے تمام دینی اور دنیوی اعمال، آپ کی شرعی سیاست، آپ کے جہاد، آپ کی جنگوں کے واقعات اور آپ کے ہم زمانہ صحابہ، دیگر امتوں اور قوموں کا تذکرہ شامل ہے۔

⑥ آپ ﷺ کی سیرت اور اس میں مذکور واقعات مشہور اور مخصوص جغرافیائی مقامات سے تعلق رکھتے ہیں جو ان کی تائید و تصدیق کرتے ہیں اور ہمارے لیے ان واقعات کی متابعت ممکن بناتے ہیں۔

⑦ سیرت طیبہ ایسے اسباق اور عبرتوں سے بھری ہوئی ہے جو ایک مسلمان کے لیے خصوصاً اور عام شخص کے

لیے عموماً استفادے کا بہترین موقع ہے، خواہ اس کی حالت، مقام و مرتبہ اور عہدہ کوئی بھی ہوتا کہ وہ دنیوی اور اخروی سعادت اور کامیابی کے اسباب تک پہنچ سکے۔

⑧ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ، یتیمی کے دوران اللہ تعالیٰ کا آپ کی سرپرستی کرنا، آپ کی حفاظت کرنا اور ہر قسم کے دشمنوں سے بچا کر رکھنا ناقابل تردید معجزہ ہے جو کہ سیرت طیبہ کے دوران واضح نظر آتا ہے اور اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کی مدد کی، آپ کے دین کی حفاظت فرمائی اور اسے پوری دنیا میں پھیلا دیا، نیز اللہ تعالیٰ نے وہ تمام وعدے پورے فرما دیے جو آپ سے یا اپنے نیک بندوں سے کیے تھے۔

⑨ آپ کی سیرت طیبہ کو نہ صرف امت مسلمہ کے فقہاء، علماء اور محدثین کی طرف سے انتہائی اہمیت اور توجہ حاصل ہوئی بلکہ اسے غیر مسلم مؤرخین اور محققین نے بھی انتہائی اہم گردانا۔

⑩ سیرت طیبہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قوانین اور نصرت الٰہی کا ایک مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝﴾

''بلاشبہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی ضرور مدد کرتے ہیں، دنیوی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جب گواہ (اللہ کے سامنے گواہی کے لیے) کھڑے ہوں گے۔'' (المؤمن 51:40)

⑪ سیرت طیبہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

''کہہ دیجیے، یقیناً میری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

(الأنعام 162:6)

نیز وہ آپ کی زندگی، صفات، اخلاق و عادات کو اچھی طرح گھیرے ہوئے ہے اور اس کا آپ کی رسالت اور نبوت سے گہرا تعلق ہے۔ تبھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوقات میں سے منتخب فرمایا۔

⑫ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ انسانی زندگی میں عظیم تبدیلی اور انقلاب کی تاریخ ہے جس میں لوگ بت پرستی

سے توحید، شرک سے اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اور جاہلیت سے اسلام کی جانب منتقل ہوئے۔

⑬ سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں اس کا گہرا اثر ہوا، نیز تزکیۂ نفس، اخلاقِ عالیہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پر مبنی روحانی تربیت میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

⑭ سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دورِ عظیم کا تعارف مکمل ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنی جان، مال اور اہل وعیال کے ساتھ آپ کی مدد کی۔ نیز اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور ان کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ انھیں کس قدر محبت تھی۔ اس طرح ہم ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کا دفاع بخوبی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے محبوب اور آپ سے سسرالی تعلق رکھنے والے تھے، مثلاً: سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم، امہات المومنین اور دیگر اہل بیت اور عام صحابہ۔ رضی اللہ عنہم.

⑮ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ انتہائی خوبصورت، کامل اور اعلیٰ درجہ کی پاکیزہ ہے۔

⑯ سیرت طیبہ قرآن کریم اور آپ کی زندگی کے مختلف مراحل میں نازل ہونے والی آیات کو سمجھنے کا انتہائی صحیح اور قابل اعتماد ذریعہ ہے۔

دورِ جاہلیت میں عربوں کے حالات

نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت سے نور چمکنے لگا، اندھیرا چھٹ گیا اور توحید، علم، معرفت، حق و انصاف اور عدل کی حکومت قائم ہوگئی۔ اسی لیے اسلام سے پہلے کا دور زمانۂ جاہلیت کے نام سے معروف ہوگیا۔ عمومی طور پر پورے جہاں اور خاص طور پر عربوں پر اسلام کا احسان جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام سے قبل تمام علاقوں کے حالات جان لیے جائیں کیونکہ اسلام صرف دینی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ دنیوی لحاظ سے بھی انسانی زندگی کا نگران اور محافظ ہے۔ اخلاق، معاملات، عادات، قوانین اور عملیات میں سے کوئی پہلو اس سے اوجھل نہیں۔ لیکن چونکہ عمومی طور پر جزیرۂ عرب ہی ابتدائی دور میں سیرت کے واقعات کا میدان رہا ہے، اس لیے بہت ضروری ہے کہ بعثت نبوی سے قبل جزیرۂ عرب کے محل وقوع اور حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ جغرافیائی لحاظ سے عرب کا علاقہ ایک بڑے جزیرے کی طرح ہے جسے تین اطراف سے سمندروں نے گھیرا ہوا ہے۔ مغربی، جنوبی اور مشرقی۔ اس کے درمیان وسیع صحراء ہے جس میں کہیں کہیں پانی پایا جاتا ہے۔ اس میں موجود رہائشی علاقے انتہائی مختصر ہیں جو کہ اس کی لمبائی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، البتہ وہ سرسبز زرعی علاقے شمار ہوتے ہیں، مثلاً: اس کے جنوب میں یمن اور عمان ہیں اور یہ دونوں پہاڑی زرعی علاقے ہیں اور کچھ حد تک معتدل ہیں لیکن ناہموار ہیں اور خاصے دشوار گزار بھی۔

دینی صورت حال

اکثر عرب بت پرست تھے۔ ان میں بت پرستی اس قدر پھیل چکی تھی کہ پورے عرب میں بت پرستی کے مشہور مرکز تھے جہاں وہ عبادت اور قربانیوں کے لیے جایا کرتے تھے اپنے اپنے طریقے کے مطابق ان سے

مدد طلب کرتے تھے۔ عرب کا کوئی خطہ اس سے محفوظ نہ تھا حتی کہ مکہ مکرمہ بھی جو ابراہیمی دین کا مرکز تھا، البتہ کہیں کہیں یہودی پائے جاتے تھے۔ ان کا مرکز یثرب (مدینہ طیبہ) اور خیبر تھا۔ اس کے علاوہ وہ تیماء، فدک اور وادیٔ قریٰ میں بھی قابل ذکر تعداد میں موجود تھے۔ (التاريخ اليهودى العام لصابر طعيمة: 14/2) اسی طرح بعض شہری مراکز میں ''موالی'' غلام بھی پائے جاتے تھے، کہیں انفرادی طور پر اور کہیں اجتماعی طور پر۔ وہ عموماً غیر عربی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض عربی قبائل میں عیسائیت بھی پھیل چکی تھی۔ عرب میں اس کا اہم مرکز نجران تھا۔ (نجران في عصر النبوة والخلافة الراشدة لمحمد بن عوض عتيبى۔ یہ مقالہ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے سال 1430ھ میں ایم۔ اے کے امتحان میں پیش کیا گیا، غیر مطبوع ہے۔) عربوں میں بھی عیسائیت تحریف کا شکار ہوچکی تھی اور اس نے بت پرستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی عبادت کرنے لگے تھے اور اپنے پادریوں اور راہبوں کو اس قدر مقدس جاننے لگے تھے کہ ان کے حکم کو اللہ کے حکم پر ترجیح دیتے تھے۔

البتہ عرب کے عیسائی دوسرے عیسائیوں کے مقابلے میں علم و ثقافت میں زیادہ مشہور تھے۔ انھوں نے رومیوں، شام و عراق کے عربیوں، خصوصاً بنو منذر اور غسانی حکمرانوں کے ساتھ میل جول کے ذریعے اپنی ثقافت کو تبدیل کر لیا تھا۔ (المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام لجواد على: 155/3، 387)

عربوں کی اجتماعی زندگی

اجتماعی زندگی پر عموماً دینی اور رائج اعتقادات کے اثرات ہوتے ہیں۔ اس دور میں تمام عرب بلا استثنا شراب نوشی، جوئے بازی اور سود خوری میں غرق تھے۔ مرد لوگ زنا کاری سے پرہیز نہیں کرتے تھے، البتہ آزاد عورتیں اسے ناپسند کرتی تھیں۔ (بلوغ الإرب في معرفة أحوال العرب لمحمود شكرى آلوسى: 4/2) نیز وہ بیٹیوں کو ناپسند کرتے تھے اور انھیں وراثت میں شریک نہ کرتے تھے۔ (تفسير ابن كثير: 1116/1) وہ لاتعداد بیویوں کے قائل تھے بلکہ بعض عورتیں بھی ایک سے زائد خاوند رکھتی تھیں۔ (المفصل لجواد على: 539/5)

بعض لوگ اپنے باپ کی بیوی سے بھی زبردستی نکاح کر لیتے تھے اور بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں جمع کر لیتے تھے۔ (تفسير ابن كثير: 453/1، والمفصل: 529/5)

البتہ دور جاہلیت میں بھی عربوں میں بعض اعلیٰ اخلاق و عادات پائے جاتے تھے، مثلاً: مہمان نوازی، بہادری، جوانمردی، فی البدیہ تقریر، ذہانت اور آزادی سے محبت وغیرہ۔ (المفصل: 402/5، وبلوغ المرام: 46/1، از محمود شکری آلوسی) لغت کے لحاظ سے عربی زبان اپنے پورے عروج پر تھی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنے جوبن پر تھی، البتہ لہجہ میں کچھ اختلاف ضرور تھا۔ (تاريخ الأدب العربي لشوقي ضيف، العصر الجاهلي، ص: 123) وہ لوگ فصاحت و بلاغت کے شہسوار تھے۔

اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ کو قرآن مجید بطور معجزہ عطا کیا گیا جس نے ان کو فصاحت و بلاغت میں بار بار چیلنج کیا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بلاغت احادیث میں بھی انتہائی دل آویز ہے۔ وہ لوگ پوری کوشش کے باوجود اس کا مقابلہ کرنے یا اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہے حتی کہ دس آیات بلکہ ایک آیت بھی بنا کر نہ لا سکے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔'' (هود 13:11)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝﴾

''اور اگر تم اس (قرآن) کے متعلق شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔'' (البقرة 23:2)

دورِ جاہلیت میں دیگر دنیا کے دینی حالات

یہ جہانِ رنگ و بو تو بہت وسیع ہے اور مکمل طور پر اس کا احاطہ کرنا خاصا مشکل ہے، البتہ ان علاقوں کی بات

آسانی سے ممکن ہے جو عرب علاقوں کے اردگرد ہیں یا ان کا عرب پر اثر ہوا یا وہ سیرت نبویہ کے دور میں خود متاثر ہوئے۔ قرآن مجید نے چند الفاظ میں اس دور جہان کی عمومی حالت اچھی طرح واضح کر دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

''خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے تا کہ اللہ انھیں ان کے بعض اعمال (کا مزہ) چکھائے جو انھوں نے کیے تا کہ وہ (ہدایت کی طرف) رجوع کریں۔'' (الروم 41:30)

جہاں تک دینی صورتِ حال کا تعلق ہے جو کہ عموماً لوگوں کے اعمال کی مضبوط بنیاد ہوتی ہے تو دونوں آسمانی دین (یہودیت اور عیسائیت) علم، کتاب اور وراثت انبیاء کے دعویدار تھے اگرچہ دیگر مذاہب بھی پائے جاتے تھے۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

یہودیت

اس سے وہ دین مراد ہے جو سیدنا یعقوب، اسرائیل علیہ السلام کی نسل میں سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے اختیار کیا کیونکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی تھی۔ یہ لوگ توحید پر کاربند تھے۔ مختلف اوقات میں ان میں بہت سے انبیاء آئے، البتہ یہودیوں نے تورات میں تحریف کی اور اپنے بعض انبیاء کو ناحق قتل کیا۔ نیز انھوں نے اپنے انبیاء کی وصیت کی مخالفت کی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی بے ادبی کی۔ یہ لوگ اہل کتاب کے نام سے مشہور ہوئے کیونکہ ان کے پاس تورات کے علاوہ بھی صحائف وغیرہ تھے۔ یہ لوگ بت پرستوں کے مقابلے میں حق کے زیادہ قریب تھے لیکن اس کے باوجود اپنی بے ادبی اور گستاخیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئے۔ نیز انھوں نے اپنے علماء کو اس قدر مقدس قرار دے دیا کہ ان کے اقوال کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر بھی مقدم کر دیا اور جان بوجھ کر تورات میں تحریف کی۔

اس سب کے باوجود وہ ''نبیٔ آخر الزماں'' کے انتظار کا دعویٰ کرتے تھے تا کہ اس کی پیروی کریں اور وہ اس حق سے بھی بخوبی واقف تھے جو سید الانبیاء محمد ﷺ لے کر تشریف لائے۔

عیسائیت

دینی لحاظ سے یہ لوگ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ یہ دین سب سے زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ ان کے مختلف گروہ اور فرقے تھے۔ شام، عراق، مصر، حبشہ اور جنوبی اور مشرقی یورپ میں ان کی حکومتیں تھیں۔ نیز انھیں روم کی سیاسی، فوجی اور مالی قوت کی تائید و مدد بھی حاصل تھی۔ (تاريخ الأديان لفاروق الدملوجي، ص: 583)

جب چوتھی صدی عیسوی میں رومی عیسائیت میں داخل ہوئے تو قسطنطین اکبر کے ہاتھوں بت پرستی اور شرک اس میں داخل ہوگیا، نتیجتاً یہ توحید سے خالی ہوگئی اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا آغاز ہوگیا، حتی کہ جو شخص سیدنا مسیح علیہ السلام کی عبادت نہیں کرتا تھا، اسے گرجا کے رسمی عقیدے سے خارج سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح رومی حکومت اس کی سیاسی قوت بن گئی اور غسانی عرب، نیز حبشہ کے بادشاہ اس کے خادم بن گئے، پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں عیسائیوں میں اختلافات پیدا ہوگئے، حتی کہ وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دینے لگے بلکہ آپس میں جنگیں شروع ہوگئیں۔ روم کے عیسائیوں اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان تصادم ہوا اور مستقل دشمنی قائم ہوگئی۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 26)

دور جاہلیت میں عرب کے عیسائی عموماً یعقوبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

(الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب المعاصرة، ص: 503)

جبکہ فارس اور عرب کے کچھ عیسائی خصوصاً عراقی عیسائی نسطوری تھے۔ (الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب المعاصرة، ص: 502) اور روم کے عیسائیوں سے بہت مختلف تھے۔

مختصر بات یہ ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دورِ جاہلیت میں عیسائیت کے تمام پیروکار کھلے طور پر بت پرستی میں داخل ہو چکے تھے۔

مجوسیت

یہ دین بنیادی طور پر آگ کی عبادت پر مبنی ہے۔ اس میں بعض مظاہرِ فطرت، مثلاً: ستارے اور سورج بھی پوجے جاتے ہیں۔ (السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 26) ان کے بڑے بڑے عبادت خانے ایران

اور فارس کے دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ فارسی حکومت نہ یہ کہ اس دین کی حمایت اور حفاظت کرتی تھی بلکہ اپنی پوری بادشاہت اور زیر اثر علاقوں میں اسے پھیلانے کی پوری کوشش بھی کرتی تھی۔ اس طرح مجوسیت عرب علاقوں میں بھی داخل ہوچکی تھی اور جزیرۂ عرب کے مشرقی علاقے بحرین میں کچھ حد تک پھیل چکی تھی۔ جہاں بھی کوئی فارسی جماعت ہوتی وہ مقامی لوگوں پر اثر انداز ہو جاتی اور اس کے عبادت خانے اور دیگر متعلقات پھیل جاتے۔

مجوسیت کا سابقہ دین زردشت تھا بلکہ کہا جاتا ہے کہ مجوسیت زردشت ہی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔

(صفوة السيرة النبوية لمهدى رزق الله، ص:51)

بدھ مت

یہ بھی بت پرست مذہب تھا جس کی بنیاد بتوں کی عبادت پر تھی۔ اس مقصد کے لیے بھی بڑے بڑے عبادت خانے قائم کیے گئے تھے جن میں کاہن، جادوگر اور شعبدہ باز قسم کے لوگ کام کرتے تھے۔ یہ مذہب ہندوستان اور اس کے جنوب و مشرق، ایشیائی علاقوں اور چین میں پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک اس مذہب کا بنیادی عقیدہ معبودوں کی کثرت اور لڑائی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝﴾

''اگر آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور معبود ہوتے تو ان میں فساد برپا ہو جاتا، لہٰذا پاک ہے اللہ تعالیٰ عرش والا ان باتوں سے جو یہ خود بناتے ہیں۔'' (الأنبياء 22:21)

انھی علاقوں میں بدھ مت کے ساتھ ساتھ ہندومت بھی معروف تھا جو کہ معبودوں کی کثرت کے اعتقاد میں سرتاپا غرق تھا۔ (السيرة النبوية للندوي، ص: 28)

اگرچہ عربوں کی بت پرستی اور بتوں کی عبادت عرب کے گوشے گوشے حتی کہ مکہ مکرمہ میں بھی عام رائج تھی مگر اس کے پیچھے کوئی فلسفی ذہن کام نہ کرتا تھا۔ اسی لیے عربوں کے پاس ان کے خود ساختہ معبودوں کے بارے میں کوئی تحریری ثقافت نہ پائی جاتی تھی۔ بلکہ ان کے اس فعل کی بنیاد صرف اور صرف اندھی تقلید تھی یا یہ

تصور کہ یہ بت ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾

''سنو! خالص بندگی اللہ ہی کے لیے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں، یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، بہت ناشکرا ہو۔'' (الزمر 3:39)

نیز وہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کے منکر تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾

''اور انھوں نے کہا: بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں بس زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کرتے ہیں۔'' (الجاثیۃ 24:45)

دورِ جاہلیت میں سیاسی حالات

ہر صاحبِ عقل شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ توحید اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت والا دین لے کر تشریف لائے۔ اور آپ نے ایک حکومت قائم کی اور اس کے لیے ایک نظام بنایا اور حکومت کو شریعت اور دین کی بنیاد پر چلایا، نیز عدل و انصاف کے ساتھ اسے قائم رکھا حتی کہ آپ کی زندگی کے آخر میں یہ ایک مضبوط اور مستحکم ریاست بن گئی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہ قائم و دائم رہی اور اس قابل ہوگئی کہ اس نے اپنی پڑوسی حکومتوں کو یا تو ختم کر دیا یا انتہائی کمزور۔ وہ دور دراز کے علاقوں پر قابض ہوگئی تا کہ توحید پھیل جائے اور لوگ اپنے خالق و مالک کی عبادت والی زندگی گزاریں جبکہ سرکش لوگوں نے ان کو بہکا کر گمراہ کر رکھا تھا، لہٰذا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے کچھ قبل کے عرب علاقوں اور اردگرد کی سیاسی حالت پر ایک سرسری

نظر ڈال لی جائے۔

عرب کے سیاسی حالات

اس دور کے جزیرۂ عرب میں خصوصاً اس کے وسط میں، کوئی واضح اور معین نظام موجود نہ تھا اور نہ وہاں کوئی قابل ذکر حکومت تھی بلکہ مختلف نظام تھے اور قبائلی سرداروں کا تسلط تھا، البتہ جزیرۂ عرب کے وسط میں بنو حنیفہ کی ایک چھوٹی سی مملکت پائی جاتی تھی۔ وہ بھی نام کی حد تک ہی مملکت تھی۔ اس کا بھی کوئی واضح نظام نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بادشاہ ہوذہ بن علی حنفی کو نامۂ مبارک بھی لکھا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اسی طرح بحرین میں بھی ایک غیر واضح مملکت معروف تھی مگر زیادہ درست بات یہی ہے کہ وہ بڑی حد تک فارسیوں کے ماتحت اور زیر اثر تھی۔ (فتوح البلدان للبلاذري، ص: 89) رسول اللہ ﷺ نے اس کے بادشاہ منذر بن ساوی عبدی کو بھی خط مبارک لکھا تھا۔ یہ بادشاہ مسلمان بھی ہوگیا تھا۔ نیز اس کے ساتھ بحرین کے بہت سے عربی اور فارسی لوگ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ (فتوح البلدان، ص: 90,89)

ضروری ہے کہ ہم عرب کے سیاسی اور تنظیمی حالات بیان کرتے وقت عرب کی دو قسمیں بنا لیں: ① وہ ممالک جو باقاعدہ الگ نام کے ساتھ قائم تھے، جیسے: یمن۔ ② مختلف شہر جن پر سیاست کی کچھ نہ کچھ چھاپ تھی اور کچھ حد تک وہاں انتظام بھی تھا، جیسے: اسلام سے قبل کے مکہ اور مدینہ۔

اَعراب

عرب کے اکثر علاقوں میں منتشر قبائل پائے جاتے تھے اور ہر قبیلے کی آگے کئی شاخیں تھیں جنھیں فَخْذ یا بطن کہا جاتا تھا۔ ان شاخوں میں وجۂ مشترک بنیادی طور پر خون اور رشتہ تھا اور اسی وجہ سے ان کی شاخیں بنتی تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے معاملات خود سرانجام دیتا تھا اور مشکل مسائل کو قبیلے کے سرداروں اور حکمرانوں کے ذریعے سے حل کیا جاتا تھا۔ یہ قبائل کسی سیاسی نظام کو تسلیم کرنے کے عادتاً روادار نہ تھے، البتہ ہر قبیلے میں ایک معین سردار پایا جاتا تھا جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جاتا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرتے تھے اور اس سردار کی مجلس میں اجتماعی طور پر اتفاق رائے کیا جاتا۔ (محاضرات في تاريخ العرب،

لصالح أحمد علی: 158/1، والنظم الإسلامیة نشأتها وتطورها، لصبحي الصالح، ص: 50) اس کے باوجود وہاں احکام نافذ کرنے کے رسمی ادارے نہیں تھے جو احکام کی پابندی کروائیں اور نظم وضبط قائم کریں۔ اگر کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ کوئی آویزش یا ٹکراؤ ہو جاتا اور جاہلی دور میں عربوں کی اکثر یہی عادت تھی تو پورے کا پورا قبیلہ اپنے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پہلے سے پوری تیاری کر رکھی ہوتی تھی، لہٰذا ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم ان قبائل میں کوئی معین سیاسی نظام تلاش کر سکیں جو ان قبائل کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرے۔

جزیرۂ عرب کے بعض قبائل کے درمیان مذاکرات بھی ہوئے کہ ایک مملکت قائم کی جائے اور کسی ایک شخص کو تاج پہنا دیا جائے مگر عموماً ایسے مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔ (محاضرات في تاریخ العرب: 160/1)

مکہ اور مدینہ

ضروری ہے کہ اسلام سے کچھ قبل کے مکہ اور مدینہ کے سیاسی حالات کا کچھ جائزہ لیا جائے کیونکہ ان حالات کا بعد میں اسلامی نظام کے نفاذ سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ہے، خصوصاً اس لیے کہ مکہ اور مدینہ اسلام کی اولین سرزمین بنے۔

مکہ اور اس کے اردگرد کے علاقے میں اسلامی دور سے قبل بعض قبائل رہائش پذیر تھے۔ ان میں سے اہم قریش تھے۔ (مروج الذهب و معادن الجوهر للمسعودی: 33/27) مکہ مکرمہ قدیم زمانے ہی سے عام عربوں کے نزدیک مقدس گردانا جاتا تھا اور ان میں سے حجاج کرام اکثر یہاں آتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مکہ والے ماہر تاجر تھے اور تجارت کے سلسلے میں یمن، حجاز، شام اور عراق وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ ان کی یہ آمد و رفت سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کے نام سے معروف تھی جس کی طرف قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے:

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝﴾

''قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے۔ ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے۔'' (قریش 2,1:106)

اس طرح انھیں سیاسی اور معاشرتی تجربات حاصل ہوتے تھے۔ اگرچہ مکہ کا عمومی مزاج قبائلی نظام جیسا تھا کہ وہاں معین اور ذمہ دار مرکزی حکومت نہ تھی جس کے ذمہ شہر کی اصلاح وانتظام ہو، تاہم وہاں دارالندوہ جیسا ادارہ قائم تھا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اکٹھے ہوتے تھے اور اہم جنگی، اجتماعی اور تجارتی معاملات پر بحث وتمحیص کیا کرتے تھے۔ (المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 44/4) اسی طرح وہاں کچھ اور اجتماعات بھی منعقد ہوتے تھے جن میں ان معاملات پر غور وخوض ہوتا تھا۔ عموماً یہ اجتماعات کعبہ کے اردگرد ہوا کرتے تھے۔ (الإدارة العربية، ص: 28) جنگ میں جھنڈا ایک یا زیادہ معین اشخاص کو دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کچھ سردار تجارتی قافلوں کی قیادت کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے علاوہ کوئی معین سیاسی نظام وہاں موجود نہ تھا جو شہری معاملات کا مکمل طور پر انتظام کرتا ہو جبکہ عرب علاقوں کے پڑوس میں معین سیاسی نظام موجود تھے۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ والوں نے ایسے شخص کو اپنا بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا جسے خود قیصر روم نے بھیجا تھا بلکہ اس کا مذاق اڑایا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 244/1) شاید یہی وجہ ہے کہ مکی معاشرے میں ظلم وفساد پایا جاتا تھا اور مذکورہ حالات اس کے لیے ممد ومعاون تھے۔ (السيرة النبوية لمحمود شاكر، ص: 33)

البتہ مدینہ طیبہ کی صورت حال مکہ مکرمہ سے ایک حد تک مختلف تھی کیونکہ مدینہ میں ملے جلے لوگ رہتے تھے۔ اوس وخزرج کے عرب بھی اور یہود کے مختلف قبائل بھی۔ (المفصل لجواد علي: 131/4، والمدينة في العصر الجاهلي لمحمد العيد الخطراوي، ص: 55، 68) اسی رنگا رنگی کی وجہ سے مدینہ کے حالات مضطرب رہتے تھے اور یہودیوں کی عیاریوں اور شرارتوں کی وجہ سے اوس اور خزرج کے درمیان وقتاً فوقتاً جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ (المفصل لجواد علي: 138/4، والنظم الإسلامية، ص: 48، والمدينة في العصر الجاهلي، ص: 146)

لیکن مدینہ کے یہودی خود اندرونی طور پر منظّم تھے۔ تبھی ہر طرف ان کے قلعے پھیلے ہوئے تھے اور ان میں معتبر شخصیات پائی جاتی تھیں جن کا نام چلتا تھا۔ جبکہ مدینہ کے عرب، یعنی اوس اور خزرج عموماً قبائلی نظام ہی پر اعتماد کرتے تھے جو کہ صحرا کے اعرابیوں میں رائج تھا۔ اگرچہ وہ شہروں اور بستیوں کے رہائشی تھے مگر تنظیمی طور پر اُن پر قبائلی رنگ غالب تھا۔ اسی لیے یہودیوں کے لیے ان پر غلبہ حاصل کرنا اور انھیں مشکلات ومصائب میں الجھائے رکھنا ہمیشہ آسان رہا۔ (الإسلام و فلسفة الحكم، لمحمد عمارة، ص: 50) ظہورِ اسلام تک مدینہ میں

یہی صورت حال جاری رہی کہ وہاں کوئی ایسا ادارہ یا نظام نہ تھا جو شہری معاملات اور مصالح کا ذمہ دار ہو۔

عراق

عراق کے شہر حیرہ میں فرات کے اردگرد کے علاقوں میں اسلام سے قبل بنو منذر کی حکومت قائم تھی جس میں عموماً عرب رہتے تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ فارسی اور نبطی بھی رہائش پذیر تھے۔ (العرب قبل الإسلام لجورجي زيدان، ص: 224) البتہ وہاں غلبہ اور اقتدار شاہانِ منذر ہی کو حاصل تھا لیکن وہ مکمل طور پر فارس کے بادشاہ کسریٰ کے تابع اور فرماں بردار تھے۔

شام

شام میں ظہور اسلام سے بہت پہلے غسانیوں کی حکومت پائی جاتی تھی۔ (العرب في الشام قبل الإسلام، ص: 186) سابقہ تاریخی کتابوں میں اس عربی مملکت کا نام کثرت سے ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شام میں اسلامی فتوحات سے متعلق اہم واقعات کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ چونکہ یہ حکومت روم کے زیر اثر تھی، اس لیے وہ انھیں لشکر کشی کرنے والی اسلامی افواج کے مقابلے میں دفاع کے لیے بار بار بھیجتے رہتے تھے۔ کبھی مقابلے میں یہ اکیلے آتے اور کبھی رومیوں کے ساتھ مل کر، جیسے: جنگ یرموک و دیگر جنگوں میں ہوا۔

یمن

دورِ جاہلیت کے دوران یمن میں کئی عربی حکومتیں قائم ہوئیں جو اپنی قوت کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ ان میں بہت سے بادشاہ ہوئے مگر اسلام سے کچھ پہلے یمن کے حالات بدل گئے کیونکہ رومیوں کی شرارت سے یہاں حبشی قابض ہو گئے اور انھوں نے اس علاقے کے عربوں کے ساتھ آویزش شروع کر دی، اسی طرح فارسیوں اور وہاں کے فارسی حکمرانوں کے ساتھ بھی۔

فارس

فارس میں عرصۂ دراز سے ایک طاقتور حکومت قائم تھی جو ان دنوں تک بہت سے تمدنی مراحل طے کر چکی

تھی، البتہ ہمارے لیے اہم وہ آخری چند سال ہیں جو اس حکومت اور اسلام کے درمیان تصادم سے قبل گزرے۔ فارس میں نظامِ حکومت مکمل بادشاہت والا تھا جس کی بنیاد استبداد اور طبقاتی امتیاز پر تھی۔

روم

روم (قرآن کریم کی ایک سورت کا نام سورۂ روم ہے جس میں ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو ان کے اور ایرانیوں کے درمیان بپا ہوئیں۔) میں ایک بہت بڑی حکومت قائم تھی جس کا اقتدار مصر، شام، شمالی افریقہ، مشرقی یورپ بلکہ یورپ کے وسط تک تھا۔ یہ تمام چھوٹی بڑی ریاستیں شاہِ روم کے تابع تھیں جن کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ اس نظامِ حکومت میں عملی طور پر اصل حکمران بادشاہ ہی ہوتا تھا جسے ہر قسم کے فیصلے کا حق حاصل تھا۔

البتہ اس کی مدد کے لیے ایک ماتحت کابینہ ہوتی تھی جو اس کے احکام نافذ کرتی تھی۔ (الحضارة البيزنطية، ص: 8) یہی وہ حکومت تھی جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝﴾

''الم۔ رومی قریب ترین علاقہ میں مغلوب ہوگئے لیکن وہ چند سالوں میں اس مغلوبیت کے بعد ضرور غالب آئیں گے۔'' (الروم30:1-3)

اس حکومت کا عمومی دین عیسائیت تھا اور عیسائی مذہبی رہنماؤں کو حکومت میں خاص مرتبہ حاصل ہوتا تھا۔

دنیا جہان رسول کریم ﷺ کے انتظار میں

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے فرزندانِ گرامی قدر خالص موحد تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی: ''یااللہ! میرے بیٹوں اور بیت الحرام کے باسیوں میں توحید قائم رکھنا۔'' ان کی دعا قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (البقرة 129:2)

یہودی

یہودی مدینہ اور خیبر میں صرف اس لیے اقامت پذیر تھے کہ یہاں آخری رسول تشریف لائیں گے لیکن جب آخری رسول ان کے علاوہ کسی اور قوم (قریش) سے آ گئے تو انھوں نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿ وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آ گئی جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتی ہے جو ان

کے پاس ہے، جبکہ اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ (حق) آ گیا جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، لہٰذا کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (البقرة 89:2)

یہود اور ان کے علماء کی طرف سے نبیٔ کریم ﷺ کے زمانے میں بہت سی ایسی باتیں ظاہر ہوئیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ ﷺ کی صفات کو بخوبی پہچانتے تھے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' (الأعراف 157:7)

مندرجہ ذیل آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے تاکید اور صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کو بخوبی پہچانتے تھے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔'' (البقرة 146:2)

آپ ﷺ سے ضد وعناد رکھنے والے یہودی بھی یقیناً جانتے تھے کہ آپ ﷺ نبی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا سردار حیی بن اخطب تھا۔ وہ اور دیگر یہودی سردار اچھی طرح پہچانتے تھے کہ آپ ﷺ سچے اور نبیٔ آخرالزمان ہیں۔ دشمنی کو تو انھوں نے ایک موقف کے طور پر اپنا رکھا تھا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 220/2)

اب تک تورات میں بیت اللہ، خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی بعثت اور آپ کی اتباع کی طرف اشارات موجود ہیں۔ دیکھیے: مزامیر:84:5,6.

طوبٰی لأناس عزهم بكة، طف بيتك فی قلوبه عابرين فی وادی البكيين يعبرونه ينبوعاً.

اس عبارت میں مکہ، طواف اور بیت الحرام کے الفاظ واضح ہیں۔

اسی طرح مزامیر:84:5,6,7 میں ہے: Bleesed is The Man where whose strenth is in thee; in whose are the ways of them passing through the valley of (Bace) make it well" ''مبارک ہے وہ شخص جس کی مضبوطی تجھ سے ہے۔ جن کے دلوں میں ان کے راستے ہیں۔ وہ وادیِ مکہ سے گزرتے ہوئے اسے چشمہ بنائیں گئے۔'' (السيرة النبوية للندوی، ص: 44، انھوں نے یہ عبارت یہودی انسائیکلو پیڈیا، جیوش 11 p .y 415 سے نقل کی ہے۔)

عربی تورات میں ایسی عبارات موجود ہیں جو نبیٔ آخرالزماں کے بنی اسماعیل سے ہونے کی صراحت کرتی ہیں۔ سفر تکوین (17-20) میں لکھا ہے:

وأما إسماعيل فسمعت وها أنا أباركه وأنميه أكثره جدًا ويلد اثنی عشر رئيسا وأجعل نسله أمة عظيمة.

''باقی رہا اسماعیل تو میں نے اس کی دعا سن لی ہے۔ میں اسے ضرور برکت دوں گا، اسے بڑھاؤں گا، اس کی نسل بہت زیادہ کردوں گا۔ وہ بارہ سردار جنے گا اور میں اس کی نسل کو ایک عظیم امت بناؤں گا۔''

(الكتاب المقدس، العهدالقديم، ص: 19)

سفر استثناء (15-18) میں لکھا ہے:

يقيم لكم الرب إلٰهكم نبيا من بينكم من إخوتكم بني قومكم فاسمعوا له ... سأقيم لهم نبيا من بين إخوتهم مثلك، وألقي كلامي في فمه فينقل لكم إليهم جميع ما أكلمه به، وكل من لا يسمع كلامي الذي يتكلم به باسمي أحاسبه عليه.

''رب کریم تمھارا معبود تم میں سے تمھارے بھائیوں میں سے ایک نبی مبعوث فرمائے گا تم اس کی بات سننا ..... میں ان میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا نبی مبعوث کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ وہ تم تک وہ تمام باتیں پہنچائے گا جو میں اس سے کروں گا۔ اور جو شخص میرا کلام نہیں سنے گا جو وہ میرا نام لے کر کرے گا میں اس سے حساب لوں گا۔'' (الكتاب المقدس، ص: 237، والسيرة النبوية للندوي، ص: 44. میں نے علامہ ندوی رحمہ اللہ کے نقل کردہ الفاظ کا عہد قدیم کی عبارت کے ساتھ مقابلہ کیا تو بعض الفاظ میں فرق تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر طبع دوسرے طبع سے مختلف ہوتا ہے۔ ترجمہ میں یا تحریف میں۔)

تمھارے بھائیوں سے مراد بنو اسماعیل ہیں کیونکہ سیدنا اسماعیل سیدنا اسحاق کے بھائی تھے اور یہودی خود اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری کتاب تحریف شدہ ہے اور ہم اس کو اپنی حکمت اور ذہانت کے ساتھ درست کرتے رہتے ہیں۔ (السيرة النبوية للندوي، ص: 45. انھوں نے یہ عبارت یہودی انسائیکلوپیڈیا، جیوش: 589/9 p، سے نقل کی ہے۔)

اسی طرح یہود کی کتب میں یہ عبارت بھی ہے:

وسوف أزلزل كل الأمم وسوف يأتي حمده لكل الأمم وسوف أملأ هٰذا البيت بالمجد كذلك قال رب الجموع.

''میں عنقریب تمام امتوں میں زلزلہ پیدا کر دوں گا اور عنقریب حمدہ (محمد) آئے گا اور میں اس گھر (بیت اللہ) کو بزرگی سے بھر دوں گا۔ رب الافواج نے ایسے ہی کہا ہے۔'' ((سفر حجي: 9/7-9) پوری عبارتیں نبیٔ کریم ﷺ کے بارے میں عبدالاحد داود کے ہاں دیکھیں، مثلاً: پرانے نسخے میں لفظ حمدہ پایا جاتا ہے جس سے نبیٔ کریم ﷺ مراد ہیں لیکن جدید نسخے میں اسے امنیت کے لفظ سے بدل دیا گیا ہے۔)

عیسائی

انھیں مصر، شام اور روم کے اکثر علاقوں پر اقتدار حاصل تھا۔ عرب کے شمالی علاقے میں بنو تمیم، بنو قضاعہ وغیرہ میں بھی عیسائیت پھیل چکی تھی اور جنوبی عرب کے نجران میں عیسائیوں کا مرکز تھا۔ قرآن کریم سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو سیدالانبیاء محمد ﷺ کے بارے میں مطلع کیا تھا اور ان سے آپ کی اتباع کا کہا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔''

(الصف 6:61. السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية لمهدى رزق الله: 132/1)

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے وہ اسی طرح مشہور و معروف ہے کہ شام کے ایک عیسائی عالم نے انھیں نبیٔ آخر الزماں کی بعثت کا وقت قریب آنے کی خبر دی تھی اور انھیں اس نبی کے اتباع کی وصیت کی تھی، پھر وہ غلام بنا لیے گئے حتی کہ وہ غلام کی حیثیت سے مدینہ کے ایک یہودی کے پاس پہنچ گئے۔ جب انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ کا کلام سنا اور آپ میں علامات نبوت دیکھیں جو اس عالم نے انھیں بتائی تھیں تو وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کے پیروکار بن گئے۔

موجودہ دور میں ہدایت پانے والے بہت سے عیسائی اہل علم نے محمد ﷺ کے بارے میں عیسائی کتابوں میں مذکورہ عبارات جمع کی ہیں۔ ان میں سے ایک سابق مصری پادری ابراہیم خلیل احمد ہیں۔ انھوں نے ''محمد فی التوراۃ والانجیل'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے کتاب

مقدس کے عہد قدیم اور عہد جدید پر اعتماد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''کتاب مقدس میں انتہائی واضح عبارات ہیں جو رسول اُمی ﷺ کی شخصیت اور رسالت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔''

(محمد في التوراة والإنجيل، ص:30)

ان آیات سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جو اہل کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں وارد ہیں، مثلاً:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔'' (البقرة 146:2)

عبدالاحد داود، جن کا اصلی نام ڈیوڈ بنجامین کلدانی تھا۔ وہ ایک بہت بڑے عیسائی عالم تھے جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے بھی ''محمد ﷺ کما ورد فی کتاب الیهود و النصاریٰ'' کے نام سے کتاب لکھی۔ دیگر بہت سے مسلمانوں نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں سے ایک شیخ احمد دیدات مرحوم ہیں۔ انھوں نے ماذا یقول الکتاب المقدس عن محمد ﷺ.

(یہ رسالہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر دیکھا جاسکتا ہے: (www.4shared.com)) کے نام سے ایک معتبر کتاب لکھی ہے جو لاکھوں کی تعداد میں انگریزی اور عربی زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔

انجیل یوحنا (16:5) میں اب تک یہ عبارت موجود ہے:

فأنا ذاهب إلى الذى أرسلنى ولا أحد منكم يسألنى: إلى أين أنت ذاهب؟ والآن قلت لكم، فملأ الحزن قلوبكم صدقونى، من الخير لكم أن أذهب، فإن كنت لا أذهب لا يجيئكم المعزى.

''تو میں اس کے پاس جارہا ہوں جس نے مجھے بھیجا تھا۔ تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا: آپ کہاں جارہے ہیں؟ میں نے تمھیں اب بتا دیا ہے جس سے تمھارے دل غم سے بھر گئے ہیں۔ میری تصدیق کرو۔ میرا جانا تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہیں جاؤں گا تو ''تسلی دینے والا'' تمھارے

پاس نہیں آئے گا۔''

اسی طرح انجیل متی (21:42,43,44) میں لکھا ہے:

أما قرأتم فی الکتب المقدسة: الحجر الذی رفضه البناؤون صار رأس الزاویة؛ هذا ما صنعه الرب، فیا للعجب....

''کیا تم نے مقدس کتابوں میں نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے مستریوں نے رد کر دیا تھا وہ زاویہ قائمہ بن گیا ہے۔ یہ رب کریم کے کام ہیں اور یہ انتہائی عجیب بات ہے۔ اسی لیے میں تمھیں کہتا ہوں: ''اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بادشاہی چھین لے گا اور ایک ایسی قوم کے سپرد کر دے گا جو اسے بارآور بنائے گی۔ جو اس پتھر پر گرے گا ٹوٹ جائے گا اور جس پر یہ پتھر گرے گا، اسے ملیامیٹ کر دے گا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے ایک گھر بنایا اور بڑا خوبصورت اور شاندار بنایا مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ اس کے اردگرد گھومتے تھے اور تعجب کرتے تھے، البتہ کہتے تھے: یہ اینٹ بھی کیوں نہ لگا دی گئی؟ وہ اینٹ میں ہوں۔ میں آخری نبی ہوں۔'' (صحيح البخاري، حديث: 3535)

انجیل یوحنا (16:7,8) میں ہے: ''میری تصدیق کرو۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ گیا تو مُعَزِّی (تسلی دینے والا) تمھارے پاس نہیں آئے گا۔ جب میں جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور جب وہ آئے گا تو سارے جہان کو نیکی و بدی اور دینداری کے بارے میں ڈانٹے گا۔''

انجیل متی کے ایک اور نسخہ میں ہے:

قلت لکم حتّٰی متی جاء وقت حدوثه تذکرت أنه سبق أن أخبرتکم به. ولم أقل لکم هذا منذ البدایة لأنی کنت معکم أما الآن عائد إلی الذی أرسلنی ولا أحد منکم یسألنی أین تذهب؟ عند ما أخبرتکم بهذا ملأ الحزن قلوبکم، ولکنی أقول لکم الحق، من الأفضل أن أَذهب إن کنت لَا أَذهب لا یأتیکم المعین.

بڑے تعجب کی بات ہے کہ میں نے اناجیل مقدسہ اور عہد قدیم کی تفسیر کے لیے ایک کتاب کی طرف رجوع کیا لیکن جب مصنف اس عبارت پر پہنچا تو لفظ مُعین کی تفسیر کیے بغیر آگے گزر گیا اور جاہل بنتے ہوئے ایک اور موضوع کی بات کرنے لگا، یعنی سیدنا مسیح علیہ السلام کی موت اس لیے ہوئی کہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے اور ان کی غلطیاں مٹا ڈالے۔ (التفسير التطبيقي للكتاب المقدس، ص: 2296)

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل یوحنا میں اصل لفظ Periglytos تھا جس کا نام احمد یا محمد ہے۔ اسے قصداً لاطینی زبان کے لفظ Paracletc میں تبدیل کر دیا گیا جس کے معنی معزی (تسلی دینے والا) کے ہیں تاکہ لوگوں کو جان بوجھ کر انجیل کے اصلی لفظ احمد سے دور کر دیا جائے اور انھیں حقیقت سے غافل کر دیا جائے۔ (محمد ﷺ كما وردفي كتاب اليهود و النصارىٰ ازعبدالأحد داود، ص: 142. عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں ذکر کیا ہے کہ 1894ء میں میں نے مشرقی علوم کے ایک اطالوی عالم کارلونیلو فونسو (1938ء) سے پراکٹس کے معنی پوچھے۔ وہ کہنے لگا: ''عیسائی عالم کہتے ہیں: اس لفظ کے معنی معزی ہیں۔ میں نے کہا: میں ڈاکٹر کارلونیلو سے پوچھ رہا ہوں جنھوں نے یونانی زبان کے علم وادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں کسی عیسائی عالم سے نہیں پوچھ رہا۔ وہ کہنے لگا: ''اس کے معنی ہیں: وہ شخص جس کی بہت زیادہ تعریف ہو۔ میں نے کہا: یہ معنی حَمِدَ کے افعل التفضیل کے موافق ہیں۔ وہ کہنے لگا: ہاں۔ میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا ایک نام احمد بھی ہے۔ وہ کہنے لگا: بھائی! تجھے بہت کچھ حفظ ہے، پھر ہم الگ الگ ہوگئے۔ اس کے بعد تو مجھے مزید یقین ہوگیا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے اس قول (ومبشرا برسول يأتي من بعدى اسمه أحمد) کے واقعتاً معنی انجیل میں موجود ہیں۔ (قصص الأنبياء للنجار، ص: 473)) اسی طرح انجیل یوحنا (13:16) میں ہے:

فمتىٰ جاء روح الحق أرشدكم إلى الحق كله، لأنه لا يتكلم بشيء من عنده، بل يتكلم مما يسمع و يخبركم بما سيحدث سيمجدني لأنه يأخذ كلامي و يقوله لكم.

''جب حق کی روح آئے گا تو وہ تمھیں مکمل حق کی طرف رہنمائی کرے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرے گا بلکہ وہی بات کرے گا جو سنے گا اور تمھیں آئندہ ہونے والے واقعات کی خبر دے

گا۔ وہ میری بزرگی بیان کرے گا کیونکہ وہ میرا کلام لے کر تمھیں سنائے گا۔''

(الكتاب المقدس، العهد الجديد، ص: 169)

کیا یہ عبارت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے موافق نہیں:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾

''وہ (نبی کریم ﷺ) اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔'' (النجم 53:3,4)

انجیل میں صاف طور پر ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت کی تائید کرتے ہیں۔ انجیل یوحنا (15:25) میں ہے:

ومتى جاء المعزى الذى أرسله إليكم من الأب، روح الحق المنبثق من الأب، فهو يشهد لى، وأنتم أيضا ستشهدون، لأنكم من البدءِ معى لأنكم من البدء معى.

''اور جب تسلی دینے والا آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمھارے پاس بھیجوں گا۔ وہ حق کی روح ہوگا جو باپ سے پھوٹی۔ وہ میرے حق میں گواہی دے گا اور تم بھی گواہی دو گے کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو۔''

اسی طرح یوحنا (16-13) میں ہے:

فمتى جاء روح الحق أرشدكم إلى الحق كله، لأنه لا يتكلم بشىء من عنده، بل يتكلم بما يسمع و يخبركم بما سيحدث.

''پس جب حق کی روح آئے گا، وہ تمھیں پورے حق کی طرف رہنمائی کرے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرے گا بلکہ وہی بات کرے گا جو سنے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔''

قرآن کریم نے تاکیداً کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام کی مثال تورات و انجیل میں بیان کی گئی ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک بھی معروف تھی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضا مندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہوگیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا، کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تاکہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔''

(الفتح 29:48)

سفر اشعیا (13:21) میں ''علی العرب'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

بيتوا في صحراء العرب يا قوافل الدادانيين، هاتوا ماء للعطشان ياسكان تيماء، استقبلوا الهارب الجائع بالخبز، هم هاربون من أمام السيوف، من أمام السيف المسلول والقوس المشدودة وويلات الحرب.

''اے دادانیوں کے قافلو! صحرائے عرب میں رات گزارو۔ اے تیماء کے رہائشیو! پیاسے کے لیے پانی لاؤ۔ بھاگنے والے بھوکے شخص کا روٹی کے ساتھ استقبال کرو۔ یہ لوگ تلواروں بلکہ ننگی تلواروں، تنی ہوئی کمانوں اور جنگ کے خطرات کے سامنے سے گزر کر بھاگ آئے ہیں۔''

(الكتاب المقدس، ص: 485)

ہوسکتا ہے اس عبارت کا اشارہ اس وحی کی طرف ہو جو نبی عرب امانت دار محمد ﷺ پر نازل ہوئی لیکن میرے خیال میں اس سے خیبر کے یہودیوں کے عرب علاقے سے بھاگنے کی طرف اشارہ ہے۔ جب وہ نبیٔ کریم ﷺ اور بعد میں صحابہ کرام کی تلواروں کے آگے بھاگے۔ اسی طرح اس میں واضح طور پر ان کی شکست اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں خیبر سے نکل کر تیماء سے گزرتے ہوئے شام کی طرف جانے کی طرف اشارہ بھی ہے جن دنوں تلواریں سونتی گئی تھیں، کمانیں تنی ہوئی تھیں اور مکمل اسلامی فتح ہونے والی تھی۔

(دیکھیے: اسی کتاب میں فتح خیبر کا موضوع اور فتوح البلدان للبلاذري، ص: 48)

مندرجہ بالا عبارت سے یہی کچھ سمجھ آتا ہے اور اس پر بحث بھی ہوسکتی ہے۔ واللّٰہ أعلم.

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اشارہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ کی طرف ہو۔ اسی قسم کی ایک اور عبارت انجیل متی (5:21) میں ہے:

قولوا لابنة صهيون هو ذا مليكك يأتيك وديعا راكبا على أتان و جحش بن أتان.

''صہیون کی بیٹی سے کہہ دو یہ ہے تیرا بادشاہ جو تیرے پاس گدھی یا گدھی کے بچے پر سوار ہو کر چپ چاپ آئے گا۔''

عیسائیوں کے اس وقت کے قائدین سے یہ بات معروف ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (بیت المقدس کی فتح کے موقع پر) بڑی تواضع کے ساتھ اپنے گدھے پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اس وقت ان کے علماء نے کہا تھا کہ ہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ صفت اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ (فتوح البلدان للبلاذري، ص: 145، تاريخ الطبري: 159/4) لہٰذا ہوسکتا ہے اس عبارت کا اشارہ بھی اسی طرف ہو جس طرف سابقہ عبارت کا اشارہ ہے لیکن یہ صرف میرا اجتہاد ہے۔

ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ بعض دیگر افراد جنھوں نے ان عبارات کا تجزیہ کیا ہے اور ان میں عبدالاحد داود بھی شامل ہیں، انھوں نے ان کا تعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح بیت المقدس سے نہیں جوڑا بلکہ ان میں سے بعض نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے مدینہ کو شمال کی طرف ہجرت سے جوڑا ہے لیکن میری نظر میں یہ

اجتہاد محل نظر ہے۔(محمدﷺ كما ورد في كتاب اليهود والنصارىٰ لعبد الأحد داود، ص: 90,89)

اور اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہود و نصاریٰ کے پاس پائی جانے والی سابقہ کتب میں مسلمانوں کی فتوحات کی طرف مطلقاً اشارات وعبارات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مندرجہ ذیل فرمان بھی ان پر صادق آسکتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔'' (الأنبياء 105:21)

اور زبور سابقہ کتب میں شامل ہے جو سیدنا داودعلیہ السلام پر نازل ہوئی اور یہودی اسے پڑھتے تھے۔ سفر اشعیا (42:1-8) میں یہ عبارت موجود ہے:

ها عبدی الذی أسانده والذی اخترته ورضیت به! جعلت روحی علیه، فیأتی للأمم بالعدل، لایصیح ولا یرفع صوته، ولا یسمع فی الشارع صراخه، قصبة مرضوضة لا یکسر وشعلة خامدة لا یطفئ بأمانة یقضی بالعدل، لایلوی ولا ینکسر، حتی یقیم العدل فی الأرض، فشریعته رجاء الشعوب، هذا ما قال الرب خالق السماوات وناشرها باسط الأرض مع خیراتها، وواهب شعبها نسمة الحیاة روحا للسائرین فیها. أنا الرب دعوتك في صدق وأخذت بیدك وحفظتك جعلتك عهدا للشعوب ونوراً لهدایة الأمم، فتفتح العیون العمیاء، وتخرج الأسری من السبحون والجالسین فی الظلمة من الحبوس أنا الرب وهٰذا أسمی.

''یہ ہے میرا کامل بندہ جس کو میں سہارا دیتا ہوں، جسے میں نے پسند کیا ہے اور اس پر راضی ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈال دی ہے۔ وہ امتوں کے لیے عدل وانصاف لے کر آئے گا۔ وہ

نہ چیخے گا نہ آواز اونچی کرے گا۔ گلیوں میں اس کے چلانے کی آواز سنائی نہ دے گی۔ وہ مضبوط بانس ہے جو کبھی ٹوٹے گا نہیں اور دہکتا ہوا شعلہ ہے جو کبھی بجھے گا نہیں۔ وہ دیانت داری کے ساتھ انصاف والے فیصلے کرے گا۔ نہ وہ منہ موڑے گا نہ سست پڑے گا حتی کہ وہ زمین میں عدل و انصاف قائم کر دے گا۔ اس کی شریعت قوموں کی امید ہے۔ یہ ہے رب کا فرمان جو آسمانوں کا خالق ہے اور ان کو پھیلانے والا ہے اور زمین کو اس کے تمام منافع سمیت بچھانے والا ہے اور اس کی شاخوں میں زندگی کی روح ڈالنے والا ہے اور اس میں چلنے والوں کے لیے راحت مہیا کرنے والا ہے۔''

''میں ہوں حقیقی رب، میں نے تجھے سچائی کے ساتھ پکارا، تیرا ہاتھ پکڑا، تیری حفاظت کی۔ تجھے تمام قوموں کے لیے عہد بنایا اور تمام امتوں کے لیے نورِ ہدایت قرار دیا۔ وہ اندھی آنکھوں کو کھولے گا۔ جیلوں سے قیدی نکالے گا اور اندھیرے میں بیٹھنے والوں کو قید خانوں سے نجات دے گا۔ میں ہوں حقیقی رب اور یہ میرا نام ہے۔''

یہ عبارت انجیل متّی (18:12) میں بھی نبی اشعیا کی طرف منسوب ہے لیکن عیسائیوں نے ان صفات کو سیدنا مسیح علیہ السلام کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ (الكتاب المقدس، انجيل متّى، عنوان، البلد المختار: 18:12، ص: 21) حالانکہ اس میں نبیٔ کریم ﷺ کی ان صفات کی طرف واضح اشارات ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے، مثلاً: آپ مصطفیٰ (چنے ہوئے، پسندیدہ) ہیں، سراج منیر (روشن چراغ) ہیں وغیرہ۔

یہودیوں کی کتابوں میں سے سفر استثناء (33) میں لکھا ہے:

وهٰذه هی البركة التی بارك فيها موسیٰ رجل الله بنی إسرائيل قبيل موته، فقال أقبل الرب من سيناء، وأشرق لهم من جبل سعير وتجلّٰی من فاران.

''اور یہی وہ برکت ہے جو اللہ کے بندے موسیٰ نے بنی اسرائیل کو دی۔ اس نے اپنی وفات سے تھوڑی دیر پہلے کہا: ''رب کوہِ سینا سے آ گیا اور سعیر پہاڑ سے ان کے سامنے چمکا اور فاران سے ظاہر ہوا۔''

یہ عبارت ابھی تک متداول عہد قدیم میں موجود ہے۔ اور فاران (معجم البلدان للحموی: 225/4،

نیز دیکھیے: انٹرنیشنل الیکٹرانک وکی پیڈیا جس میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ فاران مکہ مکرمہ کے جبل حرا کا نام ہے (www.ar.wikipedia.com)) مکہ مکرمہ کے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی۔

یہ عبارت، باوجود اس کے اس میں تحریف ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ ملا کر پڑھی جاسکتی ہے۔

﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ ﴾

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ اور طورِ سیناء کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔'' (التین 95:1-3)

سفر التکوین (21:8-20) میں ایسی عبارات ہیں جو صاف صراحت کرتی ہیں کہ فاران سیدہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا وطن تھا جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان کو صحرائے فاران میں چھوڑ آئے تھے۔ نیز ان میں بئر زمزم اور سیدہ ہاجرہ اور ان کے بچے کے اس کا پانی پینے کی طرف اشارہ ہے۔ عنوان ہے: **طرد هاجرو إسماعيل** (21:8-21)

وكبر الصبي وفطم، وأقام إبراهيم وليمة عظيمة في يوم فطام إسحاق، ورأت سارةُ ابن هاجر المصرية الذي ولدته لإبراهيم يلعب مع ابنها إسحاق، فقالت لإبراهيم: 'اُطْرُدْ هذه الجارية وابنها! فابن هذه الجارية لايرث مع ابني إسحاق'. وساء إبراهيمَ هذا الكلامُ، لأن إسماعيل كان - أيضًا - ابنه. فقال له الله: 'لايسوؤك هذا الكلام على الصبي وعلى جاريتك. اسمع لكل ما تقوله لك سارة، لأن بإسحاق يكون لك نسل. وابن الجارية - أيضًا - أجعله أمةً لأنه من صلبك.

فبكر إبراهيم في الغد وأخذ خبزًا وقربة ماءٍ، فأعطاهما لهاجر ووضع الصبي على كتفها وصرفها، فمضت تهيم على وجهها في صحراء بئر سبع. ونفد الماء من القربة، فألقت هاجر الصبي تحت إحدى الأشجار ومضت فجلست قبالته على بعد رميتي قوس، وهي تقول في نفسها: 'لا

أريد أن أرى الولد يموت'. وفيما هي جالسة رفعت صوتها بالبكاء، وسمع الله صوت الصبي، فنادى ملاك الله هاجر من السماء وقال لها، 'مالك يا هاجر؟ لا تخافي. سمع الله صوت الصبي حيث هو. قومي أحملي الصبي وخذي بيده، فسأجعله أمة عظيمة'، وفتح الله بصيرتها فرأت بئر ماء، فمضت إلى البئر وملأت القربة ماء وسقت الصبي.

''بچہ بڑا ہو گیا اور اس کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ ابراہیم نے اسحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ایک بہت بڑی دعوت تیار کی۔ سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصریہ کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ وہ ابراہیم سے کہنے لگی: اس لڑکی اور اس کے بیٹے کو نکال دو کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہیں بن سکتا۔ ابراہیم کو یہ بات اچھی نہ لگی کیونکہ اسماعیل اس کا بھی تو بیٹا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: بچے اور تیری لونڈی کے بارے میں یہ بات تجھے بری نہ لگے۔ جو سارہ تجھے کہے اسے سن کیونکہ اسحاق کے ذریعے تیری بڑی نسل ہوگی اور اس لونڈی کے بیٹے کو بھی میں ایک عظیم امت بناؤں گا کیونکہ وہ بھی تیرا حقیقی بیٹا ہے۔''

''اگلے دن ابراہیم نے صبح صبح کچھ روٹی لی اور پانی کا ایک مشکیزہ۔ یہ دونوں چیزیں ہاجرہ کو دیں، بچے کو اس کے کندھے پر رکھا اور اسے نکال دیا۔ وہ جدھر منہ اٹھا صحرائے بئر سبع میں حیران چلتی رہی۔ مشکیزے میں پانی ختم ہو گیا۔ ہاجرہ نے بچہ ایک درخت کے نیچے ڈال دیا اور چل کر دو تیر کے فاصلے پر اس کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی: میں بچے کو مرتا نہیں دیکھ سکتی، پھر وہ بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے رونے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے بچے کی آواز سن لی تو اللہ کے ایک فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو آواز دی: ''ہاجرہ! تجھے کیا ہوا؟ مت ڈر۔ اللہ نے بچے کی آواز سن لی ہے جہاں بھی وہ ہے۔ اٹھ بچے کو اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ۔ میں اسے ضرور ایک عظیم امت بناؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر تیز کر دی تو اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھ لیا۔ وہ کنویں کے پاس گئی، مشکیزہ پانی سے بھرا اور بچے کو پلایا۔ اللہ اس بچے کے ساتھ رہا حتی کہ وہ بڑا ہو گیا اور صحرا میں رہنے لگا۔ وہ بہترین تیرانداز تھا اور جب وہ

صحرا میں ٹھہرا ہوا تھا تو اس کی ماں نے اس کی شادی مصر کی ایک عورت سے کر دی۔''

کوئی شک نہیں کہ اس عبارت میں بہت سی تحریفات ہیں، پھر بھی اس میں ایسے اشارات باقی رہ گئے جو سیدنا اسماعیل علیہ السلام اور ان کے لیے فاران، یعنی مکہ مکرمہ میں پانی پھوٹنے کے واقعے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی بھی تصدیق ہوئی ہے جو آپ ﷺ نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا تھا:

«اِرمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ فَإِنَّ أَبَا كُمْ كَانَ رَامِيًا»

''اے بنی اسماعیل! تیر چلاؤ کیونکہ تمھارا باپ بہترین تیرانداز تھا۔'' (صحيح البخاري، حديث: 2899)

یہ بات بھی یقینی ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی بھی وقت کوئی ایسا شخص نہیں ہوا جس نے مکہ کے علاقۂ فاران میں نبوت کا دعویٰ کیا ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو کسی بھی مدعیٔ نبوت کے ظاہر ہونے سے محفوظ رکھا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد یمن، نجد اور یمامہ میں بہت سے نبوت کے دعویدار پیدا ہوئے لیکن مکہ مکرمہ میں کوئی مدعیٔ نبوت ظاہر نہیں ہوا نہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے نہ بعد میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی خصوصی حفاظت تھی۔

اور سفر حبقوق (3-6) میں جو کہ عہد نامہ قدیم (تورات) کا ایک اہم حصہ ہے، یہ عبارت موجود ہے:

الله يجيء من تيمان، القدّوس من جبل فاران، غطى جلاله السماوات وامتلأت الأرض من التهلّل له. يجيء كلمعان البرق ومن يده يسطع النور وفيها تستتر عزته. قدام وجهه يسير الوباء ووراء قدميه الموت، يقف فتهتز الأرض، وينظر فترتعد الأمم تتحطم جبال الدهر، وتنخسف تلال الأزل، حيث سار في قديم الزمان.

''اللہ تیمان سے آئے گا، قدوس فاران کے پہاڑ سے آئے گا۔ اس کے جلال و رعب نے آسمانوں کو ڈھانپ رکھا ہوگا اور زمین اس کی آواز سے بھر جائے گی۔ وہ بجلی کی چمک کی طرح آئے گا۔ اس کے ہاتھ سے نور چمک رہا ہوگا اور اس میں اس کی عزت چھپی ہوئی ہوگی۔ اس کے چہرے کے سامنے وبا چلے گی اور اس کے قدموں کے پیچھے موت چل رہی ہوگی۔ وہ رکے گا تو زمین پر زلزلہ برپا ہو جائے

گا۔ وہ دیکھے گا تو امتیں کانپ اٹھیں گی۔ زمانے کے پہاڑ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور ازل کے ٹیلے دھنس جائیں گے۔ جہاں بھی قدیم زمانے میں چلے گا۔'' (عہد قدیم، ص: 1174)

بہت سے معتبر تاریخی حوالے موجود ہیں کہ اس سفر کی آخری طباعت میں تبدیلیاں کی گئیں اور 1884ء میں بیروت سے طبع شدہ اصل نسخے سے مندرجہ ذیل عبارت سرے سے نکال دی گئی:

وامتلأت الأرض من تحميد أحمد ملك بيمينه رقاب الأمم.

''احمد (ﷺ) کی حمد سے زمین بھر گئی۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ امتوں کی گردنوں کا مالک بن گیا۔''

اسی طرح 1848ء میں لندن سے مطبوعہ نسخے اور 1884ء میں بیروت سے مطبوعہ نسخے میں یہ عبارت بھی تھی:

لقد أضاءت السماء من بهاء محمد وامتلأت الأرض من حمد زجرك في الأنهار، واحتدام صوتك في البحار، يا محمد! أدن لقد رأتك الجبال فارتاعت.

''محمد (ﷺ) کے حسن و رونق سے آسمان روشن ہوگیا اور زمین اس کی حمد سے بھر گئی۔ تیری ڈانٹ دریاؤں میں ہے اور تیری آواز کی کڑک سمندروں میں ہے۔ اے محمد! قریب ہو۔ بلاشبہ تجھے پہاڑوں نے دیکھا تو ڈر گئے۔'' (مجلۃ البشارات عدد اول۔ یہ عبارت مؤرخہ 27/11/2010 کو (http: //www.hurras.org) سے نقل کی گئی ہے۔)

اس عبارت سے آپ ﷺ کے اس فرمان کی تصدیق ہوتی ہے:

«نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ» ''میری ایک ماہ کے فاصلے سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 438، وصحيح مسلم، حديث: 521)

اسی طرح انجیل متی (14:11) میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنے بعد آنے والے کی خوشخبری ان الفاظ میں موجود ہے: **وإن أردتم أن تقبلوا فهذا هو إيليا المزمع أن يأتي.**

''اور اگر تم قبول کرنا چاہو تو یہ ہے ایلیا جس نے پختہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔''

اور انجیل لوقا (14:1) میں ہے:

المجد لله في الأعالي وعلى الأرض السلام وبالناس المسرّة.

''بزرگی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بلندیوں میں اور زمین پر سلامتی ہے اور لوگوں میں خوشی ہے۔''

اہل علم کو پورا یقین ہے کہ یہ عبات تحریف شدہ ہے (ترجمہ میں)۔ اصل عبارت یوں تھی:

اقترب السلام للأرض وتيسيره بين الناس محمد.

''محمد (ﷺ) کی وجہ سے سلامتی زمین کے قریب آ گئی اور لوگوں کے درمیان آسانی پیدا ہوگئی۔''

(غصن الرب في سفر أشعيا النبي، ص: 54)

مشہور انجیلوں میں سے ایک انجیل برنابا ''Gospel of Barnaba'' (اس انجیل کا ترجمہ انگریزی سے عربی میں ڈاکٹر خلیل سعادہ (1908ء) نے کیا۔ اور یہ انگریزی نسخہ لونسڑال راغ ولورا راغ نے اصلی اطالوی نسخے سے ترجمہ کیا تھا جو کہ مکتبہ ویٹکن سے برآمد ہوا تھا۔ عربی ترجمے پر تقدیم اور تعلیق ڈاکٹر احمد حجازی سقا نے لکھی۔ اسے دارالامل۔ اربد، اُردن نے 2005ء میں شائع کیا۔ یہ ترجمہ پہلی دفعہ شائع ہوتے ہی شیخ محمد رشید رضا کی خصوصی توجہ سے بہت مقبول ہوا۔ (1326ھ)۔) ہے۔ یہ ایک مشہور انجیل ہے جو سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں ویٹکن میں منکشف ہوئی۔ (www.ar.wikipedia.com) اس کے بعد یہ اطالوی، ہسپانوی اور انگریزی زبانوں میں سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں شائع ہوتی رہی۔ (www.ar.wikipedia.com)

بعض تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ پوپ گیلسیٹس نے نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے 492ء میں انجیل برنابا کی طرف اشارہ کیا تھا اور اسے ممنوعہ کتب کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ (انجیل برنابا، ص: 98) بہت سے عیسائی پوپ اس انجیل اور اس کے مندرجات کا انکار کرتے ہیں کیونکہ اس میں واضح طور پر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیش گوئیاں موجود ہیں جیسا کہ آگے آئیں گی، حالانکہ اس کے پہلے ایڈیشن آج سے تین سو سال پہلے یورپی، ہسپانوی، اطالوی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جبکہ عرب اور مسلمانوں میں تو صرف ایک صدی سے متعارف ہوئی ہے اور وہ بھی اپنے یورپی ایڈیشنوں کی بدولت۔

اس انجیل کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ بات قابل توجہ ہوگی کہ اس کے مندرجات قرآن مجید کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں، مثلاً: توحید، شرک کی حرمت، سیدنا مسیح علیہ السلام کی بشریت، ان کی عبادت کا انکار، ان کے

ابن اللہ ہونے کی تردید وغیرہ۔ اس میں صراحت ہے کہ وہ رسول تھے، بشر تھے، سیدہ مریم علیہا السلام کے بیٹے تھے اور گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے۔

انجیل برنابا میں سیدنا محمد ﷺ کے بارے میں واضح اشارات موجود ہیں بلکہ آپ ﷺ کے نام نامی محمد کی صراحت بھی ہے، مثلاً: اِصحاح:163 میں ہے:

وذهب يسوع مع تلاميذه إلى البرية وراء الأردن، فلما انقضت صلاة الظهيرة جلس بجانب نخلة وجلس تلاميذه تحت ظل النخلة، حينئذ قال يسوع: أيها الإخوة إن سَبْق الاصطفاء لسر عظيم حتى أني أقول لكم الحق: إنه لا يعلمه جَلِيًّا إلا إنسان واحد فقط، وهو الذي تتطلع إليه الأمم الذي تتجلى له أسرار الله تجليًا، فطوبى للذين سيصيخون السمع إلى كلامه متى جاء إلى العالم. لأن الله سيظللهم كما تظللنا هذه النخلة، بلى: إنه كما تقينا هذه الشجرة حرارة الشمس المتلظية هكذا تقي رحمة الله المؤمنين بذلك الاسم من الشيطان.

أجاب التلاميذ: يا معلّم من عسى أن يكون ذلك الرجل الذي تتكلم عنه الذي سيأتي إلى العالم؟ أجاب يسوع بابتهاجِ قلب: إنه محمد رسول الله، ومتى جاء إلى العالم فسيكون ذريعة للأعمال الصالحة بين البشر بالرحمة الغزيرة التي يأتي بها، كما يجعل المطر الأرض تعطي ثمراً بعد انقطاع المطر زمنًا طويلاً فهو غمامة بيضاء ملأى برحمة الله وهي رحمة ينثرها الله رذاذًا على المؤمنين كالغيث.

''سیدنا مسیح ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے ساتھ اردن کے قریب صحراء کی طرف گئے۔ جب ظہر کی نماز مکمل ہوگئی تو وہ ایک کھجور کے درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے شاگرد درخت کے سائے تلے بیٹھ

گئے۔اس وقت یسوع کہنے لگے: اے بھائیو! یقیناً مصطفیٰ سے پہلے آنے میں ایک عظیم راز ہے، حتی کہ میں اب تمھیں حقیقت بیان کر ہی دیتا ہوں۔ اس راز کو واضح طور پر صرف ایک انسان ہی جانتا ہے۔ یہ وہ شخصیت ہے جس کا سب امتیں انتظار کرتی ہیں۔ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کے راز اچھی طرح واضح ہو جائیں گے، لہٰذا مبارک ہو ان لوگوں کو کہ جب وہ جہان کے سامنے آئے گا تو وہ اس کی باتوں کی طرف کان لگائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر اس طرح سایہ فرمائیں گے جس طرح یہ درخت ہمیں سایہ کر رہا ہے۔ کیوں نہیں؟ جس طرح یہ درخت ہمیں انتہائی گرم سورج کی گرمی سے بچا رہا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت اس نام پر ایمان لانے والوں کو شیطان سے بچائے گی۔

شاگردوں نے جواب دیا استادِ گرامی! وہ شخص کون ہوگا جس کے بارے میں آپ فرما رہے ہیں کہ وہ جہان والوں کے سامنے آئے گا؟ یسوع نے انتہائی خوش دلی سے جواب دیا: یقیناً وہ محمد رسول اللہ ہیں۔ جب وہ اس جہان میں آئیں گے تو کثیر رحمت کے ساتھ آئیں گے اور لوگوں کے درمیان نیک اعمال پھیلانے کا ذریعہ بنیں گے۔ جس طرح عرصۂ دراز تک بارش نہ ہو تو آنے والی بارش اس زمین کو بارآور بنا دیتی ہے، اسی طرح وہ (محمد ﷺ) اس سفید بادل کی طرح ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھرا ہوا ہو۔ یہی رحمت اللہ تعالیٰ پھوار کی صورت میں بارش کی طرح مومنوں پر بکھیر دیں گے۔''

(انجیل برناباص:293)

کیا اس کلام سے ہمارا ذہن ان فرامینِ الٰہی کی طرف منتقل نہیں ہوتا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے۔'' (الأنبیاء 107:21)

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں،

تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔'' (الصف 6:61)

اسی طرح اِصحاح:124 میں لکھا ہے:

لما كان الله واحدًا كان الحق واحدًا، فينتج من ذلك: أن التعليم واحد وأن معنى التعليم واحد فالإيمان إذًا واحد، الحقَّ أقول لكم: إنه لو لم يُمْحَ الحق من كتاب موسى لما أعطى الله داود أبانا الكتاب الثاني، ولو لم يفسد كتاب داود لم يعهد الله بإنجيله إليّ، لأن الرب إلهنا غير متغير ولقد نطق رسالة واحدة لكل البشر، فمتى جاء رسول الله يجيء ليطهر كل ما أفسد الفجار من كتابي حينئذ أجاب من يكتب: يا معلم ماذا يجب على المرء فعله متى فسدت الشريعة وتكلم النبي المدعي؟ أجاب يسوع: إن سؤالك لعظيم يا برنابا، لذلك أفيدك أن الذين يخلصون في مثل ذلك الوقت قليلون، لأن الناس لا يفكرون في غايتهم التي هي الله، لعمر الله الذي تقف في حضرته إن كل تعليم يحول الإنسان عن غايته التي هي الله لشرّ تعليم، لذلك يجب عليك ملاحظة ثلاثة أمور في التعليم: أي المحبة لله وعطف المرء على قريبة وبغضك لنفسك التي أغضبت الله وتغضبه كل يوم، فتجنب كل تعليم مضاد لهٰذه الرؤوس الثلاثة لأنه شرير جدًّا.

''چونکہ اللہ ایک ہے، لہٰذا حق بھی ایک ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم بھی ایک ہے اور اس تعلیم کا مفہوم بھی ایک ہے۔ تب ایمان بھی ایک ہوگا۔ میں تمھیں صرف حق و سچ کہتا ہوں۔ اگر موسیٰ کی کتاب

سے حق نہ مٹایا جاتا تو اللہ تعالیٰ ہمارے جدامجد داود کو دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داود کی کتاب کو خراب نہ کیا جاتا تو اللہ تعالیٰ مجھے انجیل عطا نہ کرتا کیونکہ ہمارے معبود رب تعالیٰ میں تغیر نہیں ہے۔ اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ جب رسول اللہ (محمد ﷺ) آئیں گے تو وہ صرف اس لیے آئیں گے کہ بدکار لوگوں نے میری کتاب میں جو خرابی کی ہوگی اس سے انجیل کو پاک کریں۔ تب لکھنے والے نے پوچھا: ''استادِ گرامی! جب ہماری شریعت خراب ہو جائے اور نبوت کا دعویدار (محمد ﷺ) کلام کرنے لگے تو ہر شخص پر کیا واجب ہوگا؟ یسوع نے جواب دیا: فرمایا! تیرا سوال بہت بڑا ہے، لہٰذا میں تجھے بتاتا ہوں کہ اس وقت خلوص کا ثبوت دینے والے بہت کم ہوں گے کیونکہ لوگ اپنے مقصودِ اصلی، یعنی اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ اللہ کی زندگی کی قسم! جس کے سامنے تو کھڑا ہوگا کہ جو تعلیم انسان کو اس کے مقصودِ اصلی، یعنی اللہ تعالیٰ سے پھیر دے وہ بدترین تعلیم ہے، لہٰذا تجھے تعلیم میں تین چیزوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے: ① اللہ تعالیٰ سے محبت۔ ② اپنے رشتہ دار پر شفقت۔ ③ اپنے نفس سے بغض جو اللہ تعالیٰ کو تجھ سے ناراض کر دے۔ اور تو ہر روز ہی اسے ناراض کرتا ہے، لہٰذا ہر اس تعلیم سے بچ جو ان تین اصولوں کے خلاف ہو کیونکہ وہ انتہائی بدترین تعلیم ہے۔'' (انجیل برنابا، ص:327)

انجیل برنابا کے اِصحاح:208 سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

فقل له: من كان ابن إبراهيم هذا؟ أجاب يسوع: إن غيرة شرفك يا الله تؤججني ولا أقدر أن أسكت، الحق أقول: إن ابن إبراهيم هو إسماعيل الذي يجب أن يأتي من سلالته مسيّا الموعود به إبراهيم أن به تتبارك كل قبائل الأرض .

''اسے کہہ! وہ ابراہیم کا کون سا بیٹا ہے؟ یسوع نے جواب دیا: ''اے اللہ! تیری بزرگی کی عزت مجھے اس اعلان پر مجبور کرتی ہے۔ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ میں صرف حق و سچ ہی کہوں گا۔ ابراہیم کا وہ بیٹا اسماعیل ہی ہے۔ ضروری ہے کہ جس نبی کا ابراہیم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ اس (اسماعیل) کی نسل سے ہی آئے جس کے ساتھ زمین کے تمام قبائل برکت حاصل کریں گے۔''

انجیل برنابا میں رسول اللہ ﷺ کے کچھ خصائص بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً: آپ ﷺ کا قیامت کے دن شفاعتِ کبریٰ کی خاطر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا۔ اگرچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ انجیل کی عبارت میں تحریف ہوچکی ہے، پھر بھی کچھ سچی باتیں باقی رہ گئی ہیں جن پر ہم مطلع ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم صرف وہی خصائص بیان کریں گے جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔

برنابا نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا کلام اس شفاعت کبریٰ کے بارے میں نقل کرتے ہوئے اِصحاح: 54 اور 55 میں ایک طویل عبارت ذکر کی ہے جو اپنے مضمون کے لحاظ سے حدیثِ شفاعت کے مطابق ہے، البتہ بعض الفاظ میں اختلاف ضرور ہے اور وہی الفاظ قابل بحث ہیں۔ بہر حال اس سے یہ تو قطعی طور پر پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد، جن میں برنابا بھی شامل ہیں، محمد مصطفیٰ ﷺ کی اس منقبت اور خصوصیت سے بخوبی واقف تھے۔ انجیل برنابا (33:12:54) میں لکھا ہے:

''اس کے بعد اللہ تعالیٰ تمام انبیاء کو زندہ فرمائیں گے۔ وہ سب اونچی آواز سے کہہ رہے ہوں گے: محمد! ہمیں یاد رکھنا۔ رسول اللہ ﷺ کے دل میں رحمت جوش مارے گی۔ آپ سوچیں گے کہ ان کی نجات کے لیے کیا کروں۔ آپ بھی اللہ سے ڈر رہے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو زندہ کریں گے۔ وہ اپنے پہلے وجود کی طرف لوٹ آئے گی۔ ان میں سے ہر ایک میں بولنے کی زبردست طاقت ہوگی، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ تمام حرامیوں کو زندہ کریں گے۔ ان کے قبیح منظر کو دیکھ کر اللہ کی سب مخلوق ڈرنے لگے گی اور چیخنے لگے گی: اے ہمارے معبود رب! ہمیں اپنی رحمت سے محروم نہ رکھنا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شیطان کو زندہ کریں گے۔ اس کو دیکھتے ہی ہر مخلوق میت کی طرح ہو جائے گی کیونکہ وہ اس کا خوفناک منظر دیکھ کر ڈر جائیں گے، پھر یسوع کہیں گے: میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ میں اس دن کی ہولنا کی کو نہ دیکھوں گا۔ لیکن صرف اللہ کے رسول (محمد ﷺ) ان مناظر سے نہیں ڈریں گے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے نہ ڈریں گے، پھر اللہ کے رسول (محمد ﷺ) ارادہ کریں گے کہ سب انبیاء کو اکٹھا کریں۔ وہ ان سے کہیں گے: آؤ میرے ساتھ چلو تا کہ سب مل کر مومنوں کی خاطر اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کریں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک خوف کی وجہ سے معذرت پیش کرے گا اور خدا کی زندگی کی قسم! یقیناً میں بھی وہاں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں گا جو جانتا

ہوں گا۔ جب اللہ تعالیٰ یہ صورت حال دیکھیں گے تو اپنے رسول (محمد ﷺ) کو یاد فرمائیں گے، کیسے یاد نہ فرمائیں جبکہ انھوں نے آپ کی محبت میں تمام چیزیں پیدا کیں، لہٰذا آپ کا خوف ختم ہو جائے گا اور آپ پورے احترام کے ساتھ گزارش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھیں گے جبکہ فرشتے ترنم کے ساتھ یہ پڑھ رہے ہوں گے: ''اے اللہ، ہمارے معبود! تیرا انتہائی پاکیزہ نام بابرکت ہے۔'' اور جب آپ گزارش کے لیے اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے اپنے بازو وا کر دے گا جس طرح ایک دوست دوسرے دوست کے لیے عرصۂ دراز کے بعد ملاقات کے وقت کرتا ہے۔ اللہ کے رسول (سیدنا محمد ﷺ) کلام میں ابتدا کریں گے اور کہیں گے: ''اے میرے معبود! میں تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھ سے محبت رکھتا ہوں اور صمیمِ قلب اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ تیرا شکر ادا کرتا ہوں کیونکہ تو نے ارادہ فرمایا تو مجھے پیدا کیا اور پھر میری محبت کی وجہ سے ہر چیز کو پیدا کیا تاکہ میں تجھ سے ہر چیز کی وجہ سے اور ہر چیز کے بارے میں اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کروں۔ اے میرے معبود! تیری ہر مخلوق کو تجھ ہی سے محبت کرنی چاہیے۔ تب اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات پکار اٹھیں گی: ''اے رب کریم! ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ تیرا انتہائی پاکیزہ نام بابرکت ہے۔'' میں تمھیں صرف حق بات بتاتا ہوں۔ تب یقیناً شیطان اور حرام زادے بھی شیطان کے ساتھ رونے لگیں گے، حتیٰ کہ ان میں سے ایک کی آنکھ سے دریائے اُردن سے بھی زیادہ پانی بہے گا۔ اس کے باوجود وہ اللہ کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول (سیدنا محمد ﷺ) سے کلام کرتے ہوئے فرمائیں گے: ''میرے امانتدار بندے! تجھے خوش آمدید ہو! آپ جو چاہیں، طلب کریں۔ آپ کو ہر چیز ملے گی۔'' اللہ کے رسول (سیدنا محمد ﷺ) جواب دیں گے: رب کریم! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا تو تُو نے فرمایا تھا: میں نے یہ جہان، جنت، فرشتے اور لوگ تیری محبت کی وجہ سے پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ وہ میری وجہ سے تیری بزرگی بیان کریں۔ میں تیرا بندہ ہوں، اس لیے رب کریم! میں عاجزی کے ساتھ تجھ سے گزارش کرتا ہوں کہ تو اپنے اس وعدے کو یاد کر جو تو نے اپنے بندے سے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ، جس طرح ایک دوست اپنے دوست سے مذاق کرتا ہے، فرمائیں گے: میرے خلیل محمد! کیا تیرے اس عہد کے کوئی گواہ ہیں؟ آپ انتہائی احترام کے ساتھ جواب دیں گے: جی ہاں، رب کریم! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: جبریل! جاؤ اور انھیں بلا لاؤ۔

جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: آقائے محترم! آپ کے گواہ کون ہیں؟ رسول اللہ فرمائیں گے: آدم، ابراہیم، اسماعیل، موسیٰ، داود، یسوع بن مریم۔ فرشتے چلے جائیں گے اور مذکورہ گواہوں کو پکاریں گے۔ تب وہ سب گواہ ڈرتے ہوئے وہاں حاضر ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے: ''کیا تمھیں وہ بات یاد ہے جو میرے رسول کریم نے ذکر کی ہے؟ وہ عرض کریں گے: رب کریم! کون سی بات؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ بات کہ میں نے ہر چیز اس کی محبت کی وجہ سے پیدا کی ہے تا کہ تمام مخلوقات اس کی وجہ سے میری بزرگی بیان کریں۔ ان میں سے ہر ایک جواب دے گا: رب کریم! ہمارے پاس تین ایسے گواہ ہیں جو ہم سے بھی افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: وہ تین کون ہیں؟ موسیٰ کہیں گے: پہلا گواہ وہ کتاب جو تو نے مجھے دی تھی۔ داود کہیں گے: دوسرا گواہ وہ کتاب جو تو نے مجھے دی، پھر کہے گا: وہ جواب تم سے کلام کر رہا ہے (عیسیٰ علیہ السلام خود)، رب کریم! شیطان نے پورے جہان کو گمراہ کر دیا، لہٰذا وہ سب کہنے لگے: میں (عیسیٰ) تیرا بیٹا ہوں۔ (اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام شرک سے مکمل بری تھے اور وہ اپنے بندہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اخلاص کو تاکید سے بیان فرماتے تھے۔) اور تیرا شریک ہوں لیکن جو کتاب تو نے مجھے دی تھی، اس نے سچ کہا: میں تیرا بندہ اور غلام ہوں۔ یہ کتاب اعتراف کرتی ہے اس بات کا جو تیرے رسول کریم نے ذکر کی ہے۔ تب اللہ کے رسول (محمد ﷺ) کلام کریں گے اور فرمائیں گے: ایسے ہی وہ کتاب بھی کہہ رہی ہے جو تو نے مجھے دی۔ جب اللہ کے رسول (محمد ﷺ) یہ کہیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا ہے کہ ہر شخص کو پتا چل جائے کہ مجھے تجھ سے کتنی محبت ہے۔ یہ فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول (ﷺ) کو ایک کتاب عطا فرمائیں گے جس میں اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ لوگوں کے نام ہوں گے۔ تب اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق یہ کہتے ہوئے سجدے میں پڑ جائے گی: اے اللہ! صرف تجھ اکیلے ہی کے لیے ہر قسم کی بزرگی اور عزت ہے کیونکہ تو نے اپنے رسولِ گرامی (محمد ﷺ) کی وجہ سے ہمیں معاف فرما دیا۔''

اسی طرح انجیل برنابا میں سیدنا مسیح علیہ السلام کی بہت سی ایسی احادیث پائی جاتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے بالکل ملتی جلتی ہیں، مثلاً: اِصحاح:169 میں جنت کی صفت یہ بیان کی گئی ہے:

لم ترعينا إنسان ولم تسمع إذناه ولم يدرك قلب بشر ما أعده الله

للذين يحبونه .

''کسی انسانی آنکھوں نے وہ چیز نہیں دیکھی اور نہ انسانی کانوں نے وہ چیز سنی اور نہ کسی انسانی دل نے اس چیز کا ادراک کیا جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کر رکھی ہے جو اس سے محبت رکھتے ہیں۔''
(انجیل برنابا، ص: 298)

یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے عین مطابق ہیں:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

''کوئی شخص نہیں جانتا کہ (ان کے اعمال کے بدلے میں) ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔'' (السجدة 17:32)

اور یہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی تصدیق ہے جو آپ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

«أَعْدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ»

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں کھٹکا۔'' (صحيح البخاري، حديث: 3244، وصحيح مسلم، حديث: 2824)

نیز انجیل برنابا ان تفصیلات سے بھی متفق ہے جو مسلمانوں کے پاس قرآن وسنت میں اجمالاً سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بارے میں منقول ہیں، مثلاً: اِصحاح:216 میں ہے:

فجاء الملائكة الأطهار وأخذوا يسوع من النافذة المشرفة على الجنوب، فحملوه ووضعوه في السماء الثالثة في صحبة الملائكة التي تسبح الله إلى الأبد .

''پس مقدس فرشتے آئے اور انھوں نے جنوبی جانب کھلنے والی کھڑکی سے سیدنا یسوع کو نکال لیا اور اٹھا کر تیسرے آسمان کے فرشتوں کے ساتھ ٹھہرا دیا جو ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے

ہیں۔'' (انجیل برناباص:334)

یہ بیان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے عین مطابق ہے:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۞﴾

''حالانکہ انھوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ انھیں سولی پر چڑھایا بلکہ انھیں شبہے میں ڈال دیا گیا۔ اور بے شک جنھوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا وہ ضرور ان کے متعلق شک میں ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کے بارے میں گمان کی پیروی کے سوا کوئی علم نہیں اور انھوں نے یقیناً انھیں قتل نہیں کیا۔''

(النسآء 157:4)

خود یہودی اور عیسائی اعتراف کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اصل کتابوں اور ان کی تشریحات میں تحریف ہوچکی ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کے نزدیک حق واضح ہے خصوصاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اللہ تعالیٰ کی توحید، سابقہ انبیاء کے احترام و نیاز مندی اور ان کے اصولوں کی پیروی کی طرف دعوت دی۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞﴾

''آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔'' (آل عمرٰن 64:3)

لہٰذا ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بھی یہ بات بالکل واضح تھی تبھی آپ نے ہرقل (شاہِ روم) اور اس کے دور کے دیگر عیسائی قائدین کو خطوط لکھے تھے۔

دورِ حاضر کے مغربی محققین کے آپ ﷺ پر تبصرے

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کے بہت سے مغربی محققین نے رسول اللہ ﷺ کی سچائی کی گواہی دی ہے یا انھوں نے کسی حد تک منصفانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ہمارا ان کے ساتھ اصل عبارات اور مضامین و مفاہیم میں بعض اوقات اختلاف ہو جاتا ہے، نیز بہت سے یورپی سوانح نگار رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں غیر منصفانہ انداز رکھتے ہیں۔ (شعاع من السيرة النبوية في العهد المكي للكردي، ص: 15) ڈرمنگھم لکھتے ہیں: ''یہ بات حقیقتاً قابل افسوس ہے کہ ان ماہرین نے بسا اوقات تنقید کرتے وقت مبالغہ آرائی کی ہے، اس لیے ان کی کتابیں رسمی ہیں اور ان میں خاص طور پر تباہی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

(حیات محمد، از ڈرمنگھم)

بہت سی تالیفات میں اس موضوع کو اہمیت دی گئی ہے اور ان میں اس حقیقت کے شواہد موجود ہیں۔

(الرسول ﷺ في عيون غربية منصفة، طبع: 2006ء)

معلوم یوں ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں مغرب میں بے شمار علمی حقائق ظاہر ہونے شروع ہوئے جن کی وجہ سے یورپی مصنفین کی آنکھوں میں رسول اللہ ﷺ کے لیے انصاف پیدا ہوا، مثلاً: روڈنسن میکسم لکھتا ہے: اٹھارویں صدی میں بہت سے روشن طبع یورپی مؤرخین کے ظہور کی وجہ سے سیدنا محمد (ﷺ) کی صحیح تصویر مکمل ہونا شروع ہوئی جو کہ ایک نرم مزاج حاکم، عظیم فلسفی اور قانون ساز شخصیت تھے۔''

(الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 129)

ایک انگریز مصنف جارج برنارڈ شا نے بھی اشارہ کیا ہے کہ اب یورپ نے نبیٔ کریم ﷺ کی اصلی شخصیت کو سمجھنا شروع کر دیا ہے، جبکہ اس سے قبل ان کی شخصیت کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا رہا۔ وہ لکھتا ہے ''اب یورپ کو محمد (ﷺ) کی دانائی سمجھ آنا شروع ہوگئی ہے اور ان کا دین بھی انھیں سمجھ آنے لگا ہے۔ اب انھوں نے اسلامی

عقیدے کو ان افواہوں اور بہتانوں سے بری کرنا شروع کر دیا ہے جو وسطی صدیوں میں یورپی لوگوں نے اس پر باندھے تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 105)

اسی طرح مارشل بارزر نے بھی سیدالانبیاء محمد ﷺ اور ان کے دین کے بارے میں حق ظاہر ہونے کی گواہی دی ہے، وہ لکھتا ہے: ''تاریخی حقائق آپ کی زندگی کا ایک ایک ورق روشن کر رہے ہیں جسے ہم پوری تفصیلات کے ساتھ جان چکے ہیں۔ اب سیدنا محمد ﷺ کی وہ تصویر واضح ہوگئی ہے جو آپ چھوڑ کر گئے، اگرچہ اسے بگاڑنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ یہ علمی حقائق اسلام کے چہرے اور دینی مفہوم کا صحیح انکشاف کر کے ہمارے لیے آپ کی حقیقی عظمت کو سمجھنے کا موقع مہیا کرتے ہیں۔ سیدنا محمد (ﷺ) تاریخی لحاظ سے صرف ایک دین کی خوشخبری دینے والے ہی نہیں تھے بلکہ ایسی سیاست کے بانی بھی تھے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا اور بعد میں وسیع بنیادوں پر اسلام کے پھلنے پھولنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 114)

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے مطالعہ نے بعض مغربی اہل علم پر بہت زیادہ اثر کیا اگرچہ ان کے پاس موجود تاریخی کتابوں کا مطالعہ محدود تھا اور بعض کتابوں میں تو حقائق بگاڑے گئے تھے مگر انھی کتابوں کے بین السطور پائی جانے والی حق کی چمک نے ان کی زندگی پر سچا اور گہرا اثر ڈالا، مثلاً: الفانس ڈی لامارٹین (Alphonse de lamartine) نے لکھا ہے: ''میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا وسیع مطالعہ کیا جس سے مجھے ان کی عظمت و بقا کا ادراک ہوا۔ کون شخص جرأت کر سکتا ہے کہ کسی بھی تاریخی شخصیت کو محمد (ﷺ) کے ساتھ تشبیہ دے سکے؟ اور کون سا شخص ایسا ہوسکتا ہے جو کسی بھی پیمانے کے لحاظ سے، جس سے کسی کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکے، محمد (ﷺ) سے بڑھ کر ہو؟ مدد اور فتح حاصل ہونے کے وقت آپ ﷺ کا طرز عمل، تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں آپ کی مسلسل جدوجہد اور آپ کی عبادات، آپ کے عقیدے اور نظریے کی بنیاد ہیں۔ ایسا رسول جو خطیب بھی ہو، قانون ساز بھی ہو، فاتح بھی ہو اور مصلح بھی۔ جو ایسی عبادت کا بانی ہو جو مورتوں اور صورتوں کی تقدیس پر قائم نہ ہو، وہ صرف محمد (ﷺ) ہی ہوسکتا ہے۔ رسولِ کریم نے ان تمام اعتقادات کو ریزہ ریزہ کر دیا جو خالق اور مخلوق کے درمیان واسطے کے قائل تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 42)

ایڈورڈ پرائے (Edvard Peeroy) وضاحت سے کہتا ہے کہ جناب محمد (ﷺ) ہی خاتم النبیین (آخری نبی) ہیں۔ آپ کی شریعت الٰہی اور جامع معاشرتی نظام پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جناب محمد بن عبداللہ (ﷺ) عربی اور آخری نبی، عربوں اور تمام لوگوں کو ایک نئے دین کی خوشخبری دینے کے لیے تشریف لائے۔ وہ ایک اور یکتا اللہ کے عقیدے کی طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کی شریعت اپنی دعوت میں عقیدے یا ایمان سے مختلف نہ تھی بلکہ وہ حکومت الٰہیہ سے اتنی ہی مزید قوت حاصل کرتی تھی۔ وہ صرف دینی امور کو ہی شامل نہ تھی بلکہ دنیوی امور کو بھی شامل تھی۔ وہ مسلمان شخص پر زکاۃ بھی فرض کرتی تھی اور مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف جہاد بھی، نیز دین حنیف کی نشر و اشاعت بھی۔ جب نبی عربی (ﷺ) 632ء میں فوت ہوئے تو وہ اپنی دعوت سے فارغ ہو چکے تھے اور ایک اجتماعی نظام قائم کر چکے تھے جو قبل از اسلام عربوں میں پائے جانے والے قبائلی نظام سے کہیں بلند و اعلیٰ تھا۔ نیز وہ انھیں ایک مضبوط وحدت میں پرو چکے تھے۔ اس طرح جزیرۂ عرب میں ایک مضبوط دینی وحدت قائم ہو چکی تھی جس کی نظیر اس سے قبل ناپید تھی۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 112)

اسی طرح لائٹنر (Leitner) رسول اللہ ﷺ اور آپ پر نازل ہونے والی وحی کا دفاع کرتے ہوئے صراحت سے کہتا ہے کہ بے شمار ایسی علامات پائی جاتی ہیں جو آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرتی ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''جس قدر میں یہودیت اور عیسائیت کو سمجھتا ہوں میں یقین سے کہتا ہوں کہ جناب محمد (ﷺ) کی تعلیمات ان دینوں سے نقل نہیں کی گئیں بلکہ وہ خالص وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کی اور اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم عرصۂ دراز سے ایمان رکھتے ہیں کہ دین اسلام عزیز و علیم ذات کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۔ اور میں پورے احترام و عجز کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ذاتی مفادات کی قربانی، مقصد و نظریہ کے ساتھ خلوص، مضبوط دلی ایمان اور سچی اور روشن نظر جو گناہ اور گمراہی کی باریکیوں اور گہرائیوں تک پہنچ جائے، نیز گناہ کے ازالے کے لیے بہترین ذرائع کے استعمال کو دیکھا جائے تو یہ ایسی روشن اور واضح علامات ہیں جو جناب محمد (ﷺ) کی نبوت اور آپ پر نازل ہونے والی وحی کی صداقت کی دلیل ہیں۔ اور یہ بات بھی قطعی ہے کہ دین عیسائیت جس کو جناب محمد ﷺ نے اس کی اصلی اور صاف ستھری صورت میں لوٹانا چاہا جیسا کہ جناب مسیح علیہ السلام نے پیش کیا تھا، وہ دین ان خفیہ تعلیمات کے بالکل خلاف ہے جو سینٹ پال (Paul) نے پھیلائیں

اور ان قبیح اغلوطات کے بھی بالکل خلاف ہے جو عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے اس دین میں اپنی طرف سے داخل کیں۔ جناب محمد (ﷺ) کی خواہش اور امید یہی تھی کہ ابراہیمی دین صرف عربوں کے ساتھ ہی خاص نہ رہے بلکہ تمام لوگوں تک پہنچے۔ اور واقعتاً آپ ﷺ کا دین کروڑوں انسانوں کی ہدایت اور تہذیب کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یہ دین نہ آتا تو سب لوگ وحشت اور بدانتظامی میں غرق رہتے اور ان میں یہ بھائی چارہ قائم نہ ہوسکتا جو دین اسلام کی وجہ سے پیدا ہوا۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 152)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی سب سے اہم چیز جس نے بعض مغربی عقلاء کے ذہن کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے، وہ عقیدۂ توحید ہے اور یہی اصل دین ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دی اور بتایا کہ سب انبیاء کی دعوت توحید ہی کی تھی جیسا کہ بے شمار قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے ثابت ہوتا ہے۔ والٹیئر (Voltaire) کہتا ہے: ''سیدنا محمد (ﷺ) کا عقیدہ ہر قسم کے شک اور پیچیدگی سے پاک ہے اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر معزز گواہ ہے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 167)

روم لنڈاوَ (Rom Landau) کہتا ہے: ''محمد (ﷺ) نے کسی بھی دن اپنی طرف الوہیت کی نسبت نہیں کی اور نہ کبھی اپنی طرف فوق الفطرت قوتوں کو منسوب کیا بلکہ اس کے برعکس آپ علانیہ صراحت کرتے تھے کہ میں صرف ایک رسول ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں تک وحی پہنچانے کے لیے منتخب کیا ہے۔''

(الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 150)

آرنلڈ جے، ٹیوبی (Arnold j. Toyubee) رسول اللہ کے نزدیک توحید اور تشریع (قانونی نظام) کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''سیدنا محمد (ﷺ) نے اپنی پوری زندگی عربی معاشرے اور ماحول میں یہ دو چیزیں (دینی لحاظ سے توحید اور حکومتی لحاظ سے قانونی نظام) نافذ کرنے کے لیے وقف رکھی اور ان دو چیزوں ہی کو اپنی رسالت کا مقصود بنائے رکھا۔ اسلامی نظام کی برکت سے عملی طور پر یہ دونوں چیزیں نافذ ہوگئیں، یعنی توحید اور مضبوط حکومت۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 116) (جس کے بغیر دین قائم ہوسکتا ہے نہ عدل)

واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) فتح مکہ کے واقعے سے محمد ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے پر

استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے: ''محمد (ﷺ) خاتم النبیین تھے اور سب سے بڑے رسول جنھیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دینے کے لیے مبعوث فرمایا۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ (ﷺ) کا طرزِ عمل دلالت کرتا ہے کہ آپ نبیٔ مرسل تھے نہ کہ ایک فاتح قائد۔ آپ نے اپنے ہم وطن لوگوں کے ساتھ انتہائی رحمت اور شفقت کا سلوک فرمایا، اگرچہ آپ نے عرب کے مرکز کو فتح کیا تھا لیکن آپ نے اپنی فتح اور غلبہ کو رحمت اور درگزر کا تاج پہنایا۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 111)

ایڈورڈ رمسے (Edward Ramsay) بھی نبیٔ اکرم ﷺ کی رسالت اور توحید کے بارے میں آپ کے پختہ عزم کو تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے: ''محمد (ﷺ) سارے جہان کے سامنے اللہ واحد و قہار کا پیغام لے کر تشریف لائے تاکہ لوگوں کو اندھیرے سے روشنی میں نکال لائیں۔ اس طرح نئی صبح طلوع ہوئی جو افقِ دنیا پر صاف نظر آتی تھی۔ جس دن عظیم مصلح محمد (ﷺ) کے مضبوط ہاتھ نے دنیا میں گم شدہ عدل اور آزادی واپس لوٹا دی، اسی دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم (ﷺ) پر کامیابی کی وحی نازل ہوگئی اور اس کے مضبوط عقلی دلائل نے ایک جاہل امت کی آنکھیں کھول دیں۔ پس عرب جاگ پڑے اور انھیں پتا چل گیا کہ وہ اب تک غلامی کی گود میں سوئے پڑے تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 103)

کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) نے لکھا ہے: ''علاوہ ازیں اگر یہ سیاسی فتح ہی محمد (ﷺ) کی واحد کامیابی ہوتی تب بھی آپ اس بات کے مستحق تھے کہ ہم اس پر تعجب کریں جبکہ محمد (ﷺ) کی فتح و کامیابی تو اس دینی مزاج کی مرہونِ منت تھی جسے عربوں نے اس دور کی شاہی قوموں سے حاصل کر کے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا کیونکہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی دعوت نے ان کی روحانی ضرورت پوری کر دی۔ اتنی بات ہے کہ سیدنا محمد (ﷺ) اور اولین مسلمانوں کو یہ فتوحات اور کامیابیاں آسانی سے حاصل نہیں ہوئیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ انھیں انتہائی حوصلہ شکن اور تلخ معرکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر نبیٔ کریم اور آپ کے مقرب ساتھیوں کی بلند حوصلگی دین کو حاصل نہ ہوتی تو ان کا باقی رہنا بھی ناممکن تھا۔

(سيرة النبي محمد از کیرن آرمسٹرانگ، ص: 73)

بہت سے مغربی مصنفین و محققین رسول اللہ ﷺ کو عظیم مصلح اور ذہین قائد مانتے ہیں بلکہ آپ کی تعریف بھی

کرتے ہیں اگرچہ وہ آپ پر ایمان نہیں لائے، مثلاً: گولڈ زیہر لکھتا ہے: ''سچی بات یہ ہے کہ محمد (ﷺ) تاریخی لحاظ سے عرب قوم کے اولین اور حقیقی مصلح تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ اس دور میں اپنے پختہ تجربے، انتہائی ذہانت اور بلند مرتبہ بصیرت کے ساتھ اپنے تمام دشمنوں کا بھرپور مقابلہ کرتے ہیں جو ملک کے اندر یا باہر آپ کے مقاصد اور اہداف سے ٹکر لے رہے تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 148)

بعض محققین اس بات پر سخت پریشان ہیں کہ مغربی لوگ رسول کریم ﷺ پر ایمان کیوں نہیں لائے؟ انھوں نے اس کو ان کے لیے باعث شرم قرار دیا ہے، مثلاً: تھامس کارلائل (Thomas Carlyle) لکھتے ہیں: ''اس دور کے کسی محقق کے لیے یہ بات انتہائی باعث شرم ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں کی طرف توجہ دے کہ دین اسلام جھوٹا ہے یا محمد (ﷺ) دھوکے باز اور جعل ساز تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 186)

ایک مشہور امریکی مؤرخ وِل ڈیوراں (Will Durant) جو کہ امریکیوں کے نزدیک فادر آف ہسٹری (تاریخ کا باپ) کے لقب سے معروف ہے، لکھتا ہے: ''یہ بات صاف ظاہر ہے کہ کسی شخص نے سیدنا محمد ﷺ کو لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے کبھی خود لکھا ہو۔ اس کے باوجود یہ چیز ان کے لیے لوگوں کے حالات جاننے میں رکاوٹ نہیں بن سکی بلکہ انھیں ان معاملات کی اس قدر معرفت تھی کہ انتہائی تعلیم یافتہ شخص بھی ان باریکیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ نبیٔ کریم ایک ماہر قائد تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ بہت تجربہ کار سیاستدان بھی تھے۔ آپ جانتے تھے کہ کیسے صلح کے ساتھ جنگ جیتی جاتی ہے۔ اگر ہم عظمت کے لحاظ سے فیصلہ کریں تو محمد (ﷺ) تاریخ کی سب سے عظیم شخصیت گردانے جائیں گے۔''

(الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 128)

بعض محققین نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بے مثال اور کامل شخص تھے اور یورپ ان کی تعلیمات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ ایک جرمنی ادیب ''یوہان ولف گینگ فون گوئٹے'' (Johann Wolfgang von Goethe) واضح طور پر لکھتا ہے:

''ہم اہل یورپ اپنی پوری علمیت کے باوجود اب تک ان باتوں تک نہیں پہنچ سکے جن تک محمد (ﷺ) پہنچے اور آئندہ بھی کوئی آپ ﷺ سے بڑھ نہ سکے گا۔ میں نے تاریخ میں انسانیت کے لیے اعلیٰ درجے کا نمونہ تلاش

کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے صرف نبیٔ کریم محمد (ﷺ) میں مل سکا۔ حق کو اسی طرح غالب اور بلند ہونا چاہیے تھا جس طرح محمد (ﷺ) نے کیا کہ انھوں نے پوری دنیا کو کلمۂ توحید کے سامنے عظیم کامیابی کے ساتھ جھکا دیا۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 174)

برنارڈ شا (Bernard shaw) جو ایک مشہور انگریز ادیب ہیں، اس دور میں اسلامی تعلیمات کی ضرورت کے سلسلے میں لکھتے ہیں: ''ضروری ہے کہ اسلام کو انسانیت کے نجات دہندہ کا لقب دیا جائے۔ میرا اعتقاد ہے کہ اگر آپ ﷺ جیسا کوئی شخص موجودہ دنیا کا حاکمِ مطلق بنا دیا جائے تو وہ دنیا کی تمام مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور بہترین طریقے سے امن اور خوشحالی لے آئے گا جن کی آج دنیا کو اشد ضرورت ہے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 167) (گویا برنارڈ شا آپ ﷺ کی شریعت کو تسلیم کرتے تھے اور اسے تمام زمانوں کے لیے مناسب سمجھتے تھے۔)

گستاوَلی بون (Gustave le bon)، ایک فرانسیسی مؤرخ اور ڈاکٹر، نبی کریم ﷺ کے ساتھ مغرب کے منصفانہ رویے کی ابتدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''جب لوگوں کا مرتبہ ان کے عظیم الشان کاموں سے متعین کیا جائے گا تو جناب محمد (ﷺ) تمام تاریخی معروف شخصیات میں سے سب سے عظیم ہوں گے۔ اب مغربی اہل علم نے بھی جناب محمد (ﷺ) کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے، حالانکہ دینی تعصب نے بہت سے مؤرخین کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے کہ وہ آپ کی فضیلت کا اعتراف کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ جناب محمد (ﷺ) ہی یہ استطاعت رکھتے تھے کہ تمام عربی قوموں کے لیے ایسی مضبوط اور بلند مرتبہ مثال قائم کریں جس کا کسی گزشتہ بلند مثال سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اسی عجیب کارنامے سے خصوصی طور پر آپ ﷺ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، پھر آپ کے پیروکاروں نے بھی اس اعلیٰ مثال کو قائم رکھنے میں اپنی جان قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ سب سے زیادہ درست بات یہ ہوئی کہ جناب محمد (ﷺ) نے تمام معاشرتی، جنگی اور دینی اقتدار ایک ہاتھ میں جمع کر لیا جبکہ جزیرۂ عرب مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہم آپ کے اس کارنامے کی نتائج کے لحاظ سے قدر و قیمت کا اندازہ تک نہیں لگا سکتے کہ عربوں نے صرف ایک صدی میں پورے جہان کو فتح کر لیا، حالانکہ وہ جناب محمد (ﷺ) کی آمد سے قبل بربریوں کی طرح متفرق قبائل تھے جو

ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 154)

ایٹین ڈینٹ (Etienne Dinet) رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شخصیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: ''جناب محمد (ﷺ) کی شخصیت جوان کی دو چادروں میں ملبوس تھی، یقیناً فوق الفطرت شخصیت تھی جس نے دنیا پر بے انتہا اثر چھوڑا، حتی کہ انھوں نے اپنی شریعت کو ایک مخصوص مزاج دیا جس میں جدت طرازی نمایاں تھی گویا کہ وہ ایک نرالی چیز تھی.....۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 127)

یورپین کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گہری عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً:

ژاک آگسٹن بیرک (Jacques Augustin Berque) لکھتا ہے: ''کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے جناب محمد (ﷺ) کا انتخاب کر کے ثابت کر دیا کہ اسلام جناب محمد (ﷺ) ہی کے لائق تھا اور جناب محمد (ﷺ) ہی اسلام کے لائق تھے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص:171)

کارل بروکلمان ایک جرمن عالم ہے، لکھتا ہے: ''اسلام کے رسول کریم نے جزیرۂ عرب کو اپنی عظیم رسالت کے لیے نقطۂ آغاز بنایا جس میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ہوتی رہیں لیکن غلبہ ہمیشہ حق کو حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد (ﷺ) صرف حق ہی لے کر آئے۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 17)

بعض مغربی محققین نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کیا ہے بلکہ آپ کو پُرزور انداز میں خاتم الانبیاء بھی کہا ہے کہ آپ ﷺ واقعتاً اس عظیم مرتبہ کے لائق ہیں، مثلاً: ایک فرانسیسی دانشور کلیمنٹ (Clement) لکھتا ہے: ''محمد (ﷺ) ایک عام نبی نہ تھے بلکہ وہ حقیقتاً خاتم الانبیاء ہونے کے مستحق تھے۔ اگر مسلمان دعوتِ اسلامی کو پھیلانے کے لیے اپنے رسول کریم کو نمونہ بناتے تو سارا جہان مسلمان بن جاتا۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص:171)

بہت سے مغربی محققین نے عیسائیت اور دوسرے آسمانی مذاہب کے بارے میں آپ ﷺ کے موقف کی تعریف کی ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کو ازحد احترام دیا ہے، مثلاً:

برنارڈ شا (George Bernard Shaw) لکھتے ہیں: میں نے جناب محمد (ﷺ) کو ایک دہشت ناک آدمی فرض کر کے مطالعہ کیا ہے تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ سیدنا مسیح (علیہ السلام) کے ساتھ ہر قسم کے جھگڑے اور

مخالفت سے انتہائی بعید رہے، اس لیے ضروری ہے کہ آپ کو انسانیت کا نجات دہندہ کہا جائے۔ یورپ نے موجودہ زمانے میں عقیدۂ توحید سمجھنا شروع کر دیا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ ہماری تمام مشکلات کو اس طرح حل کر سکتا ہے کہ ہر طرف امن اور خوشحالی پھیل جائے گی، لہٰذا اسی روح کے ساتھ ضروری ہے کہ تم آپ کی نبوت کو سمجھو۔

اور جب ہم اس لحاظ سے کسی کو عظیم کہتے ہیں کہ اس نے لوگوں پر بہت زیادہ اثر چھوڑا ہے تب ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مسلمانوں کے رسول جناب محمد (ﷺ) تاریخ انسانیت کے تمام عظیم لوگوں سے بڑھ کر عظیم ہیں۔ آپ نے تعصب اور خرافات کی سرکشی کو لگام ڈالی اور یہودیت، مسیحیت اور اپنے علاقے کے قدیم دین سے بہت بلند تر مضبوط اور واضح دین قائم کیا جو آج تک عظیم شان و شوکت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور بہت بڑی قوت بن چکا ہے۔

آج تک تاریخ نے محمد ﷺ کے سوا کوئی ایک شخص بھی ایسا پیش نہیں کیا جو بیک وقت رسول بھی ہو اور ایک عظیم امت کا بانی بھی ہو اور بہترین حکومت کی بنیاد رکھنے والا بھی ہو۔ یہ تین خصوصیات جو جناب محمد (ﷺ) میں بیک وقت پائی جاتی ہیں ایک مضبوط اور قوی وحدت کی حیثیت رکھتی ہیں اور دین اسلام ہی وہ قوت ہے جو اس وحدت کو قائم رکھے گا جب تک تاریخ کا دھارا بہتا رہے گا۔ (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 175)

بعض عیسائی محققین نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے موقف اور قرآن و سنت میں ان کے احترام کی قدر کی ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر لسانیات لوئی پیری سیڈلو (Louis pierre - sedillot) لکھتا ہے: وقت آ گیا ہے کہ لوگوں کی نظریں اس امت کی تاریخ کی طرف اٹھیں جو پہلے ایشیا کے ایک کونے میں گمنام پڑی تھی لیکن پھر وہ انتہائی اعلیٰ مقام تک پہنچ گئی اور سات صدیوں تک دنیا کے آفاق کا جھومر بنی رہی۔ یہ معجزہ صادر کرنے والا صرف ایک شخص تھا جس کا نام نامی محمد (ﷺ) ہے۔

ایک عظیم خاتون (Lady E cobold) جو مسلمان ہوئی اور اس نے مدینہ منورہ کی زیارت کی، اپنے تاثرات یوں بیان کرتی ہے: ''عرب قوم جناب محمد ﷺ کی تشریف آوری سے قبل ایک بے وقعت قوم تھی۔ نہ اس کے قبائل کی کوئی اہمیت تھی نہ اس کی کوئی جمعیت تھی لیکن جب جناب محمد ﷺ تشریف لے آئے تو انھوں

نے اس امت کو ایک نئی شان کے ساتھ ابھارا جو ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ قوم سارے جہان پر غالب آئی اور عرصۂ دراز تک اس نے اس میں اپنا سکہ جمایا.....۔'' (الرسول في عيون غربية منصفة، ص: 147)

دورِ نبوی

سیرتِ نبوی کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دور کا باریک بینی کے ساتھ تعین کیا جائے جس میں آپ ﷺ نے زندگی گزاری۔ محققین کے نزدیک اس سے مراد مطالعاتی زمانہ ہوتا ہے، اگرچہ سیرت نبویہ کے علم کا تعلق اس زمانے کے ساتھ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے، اس لیے آپ کی پیدائش سے زیادہ پہلے والے زمانے کی تجدید و تعیین خاصی مشکل ہے کیونکہ اس کا تعلق مکہ مکرمہ میں قریش کی زندگی اور آپ ﷺ کے والدین کے ساتھ ہے۔

آپ ﷺ کی پیدائش عام الفیل سوموار کے دن ہوئی۔ اتنی بات تو حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے خود فرمایا: ''سوموار کا دن وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا'' (صحيح مسلم، حديث: 1162) بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش عام الفیل بارہ ربیع الاول کو ہوئی۔ عیسوی سال 571ء تھا۔ اگرچہ پیدائش سے لے کر وفات تک کے دور کی تعیین پوری باریکی کے ساتھ ہوسکتی ہے لیکن اسے ماقبل سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ (الحرف والصناعات في الحجاز في العصر النبوي، ص: 38، وعصر النبي لمحمد عزة دروزة) تاہم آپ کے دور کی انتہا متفق علیہ ہے کہ آپ ﷺ کی وفات 12 ربیع الاول سوموار کے دن چاشت کے وقت ہوئی۔ عیسوی تاریخ 8 جون 632ء تھی۔ (أزمنة التاريخ الإسلامي: 29/1)

اس دور کا بہترین حصہ دورِ ہجرت ہے جس نے آپ ﷺ کی زندگی کو دو اہم حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہجرت 1 ہجری میں ہوئی۔ عیسوی سال 622ء تھا۔ (أزمنة التاريخ الإسلامي: 344/1)

رسول کریم ﷺ کا وطن مبارک

مکہ مکرمہ نبیٔ کریم ﷺ کا مبارک وطن تھا۔ اسے ام القریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے۔ وہیں نبی بنے، وہیں پرورش پائی، پلے بڑھے اور وہیں شادی کی۔ اپنی زندگی کا بہت بڑا عرصہ وہیں گزارا اور کام کاج

کرتے رہے۔ اپنے بچوں کی پرورش کی اور دوست و ساتھی بنائے۔

مکہ مکرمہ وادی کے پیٹ میں واقع ہے جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہما السلام کو ٹھہرایا تھا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾

''اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد ایک بے زراعت وادی میں بسائی ہے، تیرے محترم گھر (کعبے) کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، لہٰذا تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہونے والے کردے اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔'' (إبراهيم 37:14)

عربوں کے علاقے میں سیدنا ابراہیم اور ان کے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہما السلام کے دور سے توحید کا پہلا وطن مکہ ہی تھا کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ اور مکہ والوں کے لیے دعا فرمائی تھی، نیز کعبہ بھی بنایا۔ ان کے بعد انبیاء اس حرمت والے گھر کا حج کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا ؕ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی ؕ وَ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَہۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّہٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾﴾

''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس (جگہ) کو امن والا شہر بنا اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے، انھیں پھلوں سے رزق دے۔ اللہ نے کہا: اور جس نے کفر کیا تو میں اسے تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر میں اسے آگ کے عذاب کی طرف مجبور کر دوں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔ اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (اور دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے رب ! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی اپنا فرماں بردار (بنا) اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے سکھا اور ہم پر توجہ فرما، بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ان لوگوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (البقرة 2:125-129)

باقی رہی مکہ مکرمہ کی جغرافیائی حالت تو وہ جزیرۂ عرب کے اکثر حصوں سے بالکل مختلف ہے کہ اسے ہر طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔

مکہ مکرمہ میں قریش اور ان کے حلیف رہتے تھے۔ قبیلۂ قریش شہری مزاج رکھتا تھا۔ پیشہ تجارت تھا، اس لیے عام طور پر سفر جاری رہتے تھے جس کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی ان کے عمدہ تعلقات تھے جبکہ عرب کے دوسرے شہروں اور قبائل کی یہ حالت نہ تھی۔ (دیکھیے: المكة والمدينة في الجاهلية وعهدالرسول) مکہ مکرمہ کعبہ کی وجہ سے بھی بہت مشہور تھا جسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

''اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (اور دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' (البقرة 127:2)

مکہ مکرمہ قریش کے مختلف قبائل اور خاندانوں کے درمیان احاطوں کی صورت میں تقسیم تھا جس سے ان کے گھروں اور اجتماع گاہوں کی تحدید وتعیین کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ان خاندانوں میں قبائلی ذمہ داریاں بھی تقسیم تھیں، مثلاً: سقایہ (زائرین کے خور ونوش کا انتظام)، رفادہ (دوسرے قبائل اور ملکوں کے ساتھ تعاون)، رایہ (میدانِ جنگ میں جھنڈا سنبھالنا) علاوہ ازیں مکہ آنے والے تاجروں پر ٹیکس نافذ تھا جسے عشور کہا جاتا تھا۔ مکہ مکرمہ اپنے **دارالندوہ** (تاريخ مكة للأزرقي، ص: 107-110، والمنمق في أخبار قريش ص: 87) کی بنا پر بھی معروف تھا۔ اس میں قریش کے صاحب بصیرت لوگ جمع ہوتے تھے جن کو ملأ (سردار) کہا جاتا تھا۔ یہ وہ سردار ہوتے تھے جو قریش کی قوت اور وحدت کے لیے تگ ودو کرتے تھے۔ مذہبی طور پر یہ اپنی جاہلیت پر جمے ہوئے تھے۔ اپنی گمراہیوں کا دفاع کرتے تھے، بتوں کی عبادت اور اس جیسے دوسرے کاموں کو اپنی آبائی وراثت سمجھتے ہوئے ان کی پابندی اور حفاظت کرتے تھے۔ ان گمراہیوں اور جہالت کی وجہ سے جھوٹی عصبیت کا شکار تھے جس کا حق کے ساتھ دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ ﴾

''وہ کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا تو ہم انھی کے پیچھے چل کر ہدایت حاصل کریں گے۔'' (الزخرف 22:43)

اس بنا پر ان کی سوچ کمزور، تقلیدی اور عقل سے خالی تھی۔ وہ چند مسائل پر تو بہت متشدد تھے مگر ضروری مسائل کی ان کو کوئی پروا نہ تھی۔ (سيرت ابن هشام: 78/1، وتفسير ابن كثير: 1679/2) وہ زنا کرتے تھے، شراب پیتے تھے، سود کھاتے تھے، گانے بجانے اور رقص کے رسیا تھے۔ غرض خواہش نفس کے تمام اسباب ان میں پائے جاتے تھے۔ شہوات کا ان پر غلبہ تھا۔ ان خرابیوں کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور حساب وکتاب کے قائل نہ تھے۔ (تفسير ابن كثير: 1699/2) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، لہٰذا تم ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (المآئدة 90:5)

یوں محسوس ہوتا تھا کہ شرک نے مکہ میں اپنے خیمے گاڑ رکھے ہیں۔ (سیرت ابن هشام: 78/1)

مصطفیٰ ﷺ کا نسب

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (شیبہ) بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لوَی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن ادد بن مقوم بن ناحور بن تیرح بن یعرب بن یشجب بن ثابت بن اسماعیل بن ابراہیم۔ (السیرة النبویه لابن کثیر: 183/1. امام بخاری رحمہ اللہ نے بعض آباء کو حذف کرتے ہوئے سلسلۂ نسب سیدنا عدنان تک پہنچایا ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔)

البتہ سیدنا عدنان کے بعد والا نسب بہت سے اہل علم کے نزدیک متنازعہ ہے لیکن یہ بات قطعی ہے کہ آپ کا نسب سیدنا اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ (زاد المعاد لابن القیم: 71/1)

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے خود فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور بنی اسماعیل میں سے کنانہ کو اور کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا، لہٰذا میں بہترین شخص ہوں، بہترین شخص کی نسل سے اور وہ آگے بہترین شخص کی نسل سے۔''

(صحیح مسلم، حدیث: 2276، والمستدرك للحاكم: 86/4، حدیث: 6996)

حبیب مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش

رسول اللہ ﷺ کے والد محترم سیدنا عبداللہ بن عبدالمطلب نے سیدہ آمنہ بنت وہب سے نکاح کیا۔ وہ آپ ﷺ کی والدہ تھیں لیکن انھیں تھوڑا عرصہ ہی بیوی کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ اس دوران انھیں جناب رسول اللہ ﷺ کا حمل ٹھہر گیا۔ انھوں نے چند ماہ ہی گزارے تھے کہ آپ کے والد عبداللہ حمل کی مدت

پوری ہونے سے قبل ہی انتقال کر گئے۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 99/1، وسیرت ابن ہشام: 158/1) اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق اس بچے کے مقدر میں مکہ کے علاقے میں پیدا ہونا لکھا تھا۔ آپ ﷺ کی والدہ محترمہ نے آپ کی پیدائش سے قبل خواب دیکھا جیسا کہ خود نبیٔ کریم ﷺ سے مذکور ہے: ''میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت بھی خاتم النبیین تھا جب آدم علیہ السلام ابھی اپنی پیدائش والی گُندھی ہوئی مٹی کی حالت میں تھے، میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری اور اپنی والدہ محترمہ کے خواب کا مصداق ہوں جو انھوں نے دیکھا تھا اور نبیوں کی مائیں اسی طرح خواب دیکھا کرتی تھیں۔'' (مسند أحمد: 127/4. (''نبیوں کی مائیں اسی طرح خواب دیکھا کرتی تھیں'' والے الفاظ صحیح نہیں ہیں۔)) کہا گیا ہے ''آپ کی والدہ محترمہ نے آپ ﷺ کی پیدائش کے وقت خواب دیکھا تھا کہ مجھ سے ایک نور نکلا جس سے علاقۂ شام کا شہر بصریٰ روشن ہوگیا۔'' (سیرت ابن ہشام: 158/1، وسیرت ابن کثیر: 206/1)

آپ ﷺ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، البتہ آپ ﷺ سے اتنا صحیح ثابت ہے کہ ''سوموار کا دن وہ دن ہے جس میں مَیں پیدا ہوا۔'' (صحیح مسلم، حدیث: 1162)

آپ ﷺ کی پیدائش کے دیگر حالات کی تعیین خاصی مشکل ہے کیونکہ آپ لوگوں کے نزدیک ایک عام یتیم بچے کی حیثیت سے پیدا ہوئے، اگرچہ آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک منتخب شدہ اور سب سے پسندیدہ انسان تھے۔ آخری نبی اور افضل ترین بندے تھے۔ کسی بھی مخلوق کو حمل یا پیدائش کے وقت اس بات کا علم نہ ہوا ور نہ انسانوں اور جنوں کے شیاطین آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کا راز پوشیدہ رکھا۔ کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں ہوئی حتی کہ خود آپ ﷺ کو بھی اس بات کا علم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنادیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف رہنمائی

کرتے ہیں۔‘‘(الشوریٰ 52:42)

ویسے علماء نے آپ ﷺ کی پیدائش کے دن کی تعیین کے سلسلے میں پوری کوشش کی ہے اور مختلف اقوال ذکر کیے ہیں۔ پیدائش کے سلسلے میں یہ اختلاف آپ ﷺ کی شان میں کسی کمی کا موجب نہیں۔ آپ ﷺ بلا شک وشبہ پوری نسل آدم کے سردار ہیں۔ کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے اس دن کی تاریخی تعیین فرمائی ہو۔

(سیرت ابن هشام: 158/1، وسیرت نبویه أزمحمد أبوشهبه: 183/1، وسیرت نبویه أز أبوالحسن ندوی، ص: 99)

باقی رہی آپ کی ولادت کی جگہ تو وہ شعب بنی ہاشم میں آپ کے چچا ابوطالب کا گھر تھا۔ یہ گھر دوصدیوں تک حرم کے پڑوس میں قائم رہا اور ایک سے دوسرے مالک کی طرف منتقل ہوتا رہا، حتیٰ کہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں اس کی والدہ خیزران حج کو آئی تو اس نے اس کے کچھ حصے کو مسجد بنا دیا۔ یہ گھر حرم سے قریب ہے اور اس کا محل وقوع اب تو مشہور ومعروف ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سعی کی جگہ سے متصل صحن کے مشرق میں مکتبہ مکۃ المکرّمہ قائم ہے۔ مکہ کے اہل علم اور باسیوں کے ہاں یہ چیز تواتر سے ثابت ہے۔

آپ ﷺ کی ولادت کے فوراً بعد آپ کو آپ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا۔ (الطبقات لابن سعد: 109/1، سیرت ابن کثیر: 223/1) اور آپ کے والد محترم کی لونڈی برکت حبشیہ نے آپ کی پرورش کی۔ اس کی کنیت ام ایمن تھی۔ رسول اللہ ﷺ پوری زندگی اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے۔ وہ مسلمان ہوئی، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور آپ ﷺ کی وفات کا سانحہ برداشت کیا۔

(سیرت ابن هشام: 109/1، سیرت ابن کثیر: 201/1، 209)

حبیب مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ کی والدہ محترمہ اور دیگر موجود عورتوں نے کیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے آپ ﷺ کے دادا محترم جناب عبدالمطلب کی خدمت میں یتیم پوتے کی پیدائش کی خوشخبری بھیجی۔ عبدالمطلب خوش خوش فوراً اپنے پیارے بیٹے عبداللہ کے گھر پہنچے اور پیارے بچے کو اپنے سینے سے لگایا۔ یقیناً انھیں اس وقت اپنے پوتے کی یتیمی اور اس کے والد عبداللہ کی وفات یاد آ گئی ہوگی۔ وہ آپ ﷺ کو اٹھا کر کعبہ میں لے گئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور آپ ﷺ کو محمد کے پیارے نام سے موسوم کیا۔ اس وقت عربوں میں یہ نام شاذ و نادر بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ (السیرة النبویة لابن کثیر: 224/1)

ایک دریتیم جسے اللہ نے سنبھالا

رسول اللہ ﷺ کی یتیمی پر بات کرنے سے قبل یہ ذہن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی یتیمی کے دوران آپ پر خصوصی توجہ مبذول رکھی اور عنایات فرمائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ ﴾

''کیا یہ حقیقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے یتیم پایا، پھر جگہ دی۔'' (الضحیٰ 6:93)

آپ کی والدہ محترمہ آمنہ بنت وہب آپ پر بہت شفقت کرتی تھیں اور انتہائی پیار کرتی تھیں کیونکہ آپ کی پیدائش اپنے والد محترم عبداللہ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ اب آپ کے دادا محترم جناب عبدالمطلب آپ کے والد کے قائم مقام تھے۔ وہ آپ کی پرورش بھی کرتے اور خبر گیری بھی۔ وہ اپنی پوری زندگی آپ پر انتہائی شفیق ومہربان رہے حتی کہ رسول اللہ ﷺ کی عمر آٹھ سال ہوگئی۔ اس دوران میں آپ بنوسعد میں بھی رضاعت کے لیے رہے، نیز اسی دوران میں آپ باپ کی طرف سے یتیمی کے ساتھ ماں کی طرف سے بھی یتیم ہوگئے کیونکہ آپ کی والدہ محترمہ آمنہ بنت وہب مدینہ منورہ کے سفر کے دوران واپس آتے ہوئے اَبواء کے مقام پر فوت ہوگئیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ اس وقت نبیٔ کریم ﷺ کی عمر مبارک چھ سال تھی۔ آپ کی لونڈی اور دایہ ام ایمن نے آپ ﷺ کو ساتھ لیا اور مکہ پہنچ کر آپ کے دادا جناب عبدالمطلب کے سپرد کر دیا۔ دادا محترم پہلے سے بڑھ کر آپ پر شفقت کرنے لگے اور آپ کا خیال رکھنے لگے۔ اس دوران آپ کی دایہ ام ایمن بھی مسلسل آپ ﷺ کی خدمت کرتی رہی اور آپ کو سنبھالتی رہی۔ اسے رسول اللہ ﷺ سے انتہا درجے کی محبت اور شفقت تھی اور رہی جس کا آپ ﷺ کو بھی اعتراف تھا۔ آپ ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی اس کے ساتھ بڑی صلہ رحمی سے پیش آتے رہے۔ (الإصابة لابن حجر: 432/4) بلکہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''میری اصل والدہ کے بعد یہی میری ماں ہے۔'' (السلسلة الضعيفة للألباني، حديث: 7059)

آپ ﷺ کی نوجوانی

اللہ کے رسول ﷺ اپنے دادا محترم کی نگرانی میں پرورش پانے لگے مگر جب آپ کی عمر آٹھ سال ہوئی تو دادا

بھی وفات پا گئے، تب آپ کے چچا ابوطالب نے اپنی نگرانی میں آپ کی پرورش شروع کر دی۔ آپ ﷺ نے اپنا باقی بچپن اور جوانی ان کے ہاں گزاری۔ ابوطالب کو آپ ﷺ سے بہت لگاؤ اور محبت تھی۔ مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شام کے ایک تجارتی سفر کے دوران وہ آپ ﷺ کو ساتھ بھی لے گئے تھے۔ (سیرت ابن هشام: 180/1، طبقات ابن سعد: 121/1، سیرت نبوي أز أبوالحسن ندوي، ص: 105) بعض راویوں نے اس سفر شام میں بحیرا راہب کا قصہ بھی بیان کیا ہے۔ بہت سے اہل علم نے اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، حالانکہ یہ روایات جامع ترمذی اور بعض دیگر کتب میں معتبر سندوں کے ساتھ منقول ہیں، البتہ علامہ ذہبی اور علامہ ابن قیم رحمہما اللہ اور بعض دیگر ہم عصر علمائے سیرت نے اس روایت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض مستشرق اہل علم نے اس روایت کو غنیمت سمجھتے ہوئے آپ ﷺ کی دعوت اسلام کو بحیرا راہب سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ آپ نے اپنی تعلیمات اور قرآنی آیات بحیرا راہب کی تعلیمات سے اخذ کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ عقل و قیاس کے سادہ اور معمولی اصولوں سے بھی جاہل ہیں۔ کیا ان کو یہ بھی شعور نہیں کہ آپ ﷺ اس وقت بچے تھے اور بالفرض یہ روایت اور سفر کا واقعہ صحیح بھی ہو تو آپ ﷺ کی عمر کا ایک بچہ ایک سرسری ملاقات میں کیا کچھ تعلیمات حاصل کر سکتا ہے، جبکہ یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ قرآن کریم تو آپ کی پوری زندگی میں واقعات اور ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا اترتا رہا ہے، حتیٰ کہ آپ کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی نازل ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ حق سے اندھے ہو چکے ہیں اور نبیٔ کریم ﷺ سے نفرت کی بنا پر ایسی روایت سے ایسا لایعنی استدلال کرتے ہیں جو کسی بھی علمی اصول سے مطابقت نہیں رکھتا، البتہ وہ اس سے اپنی دلی خواہش پوری کر لیتے ہیں۔ (دائرة المعارف الإسلامية: 398/3)

آپ ﷺ کو اس ذمہ داری کا بخوبی احساس تھا جو آپ کے بارے میں آپ کے چچا ابوطالب پر ڈالی جا چکی تھی، اس لیے آپ ﷺ پوری کوشش کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ان کے بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کرتے رہیں، اس لیے آپ چھوٹی عمر ہی میں بکریاں چرانے لگے۔ اس طرح آپ کو بکریاں چرانے کی جو اجرت ملتی تھی، اس سے اپنے چچا کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

«مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: كُنْتُ أَرْعَاهَا

عَلٰى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

''اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا اس نے بکریاں ضرور چرائیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا: اللہ کے رسول! کیا آپ نے بھی؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں میں بھی چند قیراط (قیراط دینار کے بیسویں حصے کو کہتے تھے: فتح الباری: 5/10 اور طبقات ابن سعد: 125/1) کے عوض مکہ والوں کی بکریاں چراتا تھا۔''

(صحيح البخاري، حديث: 2262)

اپنے ہاتھ سے کمائی کرنا عزت نفس، خودداری اور دوسرے لوگوں سے بے نیازی جیسے فوائد کا موجب ہے۔ نیز اس طرح آپ ان لوگوں کی مدد کر سکتے تھے جو آپ کے چچا کے ساتھ آپ کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ بڑے محنتی تھے۔ آپ صحابۂ کرام کو بھی کام، محنت، کمائی اور دوسروں کے مال سے بے نیازی کی تعلیم دیا کرتے تھے اور محنت و مشقت والی زندگی کی ترغیب دیتے تھے۔

جب سے آپ نے ہوش سنبھالا آپ بتوں سے نفرت کرتے تھے اور کبھی ان کے اڈوں پر نہیں گئے۔

اللہ تعالیٰ نے نبوت سے پہلے بھی آپ کو بچپن، جوانی اور مردانگی کے ادوار میں گناہوں اور برے کاموں سے بچا کر رکھا، مثلاً: آپ شراب کو ناپسند کرتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ مکہ میں عام تھی، پھر بھی کہیں مذکور نہیں کہ آپ نے شراب پی ہو۔ صداقت و امانت بچپن اور جوانی میں برابر آپ ﷺ کی صفات عالیہ رہیں۔ (سیرت نبویہ از ندوی، ص: 109، و سیرت ابن هشام: 188/1) آپ چھوٹی عمر کے باوجود انتہائی شفیق اور مہربان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منتخب فرمایا، آپ کی حفاظت کی۔ نبوت سے قبل اور بعد آپ کی نگرانی کی۔ (سیرت ابن هشام: 183/1) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا نتیجہ تھا جو سیدنا محمد ﷺ کے علاوہ کسی کو حاصل نہ ہوئی اور ربانی تربیت اور تادیب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾

''اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔'' (الأنعام 124:6)

آپ ﷺ کی جوانی

جب آپ ﷺ جوان ہوئے اور مردانگی کی حد میں داخل ہوئے تو آپ مکہ کے تمام لوگوں کے نزدیک قابل اعتماد اور محترم تھے۔ بلاشبہ مکہ مکرمہ میں کوئی شخص آپ سے بڑھ کر سچا اور امانت دار نہ تھا، حتیٰ کہ آپ کا لقب

صادق اور امین پڑ گیا۔ (سیرت ابن هشام: 183/1) آپ ﷺ اپنی صلہ رحمی اور شفقت کی وجہ سے مشہور تھے۔ فقراء اور حاجتمند لوگوں پر تو انتہائی شفیق تھے۔ ہم سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زبان میں آپ کی اہم صفات یوں بیان کر سکتے ہیں کیونکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بڑے قریب سے دیکھا تھا:

«كَلَّا، وَاللهِ! مَا يَحْزُنُكَ اللهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ»

''اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رنجیدہ نہیں کرے گا کیونکہ آپ رشتے جوڑتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور ناگہانی آفات میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔'' (صحيح البخاري، حديث: 2)

آپ ﷺ انسانیت اور رحمت کے تمام اعلیٰ اوصاف و فضائل سے متصف تھے۔ سب لوگوں سے زیادہ پاکیزہ، نیک، عادل اور بااخلاق تھے۔ آپ ﷺ اپنی نوجوانی اور جوانی ہی سے، اپنی بعثت سے قبل بھی اور بعد بھی عادل اور انصاف پسند تھے۔ کسی بھی شخص پر ظلم کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے آپ اپنی عمر کے بیس سال پورے ہونے پر قریش کے بعض افراد کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہوئے جو ''حلف الفضول'' کے نام سے معروف ہوا۔ یہ معاہدہ مکہ کے ایک بڑے سردار عبداللہ بن جدعان کے گھر میں منعقد ہوا جس کی اہم شق یہ تھی کہ ہم ظالم کے خلاف مظلوم کے حق میں یکجان بنیں گے حتی کہ ظالم مظلوم کا حق ادا کر دے۔

(طبقات ابن سعد، ص: 128)

آپ ﷺ کے دوست بھی ممتاز اشخاص تھے جو اپنے صدق اور اعلیٰ اخلاق کی بنا پر معروف و مشہور تھے۔ ان میں سے معروف ترین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جو تقریباً رسول اللہ ﷺ کے ہم عمر تھے۔ قریش میں محترم تھے۔ (سیرت ابن هشام: 250/1) ان کے علاوہ اور بھی آپ ﷺ کے قابل اعتماد دوست تھے جن کی تعریف خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ کی امانت و دیانت ہر شخص کی نظر میں تھی۔ قریش میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اپنا مال تجارت کے لیے کسی کو دینے کے خواہشمند تھے کہ ایسا کوئی شخص مل جائے جو معین مزدوری لے کر ان کے مال

میں تجارت کرے۔ سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا قریش کے مالدار لوگوں میں شامل تھیں۔ وہ ہر شخص کو اپنا مال تجارت نہیں دیتی تھیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اس کے خواہشمند تھے بلکہ وہ پوری تحقیق وجستجو کرتی تھیں کہ کون شخص دیانت داری کے ساتھ میرے مال میں تجارت کرسکتا ہے؟ لہٰذا انھیں لوگوں کی امانت و دیانت کا خاصا تجربہ تھا۔ جب انھیں آپ ﷺ کے صدق و امانت کا پتہ چلا تو انھوں نے خواہش کی کہ آپ ﷺ کو منافع میں حصہ مقرر کر کے مالِ تجارت سپرد کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ ان کا مال لے کر مکہ کے اردگرد عرب علاقے کی بہت سی تجارتی منڈیوں میں گئے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آزاد کردہ غلام میسرہ سے آپ ﷺ کے صدق و امانت اور تجربہ و ذہانت کے بارے میں بہت سی باتیں پہنچیں کیونکہ آپ ﷺ لین دین میں بڑے نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ دوسروں کے حقوق کا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے ان اخلاق عالیہ سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا بہت متاثر ہوئیں کہ آپ ﷺ صدق وامانت کے ساتھ ساتھ ادب اور اخلاق کو مال پر ترجیح دیتے ہیں۔ خصوصاً اس بنا پر بھی کہ آپ ﷺ کے صدق و امانت، نیز آپ کی برکت سے مالِ تجارت میں منافع بھی خوب ہوا۔

کوئی شک نہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کے سفرِ تجارت، عرب منڈیوں میں آپ کی رسائی، لوگوں اور عرب کے بلند مرتبہ سرداروں سے آپ کی ملاقات اور میل جول نے آپ ﷺ کے تجربے میں بہت اضافہ کر دیا۔ یوں آپ کو لوگوں، قبائل اور شہروں کی خوب معرفت حاصل ہوئی۔ (سیرت ابن هشام: 187/1، وطبقات ابن سعد: 131/1)

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی

خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب سردار، معزز، عقل مند اور دانا خاتون تھیں۔ ان کے والد خویلد بن اسد مکہ کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ جنگ فجار میں مارے گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نکاح سے قبل بھی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا شادی شدہ تھیں، پھر بیوہ ہوگئیں۔ وہ بہت مالدار اور نیک خاتون تھیں۔ مکہ کے مالدار ترین افراد میں شمار ہوتی تھیں۔ تاجر حضرات کو اپنا مال تجارت بطور مضاربت دیتی تھیں۔ انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ سے براہِ راست بھی بات چیت کی اور آپ ﷺ کی باتیں بھی سنیں۔ انھوں نے

آپ ﷺ کو بلند اخلاق اور اعلیٰ فطرت پایا۔ انھیں آپ کی خصلتیں بہت اچھی لگیں، لہٰذا وہ آپ ﷺ سے محبت کرنی لگیں۔ وہ اپنی قوم کے ہاں طاہرہ اور عفیفہ کے لقب سے معروف تھیں۔ (طبقات ابن سعد: 130/1، تاریخ دمشق از ابن عساکر، ص: 109، وسیرت ابن کثیر: 263/1) اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ قریش کے بڑے بڑے سردار ان سے نکاح کے خواہشمند تھے لیکن وہ بڑے ادب کے ساتھ ان کو جواب دے چکی تھیں۔ (صحیح السیرة لمحمد طرهونی، ص: 167) انھیں علم تھا کہ اکثر لوگ اپنے مادی فوائد کی خاطر پیغام بھیج رہے ہیں کیونکہ وہ مالدار تھیں، لہٰذا ہر شخص ان سے نکاح کی خواہش رکھتا تھا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے مالِ تجارت میں کاروبار کیا تو اس دوران میں انھیں پتہ چل گیا کہ آپ ﷺ مال کے سلسلے میں انتہائی بے نیاز ہیں۔ ساتھ ساتھ آپ ﷺ عفیف، پاکباز اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہیں، لہٰذا انھوں نے خود آپ کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ (سیرت ابن هشام: 189/1، وطبقات ابن سعد: 131/1) کوئی شک نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبیٔ کریم کے لیے خیر تیار کر رکھی تھی اور آپ کے لیے اس نیک خاتون کو منتخب فرما لیا تھا جس نے آپ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ انھوں نے پورے ادب واحترام کے ساتھ آپ کی خدمت میں اپنی ایک سہیلی بھیجی جو آپ سے اس بارے میں تمہیدی بات چیت کرے اور آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ اس نے آپ سے ابتدائی بات چیت کی اور بتایا کہ خدیجہ آپ کے ساتھ نکاح کرنے میں رغبت رکھتی ہے۔ اگرچہ وہ نسبت کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ اور معزز ہے لیکن اس کی آپ کی طرف رغبت آپ کے حسن اخلاق اور صدق و دیانت کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سہیلی نفسیہ بنت منیہ تھی۔ جس نے نبی ﷺ سے کچھ یوں بات کی: ''آپ شادی کیوں نہیں کر رہے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرے پاس اتنا مال نہیں جس کے ساتھ میں شادی کر سکوں۔'' وہ کہنے لگی: ''اگر آپ کو مال کی ضرورت ہی نہ رہے اور ایسی عورت مل جائے جو جمال، شرف اور مال والی بھی ہو اور آپ کے ہم پلہ بھی، تب بھی آپ قبول نہ کریں گے؟'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' وہ کہنے لگی: ''خدیجہ۔'' آپ فرمانے لگے: ''وہ مجھے کیسے مل سکتی ہے؟'' نفیسہ کہنے لگی: ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' (طبقات ابن سعد: 132/1) لہٰذا آپ نے بھی اس پاکدامن اور بلند مرتبہ خاتون سے نکاح کی رغبت ظاہر فرما دی جس طرح اس معزز خاتون

نے ظاہر کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے منتخب اور پسند فرمایا تھا۔

آپ ﷺ نے فوراً یہ بات اپنے چچا حضرات تک پہنچا دی، لہٰذا آپ کے ساتھ آپ کے دو چچا حمزہ اور ابوطالب، نیز قریش کے چند دیگر معززین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا عمرو بن اسد کے پاس گئے اور ان سے آپ ﷺ کے لیے خدیجہ کا رشتہ مانگ لیا۔ اس طرح سیدنا محمد ﷺ کا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں لکھا ہوا تھا کہ وہ ام المومنین بنیں اور رسول اللہ ﷺ کی محبوب بیوی، نیز آپ کے بیٹوں اور بیٹیوں کی ماں بھی بنیں۔ غرض دنیا میں بھی آپ ﷺ کی بیوی اور آخرت میں آپ ﷺ کی بیوی بنیں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

محمد مصطفیٰ ﷺ کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ آپ نے ان کے ساتھ تقریباً چوبیس سال بسر فرمائے اور آپ کے تمام عالی مرتبت فرزندانِ گرامی اور دخترانِ نیک اختر، سوائے ابراہیم کے، انھی سے پیدا ہوئے۔ جب وہ فوت ہوئیں تو ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔

اس شادی نے رسول اللہ ﷺ کو ذاتی راحت سے مالا مال کیا اور انتہائی سمجھدار، صاحب تمیز اور صاحبِ مرتبہ ساتھی اور سہارا مہیا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ ﷺ کے لیے اور آپ ﷺ کو ان کے لیے نبوت سے پہلے ہی منتخب فرمایا۔ جب رسول اللہ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے اپنی عقل و محبت کو استعمال کرتے ہوئے بہترین رویہ اختیار کیا اور آپ کو حوصلہ دیا۔ پہلے تو انھوں نے آپ کے اخلاق و صفات کی تعریف کی، پھر بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر رحمت نازل فرمایا کرتا ہے، انھیں رسوا نہیں کیا کرتا۔ اس طرح انھوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھا اور پھر اس دور کے سب سے بڑے صاحب علم، یعنی جناب ورقہ بن نوفل سے آپ کا رابطہ کروایا جنھوں نے بہترین الفاظ میں آپ کا حوصلہ بڑھایا۔ یہ سب کچھ اسی مبارک شادی کا نتیجہ تھا۔

تعمیرِ کعبہ کا واقعہ

بعثت نبوی سے تقریباً پانچ سال قبل کعبہ کے ساتھ دو حادثات پیش آئے جن کے نتیجے میں کعبہ کی عمارت

پھٹ گئی۔ پہلا حادثہ یہ کہ قریش کعبہ کو چمڑے اور اونی کپڑے کے ساتھ ڈھانپ کر رکھتے تھے، یعنی ان کو آپس میں جوڑ کر پردوں کی شکل دی جاتی اور وہ کعبہ پر لٹکا دیے جاتے تھے۔ نیز ان کی عادت تھی کہ کعبہ میں خوشبو کی انگیٹھیاں سلگائی جاتی تھیں۔ انگیٹھی سلگاتے وقت کعبہ کے پردوں پر کوئی انگارا جا گرا جس سے کعبہ کو آگ لگ گئی جس سے کعبہ کی عمارت پھٹ گئی۔ دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ بارشوں کی وجہ سے سیلاب آ گیا جس سے کعبہ میں دراڑیں پڑ گئیں اور بعض کنارے منہدم ہو گئے، لہٰذا قریش نے فیصلہ کیا کہ کعبہ کی پوری عمارت نئے سرے سے بنائی جائے۔ (أخبارِ مكه أز أزرقي: 160/1)

ان دنوں مکہ مکرمہ میں عمارت بنانے کا طریقہ سادہ تھا، یعنی پتھر اور مٹی سے دیواریں بنائی جاتیں اور سادہ لکڑی کی چھت ڈال دی جاتی۔ اتفاقاً انھی دنوں روم کے علاقے سے ایک بحری جہاز حبشہ کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ مکہ کے مغرب میں واقع بندرگاہ شعیبہ (یہ بحیرہ احمر کے کنارے مکہ مکرمہ کے مقابل ایک بندرگاہ ہے جو آج بھی اسی نام سے معروف ہے۔) کے برابر پہنچا تو ٹوٹ گیا۔ وہ جہاز لکڑی سے لدا ہوا تھا۔ لکڑی کے ساتھ ایک ماہر بڑھئی بھی تھا جس کا نام باقوم تھا۔ قریش کو پتہ چلا تو وہ آئے اور لکڑی خرید لی، نیز انھوں نے اس قبطی بڑھئی سے کہا کہ وہ کعبہ کی چھت ڈال دے، پھر قریش نے کعبہ کی باقی ماندہ عمارت بھی ڈھا دی تاکہ اسے نئے سرے سے تعمیر کر دیا جائے۔ (أخبارِ مكه أز أزرقي: 157/1، وسبل الهدىٰ والرشاد: 228/2) عمارت گراتے گراتے وہ کعبہ کی اصل بنیاد تک پہنچ گئے جس کی انھیں پہچان تھی تاکہ کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ (طبقاتِ ابن سعد: 145/1)

قریش نے کعبہ کی نئی عمارت پر صرف حلال مال خرچ کیا اور قبطی بڑھئی باقوم کی خدمات حاصل کیں۔ قریش کے قبائل نے کعبہ کے کونوں اور دیواروں کو آپس میں تقسیم کر لیا اور ہر قبیلے نے اپنے حصے کا کعبہ بنانے کی ذمہ داری لے لی کیونکہ کعبہ کی تعمیر کو وہ اپنے لیے شرف وفخر سمجھتے تھے، اس لیے ہر خاندان کی کوشش تھی کہ کوئی ایک قبیلہ ہی یہ شرف وسعادت حاصل نہ کرے کہ دوسرے محروم رہ جائیں۔ (سيرت ابن هشام: 195/2)

جب انھوں نے عمارت مکمل کر لی تو حجر اسود کو اس کی معین جگہ میں رکھنے کے بارے میں اختلاف ہو گیا کیونکہ قریش کا ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ میں حجر اسود کو اس کی جگہ میں رکھنے کا شرف حاصل کروں۔ اختلاف اس قدر بڑھا کہ باہمی لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ (سيرت ابن هشام: 197/1) پھر اتفاق ہو گیا کہ اس شخص سے فیصلہ کروا لیا

جائے جو سب سے پہلے (باب بنو شیبہ سے) حرم میں داخل ہو۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ باب بنو شیبہ سے سب سے پہلے داخل ہونے والے محمد مصطفیٰ ﷺ ہی تھے۔ جب انھوں نے آپ کو دیکھا تو پکار اٹھے: ''یہ ہیں امین۔ یہ ہیں محمد۔ ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں۔'' یہ ایک معتبر اور براہ راست گواہی ہے جو آپ کی قوم نے آپ کے حق میں دی حتی کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے بعد میں آپ سے دشمنی کا مظاہرہ کیا۔

(سیرت ابن هشام: 197/1)

آپ ﷺ نے فوراً اپنی چادر اتاری اور حجر اسود کو اٹھا کر اس میں رکھ دیا، پھر ہر قبیلے سے کہا کہ اس چادر کا کوئی نہ کوئی کونہ یا کنارا پکڑ لیں اور اسے اٹھائیں۔ انھوں نے ایسے ہی کیا، حتی کہ جب حجر اسود اپنی مقررہ جگہ کے برابر پہنچ گیا تو آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھا کر اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ سب لوگ اس تدبیر سے راضی اور خوش ہو گئے۔ (سیرت ابن هشام: 197/1، ومسند إمام أحمد: 425/3)

مؤرخین نے تقریباً یقین کے ساتھ کہا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر، جب کعبہ دوبارہ بنایا گیا، پینتیس سال تھی۔ (البداية والنهاية لابن كثير: 324/2، والسيرة النبوية للذهبي، ص: 77)

بعثت سے قبل علاماتِ نبوت

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیٔ کریم ﷺ کو منتخب فرمایا، ادب سکھایا، تربیت فرمائی اور تعلیم دی۔ نبوت بلکہ پیدائش سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اس کا اہتمام کیا۔ (السيرة النبوية للندوي، ص: 109، و السيرة النبوية لمحمد علي صلابي: 76/1) مگر کسی بھی انسان کو اس کا پتہ نہیں چلا۔ اس کی حکمت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے حالانکہ پوری انسانیت اور خصوصاً آسمانی دینوں کے حاملین آخری نبی کے انتظار میں تھے۔ بعثت سے کچھ عرصہ قبل اللہ کے رسول ﷺ میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نبی بننے والے ہیں، مثلاً: آپ نے بعض ایسی عبادات شروع کر دیں جن میں اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل ہوتا ہے اور کائنات میں مزید سوچ بچار کا موقع ملتا ہے۔ اسی عرصے میں سچے خوابوں کا آغاز ہوا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں کی صورت میں ہوئی۔ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے، وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہو جاتا۔ (صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 3)

اللہ کے رسول ﷺ مکہ کی گھاٹیوں اور وادیوں میں نکل جاتے اور گھنٹوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے اور اللہ کا ذکر کرتے رہتے، نیز ابراہیمی دین کے مطابق عبادت کرتے۔ (سيرت ابن هشام: 234/1) اگرچہ وحی سے قبل رسول اللہ ﷺ کی خاصی عمر گزر چکی تھی مگر آپ نے کبھی وحی کے بارے میں نہ سوچا تھا نہ خواہش ہی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

”کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں اس (قرآن) کی تم پر تلاوت نہ کرتا اور نہ وہ (اللہ) تمھیں اس کی خبر

دیتا، پس یقیناً میں اس (دعوائے نبوت) سے پہلے تمھارے اندر ایک مدت ٹھہر چکا ہوں تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟'' (یونس 16:10)

پھر آپ ﷺ میں علیحدہ رہنے کا شوق پیدا ہو گیا کیونکہ آپ تو ابراہیمی دین کے مطابق موحد تھے اور قریش کے کاموں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور اس کی کائنات میں غور کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے غارِ حرا کو منتخب فرمایا۔ (سیرت ابن هشام: 234/1) یہ غار حراء پہاڑ میں تھا جو مکہ سے مشرقی جانب ہے۔ آج کل اسے جبل نور کہا جاتا ہے اور جو شخص سیل الکبیر کے راستے سے طائف کو جائے اس کے بائیں ہاتھ پڑتا ہے۔ آپ وہاں روزہ رکھتے اور علیحدہ کئی کئی دن اور رات بیٹھے رہتے۔ آپ کا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا تھا۔ یہ بات آپ کے دل میں پیدا ہوئی تھی ورنہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ یہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ایک فطری طریقہ تھا جسے آپ نے بھی اختیار فرمایا۔ بعض روایات کی رو سے آپ ہر سال ایک ماہ وہاں گزارتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، وہ فرماتی ہیں: ''پھر آپ ﷺ کے دل میں علیحدہ رہنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ آپ کئی کئی راتیں غارِ حراء میں اکیلے عبادت کرتے گزار دیتے تھے، پھر گھر واپس آتے اور کھانے پینے کا مزید سامان لے کر چلے جاتے۔ حتیٰ کہ اچانک آپ پر وحی اترنے لگی۔ اُس وقت بھی آپ غارِ حرا ہی میں تھے۔''

(صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴾

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔'' (الشوریٰ 52:42)

بعثت سے قبل بھی رمضان المبارک کا مہینہ آپ کو تنہائی اور روزوں کے حوالے سے بے حد پسند تھا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تنہائی کے دوران میں آپ سے دُور رہنے پر کامل صبر کرتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ یہ نیک شخص ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی خیر حاصل ہوگی، اس لیے وہ نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمدردی رکھتی تھیں بلکہ آپ کی حوصلہ افزائی بھی کرتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا اعتکاف پورا کر لیتے تو مکہ لوٹ آتے اور سب سے پہلے حرم آتے اور بتوں سے دور رہتے ہوئے کعبہ کے اِردگرد طواف فرماتے۔ (سیرت ابن هشام: 235/1)

غارِ حرا اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے آپ کو کھلی فضا، زمین کو اوپر سے جھانکنے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق کی معرفت کا کھلا موقع فراہم کرتا تھا۔ (السيرة النبوية لمحمد أبي شهبه، ص: 256)

آپ ہوش سنبھالتے ہی سخی اور فیاض تھے لیکن جب آپ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کی سخاوت، عطیات اور محتاج لوگوں کی مدد کرنے میں بہت اضافہ ہو گیا، حتیٰ کہ یہ آپ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی اور طُرَّۂ امتیاز بھی۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی آپ پر وحی کے نزول کے وقت اس صفت کا خصوصی ذکر کیا تھا۔ ہوسکتا ہے رمضان المبارک کے مہینے میں نزولِ وحی سے قبل بھی صدقات میں کثرت آجاتی ہو جس طرح آپ اپنی بعثت کے بعد رمضان المبارک کے دوران انتہائی سخاوت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ (صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 3)

بعثت اور انتخاب

وحی کیا ہے؟

وحی کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی یا رسول کو کوئی شریعت یا کتاب خفیہ طریقے سے پہنچا دے۔ (مباحث في علوم القرآن از صُبْحي صالح، ص: 23) خواہ کسی واسطے کے ساتھ یا براہ راست، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کو جو پہنچتا ہے اسے وحی کہا جاتا ہے۔ وحی کے لغوی معنی خفیہ طریقے سے تیزی کے ساتھ اطلاع دینا ہے۔(المدخل لدراسة القرآن الكريم لأبي شهبه، ص: 73، و السيرة النبوية لأبي شهبه: 267/1)

نزولِ وحی

وحی کے نازل ہونے سے قبل نبیٔ کریم ﷺ نے کبھی اس کا تذکرہ تک نہ کیا تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے نہ تو کوئی بات اپنی طرف سے گھڑی نہ آپ نے سابقہ انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کسی سے سیکھی اور نہ نبوت سے قبل اس کی طرف کوئی اشارہ تک کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۙ﴾

''آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔'' (الشوریٰ 52:42)

رمضان المبارک میں جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال تک پہنچ چکی تھی، مکہ مکرمہ کے جبلِ نور میں واقع

غارِ حرا میں آپ پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں۔'' (البقرة 185:2)

مزید فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔'' (القدر 1:97)

نیز فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾

''بلاشبہ ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا، بے شک ہم ڈرانے والے ہیں۔'' (الدخان 3:44)

لہٰذا اس مبارک رات اللہ کے رسول ﷺ کی طرف وحی آئی جس کی وضاحت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی مشہور حدیث میں فرمائی ہے۔ یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ وہ اپنی خالہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں: ''اللہ کے رسول ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے اور نیک خوابوں سے ہوئی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ بعینہٖ صبح کی روشنی کی طرح واضح پیش آجاتا، پھر آپ کو تنہا رہنے کا شوق ہو گیا۔ آپ کئی کئی راتیں غارِ حرا میں تنہا گزارتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ آپ اتنے دن کے لیے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے تھے، پھر واپس سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف لوٹ آتے اور اتنا ہی سامان لے کر پھر چلے جاتے، حتیٰ کہ آپ غارِ حرا میں تھے کہ آپ کے پاس ''حق'' آ گیا۔ فرشتہ آپ کے پاس آ کر کہنے لگا: ''پڑھو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں لکھنے پڑھنے والا شخص نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب فرشتے نے مجھے پکڑ کر زور سے بھینچا حتیٰ کہ مجھے انتہا درجے کی تکلیف ہوئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہنے لگا: ''پڑھو۔'' میں نے پھر کہا: ''میں پڑھا ہوا نہیں۔'' اس نے پھر مجھے پکڑ کر اس زور سے بھینچا کہ مجھے شدید تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ کر کہنے لگا: ''اب پڑھو۔'' میں نے تب بھی یہی کہا: ''میں پڑھا لکھا شخص نہیں ہوں۔'' اس نے پھر مجھے پکڑ کر دبایا، پھر چھوڑ دیا اور کہنے لگا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ ''پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے سب کو پیدا کیا۔'' (العلق 1:96، صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 3)

تب رسول اللہ ﷺ یہ آیات لے کر واپس چلے۔ آپ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آپ سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمانے لگے: ''مجھے چادر اڑھا دو۔ مجھے چادر اڑھا دو۔'' گھر والوں نے آپ کو چادر اڑھا دی حتیٰ کہ آپ کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ تب آپ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وہ سب کچھ بتا دیا جو دیکھا اور سنا تھا، پھر فرمانے لگے: ''مجھے تو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔'' وہ کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ رشتے جوڑتے ہیں، بے کسوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں کو کما کر دیتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور ناگہانی آفات پر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔'' پھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو لے کر چلیں اور ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے ہاں جا پہنچیں۔ ورقہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے اور دورِ جاہلیت میں عیسائی بن گئے تھے۔ وہ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے، اس لیے وہ انجیل کو عبرانی زبان میں جس قدر چاہتے، لکھتے تھے۔ وہ انتہائی بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ان سے کہنے لگیں: ''چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنیے۔'' ورقہ کہنے لگے: ''بھتیجے! تُو کیا دیکھتا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے جو دیکھا تھا، انھیں بتلا دیا۔'' ورقہ کہنے لگے: ''یہ تو وہی عظیم فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔ کاش! میں اُس وقت جوان اور قوی ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں، جو شخص بھی آپ جیسی چیز لے کر آیا اُس سے دشمنی کی گئی۔ اور اگر وہ دن میری زندگی میں آ گیا تو میں آپ کی پُرزور اور مضبوط مدد کروں گا۔'' لیکن ورقہ تھوڑے عرصے بعد فوت ہو گئے اور وحی بھی وقتی طور پر رُک گئی۔ (المغازی لابن أبي شيبة، ص: 103)

حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان دنوں ایک دفعہ میں چل رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ میں نے اپنی نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا اب آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اس سے مرعوب ہو کر گھر لوٹ آیا اور میں نے کہا: ''مجھے چادر اڑھا دو۔ مجھے چادر اڑھا دو۔'' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ ﴾ ''لحاف میں لپٹنے والے!''

(المدثر 74:1، و تفسير ابن كثير: 1934/1)

رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی یہ اور دیگر آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لیے رحمت ہیں

جو انسانیت کے لیے علمِ الٰہی کا دروازہ کھولتی ہیں کیونکہ ''ہر قسم کی قراءت تیرے رب کے نام سے ہے اور رب کی طرف سے ہے۔ وہی تجھے اور دیگر مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔'' وحی الٰہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے آئی ہے۔ یہ نبیٔ کریم ﷺ نے خود نہیں بنائی۔ یہ وہی وحی ہے جو آپ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ وَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۝ ﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داود کو زبور عطا کی۔'' (النساء 163:4)

اس کے بعد قرآن مجید مسلسل نازل ہونے لگا، نیز وحی، اس کی اقسام اور اس کی حالتیں واضح ہوتی چلی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ ﴾

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔''

(الشوریٰ 52:42)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلۡ لَّوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوۡتُهٗ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَدۡرٰٮكُمۡ بِهٖ ۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ ﴾

''کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں اس (قرآن) کی تم پر تلاوت نہ کرتا اور نہ وہ (اللہ) تمھیں اس کی خبر دیتا، پس یقیناً میں اس (دعوائے نبوت) سے پہلے تمھارے اندر ایک مدت ٹھہر چکا ہوں تو کیا تم عقل

نہیں رکھتے؟'' (یونس 16:10)

مزید فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾

''اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے۔'' (العنکبوت 48:29)

ایک اور مقام پر ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝﴾

''اور بے شک آپ کا رب، یقیناً وہی نہایت غالب، بہت رحم کرنے والا ہے۔ اور بلاشبہ یہ (قرآن) یقیناً رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ روح الامین (جبریل) اسے لے کر نازل ہوا۔ آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔'' (الشعرآء 191:26-194)

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾

''اور (اے نبی!) بلاشبہ یقیناً آپ کو تو ایک کمال حکمت والے، خوب جاننے والے کی طرف سے یہ قرآن سکھایا جاتا ہے۔'' (النمل 6:27)

مزید فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''بے شک یہ (قرآن) یقیناً رسولِ کریم (جبریل) کا قول ہے۔ جو بڑی قوت والا، عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ وہاں (آسمانوں میں) اس کی اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔ اور (اے اہلِ مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد ﷺ) دیوانہ نہیں۔ اور بلاشبہ یقیناً یہ (نبی) تو اس (جبریل) کو روشن کنارے پر

دیکھ چکا ہے۔ اور وہ غیب (کی باتوں) پر بخیل نہیں ہے۔ اور یہ (قرآن) کسی مردود شیطان کا قول نہیں، پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔'' (التکویر 81:19-27)

مزید فرمایا:

﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝﴾

''اور شیاطین اس (قرآن) کو لے کر نازل نہیں ہوئے۔ اور نہ یہ ان کے لائق ہے اور نہ وہ یہ کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ تو اس کے سننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں۔'' (الشعرآء 26:210-212)

نیز فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾

''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔'' (النجم 53:3، 4)

وحی کی ابتدا میں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے سیکھنے اور حفظ کرنے کا بہت شوق تھا بلکہ ساری زندگی میں ایسا ہی رہا جس کی بنا پر آپ وحی کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝﴾

''(اے نبی!) آپ اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ یقیناً اس کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور (آپ کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے، پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔'' (القیامة 75:16-18)

مزید فرمایا:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝﴾

''پس حقیقی وسچا بادشاہ اللہ بہت بلند و بالا ہے اور (اے نبی!) آپ قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کریں اس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری کی جائے اور کہیے: اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔'' (طٰہٰ 20:114)

دعوت کی ابتدا

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کے نازل ہونے سے واضح طور پر پتہ چل گیا کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور لوگوں کو ڈرانے کا حکم دے دیا گیا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ﴾

''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور ڈرایئے۔ اور اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کیجیے۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھیے۔ اور ناپاکی چھوڑ دیجیے۔ اور زیادہ حاصل کرنے کے لیے احسان نہ کیجیے۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کیجیے۔'' (المدثر 74:1-7)

یقیناً آپ کو رسالت و دعوت کا حکم دیا گیا، نیز اس سلسلے میں ضروری کوشش، محنت، صبر اور طہارت کی تلقین کی گئی۔ لوگوں کو ڈرانے، انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے، توحید پر کاربند رہنے، شرک سے پاک رہنے، صفائی اور پاکیزگی پر کاربند رہتے ہوئے اس ذمہ داری کے لیے تیار رہنے، شر سے دور رہنے اور لوگوں کا بھلا چاہنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر ڈٹ جانے کا یہی مطلب ہے۔

ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے مسلمان ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں۔ (سیرت ابن هشام: 240/1، و سیرت ابن کثیر: 426/1) یہ کام ان سے پہلے نہ کسی مذکر نے کیا نہ مؤنث نے۔ اسی طرح وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سب سے پہلے نماز پڑھنے والی خاتون ہیں۔ (سیرت ابن هشام: 244/1، نیز السیرة النبویة للصلابي: 126/1) اسی طرح آپ ﷺ کی بیٹیوں نے بھی فوراً اسلام قبول کر لیا، خصوصاً جو بڑی تھیں۔ انھوں نے بھی اپنی والدہ کی اقتدا کی اور اپنے والد کی تصدیق کی۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ بیٹیوں کو دعوت دینے

میں بھی والدہ کا اہم کردار تھا۔ بعض علماء نے صراحتاً کہا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ان کی بیٹیاں فوراً مسلمان ہوگئیں۔'' (السيرة لمحمد أبي شهبه: 284/1)

خانوادۂ نبوت میں سیدنا علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے کیونکہ وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے زیر کفالت تھے تاکہ اُن کے والد محترم پر اخراجات کا زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اس دولت کے ساتھ سرفراز فرما دیا۔ انھوں نے بھی فوراً نبی ﷺ کی دعوت کو تسلیم کر لیا۔ اُس وقت ان کی عمر دس سال سے بھی کچھ کم تھی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 130، والسيرة النبوية لمحمد أبي شهبه: 284/1، والسيرة النبوية از صلابي: 137/1)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خاندانِ نبوت میں رہنا ان کے اس شرف کا سبب بن گیا کہ انھوں نے بعثت سے قبل بھی آپ ﷺ کے ساتھ زندگی گزارنے کی سعادت حاصل کی۔ اس طرح ان کو آپ ﷺ کے ایسے معاملات کا بھی علم ہو گیا جو کسی اور نے نہیں دیکھے تھے۔ یہاں ایک اور شخص بھی ہے جسے نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ رہنے اور آپ کے حسن سلوک کا شرف حاصل ہوا اور وہ ہیں آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جنھوں نے اپنے گھر واپس جانے کی بجائے آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے اپنے گھر والوں کو، جب وہ انھیں لینے آئے اور ان کی قیمت ادا کرنے کی پیش کش کی، صاف کہہ دیا تھا: ''میں نے آپ ﷺ سے ایسی چیزیں دیکھی ہیں جو مجھے آپ کا ساتھ چھوڑنے نہیں دیتیں۔'' اس وقت وہ آپ ﷺ کے غلام تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا جواب سنتے ہی انھیں فوراً آزاد کر دیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ اس طرح آپ ﷺ کے گھرانے کے سب افراد آپ پر ایمان لے آئے۔ بیوی بھی، بیٹیاں بھی، چچازاد بھی اور آزاد کردہ غلام بھی۔ یہ سب کے سب رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صف بنا لیتے اور آپ کی اقتدا میں نماز پڑھتے۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 437/1) یہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان تھا کہ آپ کا پورا گھرانہ آپ پر ایمان لے آیا اور آپ کی تصدیق کی۔

مردوں میں سب سے پہلے آپ پر ایمان اور اسلام لانے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ (المغازی لابن أبي شيبة، ص: 130) وہ بچپن ہی سے رسول اللہ ﷺ کے دوست اور ساتھی تھے۔ ان کا آپ سے خصوصی تعلق تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے صدق کو پہچان رکھا تھا بلکہ تجربہ کر رکھا تھا اور ایک دوسرے کی امانت و دیانت کا بھی پورا یقین تھا۔ یہ بڑے مبارک شخص تھے۔ اسلام لاتے ہی انھوں نے ایک زبردست داعی کی حیثیت

سے کوشش شروع کر دی۔ وہ سچے اور عقل مند لوگوں کا انتخاب کرتے اور انھیں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ عشرہ مبشرہ میں سے اکثر حضرات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ہی پر مسلمان ہوئے، مثلاً: سیدنا عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، ابوعبیدہ بن جراح، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور اسی طرح مقداد بن اسود وغیرہ رحمہم اللہ اجمعین۔

(المغازی لابن أبي شيبة، ص: 125-138، و سيرت ابن هشام: 250/1)

اسلام قریش میں خفیہ طور پر پھیلنے لگا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی اگرچہ بعض مسلمانوں کو دوسروں کے اسلام کا علم بھی نہیں تھا، البتہ جو شخص بھی مسلمان ہو جاتا وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے زبردست داعی کے طور پر کام کرنے لگ جاتا۔ اور اپنے اردگرد ہر قابل اعتماد شخص پر اسلام پیش کرنے لگتا۔

اولین مسلمان مکہ کے معززین میں شمار ہوتے تھے اگرچہ ان میں بعض کمزور حیثیت والے بھی تھے، مثلاً: سیدنا بلال بن رباح، عمار بن یاسر، خباب بن ارت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین، البتہ اکثر مسلمان نوجوان تھے۔ ان میں بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں، مثلاً: سیدہ اسماء بنت ابی بکر، فاطمہ بنت خطاب، فاطمہ بنت محلل، فکیہہ بنت یسار، رملہ بنت ابی عوف، سیدنا خالد بن سعید بن عاص کی بیوی، سیدنا عمار کی والدہ سمیہ وغیرہ رضی اللہ عنہن۔

(سيرت ابن هشام: 256/1، و صحيح السيرة لإبراهيم علي، ص: 54) بہرصورت مکہ مکرمہ کے معاشرے میں بہت سے گھر اور خاندان مسلمان ہو گئے۔ اولین مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر خفیہ طور پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے جہاں بھی داؤ لگتا، گھاٹیوں میں، وادیوں میں اور گھروں میں۔

(سيرت ابن هشام: 246/1، 263)

تلاوتِ قرآن اور نبیٔ کریم ﷺ کے خطابات سننے سے انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کو مخالفین کی طرف سے تکالیف حتیٰ کہ قتل تک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ کی تربیت توحید، خالص عبادت، انسانیت کی فکر، ان کو ان کے خالق سے جوڑنے اور شرک سے بچانے، اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت، طہارتِ قلب، لوگوں کا بھلا چاہنے، اللہ سے ڈرنے، آخرت کی طرف رغبت اور طلب، نیز اسباب اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور توکل کے اصولوں کے مطابق فرمایا کرتے تھے۔

سیدنا ارقم بن ابو ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں کی ملاقات کا مرکز تھا۔ ایک دوسرے کو بھی وہ وہیں ملا کرتے تھے اور وہیں نبیٔ رحمت ﷺ کی تعلیمات سے اپنی پیاس بجھاتے تھے حتیٰ کہ وہ عظیم امت اسلامیہ کے سردار بن گئے جس امت نے زمین کے تمام علاقوں میں آج تک اپنے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ یہ نیکی کے داعی تھے اور انسانیت کی بھلائی کے علم بردار۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴾

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں کہ آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا معاملہ ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔'' (الکھف 28:18)

جب دعوتِ اسلامیہ شروع ہوئے تین سال گزر گئے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا اور دعوت عام کرنے کا حکم دیا گیا:

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''اور آپ اپنے سب سے زیادہ قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں۔ اور جو مومنوں میں سے آپ کا اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں۔'' (الشعراء 214:26، 215)

اس وقت تک اسلام قریش کے خاندانوں میں پھیل چکا تھا، اگرچہ اس دعوت کو انتہائی مخفی رکھا گیا تھا حتیٰ کہ مسلمانوں کو بھی ایک دوسرے کا مکمل علم نہ تھا۔ (السیرة النبویة الصحیحة لأکرم العمری: 140/1) یہ حکم بھی آیا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾

''پس آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے کھول کر سنا دیں اور مشرکین سے بے رخی برتیں۔'' (الحجر 94:15)

تب رسول اللہ ﷺ حرم کی طرف نکلے۔ یہ ایک کھلا علاقہ تھا۔ آپ ﷺ صفا پہاڑی پر چڑھ گئے حتیٰ کہ

آپ کو سارا علاقہ نظر آنے لگا۔ آپ لوگوں کو پکارنے لگے: «يَا صَبَاحَاهُ» ''لوگو! اکٹھے ہو جاؤ، حملہ ہو گیا ہے۔'' (صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4801) (عرب میں اس انداز سے پکارنے، لوگوں کو اکٹھا کرنے اور اہم بات سنانے کا رواج ہو چکا تھا، اگرچہ کسی حملے کی خبر دینا مقصود نہ تھا۔) پھر آپ ﷺ قریش کے مختلف قبائل کا نام لے کر پکارنے لگے: ''اے بنی فہر! اے بنی عبدمناف! اے بنی عبدالمطلب! اے بنو فلاں! اے بنو فلاں!'' حتیٰ کہ سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے بتاؤ اگر میں تمھیں کہوں کہ ایک گھوڑ سوار دستہ اس پہاڑ کے دامن سے نکلنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟'' وہ سب کہنے لگے: ہم نے کبھی آپ میں جھوٹ نہیں پایا۔ یہ تمام لوگوں کی طرف سے آپ ﷺ کی سچائی کی عمومی گواہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو سن لو میں تمھیں ایک عظیم عذاب سے پہلے ڈرانے آیا ہوں۔'' حاضرین میں آپ کا چچا ابولہب بھی تھا۔ اس نے انتہائی سختی اور تکبر کے ساتھ یوں جواب دیا: ''اوئے تیرے لیے اس باقی دن ہلاکت ہو! کیا تو نے ہمیں اس لیے اکٹھا کیا تھا؟'' (طبقات ابن سعد: 200/1، و صحيح السيرة لإبراهيم علي، ص: 56) رسول اللہ ﷺ پہاڑی سے نیچے اتر آئے کیونکہ آپ تمام اہل مکہ کو اللہ کا پیغام علانیہ پہنچا چکے تھے۔ ابولہب کا جواب انتہائی درشت اور سخت تھا حالانکہ وہ آپ کا چچا تھا اور سب لوگوں سے زیادہ قریبی رشتہ آپ کے ساتھ رکھتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ گرامی پر یہ آیات نازل فرمائیں جو قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝﴾

''اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو گیا۔ نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے۔ وہ ضرور بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا۔ اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔ اس کی گردن میں چھال کی بٹی ہوئی رسی ہو گی۔'' (اللهب 111:1-5)

اس قسم کا ضد سے بھرا ہوا جواب صرف ابولہب کے ساتھ ہی خاص نہ تھا بلکہ اس کی بیوی بھی اس کی ہمہ

وقت ساتھی تھی اور رسول اللہ ﷺ کو مسلسل تکلیفیں دیتی رہی۔ (طبقات ابن سعد:200/1) آپ ﷺ نے پہلی دعوت میں یہ بھی فرمایا تھا: ''اے عباس بن عبدالمطلب! میں تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بھی کفایت نہیں کر سکوں گا۔ اے فاطمہ بنت محمد! تُو مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہے مانگ لے لیکن میں تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! میں تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فائدہ نہ دے سکوں گا۔'' (صحيح البخاري، التفسير، حديث:4771)

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ کلام انتہائی واضح اور قوی تھا جبکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے رہے تھے، نیز آپ ڈرانے والے تھے اور کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق اور اس کی رضا مندی کی طلب کے علاوہ کوئی چیز نفع یا فائدہ نہ دے سکتی تھی۔ آپ سے ان کی نری رشتہ داری انھیں کچھ بھی مفاد نہ پہنچا سکتی تھی اور اللہ کے رسول ﷺ بھی کسی ایسے شخص کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے جو ایمان، توحید اور تصدیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا طالب نہ ہو۔

مشرکین کی طرف سے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف

سب سے پہلی تکلیف تو آپ ﷺ کو ابولہب اور اس کی بیوی کی طرف سے پہنچی، پھر آپ کی قوم خصوصاً ان کے سرکش اور ضدی سردار بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو تکلیفیں پہنچانے میں شریک ہوگئے۔ ان کا سرغنہ عمرو بن ہشام تھا جس کا نام اللہ کے رسول ﷺ نے ابوجہل رکھ دیا تھا کیونکہ وہ کفر، ضد وتعصب اور ایذارسانی میں سب سے بڑھ کر تھا اور اسی پر ہلاک ہوا۔ مکہ کے جاہل لوگ اسے ابوالحکم کی کنیت کے ساتھ پکارتے تھے۔ (المنمق في أخبار قريش لابن حبيب، ص: 340، 366) عورتوں میں رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینے والی سب سے خبیث عورت ابولہب کی بیوی تھی جس کا نام اَروی بنت بن حرب اور کنیت ام جمیل تھی۔ (تفسير ابن كثير: 2045/2)

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تکلیفوں کا یہ سلسلہ علانیہ تبلیغ کے بعد دس سال مکہ میں اور ہجرت کے بعد آٹھ سال فتح مکہ تک جاری رہا۔ ان تکلیفوں کے علم بردار قریش کے سرکش لوگ تھے۔ اب ان میں سے کوئی ایک مرجاتا تو اس کی جگہ کوئی اور سنبھال لیتا، جیسا کہ جنگِ بدر میں ہوا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کی فتح کے اسباب پیدا کر دیے جس سے مشرکین کی قوت بالکل ختم ہوگئی۔ علانیہ تبلیغ کے آغاز میں ابولہب کی بیوی اَروی اللہ کے رسول ﷺ کو تکلیف دینے میں سب سے پیش پیش تھی۔ اپنی باقی زندگی میں بھی ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل آپ ﷺ کو ایذا دینے پر کار بند رہے حتیٰ کہ دونوں کفر ہی پر واصل جہنم ہوئے۔

کفارِ قریش اللہ کے رسول ﷺ پر مختلف قسم کے ظلم ڈھاتے رہے۔ ان کا مقصد آپ اور آپ کے ساتھیوں کو اسلام سے روکنا تھا۔ وہ آپ کی دعوت پھیل جانے کے بعد لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کی باتیں سننے سے بھی روکا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ مختلف اجتماعات منعقد کرتے تھے اور لوگوں کو دین کی باتوں سے دور

رکھنے کے لیے مختلف تجاویز سوچتے رہتے تھے، نیز وہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کو جسمانی اور روحانی تکالیف پہنچانے میں بھی ہر حربہ آزماتے رہتے تھے۔

اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو ذاتی طور پر اپنی قوم کی طرف سے خاصی تکالیف پہنچیں لیکن آپ ﷺ کے چچا ابوطالب اپنی طاقت کے مطابق آپ کو ان تکالیف سے بچانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ وہ اپنی قوم کے دین پر تھے جس کا کافر بھی لحاظ کرتے تھے۔ خصوصاً شروع میں تو ان کی امید تھی کہ ابوطالب بھی ابولہب کی طرح نبیٔ کریم ﷺ کے خلاف ان کے مددگار بنیں گے لیکن ابوطالب پوری زندگی آپ کے سامنے دیوار بن کر کھڑے رہے اور آپ کا بھرپور دفاع کرتے رہے۔ (سیرت ابن هشام: 265/1، طبقات ابن سعد: 201/1، و سیرت ابن کثیر: 464/1) لیکن اپنے چچا کے بھرپور دفاع کے باوجود بھی آپ کو خاصی تکلیفیں پہنچیں۔

ان ضدی اور متعصب لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ پر تازہ بہ تازہ قرآن اترتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو قرآن مجید میں ساتھ ہی ساتھ جواب دیے جاتے رہتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ان کی ہر بات کا علم ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص ان حالات اور ان کے جوابات کا جائزہ لیتا ہے تو اسے یقین آجاتا ہے کہ واقعتاً قرآن مجید آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین اور مضبوط انداز میں واقعات کے مطابق قسط وار اترتا تھا۔ یہ ایسی آیات ہیں جو قیامت تک تلاوت ہوتی رہیں گی، مثلاً: ابوجہل اور دیگر سرکش اور متکبر سردار ایک دوسرے کو قرآن مجید نہ سننے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ ﴾

''اور کافروں نے (ایک دوسرے سے) کہا: تم اس قرآن کو مت سنو اور (جب پڑھا جائے تو) شور وغل کرو تاکہ تم غالب آجاؤ۔'' (حٰمٓ السجدة 26:41)

جب وہ قرآن مجید سنتے تھے تو تکبر کرتے تھے۔ تب یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝ ﴾

''اور انھوں نے کہا: جس بات کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور

ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک پردہ ہے،لہٰذا تو (اپنا) کام کر، بلاشبہ ہم (اپنا) کام کرنے والے ہیں۔'' (حٰمٓ السجدة 5:41)

اسی طرح انھوں نے پروگرام بنایا کہ وہ رسول کریم ﷺ کو مذاق کیا کریں اور آپ کی بشریت کو آپ ﷺ کا عیب بنا کر پیش کریں کہ آپ بھی وہ تمام کام کرتے ہیں جو عام لوگ کرتے ہیں۔قرآن مجید نے ان کی بات یوں نقل کی ہے:

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ ﴾

''اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟'' (الفرقان 7:25)

پھر اس کا جواب یوں دیا:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ ﴾

''کہہ دیجیے: بس میں تو تمھارے جیسا ہی ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، لہٰذا اسی کی طرف سیدھے رہو اور اسی سے بخشش مانگو اور مشرکین کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔'' (حٰمٓ السجدة 6:41)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا رد کیا جو بشر کے رسول ہونے کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے: کاش! یہ نبی فرشتہ ہوتا۔قرآنِ مجید نے ان کو یہ جواب دیا:

﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ ﴾

''اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بناتے تو بھی ہم اسے انسان ہی کی شکل میں بھیجتے اور (تب بھی) ہم انھیں اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔'' (الأنعام 9:6)

اسی طرح ان میں سے بعض نے مطالبہ کیا کہ نبی کے ساتھ فرشتہ ہونا چاہیے تھا تو فوراً جواب نازل ہوا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝﴾

''اور ان (کافر) لوگوں نے کہا: اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی۔'' (الأنعام 8:6)

اسی طرح ان ضدی اور متعصب لوگوں نے معجزات کا مطالبہ کیا۔ ان کا مقصد حق کی تلاش نہ تھا بلکہ ضد اور انکار تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾

''اور انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے؟ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: معجزے تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور میں تو محض ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔''

(العنکبوت 50:29)

اسی طرح وہ رسول کریم ﷺ پر الزام لگاتے تھے کہ آپ مکہ میں موجود کسی عیسائی یا غلاموں سے قرآن سیکھ کر آتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 1/1077) اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ان کو یوں جواب دیا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہمیں بخوبی علم ہے کہ بے شک وہ کہتے ہیں: یقیناً اس (نبی) کو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان عجمی ہے جس کی طرف یہ غلط نسبت کرتے ہیں، جبکہ یہ (قرآن تو) واضح عربی زبان میں ہے۔'' (النحل 103:16)

انھوں نے مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر کرنے کے لیے یہ الزام بھی لگایا کہ رسول کے پیروکار تو پست درجے کے لوگ ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ ان مسلمانوں کو اپنے پاس بیٹھنے سے روک دیں تب ہم آپ کے پاس بیٹھ سکیں گے۔ قرآن مجید نے فوراً آپ کو منع کر دیا، نیز ثابت قدمی اور ان ضعیف مسلمانوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

''اور ان لوگوں کو اپنے سے مت دور کریں جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، وہ اپنے رب کا چہرہ چاہتے ہیں، آپ کے ذمے ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور نہ آپ کے حساب میں سے ان کے ذمے کچھ ہے کہ آپ ان کو اپنے سے دور کریں (ایسا کیا) تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔'' (الأنعام 52:6)

اسی طرح ہر موقع کی مناسبت سے تازہ بہ تازہ آیات اترتی رہتی تھیں۔

انھوں نے رسول کریم ﷺ پر الزام لگایا کہ آپ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں اٹھا لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

''اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں جو اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الفرقان 5:25، 6)

اسی طرح انھوں نے آپ پر جادو کا الزام لگایا:

﴿ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ ﴾

''اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو دیوانہ ہے۔'' (الحجر 6:15)

انھوں نے آپ پر جادوگر ہونے کی تہمت بھی لگائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ ﴾

''اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔'' (صٓ 4:38)

انھوں نے مختلف قسم کے اور بھی مطالبات کیے، مثلاً:

﴿ اَوۡ يُلۡقٰٓى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاۡكُلُ مِنۡهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ۝ ﴾

''یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو مارے شخص ہی کی پیروی کرتے ہو۔'' (الفرقان 8:25)

اسی طرح جب انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ کا مذاق اڑایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کا دفاع کیا اور پہلے انبیاء کی یاد دلا کر آپ کو یوں تسلی دی:

﴿ وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) یقیناً آپ سے پہلے رسولوں سے بھی مذاق کیا گیا تھا، پھر ان میں سے جن لوگوں نے مذاق کیا تھا، انھیں اس عذاب نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔'' (الأنعام 10:6)

گویا قرآن مجید نے آپ کو تسلی دی کہ فکر نہ کریں آپ سے پہلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ انھیں بھی تکلیفیں پہنچائی گئیں اور ان کی قوموں کی طرف سے انھیں بھی مذاق کیے گئے۔

ظلم کا اولین شکار بننے والے اور شہداء

مشرکوں نے رسولِ کریم ﷺ کو ایذا پہنچانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے غضب اور ایذا رسانیوں کا نشانہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی بنتے رہے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ انھیں اسلام سے مرتد کر دیں اور اللہ کے دین سے روک دیں۔ نیز وہ باقی قریشیوں خصوصاً نوجوان لوگوں کو ڈرانا چاہتے تھے کہ اگر کسی نے بھی اسلام قبول کیا تو اُسے اسی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا جو رسول اللہ ﷺ اور مومنوں سے روا رکھا جا رہا ہے۔ گویا انھوں نے اللہ کے راستے سے روکنے اور لوگوں کو دین اسلام سے دور کرنے کے لیے آپ کے پیروکاروں پر بدنی سزا کا نسخہ استعمال کیا لیکن مومنوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بہادر لوگ ان کے سامنے نہ صرف ڈٹ گئے بلکہ زمانہ بعد کے مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بن گئے اور صبر و تحمل، دین پر مضبوطی اور شہادت فی سبیل اللہ کی عظیم مثالیں بن گئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، مثلاً: سیدہ سُمیّہ و یاسر اور ان کا بیٹا عمار اور سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہم۔ اسی طرح کچھ لونڈیاں تھیں جو اپنے قریشی مالکوں کی درندگی کا نشانہ بنیں، مثلاً: سیدنا بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی والدہ حمامہ، ام عنیس، زنیرہ، بنومؤمل کی لونڈی، سیدہ نہدیہ اور ان کی بیٹی۔ آخری دونوں خواتین قریش کے قبیلے بنوعبدالدار کی کسی عورت کی لونڈیاں تھیں۔ (السيرة النبوية لأبي محمد شهبة: 346/1) یہ تمام خواتین بھی دین اسلام کے سلسلے میں مصائب کا شکار بنیں اور انھیں دین سے برگزشتہ کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے خود انھیں عذاب سے بچانے کے لیے ان کے مالکوں سے خرید کر فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔ (سیرت ابن هشام: 319/1)

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لانے والے اولین حضرات میں شامل تھے۔ ان کی والدہ حیات تھیں۔ وہ اسلام لانے سے قبل بھی ان سے بہت زیادہ حسن سلوک کرتے تھے۔ جب وہ

مسلمان ہو گئے تو انھوں نے والدہ کی مزید خدمت کرنا شروع کر دی۔ کوئی کمی نہیں آنے دی لیکن جب والدہ کو پتہ چلا کہ یہ مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔ چونکہ اُسے یقین تھا کہ یہ میرا فرماں بردار ہے، خدمت گزار ہے، لہٰذا یہ میرا حکم مان لے گا۔ وہ کہنے لگی: سعد! تو یہ دین چھوڑ دے ورنہ میں نہ کچھ کھاؤں گی نہ کچھ پیوں گی اور اسی طرح مر جاؤں گی۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امی جان! ایسا نہ کیجیے۔ میں کسی بھی طرح سے اپنا دین نہ چھوڑوں گا۔ جب اس نے ان کا عزم دیکھا تو کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پورا ایک دن گزر گیا اس نے کچھ نہ کھایا۔ یوں وہ کمزور ہونے لگی۔ تیسرے دن تک وہ اسی طرح بھوکی پیاسی رہی۔ وہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو اپنی یہ حالت دکھا کر دین چھوڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔ آخر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امی جان! یہ یقین رکھیں کہ اگر آپ میں 100 جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے نکل جائیں تب بھی میں اپنے دین کو نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے آپ کھائیں، چاہے نہ کھائیں۔ وہ انھیں یاد دلاتی تھی کہ تیرا دین بھی والدین سے حسن سلوک کا حکم دیتا ہے لیکن سیدنا سعد رضی اللہ عنہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین چھوڑ دیا جائے۔ تب اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق (حسن سلوک کا) حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے (پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری کے باوجود اٹھائے رکھا اور اس کا دودھ دو سال میں چھڑانا ہے (اور) یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور دنیا میں بھلے طریقے سے ان دونوں سے اچھا سلوک کر اور اس شخص کے طریقے کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے، پھر میری ہی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔“ (لقمان 14:31، 15، و تفسیر ابن کثیر: 1426/2)

حبشہ کی طرف پہلی ہجرت

اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر تشدد کی انتہا ہوگئی۔ آپ اپنے ساتھیوں کو تسلی دیا کرتے تھے اور صبر کا حکم دیتے تھے، نیز گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کی مثالیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ قرآنِ مجید میں بھی ایسے واقعات نازل ہوتے تھے جن میں گزشتہ امتوں کا ذکر ہوتا تھا کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی زبردست مدد کی، اس لیے آپ ﷺ بھی انھیں تسلی دلاتے تھے اور امید کا میدان کھلا رکھتے تھے۔ آپ انھیں یقین دلاتے تھے کہ بالآخر تمھاری مدد کی جائے گی اور تم ہی غالب آؤ گے، نیز اللہ تعالیٰ اس دین کو ہر طرف پھیلائے گا۔ اس موقع پر تمھارا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اسے ہر چیز سے مقدم رکھیں خواہ انھیں اس مقصد کے لیے مکہ کو چھوڑنا پڑے اور اپنے دین کو بچانے کے لیے کسی اور جگہ امن و امان حاصل کرنا پڑے۔

رسول اللہ ﷺ عرب کے پڑوسی ممالک کو بخوبی جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے دینی، سیاسی اور سماجی حالات سے بھی واقف تھے۔ ان کے بادشاہوں کے عدل و انصاف، انسانی احترام اور انسانی حقوق کی ادائیگی کو خوب سمجھتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسا اور توکل رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ اسباب بھی اختیار کرتے تھے بلکہ اس کا حکم دیتے تھے اور درحقیقت یہ چیز اس دین کا اہم جز ہے جو آپ لے کر آئے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے کسی ایسی پناہ گاہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جس میں مسلمان بوقت ضرورت پناہ لے سکیں چاہے وہ عارضی طور پر ہو یا ہمیشہ کے لیے جہاں انھیں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ بھی حاصل ہو۔ اس دوران میں قرآن مجید میں کچھ ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جن میں یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے، لہٰذا صبر سے کام لیا جائے، مثلاً:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝﴾

''کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے، ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔'' (الزمر 10:39، تفسیر ابن کثیر: 1616/2)

نیز فرمایا: ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۝﴾

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔''

(العنکبوت 56:29)

اسی طرح بعد میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 522/1)

مزید فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۝﴾

''بے شک جن لوگوں کی جان فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں کمزور تھے۔ تب فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔'' (النسآء 97:4)

رسول اللہ ﷺ چونکہ اردگرد قوموں کے حالات سے خوب واقف تھے، اس لیے آپ نے محفوظ پناہ گاہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''اگر تم حبشہ کے علاقہ میں چلے جاؤ تو اچھی بات ہے کیونکہ وہاں ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ وہ مخلص لوگوں کی زمین ہے۔ وہاں رہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمھارے موجودہ حالات میں تمھارے لیے آسانی مہیا فرما دے۔'' (سیرت ابن هشام: 30/1)

آپ کا یہ مشورہ عام مسلمانوں کو تھا جو بھی ہجرت کرنے کی قدرت رکھتے ہوں تا کہ وہ فتنہ سے محفوظ ہو جائیں لیکن سب سے پہلے آپ کے اس مشورے پر جس خاندان نے عمل کیا وہ آپ کے گھر والے ہی تھے کیونکہ اولین ہجرت کرنے والوں میں آپ کی بیٹی سیدہ رقیہ اور ان کے خاوند سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما اور کچھ دیگر حضرات تھے۔ یہ لوگ کمزور اور بے بس نہ تھے بلکہ معزز ترین تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہجرت کی۔ یہ لوگ خفیہ طور پر چپکے سے نکلے اور ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ فقیر بھی اور غنی بھی، چھوٹے بھی اور بڑے بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ ان کی کل تعداد 14 تھی۔ یہ لوگ بخیریت حبشہ پہنچ گئے۔ وہاں کے بادشاہ اصحمہ نجاشی نے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ ملاقات کی۔ ان کی باتیں سنیں اور حفاظت کا انتظام کیا تا کہ کوئی انھیں تکلیف نہ پہنچائے۔ بلکہ وہ مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی وفات پر اس کا جنازہ بھی پڑھایا۔ رضی اللہ عنہ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3877، 3878) نجاشی عیسائیت کا بڑا عالم بھی تھا۔ لازمی بات ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور پیغام کے بارے میں مسلمانوں کے ساتھ بحث و تمحیص کی تبھی وہ مسلمان ہوا، آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب ''مناقب الانصار'' میں ہجرت حبشہ کے باب کے ساتھ ایک اور باب قائم کیا ہے۔ وہ ہے: بَابُ مَوْتِ النَّجَاشِيِّ۔ پھر اس میں پانچ احادیث ذکر کی ہیں جن میں سے ہر ایک سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا نجاشی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے۔ حبشہ کی طرف مسلمانوں کی پہلی ہجرت سن 5 نبوی میں ہوئی۔ (طبقات ابن سعد: 206/1) اور یہ کئی ماہ جاری رہی۔ آخر کار وہاں کچھ افواہیں پہنچیں کہ قریش مسلمان ہو گئے ہیں۔ تب ان میں سے بہت سے حضرات واپس مکہ آ گئے۔ (سیرت ابن هشام: 364/1، و طبقات ابن سعد: 205/1)

حبشہ کی طرف دوسری ہجرت

جب یہاں پہنچ کر مسلمانوں کو پتہ چلا کہ قریش تو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور آپ کے صحابہ کو تکالیف پہنچانے پر بدستور قائم ہیں اور ان کے اسلام لانے کی خبر صحیح نہیں تھی تو ضرورت پڑ گئی کہ مسلمان پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں حبشہ جائیں کیونکہ مکہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی۔ خصوصاً جب انھیں پتہ چلا کہ پہلے مہاجرین وہاں بڑے امن میں رہ رہے ہیں، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے چچازاد سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد لے کر نکلے جن میں 83 مرد اور 11 عورتیں شامل تھیں۔ (طبقات ابن سعد: 206/1) بعض نے زیادہ تعداد ذکر کی ہے۔

یہ لوگ بھی بخیر وخوبی امن وامان کے ساتھ حبشہ پہنچ گئے اور کئی دفعہ بادشاہ نجاشی سے ملے جس سے انھیں یقین آ گیا کہ نجاشی واقعتاً مخلص آدمی ہے۔ نجاشی نے بھی ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان کی حفاظت کا انتظام کیا۔ قریش ان لوگوں کو واپس مکہ لانے کے لیے حبشہ پہنچے۔ نجاشی نے ان سے بات چیت کی، نیز سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی باتیں بھی سنیں، بالآخر اس نے قریش کا مطالبہ رد کر دیا اور مسلمانوں کی حمایت میں کمر بستہ ہو گیا۔ (سیرت ابن هشام: 334/1-338، و مغازي ابن أبي شيبة، ص: 165-169، و سيرت ابن كثير: 24/2)

اس کے بعد آپ ﷺ کے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے اور پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی اسلام لے آئے۔ وہ اپنے اسلام لانے کے وقت ہی سے نبی کریم ﷺ کی مدد اور قریش کو غضبناک کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک مضبوط، قوی، صاحبِ بصیرت اور فیصلہ کن کردار ادا کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام مسلمانوں کی عزت اور قوت کا سبب بن گیا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''جب سے عمر مسلمان

ہوئے ہم عزت اور قوت والے بن گئے۔‘‘(طبقات ابن سعد:206/1)

وہ مزید فرمایا کرتے تھے: ’’مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بیت اللہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو انھوں نے کافروں سے لڑائی لڑی حتیٰ کہ وہ ہمیں بیت اللہ میں نماز کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔‘‘

(سیرت ابن هشام:334/1-338، و مغازي ابن أبي شيبة، ص: 165-169، و سيرت ابن كثير: 24/2)

ظالمانہ بائیکاٹ

قریش رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حتیٰ کہ آپ کے حامی حضرات کے خلاف تشدد اور ایذا رسانی کا ہر حربہ استعمال کرتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ اِدھر آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کے دفاع کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ میں بنوہاشم اور بنومطلب بھی ان کے ساتھ تھے۔ چونکہ نبی ﷺ کی جان کو شدید خطرہ تھا، اس لیے آپ کے دفاع کی ذمہ داری اٹھانے والے شعب بنی ہاشم میں مقید ہو گئے۔ (الروض الأنف للسهيلي: 127/2) اسی دوران میں مشرک سردارانِ مکہ اکٹھے ہوئے۔ یہ سن 7 نبوی کی بات ہے۔ انھوں نے آپس میں طے کیا کہ وہ بنو ہاشم، بنومطلب اور دیگر حامیانِ رسول کے خلاف بائیکاٹ کا تحریری معاہدہ کر لیں۔ اس کی اہم باتیں یہ تھیں کہ وہ ان سے کوئی رشتہ ناتا نہیں کریں گے اور ان سے کسی چیز کا لین دین نہیں کریں گے، نیز جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کو ہمارے سپرد نہیں کریں گے تب تک ان سے کوئی صلح قبول نہیں کی جائے گی۔ انھوں نے یہ باتیں ایک تحریر میں لکھ کر اسے کعبہ میں لٹکا دیا تاکہ اس تحریر کو قریش اور ان کے حلیفوں کے درمیان شرعی اور قانونی حیثیت حاصل ہو جائے اور سب اس پر عمل درآمد کے پابند ہوں۔ یہ بائیکاٹ تین سال جاری رہا۔ (طبقات ابن سعد: 209/1) اس دوران میں مسلمانوں، رسولِ کریم ﷺ کے رشتہ داروں اور آپ کے حامیوں پر بھوک، فقر اور تکالیف کا راج رہا۔ حتیٰ کہ انھیں درختوں کے پتے اور چمڑے تک کھانے پڑے۔ مگر بنو ہاشم اور بنومطلب میں اتنی حمیت اور غیرت موجود رہی کہ اللہ کے رسول اور مومنوں کے لیے سینہ سپر رہے۔ اس بائیکاٹ اور محاصرے کے دوران میں ابولہب الگ تھلگ رہا۔ (سیرت ابن هشام: 351/2) البتہ قریش کے کچھ رحم دل حضرات جو بنو ہاشم کے رشتہ دار بھی لگتے تھے، ان پر ترس کرتے

ہوئے خفیہ طور پر اندھیرے میں انھیں کھانے پینے کی کچھ اشیاء پہنچا دیتے تھے۔(سیرت ابن هشام: 354/2)

تین سال کے زبردست بائیکاٹ اور محاصرے کے بعد قریش کے بعض عقل مند لوگوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور ان میں سے چند حضرات اس بائیکاٹ کو علانیہ ختم کرنے پر تل گئے۔ انھوں نے قریش سے مطالبہ کیا کہ معاہدے کی تحریر پھاڑ دی جائے اور بنو ہاشم کا بائیکاٹ ختم کیا جائے۔ ان عقل مند حضرات میں سب سے پُر جوش ہشام بن عمرو بن ربیعہ تھا۔ یہ ویسے بھی قریش کا بڑا سردار تھا۔ وہ قریش کے کئی افراد کے پاس فرداً فرداً گیا اور انھیں اس بائیکاٹ کی قباحت سے آگاہ کیا۔ عام افراد تو پہلے ہی سے اس معاہدے کو ناپسند کرتے تھے اور بنو ہاشم کی مدد کے قائل تھے۔ اس نے تحریر پھاڑنے پر ان کی انسانی اور قبائلی حمیت کو ابھارا اور اس ظالم معاہدے سے نکلنے پر زور دیا۔ جب پانچ سرداران اس بات پر متفق ہو گئے تو انھوں نے اکٹھے ہو کر صحیفۂ بائیکاٹ پھاڑنے کا عہد کیا۔(السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 139) زہیر بن امیہ، جس کی ماں عاتکہ بنت عبدالمطلب تھی، قریش کی مجلس میں کھڑا ہو کر کہنے لگا: ''مکہ والو! کیا ہم کھاتے پیتے اور پہنتے رہیں جبکہ بنو ہاشم مر رہے ہیں۔ ان سے کوئی خرید و فروخت نہیں کی جاتی؟ اللہ کی قسم! میں نہیں بیٹھوں گا جب تک یہ ظالم تحریر پھاڑ نہیں دی جاتی۔'' اسی وقت ابوجہل نے اپنا مشہور مقولہ کہا: ''یہ معاملہ کہیں رات کو طے ہو چکا ہے۔''

(سيرت ابن هشام:374/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 45/2)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی مکہ کی معاشرتی زندگی میں معمول کے مطابق زندگی گزارنے لگے اور خرید و فروخت اور تجارت کرنے لگے اور فائدہ اٹھانے لگے جبکہ اس سے قبل انھیں اس سے روک دیا گیا تھا اور ان پر ظالمانہ پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں تاکہ انھیں اقتصادی، معاشرتی اور روحانی طور پر مکہ والوں سے الگ کر دیا جائے۔

(طبقات ابن سعد:209/1)

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات

ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نبیٔ کریم ﷺ کے لیے بہترین بیوی، بہترین ساتھی، بہترین غم خوار اور بہترین مددگار ثابت ہوئیں۔ انھوں نے اپنا سارا مال آپ پر نچھاور کر دیا اور آپ کی خوب خدمت کی۔ سب سے پہلے آپ پر ایمان لائیں اور تصدیق کی۔ سردارِ کائنات کی افضل ترین بیوی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود ان کی تعریف فرمائی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں ہے:

«خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيجَةُ»

''بنی اسرائیل کی عورتوں میں افضل ترین مریم بنت عمران ہے اور امت مسلمہ کی عورتوں میں افضل ترین خدیجہ ہے۔'' (صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3815)

وہ آپ ﷺ کی یکتا بیوی تھیں۔ ان کی وفات تک آپ نے کسی اور سے شادی نہیں کی۔ وہ آپ کے بیٹوں اور بیٹیوں کی والدہ تھیں۔ سب عورتوں سے زیادہ با اخلاق اور رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ انھوں نے بذاتِ خود آپ سے بہت سی تکالیف دور کیں اور اپنی بیٹیوں کو بھی اس کام پر لگائے رکھا۔ بلکہ ان کے رشتہ دار بھی ان کی خاطر نبیٔ کریم ﷺ کا دفاع کرتے رہے۔ وہ ان کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور آپ کے حسن سلوک کے تذکرے سنتے رہتے تھے۔

سن 10 نبوی میں یہ ام المومنین سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ (طبقات ابن سعد: 211/1) رسول اللہ ﷺ ان سے کانوں تک راضی تھے۔ ان سے شدید محبت رکھتے تھے۔ کئی دفعہ آپ نے ان کو جنت کی خوشخبریاں دیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی سال آپ کے چچا ابوطالب بھی فوت ہو گئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا بہترین دفاع کرنے والے تھے، اسی لیے اس سال کو ''عام الحزن'' (غم کا سال) قرار دیا گیا۔ (السيرة النبوية للصلابي: 367/1)

جناب ابوطالب کی وفات

اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل سن 10 نبوت میں جناب ابوطالب بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں اسلام اور خیر کی دعوت دیتے تھے۔ بعثت ہی سے آپ کا رویہ یہی تھا مگر وہ مسلمان نہیں ہوئے لیکن اس دوران میں وہ کبھی بھی آپ ﷺ کی مدد سے پیچھے نہیں رہے بلکہ آپ کے سامنے سینہ سپر ہوکر ڈٹے رہے اور زبردست حمایت کرتے رہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے: جب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو نبیٔ کریم ﷺ ان کے پاس پہنچے۔ ان کے پاس ابوجہل بھی بیٹھا تھا۔ آپ ﷺ فرمانے لگے: ''چچا جان! لا الہ الا اللہ پڑھ لیجیے۔ یہ وہ کلمہ ہے جسے میں اللہ تعالیٰ کے پاس آپ کے لیے بطور حجت پیش کروں گا۔'' لیکن ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ کہنے لگے: ابوطالب! کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے؟ وہ ان سے اس طرح کی باتیں کرتے رہے، حتیٰ کہ آخری بات جو ابوطالب نے کہی وہ یہ تھی: میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں ضرور آپ کے لیے بخشش کی دعا کرتا رہوں گا جب تک مجھے روک نہ دیا جائے۔'' (صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3884) پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾

''نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، ان کے متعلق یہ واضح ہوجانے کے بعد کہ بلاشبہ وہ دوزخی ہیں۔'' (التوبة 113:9)

نیز فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔'' (القصص 56:28، و تفسير ابن كثير: 1421/1)

نبیٔ کریم ﷺ اپنے چچا سے بہت محبت رکھتے تھے، لہٰذا ان پر شفقت فرماتے رہتے تھے۔ ان کے احسان کی

قدر کرتے تھے اور ڈٹ کر ساتھ دینے پر ان کے شکر گزار تھے۔ آپ یہ جانتے تھے کہ آگ سے نجات دینے والی چیز لا الٰہ الا اللہ کی گواہی کے علاوہ کوئی نہیں، خواہ کوئی شخص بھی ہو، اس لیے آپ کی شدید خواہش تھی کہ ابوطالب یہ کلمہ پڑھ دیں لیکن ابوجہل اور اس قسم کے دوسرے شیاطین کی موجودگی رکاوٹ بن گئی کیونکہ وہ انھیں بزور روکتے رہے اور مسلسل عبدالمطلب کے دین پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے حتیٰ کہ ابوطالب نے آخری بات یہی کہی کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔'' اسی پر وہ فوت ہو گئے تو نبیٔ کریم ﷺ کو سخت غم اور صدمہ پہنچا۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ مشرکین کے لیے استغفار سے ممانعت والی آیت ابوطالب کے بارے میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود آیت سے یہ تو واضح معلوم ہو رہا ہے کہ عمومی طور پر اسلام کے علاوہ کسی اور دین پر فوت ہونے والے کے لیے استغفار جائز نہیں، خواہ وہ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ چونکہ ابوطالب رسول اللہ ﷺ کے لیے زبردست سہارا تھے اور ان کی وفات سے آپ کا بازو کمزور ہوا اور آپ کے مددگاروں میں کمی آ گئی جبکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا وقت بھی یہی تھا، لہٰذا اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) قرار دیا گیا۔ (سیرت ابن هشام: 416/1)

اسراء ومعراج

اسراء اور معراج انتہائی اہم واقعہ ہے اور ہمارے نبیٔ کریم ﷺ کا خصوصی معجزہ اور زبردست عظمت ہے۔ قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ''اسراء'' رکھنا (ہمارے ہاں اس سورت کا معروف نام بنی اسرائیل ہے) اور اس واقعے کے بارے میں بہت سی عظیم الشان احادیث کا آنا اس واقعے کی اہمیت، نیز آپ ﷺ کی زندگی، نبوت اور رسالت کے ساتھ اس کے خصوصی تعلق کی واضح دلیل ہے۔

اسراء سے مراد رسول اللہ ﷺ کا مکہ مکرمہ کی مسجد حرام سے بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ تک رات کے ایک حصہ میں جانا اور اسی رات معجزاتی طور پر واپس آنا ہے۔(السيرة النبوية لابن كثير: 95/2، و فتح الباري: 49/15، وطبقات ابن سعد: 213/1) اور معراج سے مراد آپ کو بیت المقدس سے چڑھا کر ساتوں آسمانوں تک لے جانا اور وہاں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھنا اور پھر اسی رات بیت المقدس واپس آجانا ہے۔

(المغازی لابن أبي شيبة، ص: 120، و طبقات ابن سعد: 213/1)

اسراء سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ مکہ کے بیت اللہ کا بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور نبیٔ کریم ﷺ کا سابقہ انبیاء کے ساتھ مضبوط رابطہ ہے۔ اسی طرح آپ کی پیش کردہ دعوت توحید کا سابقہ انبیاء کی دعوتوں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ رب ایک ہے، دین ایک ہے اور انسانوں کا باپ بھی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾

''اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا! بے شک وہ بہت شکرگزار بندہ تھا۔'' (بنيٓ إسرآء يل 3:17)

اسی طرح دین کا مقصد اور ہدف بھی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

''اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، کیا پھر تم ڈرتے نہیں؟'' (الأعراف 65:7)

قرآن مجید میں اسراء کے بارے میں واضح آیات ہیں، مثلاً:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾

''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اردگرد کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔'' (بنيّ إسرآء يل 1:17)

اس سے صاف سمجھ آتا ہے کہ اسراء جسم اور روح سمیت ہوا۔ اسراء کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اللہ کے رسول ﷺ مکہ مکرمہ میں اپنے گھر کے اندر سوئے ہوئے تھے۔ جبریل علیہ السلام آئے اور آپ کو اٹھا کر زمزم کے کنویں پر لے گئے، پھر آپ کا سینہ مبارک چاک کیا، دل کو پاک و صاف کیا اور اس میں ایمان و حکمت بھر دیے۔ (صحيح البخاري، أحاديث الأنبيآء، حديث: 3342، والسيرة النبوية لابن كثير: 98/2) اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور مواقع پر آپ کا سینہ نہیں چاک کیا گیا۔ (دیکھیے حادثه شق صدر فی بنی سعد، اسی کتاب میں) بلکہ یہ بھی ان مواقع میں سے ایک ہے، پھر آپ کے لیے براق لایا گیا جو انتہائی تیز اور متحرک تھا جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ آپ ﷺ براق پر سوار ہوئے جس نے انتہائی تیزی کے ساتھ آپ کو بیت المقدس پہنچا دیا۔ (سيرت ابن هشام: 397/1) مسجد اقصیٰ کے پاس براق کو اس حلقے کے ساتھ باندھ دیا گیا جس کے ساتھ سابقہ انبیاء اپنے جانور باندھتے تھے۔ (صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 162، والمغازى لابن أبي شيبة، ص: 120) پھر اللہ کے رسول ﷺ نے دو رکعات پڑھیں، پھر جبریل علیہ السلام آپ کے پاس دو برتن لائے جن میں سے ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی۔ آپ ﷺ نے دودھ والا برتن پکڑ لیا۔ جبریل کہنے لگے: ''آپ کو فطرت

کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ شراب والا برتن پکڑ لیتے تو آپ بھی گمراہ ہو جاتے اور آپ کی امت بھی۔'' (صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 162، و سيرت ابن هشام: 287/1)

مؤرخ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے وہاں چند انبیاء بھی پائے جن میں سیدنا ابراہیم، سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام بھی شامل تھے اور بھی نبی اکٹھے کیے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو نماز پڑھائی۔'' (سيرت ابن هشام: 398/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 99/2)

پھر رسول اللہ ﷺ کو آسمان پر چڑھا دیا گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ایک باب ''باب المعراج'' کے نام سے قائم کیا ہے جس میں ایک لمبی حدیث ذکر کی ہے جو سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اس میں اسراء و معراج کے بارے میں مختصر معلومات مذکور ہیں، البتہ تفصیلات بہت سی دیگر روایات میں آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بہت دفعہ وہ باتیں بیان فرمایا کرتے تھے جو آپ نے معراج کے دوران دیکھیں خواہ ان میں جنت کے اوصاف ہیں یا آگے کے۔ آپ ﷺ کو معراج کے دوران میں علم کے عظیم خزانے بھی دیے گئے اور بہت سی عظیم نشانیاں بھی آپ نے مشاہدہ فرمائیں جنھیں آپ وقتاً فوقتاً اپنی باقی زندگی میں امت کے سامنے بیان فرماتے رہے۔ ان تمام باتوں کو کسی ایک حدیث میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔

(سيرت ابن هشام: 272/1، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 120)

بہت سے اہل علم نے سورۂ نجم کی مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کرتے ہوئے انھیں معراج رسول کے ساتھ جوڑا ہے:

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ؕ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ؕ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ؕ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ؕ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ؕ ﴾

''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرتا ہے! تمھارا ساتھی نہیں بہکا اور نہ وہ بھٹکا ہے۔ اور وہ (اپنی) خواہش

سے نہیں بولتا۔ وہ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔ اسے مضبوط قوتوں والے (جبریل) نے سکھایا۔ جو نہایت طاقتور ہے، سو وہ (اپنی اصلی صورت میں) سیدھا کھڑا ہوگیا۔ جبکہ وہ (آسمان کے) بلند کنارے پر تھا، پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا۔ تو وہ دو کمانوں جتنا بلکہ اس سے بھی قریب ہوگیا، پھر اس نے اللہ کے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ اس (رسول) نے جو کچھ دیکھا، اس کے دل نے (اس کے متعلق) جھوٹ نہیں بولا۔ کیا پھر تم اس چیز پر اس (نبی) سے جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے۔ اور بلاشبہ یقیناً اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی اترتے دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ (آخری حد کی بیری) کے پاس۔ اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔ بلاشبہ یقیناً اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' (النجم 53:1-18)

پھر رسول اللہ ﷺ کو معراج سے دوبارہ بیت المقدس لایا گیا اور اسی رات آپ واپس مکہ لوٹ آئے۔ آپ ﷺ نے اگلے دن کی صبح یہ واقعہ اہل مکہ کے سامنے بیان کیا اور ان کو حیران و پریشان کر دیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کا امتیاز معراج کی صبح ظاہر ہوا جب قریش کے مشرک بڑے خوش خوش یہ خبر لے کر ان کے پاس پہنچے کیونکہ وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عقل اور تحقیق سے بخوبی واقف تھے لیکن انھیں یہ پتہ نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں وہ کس قدر بلند پیمانہ اور گہری نظر اور اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، چنانچہ جب یہ مشرک بھاگے بھاگے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور انھیں یہ سب واقعہ سنایا تو وہ فرمانے لگے: اللہ کی قسم! اگر یہ واقعہ نبیٔ کریم ﷺ نے بیان کیا ہے تو سو فیصد سچ ہے۔ تمھیں اس پر تعجب کیوں ہے؟ اللہ کی قسم! وہ تو مجھے ہمیشہ دن رات کسی بھی وقت آسمان سے آئی ہوئی کوئی نہ کوئی خبر سناتے رہتے ہیں۔ یہ تو اس واقعہ سے بھی زیادہ قابل تعجب ہے۔ (سیرت ابن هشام: 399/1، والسيرة النبوية لابن كثير: 97/2) پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور سب لوگوں کے سامنے آپ سے تفصیلات پوچھنے لگے تاکہ ان کے سامنے تصدیق کریں۔ جب بھی اللہ کے رسول ﷺ کوئی بات بیان فرماتے تو وہ کہتے: ''آپ نے سچ فرمایا۔'' نبیٔ کریم ﷺ

فرماتے: ''ابوبکر! تو بھی صدیق ہے۔''

(المستدرك للحاكم: 63/3، امام ذہبی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ وسیرت ابن هشام: 399/1)

معراج کے صحیح وقت کا تعین مختلف فیہ ہے۔ بعض اسے ربیع الاول میں قرار دیتے ہیں اور بعض رجب وغیرہ میں۔ (طبقات ابن سعد: 213/1، والسيرة النبوية لابن كثير: 107/2، والسيرة النبوية لمحمد أبي شهبه: 418/1)

اور اعتبار بھی اصل بات کا ہوتا ہے نہ کہ وقت کا کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ شرف حاصل ہوا۔ یا پھر اعتبار ہوتا ہے ان اسباق کا جو اس واقعے سے حاصل ہوتے ہیں یا ان حالات ونتائج کا جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔

قبائل کے سامنے پیشکش

یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے نبیٔ کریم ﷺ پر خصوصی رحمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام قبائل اور ان کے مقامات کی پہچان عطا کر رکھی تھی کیونکہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے یہ معرفت ضروری تھی۔ یہ آپ کی تعلیم و تربیت کا تقاضا بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تجارتی مال کے سلسلے میں سفر کیا تھا۔ ویسے بھی آپ مکہ والوں کے نزدیک ایک معتبر شخصیت تھے، لہٰذا آپ مختلف قبائل سے آنے والے لوگوں سے ملاقات کیا کرتے تھے، نیز آپ عرب میں منعقد ہونے والی موسمی منڈیوں میں بھی جایا کرتے تھے جہاں ہر قبیلے کے عرب آتے تھے، مثلاً: موسمِ حج سے کچھ عرصہ قبل وہ لوگ طائف کے قریب عُکاظ کی منڈی میں آتے، وہاں سے حج کرنے چل پڑتے، پھر حج کے بعد مجنّہ اور ذوالمجاز کی منڈیاں لگتیں تو وہاں بھی جاتے۔

رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ کی دعوت ظاہر ہوئی تو مکہ والوں نے ابتدا ہی سے آپ کے ساتھ جنگ اور مخالفت شروع کر دی۔ ویسے بھی آپ کی دعوت مکہ و اہل مکہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ وہ عالمی دعوت تھی جس میں سب لوگ داخل تھے۔ بعثت کے آغاز ہی سے آپ پر ایسی آیات اترتی رہی تھیں جن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ آپ کا پیغام اور دعوت پورے جہان کے لیے ہے، مثلاً: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں پر رحمت کرنے کے لیے ہی بھیجا ہے۔'' (الأنبیآء 107:21) اور ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ ''سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' (الفاتحة 2:1) لہٰذا آپ ﷺ اپنے آپ کو مکہ تک محصور نہیں رکھ سکتے تھے بلکہ شروع ہی سے آپ منڈیوں میں دعوت کے لیے جاتے تھے۔ اسی طرح باہر سے مکہ آنے والوں تک آپ اپنا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ آپ موسمِ حج میں دیگر قبائل کے مجمعوں میں جاتے اور ان پر دعوتِ اسلام پیش کرتے۔

آپ ﷺ کا چچا ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تا کہ لوگوں کو آپ کی بات نہ سننے دے۔ نبیٔ کریم ﷺ فرماتے تھے: ''اے بنوفلاں! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری طرف بھیجا گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتے ہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ بتوں کو چھوڑ دو جن کی تم اس کے علاوہ عبادت کرتے ہو، نیز مجھ پر ایمان لاؤ۔ میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغام پہنچا دوں۔'' ابولہب آپ پر کنکر پھینکتا اور لوگوں کو دور کرنے کے لیے کہتا: تو پاگل شخص ہے۔ تو ان میں سے بعض لوگ بھی آپ ﷺ کو کھر درا جواب دیتے اور کہتے: ''تیری قوم تجھے زیادہ جانتی ہے۔''

(السيرة النبوية لابن كثير: 185/2، و سيرت ابن هشام: 424/1)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ان مواقع میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے خصوصاً موسمِ حج میں۔ اس سے قبائل، ان کی رہائش، ان کی تعداد اور ان کی قوت کی مزید معرفت ہو جاتی تھی کیونکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تجربہ کار شخص تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی ان سے پوچھ بھی لیتے تھے: ''تمھاری تعداد کتنی ہے؟ تمھارا دفاع کیسا ہے؟'' وغیرہ وغیرہ۔ (مسند أحمد: 492/3، و السيرة النبوية لابن كثير: 166/2)

سن 10 نبوی اور بعد والے سال میں رسول اللہ ﷺ نے کثرت کے ساتھ قبائل سے رابطہ کیا، خصوصاً طائف کے سفر سے واپسی کے بعد۔ (سيرت ابن هشام: 424/1، والأنساب للسمعاني) بعض تاریخی کتب میں ان ملاقاتوں کی بعض تفصیلات بھی منقول ہیں۔ ان قبائل میں بنوعامر بن صعصعہ بھی شامل تھے۔ ان کا ایک سردار بُحَیرَہ بن فراس کہنے لگا: اللہ کی قسم! اگر میں اس قریشی نوجوان کو اپنے ساتھ ملا لوں تو سارے عرب کو فتح کر لوں گا، پھر اس نے نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا: اگر ہم آپ کے ہاتھ پر آپ کے دین کی بیعت کر لیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد حکومت ہمیں ملے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''حکومت تو اللہ کی ہے، وہ جسے چاہے دے گا۔'' وہ کہنے لگا: کیا خوب! ہم آپ کی مدد میں عربوں سے اپنے سینے چھلنی کرائیں اور جب اللہ تعالیٰ آپ کو غالب کر دے تو حکومت دوسروں کی ہو، ہمیں ایسے سودے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' (سيرت ابن هشام: 425/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 171/2)

سن 11 نبوی کے حج سے پہلے رجب میں انصار کا وفد آیا اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی۔ (المغازی لابن

أبی شیبة، ص: 125، و سیرت ابن هشام: 424/1) نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ ملاقات کرنے والے قبائل میں قبیلہ بنوشیبان بن ثعلبہ بھی تھا جو بنوبکر بن وائل سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کا آپ ﷺ کو جواب یہ تھا: اگر آپ چاہیں کہ آپ کو ہم پناہ دیں اور قریبی عرب قبائل کے مقابلے میں آپ کی مدد کریں تو ہم یہ کرنے کو تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے کوئی برا جواب نہیں دیا کیونکہ تم نے سچ بات صاف کہہ دی ہے لیکن اللہ کے دین کی مدد تو وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اسے تمام اطراف سے محفوظ کریں۔ تم بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ بعد ہی تم کو مخالفین کی زمینوں اور علاقوں کا وارث بنا دے اور ان کی عورتوں کو تمھاری لونڈیاں بنا دے تو تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس نہیں کرو گے؟'' نعمان کہنے لگا: اللہ کی قسم! تو تجھے سب کچھ ملے گا قریشی بھائی! پھر اللہ کے رسول ﷺ نے ان پر یہ آیت تلاوت کی اور اٹھ آئے: ﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ ﴾

''(اے نبی!) بلاشبہ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔'' (الفتح 48:8، والبداية و النهاية لابن كثير: 168,167/2، وسبل الهدٰى والرشاد: 598-596/2)

اللہ کے رسول ﷺ عالمی دعوت کے علم بردار تھے، اس لیے آپ نے کسی ایسے شخص کی بات نہیں مانی جو آپ کی دعوت کو جغرافیائی، نسلی یا زمانی طور پر مقید کرنا چاہتا تھا، اسی لیے آپ نے بنوشیبان کی محدود پیشکش قبول نہیں فرمائی کہ سیاسی یا علاقائی لحاظ سے انھیں کسی حدود کا پابند فرمائیں۔ آپ تو اسلامی حکومت کی ایسی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے جس سے وہ پوری دنیا میں پھیل جائے۔ جس کی کوئی حد نہ ہو، جو کسی معاہدے کو توڑے نہ خلاف ورزی کرے۔ اسی طرح آپ نے کوئی ایسی شرط بھی قبول نہیں کی جس سے آپ کے بعد حکومت کسی خاص قبیلہ یا سردار کے ساتھ خاص ہو جائے کیونکہ یہ تو عالمی دعوت اور حکومت ہے جس میں اخلاص ہی اخلاص ہے اور ایک اللہ کی اطاعت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جانتے تھے کہ اس دعوت کو کسی نہ کسی دن کسریٰ کے ساتھ مقابلہ پیش آئے گا۔ اسی لیے آپ نے بنوشیبان کا استثنا قبول نہیں فرمایا۔

انصار کے ساتھ پہلی ملاقات

اوس اور خزرج دونوں قبائل مدینہ منورہ کے اصل باسی تھے۔ ان کے درمیان کچھ جنگیں بھی ہو چکی تھیں جن میں زیادہ مشہور جنگِ بُعاث تھی۔ (المفصل لجواد علي: 140/4) دونوں میں سے ہر قبیلہ اپنے حلیف اور معاون

و مددگار تلاش کرتا تھا۔ اسی دوران میں انھوں نے اسلام کی بات سنی۔ گویا یہ جنگ نبی ﷺ سے ان کی ملاقات کا ایک سبب بن گئی کیونکہ وہ مدد حاصل کرنے کے لیے ہی مکہ آئے تھے۔ اسی طرح یہ جنگ ان کے لیے نبیٔ کریم ﷺ کی زیر قیادت متحد ہونے کا بھی ذریعہ بن گئی، جبکہ جنگ نے انھیں سخت نقصان پہنچایا تھا اور ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، لہٰذا انھیں اسلام کے اصولوں میں اتحاد اور امن وسلامتی کی جھلک نظر آئی۔

مدینہ منورہ میں اوس وخزرج کے ساتھ یہودی بھی رہتے تھے اور انھیں نبیٔ آخر الزمان کی بعثت کی باتیں بتایا کرتے تھے بلکہ ان کو دھمکی بھی دیتے تھے کہ ہم اس نبی کے ساتھ مل کر تم پر غالب آئیں گے۔ مذکور ہے کہ جب یہودیوں اور ان کے پڑوسیوں اوس اور خزرج کے درمیان کوئی جنگ ہوتی تو یہودی انھیں کہتے تھے: ''آخری نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ اس کا زمانہ آچکا ہے۔ ہم اس کے ساتھ مل کر تم کو عادِ ارم کی طرح نیست و نابود کر دیں گے۔'' لہٰذا جب اوس وخزرج کی رسول اللہ ﷺ سے اس حال میں ملاقات ہوئی کہ آپ اپنے آپ کو قبائل پر پیش کرتے پھر رہے تھے تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''تم جانتے ہو، اللہ کی قسم! یہ وہی نبی ہے جس کی تمھیں یہودی دھمکیاں دیا کرتے ہیں، لہٰذا اب وہ تم سے ان کی طرف سبقت نہ لے جائیں۔''

(سیرت ابن هشام: 429/1)

جب ان کی اللہ کے رسول ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' وہ کہنے لگے: ہم بنوخزرج میں سے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہودیوں کے حلیف خزرج میں سے؟'' وہ کہنے لگے: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم تھوڑی دیر بیٹھو گے کہ میں تم سے کچھ بات چیت کروں؟'' وہ کہنے لگے: کیوں نہیں؟ پھر وہ آپ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے انھیں اللہ کی دعوت پہنچائی اور ان پر اسلامی تعلیمات پیش کیں، نیز قرآن مجید کی تلاوت کی۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: بھائیو! تم جانتے ہو یہ وہی نبی ہیں جن کا نام لے کر یہودی تمھیں دھمکیاں دیتے ہیں، لہٰذا وہ تم سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئیں۔ لہٰذا انھوں نے آپ کی دعوت کو تسلیم کر لیا، آپ کی تصدیق کی اور اسلامی تعلیمات قبول کر لیں، پھر وہ آپ سے کہنے لگے: ہماری قوم کی اب یہ حالت ہے کہ ہماری دشمنی اور جنگ ختم ہی نہیں ہو رہی۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے انھیں متفق و متحد کر دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے، انھیں آپ کی دعوت پیش کریں گے اور یہ دین جو ہم نے قبول کیا

ہے ان کو بھی اس کا قائل کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ پر متفق کر دیا تو کوئی شخص آپ سے بڑھ کر معزز اور قوی نہ ہوگا، پھر وہ اپنے علاقے کو روانہ ہو گئے۔ وہ آپ پر ایمان لا چکے تھے اور آپ کی تصدیق کر چکے تھے۔(سیرت ابن هشام: 429/1)

جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو انھوں نے اپنی قوم سے آپ ﷺ کی ملاقات کا تذکرہ کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی حتیٰ کہ یہ دعوت گھر گھر پھیل گئی اور انصار کے ہر گھر میں اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر ہونے لگا۔

(السيرة النبوية لابن كثير: 176/1، و السيرة النبوية لمهدي رزق الله: 288/1)

بیعتِ عقبہ اولیٰ

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو بتایا کرتے تھے کہ تمھارے دارِ ہجرت کی تعیین ہونے والی ہے جہاں ہم اکٹھے رہیں گے۔ اس سے پہلے ان میں سے بہت سے صحابہ حبشہ کو ہجرت کر چکے تھے اور ابھی تک وہیں تھے لیکن سب کو ایک ایسے دارِ ہجرت کا انتظار تھا جہاں اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو بھی ہجرت کی اجازت فرمائیں تاکہ سب وہاں آگے پیچھے اکٹھے ہو جائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ سے نکال دینے کے سلسلے میں کفار کا دباؤ بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

''اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس سرزمین (مکہ) سے اکھاڑ دیں تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں اور تب آپ کے پیچھے وہ خود بھی تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔''(بنيّ إسرآء يل 76:17)

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو بتا دیا تھا: ''میں وہ جگہ خواب میں دیکھ چکا ہوں۔'' انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں مکہ سے ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جہاں کھجوریں بہت ہیں۔ میرا خیال تھا، شاید وہ جگہ یمامہ یا ہَجَر ہو مگر صحیح یہ ہے کہ وہ جگہ یثرب ہے۔''(صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3622)

یہودیوں نے مدینہ، اس کے اردگرد کے نخلستانوں اور سیاہ پتھروں والے گرم میدانوں کو اسی لیے وطن بنایا تھا

کیونکہ وہ آپ کی ہجرت گاہ سے خوب واقف تھے اور آپ کے منتظر تھے۔

سن 12 نبوی میں انصاری مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی ملاقات کا پروگرام بنایا کیونکہ وہ اس سے چند ماہ قبل آپ کی شخصیت اور دعوت کا تعارف حاصل کر چکے تھے۔ یہ 12 افراد تھے۔(سیرت ابن هشام: 292/1) ان میں سے دس خزرجی اور دو اوسی تھے۔(السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 197/1) اسے بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے شہرت ملی۔

اس بیعت والی رات کے عینی شاہد سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت کے جھرمٹ میں فرمایا: ''آؤ، میری بیعت کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کرو گے، اپنی طرف سے جوڑ کر کسی پر بہتان طرازی نہیں کرو گے اور کسی اچھے کام میں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔ تم میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا، اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمے ہے اور جو شخص ان میں سے کوئی کام کرے گا تو اگر اسے دنیا میں اس کی سزا مل گئی، وہ اس کے گناہ کو مٹانے کا ذریعہ ہو گی لیکن اگر کسی شخص نے ان میں سے کوئی کام کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔'' ہم نے ان شرائط پر آپ کی بیعت کر لی۔'' (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3892)

یہ بیعت دعوتِ اسلامی کی بیعت تھی جس کی بنیاد توحید اور اطاعت پر تھی۔ اس میں لڑائی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اسی لیے بعض صحابہ نے اسے ''بیعت النساء'' (عورتوں والی بیعت) کا نام دیا ہے۔

جب یہ لوگ واپس لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا اور حکم دیا کہ انصار کو قرآن پڑھائیں، انھیں اسلام کی تعلیمات سکھائیں اور دین کی سمجھ بیدار کریں۔ مدینہ منورہ میں اسی لیے ان کو قاری اور استاد کہا جاتا تھا۔ (سیرت ابن هشام: 293/1) وہ نمازوں میں ان کے امام بھی تھے۔(سیرت ابن هشام: 293/1) مدینہ منورہ میں اولین انصاری مسلمانوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان کا مکمل دفاع کیا، نیز ان کی پوری مدد کی۔ مدینہ منورہ میں بہترین طریقہ سے اسلام پھیلانے میں ان کا بہت بڑا کردار تھا اور اس کام میں انھیں انصار کی بھرپور مدد حاصل رہی، خصوصاً ان سرداروں اور رہنماؤں کو مسلمان کرنے میں جن کو

اپنے ماتحت افراد پر اثر و رسوخ حاصل تھا۔

سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے سال بھر خوب محنت کی۔ ان کے ہاتھوں انصار کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوئی جن کو انھوں نے سن 13 نبوی کے موسمِ حج میں مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی ملاقات کے لیے تیار کیا تھا۔ یقیناً سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اپنے اس عمل میں بلکہ دیگر اعمال میں بھی انتہائی سچے اور مخلص تھے۔ یقیناً ان جیسے افراد کے بارے ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، پھر ان میں سے بعض نے اپنی نذر پوری کر دی (شہادت پا گئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔'' (الأحزاب 23:33، و تفسير طبري: 280/10، و تفسير ابن كثير: 1488/2)

بیعتِ عقبہ ثانیہ

مدینہ منورہ میں انصار کے گھروں میں اسلام خوب پھیل گیا۔ وہ لوگ قرآن مجید کا سبق پڑھتے اور سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے منتظر رہتے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کے درمیان رابطہ رہتا تھا کہ ان مومنوں کو مکہ لایا جائے کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے بہت زیادہ شائق تھے اور ہر وقت اس کے لیے تیار رہتے تھے۔ اُدھر اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان مخلص مومنوں کے منتظر تھے۔ مدینہ منورہ میں انصار مسلمان اپنی ملاقاتوں میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے:

''ہم کب تک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے پہاڑوں میں خوف کی حالت میں بھٹکتا رہنے دیں گے؟''

(السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 198/1) مؤرخ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے بیعت عقبہ ثانیہ کی تفصیلات کے سلسلے میں ایک طویل روایت ذکر کی ہے جو اس بیعت کے عینی شاہد سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم حج کے لیے نکلے جبکہ ہم نے ایام تشریق میں سے درمیانہ دن (12 ذوالحجہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے طے کر رکھا تھا۔ جب ہم حج سے فارغ ہوئے اور وہ رات آ گئی جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہم سے طے کر رکھی تھی تو ہمارے ساتھ ہمارے ایک بہت بڑے سردار اور معزز شخص سیدنا عبداللہ بن عمرو بن حرام بھی تھے۔ یہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے والد تھے۔ ہم نے انھیں اپنے ساتھ لیا، نیز ہم نے یہ معاملہ اپنے مشرک ساتھیوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ تب ہم نے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ سے بات کی۔ ہم نے کہا: ''جنابِ ابوجابر! آپ ہمارے ایک بہت بڑے سردار اور معزز شخص ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کل آگ کا ایندھن بنیں، لہٰذا آپ اپنی حالت بدلیں، چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور ہمارے ساتھ وادیٔ عقبہ میں گئے، پھر وہ نقیب بھی مقرر ہوئے۔ ہم شروع رات میں اپنی قوم کے لوگوں کے خیموں میں ان کے ساتھ ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب تہائی رات گزر گئی تو ہم خیموں سے نکل کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے چل دیے۔ ہم بھٹ تیتر کی طرح دبے پاؤں خفیہ طور پر کھسکتے رہے حتیٰ کہ ہم سب عقبہ کے پاس وادی میں جمع ہو گئے۔ ہم 73 آدمی تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک نُسَیْبَہ بنت کعب اُمّ عمارہ بنو مازن بن نجار سے تھیں اور دوسری اسماء بنت عمرو بن عدی بنو سلمہ سے تھیں۔ ان کی کنیت اُمِّ منیع تھی۔

ہم وادی میں اکٹھے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگے، حتیٰ کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ وہ اس وقت اپنی قوم کے دین ہی پر تھے لیکن انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس اہم موقع پر وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ ہوں تاکہ ان کے بارے میں انصار سے یقین دہانی حاصل کریں۔ جب آپ بیٹھ گئے تو سیدنا عباس بن عبدالمطلب ہی نے بات شروع کی۔ وہ کہنے لگے: ''خزرجیو! (عرب لوگ عموماً انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو مجموعی طور پر خزرج ہی کہتے تھے۔) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں جس حالت میں ہیں، وہ تم بخوبی جانتے ہو۔ ہم نے انھیں اپنی قوم سے اب تک محفوظ رکھا ہے، لہٰذا وہ اپنی قوم میں پوری عزت اور اپنے شہر میں انتہائی محفوظ زندگی گزار رہے ہیں۔ اب وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ تم میں منتقل ہو جائیں گے۔ اگر تمھیں یقین ہے کہ تم ان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو گے اور ان کے مخالفین سے انھیں محفوظ رکھو گے تو ٹھیک ہے۔ تم اس کے ذمہ دار ہو گے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ان کو اکیلا چھوڑ دو گے اور تمھارے پاس آنے کے بعد ان کی مدد نہیں کرو گے تو ابھی سے رہنے دو کیونکہ وہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں عزت اور حفاظت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ہم نے کہا: ہم نے آپ کی باتیں بغور سن لی ہیں۔ اے اللہ کے

رسول! آپ گفتگو فرمائیں اور اپنے اور اپنے رب کے لیے ہم سے جو شرط منوانا چاہیں، منوائیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے گفتگو شروع کی۔ آپ نے سب سے پہلے قرآن کی تلاوت کی، پھر اللہ کی طرف دعوت دی اور اسلام میں رغبت دلائی، پھر فرمانے لگے: ''میں تم سے یہ عہد لیتا ہوں کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو گے جس طرح تم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔'' سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آپ کا مبارک ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے: جی ہاں! قسم اس ذات کی جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے! ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنے تہ بند کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم جنگوں کے آزمودہ بیٹے ہیں، ہم جنگجو لوگ ہیں اور ہمیں یہ بہادری نسل در نسل وراثتاً ملی ہے۔ ابھی سیدنا براء رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بات کر رہے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان ان کی بات کاٹ کر بولے: اللہ کے رسول! ہمارے کچھ لوگوں کے ساتھ معاہدے ہیں، یعنی یہودیوں کے ساتھ۔ ہم آپ کی تشریف آوری کے بعد وہ معاہدے ختم کر دیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب ہم یہ کر چکیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو غالب فرما دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس آ جائیں؟ رسول اللہ ﷺ مسکرائے، پھر فرمانے لگے: ''نہیں بلکہ اب تمھارا خون میرا خون ہے اور تمھاری ہلاکت میری ہلاکت ہے۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ جن سے تمھاری جنگ، ان سے میری جنگ اور جن کے ساتھ تمھاری صلح، ان کے ساتھ میری صلح۔''

(سیرت ابن هشام: 1/440-442)

بیعت کرنے والے انصار کو بیعت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے خطرات کا پورا احساس تھا کیونکہ اس بیعت کی شرطیں عقبہ کی پہلی بیعت سے مختلف تھیں اور جنگ کی بیعت ''عورتوں کی بیعت'' سے مختلف ہی ہوتی ہے۔ (فقه السيرة لمحمد غزالي، ص: 160) یہ واضح بات تھی، اس کے باوجود سیدنا عباس بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ انصار کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کر دیا جائے، لہٰذا وہ کہنے لگے: خزرجیو! جانتے ہو اس عظیم شخصیت کی بیعت کا مطلب کیا ہے؟ وہ کہنے لگے: ہاں! تب انھوں نے وضاحت کی: ان کی بیعت کا مطلب ہے کہ تمام سرخ و سیاہ لوگوں سے جنگ مول لے رہے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جب تمھارے مال لوٹے جائیں گے، تمھارے سردار اور معزز لوگ قتل ہوں گے تو تم ان کی مدد چھوڑ دو گے تو پھر بہتر ہے ابھی سے چھوڑ دو کیونکہ

اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہوگی۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم ہر حال میں اپنا عہد پورا کریں گے جو آپ ﷺ سے کر رہے ہیں خواہ اس میں ہمارے سارے مال لوٹ لیے جائیں اور ہمارے سردار اور معزز لوگ مارے جائیں تو اس بیعت پر کاربند ہو جاؤ۔ اللہ کی قسم! اس میں دنیا کی بھی خیر ہے اور آخرت کی بھی۔'' سب کہنے لگے: ہم ہر حال میں آپ کا دامن پکڑے رکھیں گے خواہ ہمارے مال تباہ ہو جائیں اور ہمارے سردار قتل ہو جائیں لیکن اللہ کے رسول! ہمیں اس کے بدلے کیا ملے گا؟'' فرمایا: ''جنت۔'' وہ سب پکار اٹھے: اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور سب نے آپ کی بیعت کر لی۔

(سیرت ابن هشام: 446/1)

وہ لوگ بیعت میں مخلص تھے، لہٰذا وہ اللہ کے رسول ﷺ سے کہنے لگے: قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم صبح منیٰ والوں کو اپنی تلواروں کی باڑ پر رکھ دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہمیں اس کی اجازت نہیں۔ بلکہ تم اپنے خیموں میں واپس چلے جاؤ۔''(سیرت ابن هشام: 446/1) وہ سب اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ تم اپنے میں سے 12 نقیب مقرر کر لو۔ لہٰذا انھوں نے بنوخزرج میں سے 9 اور اوس میں سے 3 نقیب مقرر کر لیے جو ان کے سردار اور نگران بنے۔(السيرة النبوية لابن كثير: 198/2)

منیٰ سے لوگوں کی واپسی کے بعد قریش کو اس خبر کا پتہ چلا تو انھوں نے انصار کو پکڑنے کے لیے تگ و دو کی مگر وہ صرف سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو پکڑ سکے۔ انھوں نے ان کے ہاتھ ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیے اور انھیں مکہ لے گئے۔ انھیں برا بھلا کہتے رہے اور مارتے پیٹتے رہے۔

اس بیعت کا اہتمام اس بنا پر ممکن ہوا کہ سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں انصار میں ایک تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اس بیعت کا مطلب واضح تھا کہ آپ بھی ان کے ساتھ وفا کریں گے جس طرح وہ آپ کے ساتھ وفا کریں گے جس کا اظہار آپ ﷺ نے اَلدَّمَ الدَّمَ وَالْهَدْمَ الْهَدْمَ کے جملہ سے فرما دیا تھا۔(السيرة النبوية لابن كثير: 198/2)

رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک ہی وقت میں زندگی گزارنے کی ترتیب، نظام، ذمہ داری اور شوریٰ کی اہمیت

سب کچھ سمجھا دیا کیونکہ آپ نے ان سے کہا کہ وہ خود ہی اپنے میں سے 12 نقیب منتخب کر لیں جو ان کے ذمہ دار ہوں گے، لہٰذا آنے والا مرحلہ گزشتہ سے مختلف ہوگا۔ اب نئی ترتیب اور تنظیم کام کرے گی۔ ذمہ داریوں کا تعین ہوگا اور مشورہ سے کام چلے گا۔ اور یہ سب چیزیں آپ ﷺ کی سنت ہیں۔ (فقه السيرة لمحمد غزالي، ص: 159) آپ کی اس حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ انصار ایک منظّم قوم بن گئے اور اب وہ اپنے شہر دارالانصار میں رسول اللہ ﷺ کا استقبال کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

اس بیعت نے مستقبل میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے لیے ہجرت کا دروازہ کھول دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے آپ ﷺ سے پہلے مدینہ کی طرف ہجرت کر لی تاکہ وہ وہاں اسلامی معاشرہ، ایک نبوی ریاست اور باقاعدہ شہری اور فوجی نظام تشکیل دے سکیں۔

مشرکوں کو جب بیعت کی تفصیلات کا پتہ چلا تو انھوں نے مزید سختی اور تشدد شروع کر دیا اور مسلمانوں کا مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا۔ جب مسلمان آپ ﷺ سے شکایت کرتے تو آپ انھیں ہجرت کا حکم دے دیتے اور فرماتے: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے بھائی پیدا کر دیے ہیں اور ایسا علاقہ مہیا کر دیا ہے جس میں تم امن کے ساتھ رہ سکتے ہو۔'' (من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 153)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت

عربی زبان میں ہجرت کے معنی ایک علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں چلے جانا ہے۔(تاج العروس للزبیدی: 611/3) شرعی اصطلاح میں اس سے مراد دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے آنا ہے جس میں اس کا دین محفوظ رہ سکے۔(تاج العروس للزبیدی: 611/3، و فی ظلال السیرة لمحمد عبد القادر) فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

''اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں پناہ کی بہت جگہ اور بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو بلاشبہ اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''(النسآء 100:4)

ظاہر ہے ہجرت کا مقصد اپنے دین کی حفاظت، اس پر آزادانہ عمل درآمد، دین کی مدد، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی معیت، دین کی نشر و اشاعت، اللہ کے راستہ میں جان و مال خرچ کرنا اور مخلوق اور مخلوقِ الٰہی کے لیے عبادتِ الٰہی کی آسانی مہیا کرنا ہے، نیز ایسا نظام وضع کرنا جس سے یہ مقاصد بخوبی حاصل ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ اور اردگرد کے مسلمانوں کو حکم فرما دیا تھا کہ مدینہ منورہ میں اپنے بھائیوں سے جاملیں۔ یہ بات تو قطعی ہے کہ اگر قریش مسلمانوں کو ازحد تنگ نہ کر دیتے تو وہ کبھی ہجرت نہ کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا گیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں سے نکالے گئے، اس حال میں کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہی سچے ہیں۔'' (الحشر 8:59)

انصار کو ان مہاجرین سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان کے انتہائی ہمدرد تھے اور ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴾

''اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الحشر 9:59)

اولین مہاجرین اور اولین انصار کو دیگر مسلمان صحابہ پر زبردست فضیلت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کی بخوبی صراحت ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۚ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبولِ اسلام میں) سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ

جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' (التوبة 100:9)

اب لوگ پے در پے ہجرت کرنے لگے تھے، مثلاً: سیدنا ابن ام مکتوم، عمر بن خطاب، طلحہ بن عبیداللہ، عمار بن یاسر، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، بلال بن رباح، زید بن حارثہ، حمزہ بن عبدالمطلب، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوکبشہ، عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب، زبیر بن عوام، ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، عتبہ بن غزوان، عثمان بن عفان و دیگر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (سیرت ابن هشام: 1/329-331) تاریخی کتابوں میں تفصیل موجود ہے کہ یہ حضرات کن انصار کے پاس ٹھہرے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الحشر 9:59)

بعض غیر شادی شدہ حضرات اپنے جیسے غیر شادی شدہ افراد کے پاس بھی ٹھہرے جس طرح بعض لوگ سیدنا سعد بن خیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہرائے گئے۔

انصار کی کوشش تھی کہ مہاجرین کی رہائش، اخراجات اور ہمدردی کے سلسلے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں حتیٰ کہ بسا اوقات کسی مہاجر کے آنے پر باقاعدہ قرعہ ڈالنا پڑتا۔ (سیرت النبی أز عبد الحمید طهماز، ص: 246) اس دوران میں ایسی آیات بھی نازل ہوتی رہیں جن میں مہاجرین کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کی

مدد کا وعدہ بھی کیا گیا، مثلاً:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، یقیناً ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔'' (النحل 16:41,42، و سير أعلام النبلاء للذهبي: 21/2)

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں) کے بعد ضرور بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (النحل 16:110)

دیگر بہت سی آیات میں مہاجرین کا ذکر کیا گیا ہے۔

(هجرة الرسول و صحابته في القرآن والسنة لأحمد عبدالغني النجولي)

اہلِ صفہ

یہ بہت سے مہاجرین تھے جو رسول اللہ ﷺ کی مسجد سے متصل رہا کرتے تھے۔ ان کو اہل صفہ کہا گیا۔ یہ غیر شادی شدہ فقیر لوگ تھے جن کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ (أصحاب الصفّة لأبي تراب الظاهري) رسول اللہ ﷺ کے پاس صدقہ آتا تو آپ ان کے پاس بھیج دیتے۔ حدیث مبارکہ میں ہے: ''اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے جن کا نہ کوئی گھر تھا نہ اہل و مال۔ جب آپ کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ انھیں بھیج دیتے اور خود کچھ نہ کھاتے لیکن جب کوئی تحفہ آتا تو ان کے پاس بھی بھیجتے اور خود بھی کھاتے۔ اس طرح ان کو اپنے ساتھ شریک کر لیتے تھے۔ (مسند أحمد: 287/3) اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہے: ''آپ ہر روز ان کے لیے دو

افراد کو ایک مُدّ کے تناسب سے کھجوریں بھیجتے تھے۔‘‘(مسند أحمد: 287/3)

رسول اللہ ﷺ اہل وعیال والے افراد کو ان فقراء کے کھانا کھلانے پر ابھارتے رہتے تھے، لہٰذا انصار بعض اصحاب صفہ کو اپنے ساتھ گھروں میں لے جاتے تھے اور ان کو کھانا کھلاتے تھے، نیز ان سے غمخواری کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے: اصحابِ صفہ فقیر لوگ تھے، ایک دفعہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’جس شخص کے ہاں دو افراد کا کھانا ہے وہ تیسرا آدمی اپنے ساتھ لے جائے اور جس کے ہاں چار افراد کا کھانا ہے وہ پانچویں اور چھٹے کو اپنے ساتھ لے جائے۔‘‘ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمی ساتھ لے گئے اور رسول اللہ ﷺ دس افراد ساتھ لے گئے۔(حلية الأولياء: 22/2-33، والسيرة النبوية للصوياني: 32/2)

اصحابِ صفہ میں سے کچھ لوگ بازار میں بار برداری کا کام بھی کرتے تھے۔ کوئی لکڑیاں لاکر بیچتا تھا یا سادہ خرید وفروخت کرتا تھا۔ اگرچہ ان کے حالات ان کے مددگار نہیں تھے، اس کے باوجود جب ان میں سے کوئی لکڑیاں وغیرہ بیچتا یا کوئی اور محنت کرتا تو وہ اپنے ساتھیوں کے لیے بھی کھانے پینے کی اشیاء لے آتا۔

(حلية الأولياء:348/1)

نبیٔ اکرم ﷺ کی ہجرت

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے گھر والوں کا ہجرت میں کردار

رسولِ اکرم ﷺ انبیائے کرام علیہم السلام میں کوئی پہلے ہجرت کرنے والے نہیں ہیں بلکہ آپ سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی ہجرت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝﴾

''پھر ابراہیم پر لوط ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا: بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، بلاشبہ وہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (العنکبوت 26:29)

مکہ سے آپ ﷺ کی ہجرت کا سبب مشرکین کی زیادتیاں تھیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کو مکہ سے نکالنے یا آپ کی قید و قتل کے منصوبے بنائے۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی مکہ سے شدید محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ۝﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 30:8)

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾

''اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس سرزمین (مکہ) سے اکھاڑ دیں تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں اور تب آپ کے پیچھے وہ خود بھی تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔'' (بنيٓ إسراء يل 76:17)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کفارِ قریش نے آپ ﷺ کو نکالنے کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴾

''اور کتنی ہی بستیاں کہ وہ آپ کی اس بستی (مکہ) سے جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہے، کہیں زیادہ طاقتور تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہ تھا۔'' (محمد 13:47)

نیز ہجرت اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبتِ رسول والی آیت صاف واضح کر رہی ہے کہ کافروں نے آپ ﷺ کو نکالا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور بات تو اللہ ہی کی سب سے بلند ہے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''

(التوبة 40:9)

احادیث بھی صراحت کر رہی ہیں کہ آپ ﷺ کو مکہ سے نکالا گیا تبھی تو آپ نکالنے والوں پر بددعا کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ سے شدید محبت رکھتے تھے۔ آخر آپ وہیں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے، وہیں شادی کی، وہیں کھاتے پیتے رہے۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے بلکہ لوگوں کو بھی باور کرواتے تھے کہ مکہ حرم ہے اور اللہ کے ہاں سب سے افضل مقام ہے۔ ہجرت کے وقت آپ ﷺ نے مکہ کی طرف منہ موڑا اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! تو مجھے اللہ تعالیٰ کی پوری زمین سے زیادہ محبوب ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی پوری زمین سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تیرے باسیوں نے مجھے تجھ سے نکال دیا ہے تو میں کبھی بھی تجھ سے نہ نکلتا۔'' (المواهب للزرقاني: 328/1، و سنن ابن ماجه، حديث: 3108)

بیعت عقبہ ثانیہ 12 ذوالحجہ سن 13 نبوی کو ہوئی۔ اس کے فوراً بعد تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے صحابۂ کرام ہجرت کر گئے اور پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھتی گئی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہجرت کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ آپ نے صحابہ کو ہجرت کا حکم دے دیا تھا لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کچھ تاخیر کا مشورہ دیا جس کی حکمت اللہ تعالیٰ جانتے تھے یا رسول اللہ ﷺ خود۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

دراصل رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ کب مجھے ہجرت کا حکم ملتا ہے! ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے رسولِ کریم ﷺ کے لیے تدبیر کرنا تھی اور صورتِ حال کو موافق کرنا تھا۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 8:30)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے لیے بھی ضروری تیاری کر رکھی تھی۔ خصوصاً اونٹنیاں

اور دوسرا سامانِ سفر تیار کر رکھا تھا، حالانکہ انھیں ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ بھی ہجرت میں آپ کے ساتھ ہوں گے۔ قریش نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی ہجرت میں رکاوٹ ڈالنے اور آپ کو نعوذ باللہ شہید کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔

سیدنا جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ سے آ کر کہنے لگے: ''آج رات آپ اپنے معمول کے بستر پر نہ سوئیں۔'' جب رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو کفارِ قریش آپ ﷺ کے دروازے کے پاس اکٹھے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ آپ بستر پر سوئیں تو ہم یکبارگی آپ پر ٹوٹ پڑیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم میرے بستر پر میری یہ حضرمی سبز چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ تمھارا بال تک بیکا نہ ہوگا۔'' رسول اللہ ﷺ اسی چادر میں سویا کرتے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ باہر نکلے۔ آپ نے ایک مٹھی مٹی اٹھائی اور یہ آیات پڑھتے ہوئے اور ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے ان کے پاس سے گزر گئے مگر وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے:

﴿ يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۞ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۞ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۞ ﴾

''یٰسٓ۔ قسم ہے اس حکمت بھرے قرآن کی! بلاشبہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔ راہِ راست پر ہیں۔ (یہ قرآن) نہایت غالب، خوب رحم کرنے والے (اللہ) کا اتارا ہوا ہے۔ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے تو وہ (دین سے) غافل ہیں۔ بلاشبہ یقیناً ان کی اکثریت پر (اللہ کا) قول ثابت ہو گیا ہے، لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں اور وہ (ان کی) ٹھوڑیوں تک ہیں، لہٰذا وہ سر اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے سے بھی ایک دیوار، پھر ہم نے ان (کی آنکھوں)

کو ڈھانک دیا تو وہ دیکھ نہیں سکتے۔'' (یٰسٓ 36:1-9)

آپ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کے سر پر مٹی ڈالی۔ ایک شخص نے آ کر ان سے پوچھا: یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟ وہ کہنے لگے: محمد (ﷺ) کا۔ وہ کہنے لگا: اللہ تمھیں ناکام کرے! وہ تو ابھی تمھارے پاس سے گزر گئے ہیں اور انھوں نے تم میں سے ہر ایک کے سر پر مٹی بھی ڈالی ہے۔ تمھیں پتہ ہی نہیں چلا؟ یہ سن کر ان میں سے ہر شخص نے اپنے سر پر ہاتھ لگایا تو واقعتاً مٹی پڑی ہوئی تھی، پھر وہ دیواروں پر سے جھانکنے لگے تو وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے بستر پر لیٹا دیکھ کر مطمئن ہو گئے جو آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! محمد (ﷺ) تو وہ سوئے پڑے ہیں۔ انھی کی چادر ہے۔ وہ اسی غلط فہمی میں رہے، حتیٰ کہ صبح ہوئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں دیکھ کر وہ کہنے لگے: اوہو! اللہ کی قسم! رات اس شخص نے ہم سے صحیح کہا تھا۔ مؤرخ ابن اسحاق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس دن اور ان کے عزائم کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 8:30)

نیز فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝﴾

''کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟ کہہ دیجیے: تم انتظار کرو، یقیناً میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

(الطور 52:30، 31. سیرت ابن هشام: 484/1، وطبقات ابن سعد: 227/1، و تفسیر ابن کثیر: 734/1)

اس موقع پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے بہترین ساتھی ثابت ہوئے۔ ایسے کئی مواقع پیش آئے جن میں

انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ جب غارِ ثور میں داخل ہونے لگے تو انھوں نے آپ ﷺ سے گزارش کی: ٹھہریے! میں اندر جا کر چھان بین کر لوں کہ وہاں آپ کو کوئی خطرہ تو نہیں، پھر جب وہ دونوں غار میں بیٹھے تھے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک سوراخ سے خطرہ محسوس ہوا۔ انھوں نے فوراً اپنا پاؤں سوراخ میں داخل کر دیا اور گزارش کرنے لگے: اللہ کے رسول ﷺ اگر کوئی سانپ بچھو ہوا تو وہ مجھے کاٹے گا، آپ محفوظ رہیں گے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 151) غار کے اندر بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں انھیں انتہائی تشویش رہی۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان سے نقل کرتے ہیں: ''میں نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ غار میں تھا کہ اچانک میں نے سر اٹھایا تو مجھے کچھ لوگوں کے پاؤں نظر آنے لگے۔'' میں گھبرا کر کہنے لگا: ''اللہ کے نبی ﷺ! اگر ان میں سے کسی نے نیچے نظر کی تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! چپ رہو، ہم دو ہیں جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔'' (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3922)

اُن کی اس تشویش اور رسول اللہ ﷺ کے اطمینان اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلانے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور بات تو اللہ ہی کی سب سے بلند ہے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''

(التوبة 40:9)

ہاں! واقعتاً اللہ تعالیٰ ہی نے رسول اللہ ﷺ پر اطمینان وسکون نازل فرمایا تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ راستے میں بھی برابر آپ کی خدمت کرتے رہے۔ وہ آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے تھے چونکہ وہ اکثر شام کا سفر کرتے رہتے تھے، اس لیے وہ لوگوں میں معروف تھے، اس لیے جب کوئی انھیں پہچان لیتا تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ کا صحیح تعارف نہیں کراتے تھے بلکہ گول مول الفاظ استعمال کرتے تھے تاکہ آپ کے دفاع میں کوئی خرابی نہ پڑے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت ہے: ''سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کا بھی سفرِ ہجرت میں بڑا کردار تھا۔'' سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے نبیٔ کریم ﷺ کے کھانے پینے کا سامان اپنے گھر میں تیار کیا۔ ہمیں آپ کے دسترخوان اور مشکیزہ باندھنے کے لیے کوئی رسی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ابا جان! اللہ کی قسم! مجھے سامان باندھنے کے لیے کوئی چیز نہیں مل رہی، البتہ میرا ازار بند ہے۔ وہ فرمانے لگے: ''اسی کو درمیان سے چیر کر دو بنا لے۔ ایک کے ساتھ مشکیزہ باندھ دے اور دوسرے کے ساتھ دسترخوان۔'' اسی لیے مجھے ''ذات النطاقین'' (دو ازار بندوں والی) کہا گیا۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 144، وصحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3907) خود سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو بھی رسول اللہ ﷺ کے ہجرت فرمانے کے بعد مشرکین مکہ کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نکل گئے تو چند قریشی ہمارے گھر آئے۔ ان میں ابوجہل بھی تھا۔ وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگے۔ میں باہر نکلی تو وہ کہنے لگے: ابوبکر کی بیٹی! تیرا باپ کہاں ہے؟ میں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے کچھ پتہ نہیں وہ کہاں ہیں؟ ابوجہل نے غصے میں ہاتھ اٹھا لیا اور وہ بڑا بے حیا اور خبیث آدمی تھا۔ اس نے میرے رخسار پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ میری بالی دور جا گری۔ (سیرت ابن هشام: 487/1) انھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ غار میں رسول اللہ ﷺ اور اپنے والد گرامی کو مدینہ کا سفر شروع کرنے سے قبل کھانا پہنچایا کرتے تھے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 150) اور ساتھ ساتھ مشرکین کی خبریں بھی بتایا کرتے تھے۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رات کو بکریاں لے کر غار کے قریب آجایا کرتے تھے تاکہ انھیں تازہ دودھ ملتا رہے بلکہ یہ تو ہجرت کے سفر میں رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی چل پڑے تھے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 150)

نبی ﷺ کی خاطر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قربانی اور امانتوں کی ادائیگی

جب قریش نے ہجرت والی رات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قتل کا مشورہ اور فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو اس بارے میں اطلاع کر دی۔ سیدنا جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا کہ آج رات اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی سبز چادر اوڑھی اور سکون و اطمینان سے آپ ﷺ کے بستر پر لیٹ گئے۔ نبیٔ کریم ﷺ گھر سے نکل پڑے، حالانکہ مشرکین دروازے پر کھڑے تھے لیکن آپ ﷺ ان کو نظر نہیں آئے۔ مشرکین بیچارے کھڑے گھر کا پہرہ دیتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آپ کے بستر کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتے جہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ مشرک سمجھتے تھے کہ یہ نبی ﷺ ہیں۔ اسی طرح وہ صبح تک انتظار کرتے رہے، اس لیے نبیٔ کریم ﷺ کو خاصا وقت مل گیا اور آپ اطمینان کے ساتھ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں غار تک جا پہنچے۔ (سیرت ابن هشام: 482/1)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ جرأت مندانہ کردار اور رسول اللہ ﷺ کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دینا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ان عظیم کارناموں میں سے ایک ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سرانجام دیے۔ آخر وہ آپ کے چچازاد تھے، داماد تھے اور ان کو جنت کی خوشخبریاں ملی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے گھر میں پرورش اور تربیت پائی تھی اور ایمان و اسلام کے سائے میں پلے بڑھے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کی خدمات رسول ﷺ کی ہجرت اور خدمت کے سلسلے میں بے انتہا ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کمی کو پورا کیا۔ ان میں مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ تو نیکی، محبت رسول اور حمایت رسول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش ہے جس سے کمال حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے چند دن بعد ہجرت کی کیونکہ انھوں نے وہ امانتیں مالکوں تک پہنچانی تھیں جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں اگرچہ وہ مشرک تھے۔ درحقیقت یہ کام سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کے لائق تھا کیونکہ وہ امین تھے اور انھیں رسول اللہ ﷺ کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ مومن اور دوسرے لوگ بھی انھیں معتبر سمجھتے تھے۔ (سیرت ابن هشام: 482/1) لہٰذا سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ

کے تشریف لے جانے کے تین دن بعد تک مکہ میں رہے، امانتیں ادا کیں اور پھر رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ میں جا ملے۔(سیرت ابن هشام:493/1)

مدینہ منورہ کا راستہ

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غارِ ثور میں تین دن ٹھہرے۔ جبل ثور مکہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے، مدینہ کے راستے سے بالکل الٹی جانب۔ یہاں ٹھہرنے کا مقصد اپنے سفر کو انتہائی خفیہ رکھنا اور تلاش کرنے والوں کو دور رکھنا تھا۔ ادھر قریش نے رسول اللہ ﷺ کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر 100 اونٹ کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906، و صحيح السيرة للدكتور العمري: 211/1) اس بنا پر بہت سے لوگ پوری تگ و دو کے ساتھ مکہ کے اردگرد تمام راستوں میں آپ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس دوران میں وہ کئی دفعہ غار کے پاس بھی گئے مگر اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو ان سے محفوظ رکھا۔ جب قریش کی تلاش و جستجو تھم گئی تو رسول اللہ ﷺ آرام سے رات کے وقت غار سے نکلے۔ آپ کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ دونوں اپنے رہنما عبداللہ بن اُرَیقِط سے جا ملے۔ اس کے پاس ان کی دو اونٹنیاں موجود تھیں۔ وہ انھیں مکہ کی نشیبی جانب سے لے چلا اور ساحل سمندر سے قریب لے گیا اور انھیں لے کر ایسے راستے پر چلا جس پر مدینہ کو جانے والے لوگ نہیں چلتے تھے۔ اس کا مقصد مخالفین اور تلاش کرنے والوں سے پوشیدہ رہنا تھا۔

ہجرت کے سفر کے دوران کا اہم اور مشہور واقعہ ام معبد سے ملاقات کا ہے۔ اس کا خیمہ اس راستے پر واقع تھا جہاں سے آپ گزر رہے تھے۔ دوسرا مشہور واقعہ سراقہ بن مالک سے ملاقات کا ہے جسے سراقہ بن مالک بن جعشم کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی نے اپنے والد سے بیان کیا ہے۔ انھیں خود سراقہ بن مالک بن جعشم نے یوں بیان کیا کہ ہمارے پاس کفارِ قریش کے قاصد آئے اور انھوں نے بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میں سے ہر ایک کے قتل یا قید پر پوری دیت انعام میں ملے گی۔ میں ابھی اپنی قوم بنو مدلج کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی آ کر کہنے لگا: ''سراقہ! میں نے ابھی ساحل سمندر پر کچھ سائے سے دیکھے ہیں۔

میرا خیال ہے وہ محمد اور ان کے ساتھی ہوں گے۔'' میں سمجھ گیا کہ واقعتاً وہ وہی ہیں لیکن میں نے اسے کہا: ''یہ وہ نہیں ہیں بلکہ تو نے فلاں کو دیکھا ہے، وہ ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر کر گئے ہیں۔'' پھر میں تھوڑی دیر مجلس میں بیٹھا رہا (تاکہ کسی کو شک نہ پڑے) پھر میں اٹھا۔ گھر گیا اور لونڈی سے کہا کہ وہ میرا گھوڑا جو کہ ایک ٹیلے کے پیچھے کھڑا ہے، لے جائے اور پکڑ رکھے، میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے اپنا نیزہ پکڑا اور گھر کے پچھواڑے سے نکل گیا۔ میں نے نیزے کی نوک والا حصہ زمین پر لگا لیا اور لکڑی کو نیچا کر لیا حتیٰ کہ میں ان کے قریب پہنچ گیا لیکن اچانک میرا گھوڑا لڑکھڑایا۔ میں گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ میں اٹھا اور اپنے تیروں کی طرف ہاتھ بڑھا کر قسمت آزمائی والے تیر نکال لیے اور قسمت معلوم کرنا شروع کر دی کہ میں انھیں نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ نتیجہ میری خواہش کے خلاف نکلا۔ مگر میں تیروں کی نافرمانی کرتے ہوئے دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور میرا گھوڑا پھر مجھے ان کے قریب کرنے لگا۔ حتیٰ کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنائی دینے لگی لیکن آپ ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے گھوڑے کی اگلی ٹانگیں پتھریلی زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئیں اور میں پھر گر پڑا۔ میں نے اٹھ کر گھوڑے کو ڈانٹا۔ وہ اٹھا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی ٹانگیں زمین سے نکالیں۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگوں والی جگہ سے آسمان کی طرف ایک دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ تیروں کے ساتھ قسمت آزمائی کی لیکن پھر بھی وہی نتیجہ نکلا جو مجھے ناپسند تھا، لہٰذا میں نے انھیں امان کی پیشکش کی۔ وہ رک گئے۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا۔ جب میرے ساتھ یہ بیت چکا تو مجھے یقین آ گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دین ضرور غالب آئے گا۔ میں نے آپ ﷺ سے گزارش کی کہ آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری پر پوری دیت انعام مقرر کر رکھا ہے، نیز ان کے دوسرے منصوبوں سے بھی آپ کو آگاہ کیا، نیز زادِ راہ اور ضروری سامان کی پیشکش کی لیکن انھوں نے کوئی چیز قبول نہ کی، نہ کوئی چیز ہی مجھ سے مانگی۔ صرف اتنا کہا: ''ہمارا معاملہ مخفی رکھنا۔'' میں نے آپ ﷺ سے گزارش کی: حضور! مجھے امان نامہ لکھ دیں۔ آپ ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا تو اس نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر میرے لیے امان نامہ لکھ دیا، پھر رسول اللہ ﷺ چل دیے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 146)

تاریخی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا تھا کہ کسریٰ کی بادشاہت ختم ہو جائے گی اور تو اس کے کنگن پہنے گا۔(الإصابة لابن حجر: 19/2)

روایات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سیدنا سراقہ رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے کیا ہوا عہد پورا کیا اور نبیٔ کریم ﷺ کی تلاش کرنے والے بہت سے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ راستے سے اِدھر اُدھر کر دیا۔(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 146) سننے والا شخص تعجب کرتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سراقہ کو کسریٰ کے کنگن پہننے کی خوشخبری اس وقت دے رہے ہیں جب آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا تھا اور مشرکین آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر بھاری انعام کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔ اس کے باوجود آپ سراقہ کو کسریٰ کا ملک فتح ہونے اور ایک اعرابی کو کسریٰ کے کنگن پہننے کی خبریں دیتے ہیں۔ حالانکہ کوئی اعرابی تو کسریٰ کے کنگن دیکھنے یا کسریٰ کے دارالخلافہ مدائن پہنچنے کا تصور کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا تو اونٹوں کا ایک چرواہا انھیں کیسے پہن سکتا تھا۔ یہ سراقہ رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ حنین و طائف سے واپسی کے وقت جعرانہ کے مقام پر ملے اور آپ کو وہ تحریر دکھائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج وفائے عہد اور نیکی کا دن ہے۔ اِدھر قریب آ جاؤ۔'' وہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب آ گئے اور مسلمان ہو گئے۔

(دلائل النبوة للبيهقي: 489/2، و الإصابة لابن حجر: 19/2)

رسول اللہ ﷺ نے جو خوشخبری دی تھی وہ حقیقتاً واقع ہوئی، لہٰذا یہ آپ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدائن فتح ہوا اور مالِ غنیمت لایا گیا جس میں کسریٰ کے کنگن، اس کا تاج، اس کا بچھونا اور اس کے قیمتی جواہرات شامل تھے۔ تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نبیٔ کریم ﷺ کا وعدہ یاد آتا ہے۔ وہ سیدنا سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ان کو کسریٰ کے کنگن پہناتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''کہو الحمدللہ جس نے یہ کنگن کسریٰ بن ہرمز سے چھین کر بنو مدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن جعشم کو پہنائے۔''

(الإصابة لابن حجر: 19/2، و البداية و النهاية لابن كثير: 68/7) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ اونچی آواز سے ادا فرمائے، پھر سراقہ کو سوار کر کے مدینہ منورہ میں گھمایا گیا۔ ان کے گرد لوگوں کا جھرمٹ تھا اور وہ بار بار اللہ اکبر کہتے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ دہراتے تھے حتیٰ کہ پورے مدینہ والوں نے یہ معجزہ دیکھا جو آپ ﷺ کے

فرمان سے صرف پندرہ سال بعد ظاہر ہو گیا۔ والحمدللہ!

مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے ایک اور واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں کا ایک قافلہ جو شام سے واپس آ رہا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ سے ملا۔ اس قافلے میں سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی تھے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید جوڑے پہنائے۔ (فتح الباري لابن حجر: 1936/7) اسی طرح رسول اللہ ﷺ جحفہ کے مقام پر ایک اسلمی شخص کے اونٹوں کے پاس سے گزرے۔ وہاں ایک چرواہا لڑکا بھی تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''یہ اونٹ کس کے ہیں؟'' لڑکا کہنے لگا: اسلم قبیلے کے ایک شخص کے ہیں۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''ان شاء اللہ تم سلامت رہو گے۔'' پھر آپ ﷺ نے اس لڑکے سے پوچھا: ''تیرا نام کیا ہے؟'' وہ کہنے لگا: مسعود۔ آپ ﷺ نے پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''تم ان شاء اللہ نیک بخت ہو گے۔'' (السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 459/1) دراصل آپ ﷺ نیک شگون لینے کو اچھا سمجھتے تھے۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 256/2)

مدینہ تشریف آوری

رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے روانگی کی خبر مدینہ منورہ میں مہاجرین و انصار کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا وہ ہر روز حَرَّہ میں پہنچ جاتے اور آپ کا انتظار کرتے۔ جب دوپہر گرم ہو جاتی تب لوٹ جاتے۔ ایک دن طویل انتظار کے بعد وہ لوٹے اور ابھی گھروں میں پہنچے ہی تھے کہ ایک یہودی اپنے کسی کام کے لیے ایک قلعے پر چڑھا۔ اُسے دور ریت پر رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سفید کپڑے چمکتے نظر آئے۔ وہ یہودی ضبط نہ کر سکا اور بلند آواز سے کہنے لگا: ''عربیو! جن کا تم انتظار کرتے ہو وہ تشریف لے آئے ہیں۔'' مسلمان اپنے اسلحے کی طرف بھاگے اور رسول اللہ ﷺ کے استقبال کو جا پہنچے۔ آپ ﷺ انھیں لے کر دائیں جانب مڑ گئے حتیٰ کہ بنوعمرو بن عوف میں جا پڑاؤ ڈالا۔ یہ سوموار کا دن تھا اور ربیع الاوّل کی آٹھ تاریخ تھی۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906) اور عیسوی لحاظ سے 21 ستمبر 622ء۔ (أزمنة التاريخ الإسلامي للترمانيني، ص: 15) سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے حتیٰ کہ آپ کو دھوپ لگنے لگی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

آئے اور اپنی چادر کے ساتھ آپ کو سایہ کر دیا۔ اس وقت لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ﷺ

(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906، و سيرت ابن هشام:343/1)

بعض روایات کے مطابق مدینہ منورہ میں آپ کی تشریف آوری کے موقع پر آپ کا استقبال کرنے والے انصار پانچ صد (500) تھے۔ (السيرة الصحيحة للدكتور العمري: 218/1) بہرصورت استقبال کے بعد جو لوگ آپ سے ملاقات کے لیے قبا میں حاضر ہوئے ان کی تعداد اتنی یا اس کے قریب ہوگی۔ مہاجرین ان کے علاوہ تھے جن کی تعداد 100 سے کم نہ تھی۔ روایات سے یہی پتہ چلتا ہے۔ مہاجرین نے اس موقع پر بھی آپ کی بیعت کی کیونکہ وہ ان خطرات کو بخوبی سمجھتے تھے جو آپ کو دشمنوں کی طرف سے درپیش تھے۔ بہرصورت وہ آپ ﷺ کی حمایت، اطاعت اور آپ کی خاطر ہر قسم کی قربانی کے لیے بالکل تیار تھے۔ آپ کی مدینہ تشریف آوری پر انصار نے بھی آپ کی دوبارہ بیعت کی، جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3916)

صحیح بخاری میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں اس سے زائد یہ الفاظ بھی ہیں: رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کی بالائی جانب ایک قبیلہ بنوعمرو بن عوف میں آپ نے نزول فرمایا۔ وہاں آپ چودہ دن ٹھہرے، پھر آپ نے بنونجار کو پیغام بھیجا تو وہ اپنی تلواریں حمائل کیے حاضر ہو گئے۔ مجھے آج بھی نظر آ رہا ہے گویا اللہ کے رسول ﷺ اپنی اونٹنی پر تشریف فرما ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے بیٹھے ہیں اور بنونجار کا دستہ آپ ﷺ کے اردگرد ہے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3932)

رسول اللہ ﷺ قباء میں بنوعمرو بن عوف کے سردار کلثوم بن ہِدم اور سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہما کے پاس ٹھہرے۔ آپ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے گھر لوگوں سے ملاقات فرماتے تھے۔ یہ مکان بہت سے غیر شادی شدہ مہاجرین کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ (سيرت ابن هشام:343/1)

رسول اللہ ﷺ کا مدینہ میں قبا تک پہنچنا ایک ممتاز دن تھا جسے مسلمانوں نے بعد میں اس کی اہمیت کے پیش نظر ہجری تاریخ کا آغاز قرار دے دیا۔ (تاريخ المدينة لعمر بن شبة: 585/2، و صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3934) اس دن کا ذکر بذاتِ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مسجد قبا کی تعمیر والی حدیث سے

مربوط کر کے کیا ہے:

﴿ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ بہت پاک صاف ہوں اوراللہ بہت پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (التوبة 108:9)

اس آیت میں اس دن کی طرف براہِ راست اشارہ ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے تاریخ ہجری کا آغاز اس سے کیا۔ اُن کے ذہن میں تھا کہ قرآن کریم نے اس دن کا براہِ راست ذکر کیا ہے، لہٰذا انھوں نے اسلامی تاریخ کو ہجرت سے شروع کرنا مناسب سمجھا اور دوسری تجاویز پر اس رائے کو ترجیح دی، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہجرت نے حق و باطل کے درمیان فرق واضح کر دیا، لہٰذا اس سے تاریخ شروع کرو۔'' (البداية و النهاية: 253/2، و تاريخ المدينة لعمر بن شبة: 758/2) لہٰذا تمام صحابہ کی رائے یہ ہوگئی کہ یہ وہ پہلا وقت ہے جب اسلام کو عزت حاصل ہوئی۔

آپ ﷺ قبا میں چودہ دن رہے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3932) اس دوران میں آپ نے بعض کام سرانجام دیے جن میں سے اہم مسجد قبا کی بنیاد رکھنا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ اور یہ پہلی مسجد ہے جو اسلامی دور میں بنائی گئی۔ اس کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ خود شریک ہوئے اور ظاہر بات ہے کہ آپ نے اس میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔ بلکہ آپ اس میں نماز پڑھنے کی رغبت دلایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''قبا کی مسجد میں نماز پڑھنا عمرہ کے برابر ہے۔'' (سنن ابن ماجه، حديث: 1412) مسجد قبا ہی ﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ﴾ (التوبة 108:9) کا مصداق ہے۔ لیکن اس آیت کے ساتھ مسجد قبا کے تعلق رکھنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ مسجد نبوی سے افضل ہے کیونکہ دونوں کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ بہت سی احادیث میں قباء والوں کا خصوصی وصف ''طہارت'' ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ استنجا

کرتے وقت مٹی کے بعد پانی ضرور استعمال کرتے تھے۔(تفسیر ابن کثیر: 908/1) (اس آیت میں بھی اہل قبا کے اس خصوصی وصف کا ذکر کیا گیا ہے۔) رسول اللہ ﷺ نے پہلا جمعہ مدینہ پہنچنے سے قبل بنوسالم بن عوف کے محلّہ میں پڑھایا اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا۔(سیرت ابن هشام: 493/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 271/2) جس جگہ آپ ﷺ نے جمعہ پڑھایا وہ مسجد مدینہ منورہ میں ہمیشہ سے مسجد جمعہ کے نام سے مشہور رہی ہے اور وہ مدینہ منورہ کے مشہور اور اہم مقامات میں سے ایک ہے۔(المجموعة المصورة لأشهر معالم المدينة المنورة: 148/1)

بنونجار اکیلے آپ ﷺ کے ہم رکاب اور حامی نہیں تھے بلکہ باقی انصار اور مہاجرین بھی آپ کے ساتھ ایک بارعب فوج کی صورت میں اپنی قوت کا اظہار کر رہے تھے جس کی تعداد پانچ سو افراد سے زائد تھی۔(السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 25/2) مدینہ میں آپ ﷺ کا داخلہ رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کے لیے ایک مستقل رہائش گاہ کا آغاز تھا۔ خوشی، سرور اور نور کا آغاز مدینہ منورہ کے باسیوں کے لیے جن کے اکثر گھروں میں اسلام داخل ہو چکا تھا، اس لیے تمام اہل مدینہ حتیٰ کہ نوجوان بالغ عورتیں بھی چھتوں پر چڑھ کر آپ کے جلوس کو دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں؟ ان میں سے محمد ﷺ کون ہیں؟ انھوں نے اس سے قبل کبھی ایسا روح پرور منظر نہیں دیکھا تھا۔ بنونجار کی بچیاں بھی رسول اللہ ﷺ کو خوش آمدید کہنے کے لیے گھروں سے باہر نکلیں۔ وہ بار بار یہ شعر دہرا رہی تھیں ؎

نَحْنُ جَوارٍ مِنْ بَنِي الْنَجَّارِ يَاحَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ

''ہم بنونجار کی بچیاں ہیں۔ کیا ہی خوب ہوا کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی بن گئے ہیں جو بہترین پڑوسی ہیں۔''

مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟'' وہ کہنے لگیں: جی ہاں! اللہ کی قسم! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں بھی تم سے محبت رکھتا ہوں۔''(فتح الباري لابن حجر: 125/15) یہ تھی حقیقی اور خالص محبت جو رسول اللہ ﷺ کو انصار کے چھوٹے بڑے سب کی طرف سے حاصل ہوئی۔ مدینہ تشریف آوری کے وقت ان کی یہ محبت گلیوں اور گھروں میں علی الاعلان ظاہر ہوئی حتیٰ کہ غلام اور نوکر چاکر بھی کہتے پھر رہے تھے: ''اللہ اکبر! اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے آئے۔ اللہ اکبر! اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے آئے۔''(السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 25/2)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو مرد عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور غلام اور نوکر چاکر گلیوں میں بکھر گئے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے: اے محمد! اے اللہ کے رسول! اے محمد! اے اللہ کے رسول (مرحبا!)(صحيح مسلم، حديث: 2009(7522)) اور بعض یوں کہتے پھر رہے تھے: **جَاءَ نَبِيُّ اللّٰهِ جَاءَ نَبِيُّ اللّٰهِ.** ''اللہ کے نبی آ گئے، اللہ کے نبی آ گئے۔''(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3911)

ایک انصاری نوجوان سیدنا براء بن عازب نے نبیٔ کریم ﷺ کے مدینہ داخلے کا منظر دیکھا تھا۔ وہ مدینہ والوں کے جذبات یوں نقل فرماتے ہیں: ''میں نے نہیں دیکھا کہ مدینہ والے کسی چیز سے اتنا خوش ہوئے ہوں جتنا آپ ﷺ کی تشریف آوری سے ہوئے۔''(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 154، و زاد المعاد لابن القيم: 55/3)

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو ہر انصاری آپ کی مہمان نوازی کا شائق تھا اور چاہتا تھا کہ آپ کی مہمان نوازی کا شرف مجھے حاصل ہو اور آپ میرے پاس ٹھہریں، لہٰذا جگہ جگہ لوگ آپ کو روکتے تھے اور ٹھہرنے کی درخواست کرتے تھے۔ وہ آپ کے اکرام و احترام اور دفاع کی قوت ظاہر کرنے کے لیے کہتے تھے: حضور! تشریف لائیے۔ ہم تعداد اور اسلحہ، نیز ساز و سامان اور حفاظت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہیں۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ آپ کی اونٹنی کی مہار تھام لے۔ مگر آپ فرماتے تھے: ''اسے کچھ نہ کہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے (اس کے حکم کی پابند ہے۔) اونٹنی کئی دفعہ اِدھر اُدھر گھومی، بالآخر مسجد نبوی کی جگہ میں بیٹھ گئی۔ اس وقت یہ جگہ گھروں کے پیچھے جانوروں کا کھلا سا باڑا تھا جو بنونجار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بھی کچھ صحابہ اس کے اردگرد نماز پڑھا کرتے تھے۔

(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3932، و السيرة النبوية لابن كثير: 273/2)

چونکہ آپ کی مہمانی کرنے کے خواہش مند بہت زیادہ تھے اور آپ سب کو خوش بھی رکھنا چاہتے تھے مگر سب کو اس سعادت سے بہرہ مند کرنا ناممکن تھا۔ ویسے آپ کی خواہش تھی کہ اپنے دادا کے ننھیال بنونجار کے مہمان بنیں، لہٰذا جلدی سے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی سے آپ کا پالان اتار کر اپنے گھر لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اظہارِ رضا مندی فرما دیا کہ ''آدمی اپنے پالان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔''(سيرت ابن هشام: 491/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 273/2) اس طرح سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے

آپ کی مہمان داری کا شرف حاصل کرلیا۔(طبقات ابن سعد:237/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 280/2)

مدینہ اور اس کے باسی

دورِ جاہلیت میں عربوں میں مدینہ ''یثرب'' کے نام سے مشہور تھا۔(تفسير ابن كثير: 908/1) اس نام کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝﴾

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا، وہ کہتے تھے: بے شک ہمارے گھر تو غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، وہ تو صرف (جنگ سے) فرار چاہتے تھے۔''(الأحزاب 13:33)

لیکن رسول اللہ ﷺ یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس کا نام بدل کر مدینہ رکھ دیا۔ اس نام کا ذکر قرآن مجید میں چار دفعہ آیا ہے۔ مدینہ منورہ کے اور نام بھی ہیں، مثلاً: طیبہ، طابہ، مبارکہ، مشرفہ اور دارالہجرت وغیرہ۔ مدینہ منورہ اور اس کے فضائل کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

(الأحاديث الواردة في فضائل المدينة جمعًا ودراسةً للدكتور صالح بن حامد الرفاعي)

مدینہ منورہ کو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اور دعاؤں کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک دعا یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ»

''یا اللہ! مدینہ ہمیں محبوب بنا دے جس طرح ہمیں مکہ سے محبت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3926)

نیز

«اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا، وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَبْدُكَ

وَخَلِيلُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَإِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَمِثْلِهِ مَعَهُ»

''اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں اور ہمارے شہر میں برکت عطا فرما اور ہمارے لیے ہمارے صاع ومدّ (غلہ) میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ! بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے۔ میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ انھوں نے تجھ سے مکہ کے لیے دعا کی تھی۔ میں تجھ سے مدینہ کے لیے اسی جیسی دعا کرتا ہوں بلکہ اس سے دگنی برکت کی دعا کرتا ہوں۔''

(صحيح مسلم: الحج، حديث: 1373)

رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ سے بہت محبت تھی۔ آپ ﷺ نے اسے حرم اور محفوظ علاقہ قرار دیا تھا۔ صحیح بخاری میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ فلاں سے فلاں جگہ تک حرم ہے۔ اس کے (خودرَو) درخت نہ کاٹے جائیں اور اس میں بے دینی اختیار نہ کی جائے۔ جو اس میں بے دینی اختیار کرے اس پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہو۔''

(صحيح البخاري، فضائل المدينة، حديث: 1867)

جب سے رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے اسی وقت سے اسے اسلامی حکومت کا دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں بھی ایسے ہی رہا، لہٰذا اس دور میں بھی اور بعد میں بھی اس شہر کا پورے جہان پر سب سے زیادہ اثر ہوا۔

مدینہ منورہ میں اوس اور خزرج کے مختلف ذیلی قبیلے اور محلے آباد تھے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے محلے میں رہتا تھا۔ (نهاية الأرب في فنون الأدب للنويري: 311/1) عمومی طور پر ان دو بڑے قبیلوں کے درمیان تعلقات اچھے تھے۔ آپس میں سسرالی رشتے ناتے بھی کرتے رہتے تھے، البتہ کبھی کبھی جنگیں بھی ہوئیں جن میں سے جنگِ بُعاث زیادہ مشہور ہے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3930) ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی آمد کے وقت مدینہ منورہ میں یہودی قبائل اور خاندان بھی اہم حیثیت رکھتے تھے اور ان کی جنگی قوت اور اثر و رسوخ اوس وخزرج سے کم نہ تھا۔ (الحوار في السيرة النبوية ص: 187) اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کے

پیش نظر بہترین طرزِ عمل کا مظاہرہ فرمایا تاکہ بہترین نتائج حاصل ہوسکیں اور صلح پسند معاشرہ وجود میں آئے جس میں سب لوگ عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں، نیز آپ نے مسلمانوں کے درمیان عقیدۂ اسلام کو محبت اور اخوت کی بنیاد بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر باسیوں، جن میں یہودی بھی شامل تھے، کے ساتھ بھی امن و سلامتی کے معاہدے کیے جسے بعد میں ''میثاقِ مدینہ'' کا نام دیا گیا۔

(وثيقة المدينة المضمون والدلالة، كتاب الدُمّز، ص: 29)

رسول اللہ ﷺ مسجد اور حجرات کی تکمیل تک سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر ہی میں رہے۔ یہ ایسا شرف اور فخر ہے جو قیامت تک ان کو حاصل رہے گا۔ دیگر صحابہ اس بارے میں ان پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ ان کا گھر مدینہ منورہ میں کئی ماہ تک رسول کریم ﷺ کا ٹھکانہ، وحی کا مرکز اور اہل ایمان کی اجتماع گاہ بنا رہا۔ سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ اور دیگر انصار کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کی اس قدر عزت افزائی اور اکرام و احترام اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی اور مشرکین مکہ کی طرف سے بدسلوکی اور ظلم وستم کا بہترین معاوضہ اور بدلہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کو مکہ سے نکال کر ان کے گھروں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اِدھر انصار رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کا بہترین استقبال کر رہے تھے اور انھیں اپنا گھر بار اور مال پیش کر کے ان سے بہترین ہمدردی اور غمخواری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یقیناً پوری امت مسلمہ قیامت تک سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور دیگر انصار کو اس اعزاز واکرام پر خراجِ تحسین پیش کرتی رہے گی۔

(طبقات ابن سعد:237/1، والإصابة:402/1، و سير أعلام النبلاء: 402/2)

تعمیر مسجدِ نبوی

مدینہ پہنچنے کے بعد نبیٔ کریم ﷺ کا سب سے اولین کام مسجد نبوی کی جگہ کی حد بندی تھا۔ آپ کی اونٹنی قصواء مسجد نبوی کی جگہ کے سامنے ہی بیٹھی تھی جہاں کچھ لوگ ان دنوں نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔(طبقات ابن سعد:237/1) یہ جگہ کھجوروں کا کھلیان اور سہل و سہیل رضی اللہ عنہما کی ملکیت تھی۔ یہ دونوں یتیم بھائی تھے جو سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے۔ جب آپ ﷺ کی اونٹنی اس جگہ بیٹھی تو آپ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ یہ ہماری قیام گاہ ہوگی۔'' پھر اللہ کے رسول ﷺ نے دونوں بچوں کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ میں

اس جگہ مسجد بنانا چاہتا ہوں۔ بچے کہنے لگے: اللہ کے رسول ﷺ! ہم یہ جگہ آپ کو ہبہ کر دیتے ہیں۔لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا یہ ہبہ (ان کی یتیمی کی وجہ سے) قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ آپ نے یہ جگہ ان سے مول خریدی، پھر یہاں مسجد بنادی۔'' (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3906)

رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ فکر مسجد بنانے کی تھی جس میں ایک اللہ کی عبادت کی جائے۔(مساجد في السيرة النبوية للدكتور سعاد ماهر) آپ کا ذہن یہ تھا کہ ان یتیم بچوں کا مال لیں نہ کسی اور کا۔ اگرچہ آپ تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے تھے مگر اس موقع پر آپ نے قبول نہ کیا بلکہ آپ ﷺ نے (سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو) اپنے مال سے قیمت ادا کرنے کا حکم دیا، لہٰذا قیمت کا تعین کرکے بچوں کو قیمت ادا کی گئی۔ یہ مسجد اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا جو سیدنا مصطفیٰ ﷺ نے کیا، لہٰذا سب سے پہلا کام جو آپ نے سرانجام دیا وہ اپنی مسجد کی جگہ کا انتخاب تھا اور پہلی وہ عمارت جو رسول اللہ ﷺ، مہاجرین اور انصار نے بنائی وہ مسجد قبا کی عمارت تھی جو آپ نے مدینہ منورہ کو آتے ہوئے راستہ میں بنائی۔ مسجد نبوی بھی رسول اللہ ﷺ کے دور میں دو دفعہ بنائی گئی۔ پہلی دفعہ سن یکم ہجری میں مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد اور دوسری دفعہ سن 7 ہجری میں۔ پہلی تعمیر پیمائش اور مضبوطی کے لحاظ سے دوسری تعمیر سے کم تھی۔ آپ نے پہلے زمین کو ہموار کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ تعمیر کے لائق ہو جائے۔ آپ مسجد کی تعمیر میں بذاتِ خود شریک ہوئے۔ تعمیر کے دوران میں آپ صحابہ کے ساتھ مل کر اشعار بھی پڑھا کرتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی تعمیر میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہوتے۔ اس پہلی تعمیر میں آپ نے مسجد کا قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا تھا، پھر تحویل قبلہ کا حکم آنے کے بعد قبلہ بیت اللہ کی طرف بنایا گیا۔

جنگ خیبر کے بعد مزید توسیع کے ساتھ مسجد دوبارہ بنائی گئی۔ رسول اللہ ﷺ کے دور کی مسجد کی حدود اب بھی معروف ہیں اور سبز نشان کے ساتھ واضح کی گئی ہے جسے مسجد نبوی کی زیارت کرنے والا دیکھ بھی سکتا ہے اور پڑھ بھی سکتا ہے۔

مؤاخات اور بھائی چارا

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے درمیان مضبوط تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد

بنیں۔ ایک دوسرے کا احساس کریں، نیز اسلام اور ہجرت کے نتیجہ میں پہنچنے والے ذاتی اور مالی نقصان کی تلافی کریں، اسی لیے منقول ہے کہ سب سے پہلا بھائی چارا ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے درمیان قائم کیا گیا، مثلاً: سیدنا عمر اور ابوبکر، طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان۔ تبھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے اپنے صحابہ کے درمیان بھائی چارا قائم کیا ہے تو میرا بھائی کون ہے؟ فرمایا: ''میں تیرا بھائی ہوں۔'' یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔(السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 52/2، و أنساب الأشراف للبلاذري:270/1، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:240/1، لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے، دیکھیے: سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة للألباني، حديث:351)

جب مسلمان ہجرت کے بعد مدینہ میں امن وسکون سے رہنے لگے تو آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارا قائم کیا۔ راویوں نے ہر صحابی اور اس کے بھائی کے نام ذکر کیے ہیں۔ یہ مؤاخات عموماً ایک انصاری اور مہاجر کے درمیان تھی (سيرت ابن هشام: 505/1) مگر بعض روایات میں مہاجر اور مہاجر کے درمیان مؤاخات کا بھی ذکر ہے۔ ممکن ہے ایسا بعد میں کسی مرحلہ پر ہوا ہو یا مخصوص حالات میں کبھی ایسا کیا گیا ہو ورنہ راجح یہی ہے کہ یہ مؤاخات انصاری اور مہاجر کے درمیان ہی تھی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی

نبی کریم ﷺ کے لیے بیویوں کا انتخاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ اور امت پر خصوصی رحمت ہے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا عمر میں آپ ﷺ سے بڑی تھیں کیونکہ اُس وقت اسی چیز کی ضرورت تھی، حتیٰ کہ جب وحی نازل ہوئی تو وہ بہترین مددگار و غمخوار ثابت ہوئیں۔ وہ آپ ﷺ پر ایمان لائیں، ہمدردی کی اور ضروری مدد کی، نیز آپ کو بہترین مشورہ دیا جو انتہائی حکیمانہ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے ازحد مفید و معاون تھا۔ ظاہر ہے یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی۔ اس کے مقابلہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں واحد کنواری خاتون تھیں اور سب سے کم سن تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں آپ کے لیے خصوصی طور پر تجویز فرمایا کیونکہ وہ سب سے زیادہ حافظے والی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اور دیگر ازواجِ مطہرات کو ایک دوسرا اہم کام

سپرد کیا اور وہ تھا نبیٔ کریم ﷺ سے شرعی مسائل ضبط کرنا اور امت تک پہنچانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ ﴾

''اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور سنت (کی باتیں) پڑھی جاتی ہیں وہ یاد کرو، یقیناً اللہ ہمیشہ سے نہایت باریک بین، خوب باخبر ہے۔'' (الأحزاب 34:33)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صِغرِ سِنّی کا اس بات میں بہت دخل ہے کہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کی طبیعت اور اخلاق میں رنگی گئیں اور آپ نے کئی لحاظ سے ان کی خوب تربیت کی حتیٰ کہ مرضِ وفات میں بھی آپ کی خواہش تھی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی میری تیمار داری کریں اور آپ انھی کے گھر میں رہیں، حتیٰ کہ آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ کا سر مبارک اُن (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) کی گود میں تھا۔ دیگر ازواجِ مطہرات کے مقابلے میں انھوں نے آپ ﷺ سے بہت زیادہ علم حاصل کیا اور یاد بھی رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں عمر بھی لمبی عطا فرمائی حتی کہ انھوں نے امت کی کئی نسلوں کو علم سے بہرہ ور کیا۔ مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی سنت رسول سکھلائی۔ وہ آپ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ انھیں اولاد نصیب نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی نسبت سے اپنی کنیت ام عبداللہ رکھی۔ علاوہ ازیں وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، لہٰذا انھیں بیک وقت رسول اللہ ﷺ اور اپنے والد محترم سے علم حاصل کرنے کا وسیع موقع ملا کیونکہ سیدنا ابوبکر ان کے گھر ہی میں رسول اللہ ﷺ سے ملا کرتے تھے۔ دورانِ سفر بھی ان کو یہ سہولت حاصل ہوتی تھی۔ ظاہر ہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بلکہ پوری آلِ ابوبکر اس شرف پر فخر کرتے تھے کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ (سیر أعلام النبلاء: 135/1)

مدینہ اور مدنی معاشرہ کی ترقی

اسلام کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید و اطاعت کا دور دورہ ہو۔ اس کی عزت بلند مرتبہ ہو جائے، انتظام قوی اور مضبوط ہو، آمدنی بڑھے، علاقہ اور ماحول فساد سے محفوظ ہو جائے، اُس میں انسانی اقدار کا احترام ہو۔ مدینہ منورہ ان تمام خصوصیات میں ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ آپ نے مختلف قوانین نافذ کرکے اسے انتہائی منظّم بنا دیا تھا، نظم کو قائم رکھنے والے معاملات رائج کر دیے تھے اور شہری سہولیات مہیا کر دی تھیں جس کی وجہ سے تمام شہری ایک دوسرے سے بڑھ کر کمائی کرتے تھے اور دوسروں کو عطیات دیتے تھے۔ نکھٹو اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے والے نہ تھے۔ یہ حالات مدینہ میں صاف دیکھے جا سکتے تھے اور مدینہ کی حالت ہجرت نبوی کے بعد بدل گئی تھی اور اس میں بڑی ترقی آ چکی تھی۔ آپ ﷺ نے اصلاح کی ابتدا روحانی معاملات سے کی جن کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

① شہر کے نام کی تبدیلی

اسلام کے دور سے پہلے مدینہ یثرب کے نام سے معروف تھا جس کے معنی ملامت، گڑبڑ اور فساد کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس نام کو ناپسند فرمایا اور اسے بدل کر مدینہ نام رکھنے کا حکم دیا۔ (الأحاديث الواردة في فضائل المدينة للرفاعي، ص:301) ظاہر ہے کہ نام کا بھی شہر کی تہذیب وتمدن اور امن وامان سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ شہریت کے ساتھ تعلق رکھنے والی دوسری چیزیں، مثلاً: علوم، اعمال، نظام اور انصاف وغیرہ بھی اس کے تابع ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شہر کے اور بھی کئی نام رکھے، مثلاً: طابہ، طیبہ، مبارکہ، مشرفہ، دارالایمان، حصینہ (محفوظ و مامون) وغیرہ۔ یہ تمام نام نیک شگون کے لحاظ سے بہترین ہیں۔ اعلیٰ نظریے اور خوبصورتی و جمال

کا مظہر ہیں۔(الأحاديث الواردة في فضائل المدينة للرفاعي، ص: 305)

② مدینہ سے محبت واحترام

رسول اللہ ﷺ کو خاص رغبت تھی کہ مدینہ کو حرم قرار دیا جائے، اس لیے آپ نے مدینہ کی حدود مقرر کیں اور اس کے لیے دعائیں فرمائیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور مکہ والوں کے لیے دعائیں کیں۔ میں نے مدینہ کے دو پتھریلے میدانوں کے درمیان والے علاقے کو حرم قرار دیا ہے۔''(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4084) آپ ﷺ نے دعا بھی فرمائی: ''اے اللہ! مدینہ کو ہمارے لیے محبوب بنا دے جس طرح ہمیں مکہ سے محبت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3926، و صحيح مسلم، الحج، حديث: 1376) اور یہ قطعی بات ہے کہ کسی جگہ کی محبت اس کی حفاظت کا سبب ہے، اس سے اس کی طرف دھیان رہتا ہے اور اسے چھوڑنے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اسی طرح آپ نے مدینہ کے ماحول اور اس کی طبیعاتی زندگی کی حفاظت کے لیے قوانین وضع فرمائے، مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا: ''سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا۔ میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔ اس کے دو پتھریلے میدانوں کا پورا درمیانی علاقہ حرم ہے اور ممنوع علاقہ ہے۔ یہاں سے گھاس نہ کاٹی جائے۔ اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے۔ کوئی شخص یہاں کی گری پڑی چیز نہ اٹھائے علاوہ اس کے جو ہمیشہ اعلان کرے۔ اس جگہ کا کوئی درخت نہ کاٹا جائے مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے اونٹ کو کھلائے اور یہاں لڑائی کے لیے اسلحہ نہ اٹھایا جائے۔''(مسند أحمد: 119/1) نیز فرمایا: ''مدینہ کے دو پتھریلے میدانوں کا درمیانی علاقہ میری زبانی حرم قرار دیا گیا ہے۔'' ایک دفعہ آپ ﷺ بنو حارثہ کے ہاں تشریف لائے اور فرمانے لگے: ''بنو حارثہ! میرا خیال ہے تم حرم سے باہر رہتے ہو۔'' پھر آپ ﷺ نے غور سے دیکھ کر فرمایا: ''نہیں بلکہ تم حرم میں ہی ہو۔''(صحيح البخاري، فضائل المدينة، حديث: 1869) رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے اصل باسیوں، وہاں اقامت اختیار کرنے والوں، پناہ حاصل کرنے والوں اور اس کی طرف ہجرت کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا: ''یقیناً ایمان مدینہ میں پناہ حاصل کرے گا جس طرح سانپ اپنے بل میں پناہ حاصل کرتا ہے۔''(صحيح البخاري،

فضائل المدينة، حديث: 1876، و صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 147) ایک لمبی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ کاش وہ جانتے ہوتے۔''

(صحيح البخاري، فضائل المدينة، حديث: 1875، و صحيح مسلم، الحج، حديث: 1387)

③ آبادی میں اضافہ

اللہ کے رسول ﷺ کی خواہش تھی کہ مدینہ کے رہائشیوں خصوصاً مومنوں کی نسل میں اضافہ ہو۔ اسی لیے ہجرت کے بعد مہاجرین میں سب سے پہلا بچہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پیدا ہوا۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3909، و المغازي لابن أبي شيبة، ص: 152) تو آپ ﷺ انتہائی خوش ہوئے اور دیگر مسلمان بھی۔ قرآن مجید میں ایسی آیات ہیں جن میں بچوں کی حفاظت کا حکم آیا ہے، مثلاً:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝﴾

''اور تم اپنی اولاد کو غریبی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی، بے شک ان کا قتل کبیرہ گناہ ہے۔'' (بنيّ إسرآء يل 31:17)

مطلب یہ کہ غربت کے ڈر سے بچوں کو زندہ درگور نہ کیا جائے کیونکہ اُن کا اور اُن کے والدین کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔ اسی طرح احادیث نبویہ میں بھی مسلمانوں کی کثرت کی اہمیت بیان کی گئی ہے بشرطیکہ بچوں کی اچھی تربیت بھی کی جائے اور ان کو دشمن کے مقابلے کے لیے تیار بھی کیا جائے، مثلاً: ایسی عورت سے شادی کرو جو زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی ہو کیونکہ قیامت کے دن تمھاری کثرت کی وجہ سے میں دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔'' (مسند أحمد: 245/3)

اسلام میں پہلی مردم شماری رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان لوگوں کو شمار کرو جو کلمۂ اسلام پڑھ چکے ہیں۔'' سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے پندرہ سو آدمی شمار کیے۔ یہ دراصل افرادی قوت کی معرفت کے لیے کیا گیا کیونکہ آپ ﷺ ہر فرد کو اُس کی صلاحیت کے مطابق مقرر کرتے تھے۔

یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے ترغیب دلائی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نظم وضبط کے بھی خواہش مند تھے کہ شہر اپنی حدود سے باہر نہ جائے اور اس کی تنظیم وتربیت قائم رہے اور رہائشی ترکیب میں کوئی خرابی برپا نہ ہو۔ اسی لیے جب بعض قبائل مسلمان ہوئے اور انھوں نے مکمل طور پر مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے انھیں اپنے علاقے اور گھروں میں رہنے کا حکم دیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے علم حاصل کریں اور آپ کے احکام کے لیے تیار رہیں۔ (تاريخ المدينة لعمر بن شبة: 2/22-88) اسی طرح فتح مکہ کے بعد ہجرت موقوف کر دی گئی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 347، وتاريخ المدينة لعمر بن شبة: 2/483) تاکہ مدینہ اور دوسرے شہروں میں رہائشی توازن قائم رہے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے اندر بھی رہائشی انتظام اہم تھا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی بنائی اور انصار کو اس کی اور اس میں نماز کی فضیلت کا پتہ چلا تو بنوسلمہ نے ارادہ کیا کہ مدینہ کے اطراف میں واقع اپنے گھروں کو چھوڑ کر مسجد نبوی کے قریب اپنی رہائش گاہوں میں منتقل ہو جائیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اس ارادہ کو پسند نہیں کیا جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بنوسلمہ نے مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند کیا کہ مدینہ غیر محفوظ ہو جائے، لہٰذا فرمایا: ''بنوسلمہ! کیا تم اپنے آثارِ قدم کا ثواب طلب نہیں کرتے؟'' چنانچہ وہ اپنے گھروں میں ٹھہرے رہے۔

(صحيح البخاري، فضائل المدينة، حديث: 1887)

④ روحانی ترقی

رہائشیوں اور شہریوں کی کثرتِ تعداد بے فائدہ ہے اگر ان میں انسانیت اور شخصیت کی طرف توجہ نہ ہو۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ اس بات کے بھی خواہش مند تھے کہ ہر مسلمان فرد کو اپنی شخصیت اور مرتبے کا احساس ہو، البتہ تکبر نہ ہو۔ اس کے ساتھ اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع وخضوع، مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور شفقت اور سب لوگوں کے ساتھ رحمت ومہربانی کے اوصاف بھی ہوں۔ ان اوصاف سے روح کو غذا ملتی ہے اور اسے قوت حاصل ہوتی ہے۔ شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور نفسیاتی معیار بلند ہو جاتا ہے اور اس کی ابتدا اس کی زندگی کے ابتدائی دنوں سے ہونی چاہیے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا نام اچھا ہو جس کے ساتھ اسے پکارا

جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بہترین نام رکھے جائیں۔(موسوعة حقوق الإنسان في الإسلام للدكتور عدنان وزان: 35/5) اور برے ناموں کو اچھے ناموں اور بری کنیتوں کو اچھی کنیتوں کے ساتھ بدل دیا جائے۔ آپ ﷺ نے اپنے دور میں پیدا ہونے والے بہت سے بچوں کے نام رکھے، مثلاً: عبداللہ بن زبیر، حسن بن علی، حسین بن علی وغیرہ رضی اللہ عنہم اور یہ سب مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد ہوا۔ اسی طرح آپ نے بعض صحابہ کے نام تبدیل بھی کیے۔(طبقات ابن سعد: 245/4) اسی طرح آپ نوجوانوں اور عام لوگوں کو ان کے ناموں، لقبوں اور کنیتوں سے پکار کر روحانی خوشی عطا کرتے تھے جو ان کو سب سے زیادہ پسند ہوتے تھے۔ آپ چھوٹے بچوں کو بیٹا کہہ کر پکارتے تھے اور ان کی کنیتیں بھی رکھتے تھے، مثلاً: آپ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی کو یوں پکارتے تھے: ''اے ابوعمیر!'' یہ تو افراد کی بات ہے۔ مجموعی طور پر امتِ محمدیہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے۔'' (آل عمران 110:3) اسی طرح آپ نے پوری امت کو ایک دوسرے سے بلکہ پوری انسانیت سے محبت اور ہر زندہ چیز پر رحمت و شفقت کی تعلیم دی۔

⑤ علمی ترقی

نزولِ قرآن کی ابتدا ہی سے اسلام نے لوگوں کو علم کی طرف توجہ دلائی۔ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی اولین آیات میں علم و قلم کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ ﴾

''وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' (العلق 5,4:96)

ایک وقت تھا جب عربوں پر جہالت، خرافات اور بناوٹی قصے کہانیوں کا غلبہ اور تسلط تھا۔ وہ اس قابل نہ تھے کہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جا سکے حتیٰ کہ عرب میں بسنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ان کا کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن اب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تعلیم و تعلم کی رغبت دلاتے تھے۔ (دیکھیے:

الحركة العلمية في عصر الرسول و خلفائه الراشدين لسيد محمد وكيل) بظاہر اس کا مدینہ کی معاشرت اور علمی ترقی پر گہرا اثر پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی مجلسیں علم وحکمت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھتے تھے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو تم کشادگی کرو، اللہ تمھارے لیے کشادگی کردے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرے گا اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔'' (المجادلة 11:58)

رسول اللہ ﷺ مدینہ کے معلمِ اوّل تھے۔ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے اور دینی احکام سکھاتے تھے۔ دین اسلام ایک مکمل نظام، جامع قانون اور پوری زندگی کے لیے شریعت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں کتاب العلم قائم کیا ہے جس میں وہ 53 باب لائے ہیں اور بہت سی احادیث کے علاوہ بہت سی آیاتِ قرآنیہ کی تشریح بھی ذکر کی ہے، مثلاً:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾

''کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی رکھتا ہے؟ کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔'' (الزمر 9:39)

اسی طرح:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾

''اور وہ (یہود) آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' (بنيٓ إسرآء يل 85:17)

نیز فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝﴾

''اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں سے بھی (ایسے ہیں کہ) ان کے رنگ مختلف ہیں، بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں، بلاشبہ اللہ نہایت غالب، بہت بخشنے والا ہے۔'' (فاطر 28:35)

رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے: ''صرف دو اشخاص پر رشک کیا جا سکتا ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور اسے جائز اور حق کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہو۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے سرفراز فرمایا ہو اور وہ اس کے ساتھ فیصلے کرتا ہو اور دوسروں کو علم سکھاتا ہو۔'' (صحيح البخاري، العلم، حديث: 73) رسول اللہ ﷺ علم حاصل کرنے والوں کو حکم دیتے تھے کہ تم دوسروں کو بھی تعلیم دو، مثلاً: آپ ﷺ نے وفدِ عبدالقیس کو حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تعلیم دیں، نیز فرمایا تھا: ''اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ اور ان کو بھی علم سکھاؤ۔'' (صحيح البخاري، العلم، حديث: 87)

مدینہ منورہ میں کتابت یہودیوں کے ہاں تھی اور وہ بھی ابتدائی درجہ میں۔ وہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور اپنے بیٹوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ ان کے باقاعدہ مدارس تھے۔ (المدينة في العصر الجاهلي لمحمد العيد فطراوي، ص: 99) لیکن وہ عربی زبان بھی عبرانی حروف میں لکھتے تھے، البتہ یہودیوں سے اوس وخزرج کے کچھ افراد نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ (كُتّاب النبي ﷺ لمصطفٰى الأعظمي)

مسلمان ہجرت سے قبل بھی کتابت کا مقام ومرتبہ سمجھتے تھے۔ سیدہ فاطمہ بنت خطاب اور ان کے خاوند سعید بن زید رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ میں سورۂ طٰہٰ ایک صحیفے میں لکھی ہوئی پڑھتے تھے جو ان کے پاس موجود تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (اپنے دورِ کفر میں) اچانک اُن کے ہاں چلے گئے تھے تب ان کے اسلام کا انکشاف

ہوا تھا۔ (سیرت ابن هشام: 345/1) اسی طرح سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اہل صفہ کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ (المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور أكرم العمري، ص: 96) غزوۂ بدر ختم ہونے کے بعد مشرکین قریش کے بہت سے لوگ قیدی بنا لیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن ان کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہیں تھا تو رسول اللہ ﷺ نے تجویز فرمایا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اس طرح انصار کے بہت سے بچے لکھنا پڑھنا سیکھ گئے چونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن وسنت کے لکھنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا، اس لیے اہل مدینہ کتابت میں انتہائی ماہر بن گئے۔ اور نبیٔ کریم ﷺ کے کاتبوں کی تعداد، جنھوں نے قرآن کی کتابت اور اس دور کے بادشاہوں اور دیگر امراء کو خطوط لکھنے میں حصہ لیا، تقریباً 60 تھی۔ (كُتّاب النبي ﷺ لمصطفٰى الأعظمي، ص: 179، والوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة لمحمد حميد اللّٰه، و المصباح المضيئ في كتاب النبي لجمال الدين أبي محمد بن أبي حديدة)

دوسرے لوگوں کے حقوق کی اہمیت اور ان کو تحریر میں لانے کی ضرورت بھی کتابت کا ایک اہم داعی ہے۔ اسی بات کی طرف قرآنِ مجید کی سب سے لمبی آیت جسے ''آیتِ دَیْن'' کہا جاتا ہے، میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــُٔوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۭ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ

فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں ایک مقررہ مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمھارے درمیان انصاف کے ساتھ تحریر کر دے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے اسے لکھنا چاہیے اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے قرض ہو اور اسے اپنے رب، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور (لکھواتے وقت) وہ (مقروض) اس میں سے کوئی چیز کم نہ کرے، پھر اگر وہ جس کے ذمے قرض ہے نادان یا کمزور ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا مختار انصاف کے ساتھ لکھوائے اور تم اپنے (مسلمان) مردوں میں سے دو گواہ بنا لو، پھر اگر دو مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہی دیں) جنھیں تم گواہوں کے طور پر پسند کرو (یہ اس لیے) کہ ایک عورت اگر بھول جائے تو ان میں سے دوسری اسے یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے مقررہ مدت تک لکھوانے میں سستی نہ کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کے لیے زیادہ درست طریقہ ہے اور (اس طرح) تمھارے شک میں پڑنے کا امکان بھی کم رہ جاتا ہے۔ ہاں، تم آپس میں نقد جو تجارتی لین دین کرو، اسے نہ لکھا جائے تو تم پر کوئی حرج نہیں اور جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو اور کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے اور اگر تم (ایسا) کرو گے تو یقیناً یہ تمھاری طرف سے نافرمانی ہو گی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمھیں (یہ احکام) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔'' (البقرة 282:2)

یہ بات بھی مشہور و معروف ہے کہ بعض عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور آپ ﷺ کے دور میں دوسری عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حوصلہ افزائی کی وجہ سے تھا۔ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے سیدہ شفاء بنت عبداللہ، جو کہ قریش کے ایک خاندان بنوعدی بن کعب میں سے تھیں اور مسلمان ہو کر مدینہ ہجرت کر آئی تھیں، سے فرمایا: ''تم حفصہ کو نملہ کا دم کیوں نہیں سکھا دیتی جس طرح تم نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔'' (زاد المعاد لابن القيم: 24/3) ان کے علاوہ اور بھی ایسی عورتیں پائی جاتی تھیں جو دورِ نبوی میں دوسری عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ (الحرف و الصناعات في الحجاز في العصر النبوي، ص: 35) یہ

بات بھی معلوم ہے کہ تعلیم و تعلم کی رغبت دلانا جو کہ قرآنِ مجید اور سنت نبویہ میں واضح طور پر آیا ہے، وہ صرف مردوں کے لیے خاص نہ تھا بلکہ پوری امت کے لیے تھا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پھر وہ کسی بھی جنس، عمر اور جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔

ہجرتِ نبوی سے قبل مدینہ میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد کا ہجرت کے بعد صرف چار سال کے عرصہ میں اس قدر بڑھ جانا صاف بتلاتا ہے کہ مدینہ میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج ہجرت کے بعد ہوا۔ اس میں نبیٔ کریم ﷺ کا براہِ راست اثر بہت زیادہ تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ پہلی تعداد میں تین چار گنا اضافہ ہوا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قراءت اور قلم، علم کا ابتدائی آلہ ہیں۔ اس کی طرف پیارے نبی ﷺ پر نازل ہونے والی اولین آیات میں واضح اشارہ موجود ہے۔

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ ﴾

''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' (العلق 96:1-5)

حالانکہ عین اسی وقت نبیٔ کریم ﷺ کے اُمّی ہونے کو آپ کے حق میں معجزہ قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ؕ ﴾

''اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے۔'' (العنکبوت 48:29)

⑥ معاشرتی ترقی

اسلام اور ہجرتِ نبوی سے قبل مدینہ کا معاشرہ کسی بھی جاہلی عربی معاشرے کی طرح تھا جس پر قبائلی عادات اور رسوم و رواج غالب ہوتے تھے جس میں اکثر رسوم جاہلیت والی ہوتی تھیں، البتہ کچھ اچھی بھی تھیں لیکن جب

رحمۃ للعالمین رسول ﷺ تشریف لائے تو آپ کے ساتھ اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ جمیلہ بھی درآئیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ یہ خوبصورت اخلاق وصفات تمام لوگوں میں پھیل جائیں، لہٰذا مدنی معاشرے میں تبدیلی اور تغیر کا عمل شروع ہوگیا، مثلاً: اجتماعی معاملات میں شرکت وحصہ داری، ذمہ داری کا تعین، صدقہ کی وسعت، محتاج و فقیر لوگوں سے ہمدردی، اجتماعی مفادات میں تعاون، خواہ وہ مہاجرین و انصار کے درمیان ہو یا عام محتاج مسلمانوں میں بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور تعاون۔ (السياسة و المجتمع في العصر النبوي، ص: 233) علاوہ ازیں عفت و پاکبازی اور دوسروں سے مستغنی رہنے کے بارے میں نبوی تعلیمات۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾

''اور وہ جن کے مالوں میں ایک حق مقرر ہے۔ سوالی اور محروم کا۔'' (المعارج 70:24، 25)

کچھ کام ایسے ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کاموں کے خلاف جنگ کی، مثلاً: زنا جسے اسلام نے زبردست حرام قرار دیا ہے اور اس پر سخت سزا نافذ کی ہے۔ یہ معاشرتی بگاڑ کا اہم سبب ہے۔ اس سے نسب ضائع ہو جاتا ہے، نطفے مل جاتے ہیں، روحانی امراض عام ہوتے ہیں۔ ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قطع رحمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر اس کے بارے میں بہت زیادہ سختی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾

''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں تو بلاشبہ (ان کے متعلق) ان پر کوئی ملامت نہیں۔'' (المؤمنون 23:5، 6)

اسی طرح اسلام نے خاوند بیوی کے حقوق مقرر کیے، نیز ایک دوسرے کے احترام اور باہمی طور پر حسنِ سلوک، محبت ومہربانی اور احسان کا حکم دیا، پھر نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ سلوک کرتے ہوئے ان تمام اوصاف کا بہترین مظاہرہ کیا، لہٰذا اس بارے میں آپ زندہ مثال اور نمونہ بن گئے۔

(فن تعامل النبي في الحياة الزوجية، ص: 17)

اسی طرح شراب نوشی بھی معاشرے میں بہت بڑے فساد کا باعث بنتی ہے۔ عربوں میں یہ چیز فخر شمار کی جاتی تھی، حالانکہ یہ بہت زیادہ مشکلات کا سبب ہے، لہٰذا اسلام نے اس کو تدریجاً حرام قرار دے دیا حتیٰ کہ یہ کبیرہ گناہوں میں شامل ہوگئی۔ (صحيح البخاري، كتاب الأشربة، حديث: 5575-5602) اس کی حرمت کی وجہ سے بے شمار لوگوں کے طرزِ عمل میں زبردست تبدیلی آ گئی۔

اسلام اجتماعی روابط میں اضافے کا قائل ہے، اس لیے اس نے صلہ رحمی کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے، نیز رشتہ داروں کا خیال رکھنا، ان سے حسن سلوک کرنا اور ان پر مال خرچ کرنا ثواب کا عظیم سبب بتلایا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ توحید اور عدل بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

”بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو (امداد) دینے کا حکم دیتا ہے اور وہ بے حیائی، برے کام اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں وعظ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم آپس میں عہد کرلو اور قسمیں پکی کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم نے اللہ کو اپنے (عہد) پر ضامن بنایا ہے۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔“ (النحل 16:90,91)

اسی طرح شریعت اسلامیہ نے والدین سے حسنِ سلوک کو شرعاً فریضہ قرار دیا بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو اور اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ ﴾

”اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے اچھا سلوک کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے ہاں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تُو ان سے ”اف“

تک نہ کہہ اور انھیں مت جھڑک اور ان سے نرم (لہجے میں ادب واحترام سے) بات کر۔''
(بنيٓ إسرآء يل 23:17)

شریعت اسلامیہ نے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کو بھی شرعی فریضہ باور کرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝﴾

''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، ساتھ رہنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنی ملکیت کنیزوں اور غلاموں سے بھی نیکی کرو۔ بے شک اللہ ہر اکڑنے والے، غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (النسآء 36:4)

نیز نیکی اور تقویٰ پر تعاون کو معاشرتی اور اجتماعی امتیاز قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ آۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی، نہ حرم میں قربان ہونے والے اور نہ پٹے پہنائے جانوروں کی اور نہ بیت الحرام کا قصد کرنے والوں کی جو اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں صرف اس لیے ان سے زیادتی کرنے پر آمادہ نہ کرے کہ انھوں نے تمھیں مسجد حرام سے روک دیا تھا اور تم نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت عذاب

دینے والا ہے۔'' (المآئدۃ 2:5)

ان تمام احکام نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے معاشرے کی اصلاح اور اجتماعی مفادات میں خوب کردار ادا کیا جس سے معاشرہ ترقی یافتہ بن گیا۔ لوگ ایک دوسرے کی خبر گیری کرنے لگے اور دوسروں کو معاف کرنے کا رواج ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اور وہ لوگ کہ جب ان پر ظلم و زیادتی ہو تو وہ بس بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بلاشبہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (الشوریٰ 40,39:42)

اس سلسلے میں ان تمام پند و نصائح کا بہت دخل ہے جو اخلاق، حسنِ سلوک اور جہلاء سے اعراض کے بارے میں کی گئیں، مثلاً:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔'' (الفرقان 63:25)

نیز فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝﴾

''اور وہ جو جھوٹی شہادت نہیں دیتے اور جب کسی لغو اور بے ہودہ کام سے ان کا گزر ہو تو وہ عزت و وقار سے گزر جاتے ہیں۔'' (الفرقان 72:25)

البتہ اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت اچھے طریقے سے دفاع کا بھی حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝﴾

''اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکا یک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہوجائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔'' (حٰمٓ السجدة 34:41)

شریعت اسلامیہ نے فرد اور معاشرے کے لیے اخلاقِ عالیہ کو اعلیٰ مقصود و مطلوب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا (مذاق اڑائیں)، ہوسکتا ہے کہ وہ (عورتیں) ان سے بہتر ہوں اور تم آپس میں (ایک دوسرے پر) عیب نہ لگاؤ اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو، ایمان (لانے) کے بعد فاسقانہ نام (سے پکارنا) برا ہے۔ اور جس نے توبہ نہ کی تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو، بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔ اور تم ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، پس (ظاہر ہے کہ) تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحجرات 12,11:49)

اسلام نے سب لوگوں کو کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر قرار دیا ہے اور اُن میں کچھ بھی فرق روا نہیں رکھا۔ قرآن نے علانیہ فرمایا کہ تمام انسانوں کی اصل اور مادہ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ

اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝﴾

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔'' (الحجرات 13:49)

نیز تکبر اور دوسروں سے اپنے آپ کو بلند سمجھنا حرام قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝﴾

''اور تو تکبر و غرور سے اپنے رخسار کو لوگوں سے نہ پھیر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ ہر مغرور، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (لقمان 18:31)

اسی طرح معاشرے اور عام زمین کے فائدے کو ہر مسلمان کا عمومی ہدف اور مقصد قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور زمین کی اصلاح کے بعد تم اس میں فساد نہ کرو اور اللہ کو خوف سے اور طمع کرتے ہوئے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔'' (الأعراف 56:7)

ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر ڈٹ جانے کو انسانی فریضہ قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

''زمانے کی قسم! بے شک ہر انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔'' (العصر 103:1-3)

تمام اسلامی عبادات صحیح طرزِ عمل اور اعلیٰ اقدار پیدا کرتی ہیں اور ہر قسم کی برائیوں اور منکرات سے روکتی ہیں، مثلاً: نماز کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) اس کتاب کی تلاوت کیجیے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور بلاشبہ اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔'' (العنکبوت 45:29)

یہ تمام معاشرتی اقدار ہجرت کے بعد مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی برکت کے ساتھ پیدا ہوئیں اور ان کی بنا پر ایسی معاشرتی ترقی اور بلندی حاصل ہوئی کہ انسانیت کی تاریخ نے اس کی کوئی مثال نہیں دیکھی۔

⑦ صحت کی ترقی

مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل یہاں کے باسی صحت کے لحاظ سے بہت سی مشکلات کا شکار تھے۔ بعض بیماریوں کا تعلق آب و ہوا اور ماحول سے تھا۔ خصوصاً بخار جو کہ مدینہ میں عام تھا کیونکہ مدینہ کے اردگرد کھیت تھے جن کی وجہ سے وہاں گڑھے اور تالاب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! مدینہ ہمارے نزدیک محبوب بنا دے جس طرح ہمیں مکہ سے محبت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے صاع اور مُدّ (غلہ وغیرہ) میں برکت عطا فرما اور مدینہ کو ہمارے لیے صحت افزا بنا دے اور اس کا بخار جحفہ میں منتقل کر دے۔'' (صحیح البخاري، فضائل المدینة، حدیث: 1889) اس دعا سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ والوں کی صحت کا بہت فکر تھا۔

رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے انسانوں کی طرح کبھی بیمار پڑ جاتے تھے، البتہ آپ نے لوگوں کو علاج کرنے کی طرف بھی رغبت دلائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری نازل کی ہے اس کی شفا بھی نازل کی ہے۔ (صحیح البخاري، الطب، حدیث: 5678) آپ نے ہمیشہ علاج کروایا ہے اور طبیعی علاج کی تاکید بھی فرمائی ہے، مثلاً: شہد استعمال کرنا وغیرہ۔ آپ ﷺ سے منقول ہے: ''شفا تین چیزوں میں ہے:

① شہد پینا ② سینگی لگوانا ③ آگ سے داغ لگانا۔ ویسے میں اپنی امت کو داغ لگانے سے روکتا ہوں۔‘‘
(صحيح البخاري، الطب، حديث: 5680)

آپ نے ان خرافات کے بارے میں مضبوط موقف اپنایا جو نفسیاتی اور جسمانی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں، مثلاً: بدشگونی اور نحوست، البتہ آپ نے اچھی فال کو مستحسن قرار دیا۔ آپ بعض نباتات کو بطورِ علاج استعمال کرنے کا حکم دیتے تھے، مثلاً: کلونجی وغیرہ۔(الطب النبوي لابن القيم، ص: 229)

پرہیزی علاج کے سلسلے میں آپ ﷺ کا یہ فرمان پیش کیا جا سکتا ہے: ’’جب تم کسی علاقہ میں طاعون کی وباء پڑنے کا سنو تو وہاں مت جاؤ۔ اور اگر کسی علاقہ میں طاعون واقع ہو جائے اور تم پہلے سے وہاں موجود ہو تو وہاں سے مت نکلو۔‘‘(صحيح البخاري، الطب، حديث: 5728) آپ نے صحت، پرہیز اور علاج کے بارے میں اہم قواعد وضع فرمائے، مثلاً: کھانے میں حد سے نہ بڑھا جائے، فرض اور نفل روزے رکھے جائیں، مضر صحت کھانوں سے پرہیز کیا جائے، وغیرہ۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ’’آدم کے بیٹے نے کوئی ایسا برتن نہیں بھرا جو پیٹ سے برا ہو۔ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اُس کی کمر کو سیدھا رکھیں۔ اگر اس نے ضرور زیادہ ہی کھانا ہے تو پھر پیٹ کا ایک تیسرا حصہ کھانے کے لیے، دوسرا حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ سانس کے لیے رکھا جائے۔‘‘(جامع الترمذي، حديث: 2380)

آپ ﷺ مریضوں کے لیے طبیب بلا کر لانے کو درست سمجھتے تھے جیسا کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا۔ جب وہ حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہو گئے تھے۔(طبقات ابن سعد: 137/3، و صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4409) آپ نے قرآنی دموں اور دعا کو بھی جاری رکھا ہے۔ آپ کے زمانے میں سب سے پہلا ہسپتال وجود میں آیا جب سیدہ رُفیدہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا نے غزوۂ خندق کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ کی مسجد میں ایک بڑا خیمہ لگایا جہاں زخمیوں کا علاج کیا جاتا تھا۔(سيرت ابن هشام: 238/3، و الإصابة لابن حجر: 303/4) رسول اللہ ﷺ نے وہاں سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بھی ٹھہرایا تھا جب وہ غزوۂ خندق میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ’’انھیں رُفیدہ کے خیمے میں منتقل کر دو تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کر لیا کروں۔‘‘(سيرت ابن هشام: 238/3)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صفائی اور غسل کے بارے میں جو احکام دیے ان کا بیماریوں کو روکنے اور ان کی وسعت کو محدود کرنے میں بڑا کردار اور حصہ ہے۔ اسی طرح کھانوں کی صفائی اور ان کی حفاظت اور انھیں ڈھانپ کر رکھنے کے احکام وتعلیمات کا بھی انسان کی عمومی صحت کی حفاظت میں بہت زیادہ دخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ختنہ اور بعض جسمانی صفائیوں پر زور دینا بھی بیماریوں اور جراثیم کو روکنے میں بہت معاون ہے، مثلاً: پانچ چیزیں فطرتِ انسانیہ کا تقاضا ہیں۔ ① ختنہ ② زیرِ ناف بالوں کی صفائی ③ ناخن کاٹنا ④ بغلوں کی صفائی ⑤ مونچھیں کاٹنا۔'' (صحيح البخاري، اللباس، حديث: 5889) طب نبوی کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی بنیاد ان احادیث پر ہے جو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے نقل کی گئی ہیں۔ (دیکھیے الطب النبوي لابن القيم، الطب النبوي للذهبي، طبقات الأطباء لابن جلجل، طبقات الانبياء لابن أبي أُصَيْبِعَه)

ان تعلیمات نے مدینہ منورہ پر بہت اثر ڈالا اور مدینہ منورہ کے باسیوں نے ان کو اپنی عام اور خاص زندگی میں داخل کر لیا، لہٰذا ان پر ان کا بہت اثر ہوا۔ اگرچہ آپ کی یہ تعلیمات پوری امت کے لیے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو مدنی معاشرہ زیادہ متاثر ہوا اور دوسروں سے پہلے اُسی میں انقلاب آیا۔ ان تعلیمات کا مدینہ والوں کی جسمانی صحت کی ترقی میں بہت بڑا کردار ہے اور اس کی ابتدا رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے ہوئی اور اس کا اثر آج تک موجود ہے، نیز قیامت تک باقی رہے گا جب اللہ تعالیٰ زمین اور زمین والوں کے وارث بنیں گے۔

⑧ اقتصادی ترقی

رسول اللہ ﷺ بچپن ہی سے محنت اور کمائی کرتے رہے۔ آپ ﷺ نے اجرت پر مکہ والوں کی بکریاں چرائیں تاکہ اپنی کمائی سے اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ان کی اولاد کی پرورش میں تعاون کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا اس نے بکریاں ضرور چرائیں۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے بھی؟ فرمایا: ''ہاں، میں سونے کے چند قیراطوں (قیراط دینار کا بیسواں حصہ ہوتا تھا، فتح الباري: 5/10) کے عوض مکہ والوں کی بکریاں چراتا رہا۔'' (صحيح البخاري، الإجارة، حديث: 2262) پھر جب آپ ﷺ بالغ ہو کر پورے مرد بن گئے تو آپ نے اجرت لے کر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی درخواست پر ان کے مال میں تجارت

کی۔ اسی طرح آپ نے کئی تجارتی سفر کیے۔ کام اور کمائی کرنے کے بارے میں آپ ﷺ کے کئی اقوال مشہور ہیں، مثلاً: ''کسی شخص نے کوئی ایسا کھانا نہیں کھایا جو اس کے ہاتھ کی کمائی سے بہتر ہو اور اللہ کے نبی سیدنا داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔''(صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2072)

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ان انبیاء کی مثالیں بیان فرمایا کرتے تھے جو کوئی نہ کوئی پیشہ اور ہنر اختیار کر کے کمائی کیا کرتے تھے، مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا: ''زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے۔''

(صحيح مسلم، حديث: 2379)

محدثین نے مختلف ابواب قائم کیے ہیں جو ان احادیث نبویہ سے بھرے پڑے ہیں جو محنت اور کمائی کی ترغیب دلاتی ہیں، مثلاً: امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب البیوع میں باب قائم کیا ہے۔ **بَابُ كَسْبِ الرَّجُلِ وَعَمَلِهِ بِيَدِهِ.** ''آدمی کا کمائی کرنا اور اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔'' سنن ابن ماجہ میں ہے: **بَابُ الْحَثِّ عَلَى الْمَكَاسِبِ.** ''کمائی کے کاموں کی ترغیب دلانا۔'' سنن دارمی میں ہے: **بَابٌ فِي الْكَسْبِ وَعَمَلِ الرَّجُلِ بِيَدِهِ.** ''کمائی کرنا اور آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔'' رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں محنت اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے ایک درزی کی کھانے کی دعوت قبول فرمائی۔(صحيح البخاري، الأطعمة، حديث: 5379) نیز آپ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کی بیوی کے گھر رکھا۔(الإصابة لابن حجر: 98/4) اس قسم کے فرامین اور طرزِ عمل کا اہل مدینہ اور دیگر لوگوں کے ذہن بدلنے میں بڑا کردار ہے جو بعض پیشوں اور کاموں کو حقیر سمجھتے تھے، مثلاً: لوہار کا کام وغیرہ۔

(الحرف و الصناعات في الحجاز في العصر النبوي، ص: 43)

اسلام کی مختلف تعلیمات اور تشریعات نے جنھیں آپ ﷺ نے معاشرے میں نافذ کیا، مدینہ کی پیداوار میں اضافے اور اس کی اقتصادی ترقی میں زبردست کردار ادا کیا۔

کافروں سے لڑائی کی اجازت

یہ بات تو شک وشبہ سے بالا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے تمام دینی معاملات و اعمال میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اجازت کا انتظار کرتے تھے۔ دین کے نام پر لڑنا بہت اہم معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ کی دعوتی زندگی کی ابتدا سے ہی سخت قسم کی تکلیفیں جھیلتے رہے۔ انھیں ایذا دی گئی۔ ان کے مال لوٹے گئے۔ بعض مسلمانوں کا خون بھی بہایا گیا، ان میں سے بہت سے افراد قید کیے گئے اور دیگر افراد کو مکہ سے بھگا دیا گیا حتیٰ کہ مسلمان مکہ میں اپنے گھر بار اور مال و منال چھوڑنے اور پہلے حبشہ اور پھر بالآخر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ان تمام حالات کے باوجود رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں اپنے صحابہ کو صبر وتحمل کی تاکید فرمایا کرتے کہ وہ ان مصائب کا اللہ تعالیٰ سے اجر طلب کیا کریں، نیز انھیں پہلی امتوں کے مومنوں کے واقعات یاد دلایا کرتے تھے کہ انھیں اس قدر تکلیفیں دی گئیں کہ وہ جان کی بازی تک ہار جاتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ ان کے دلوں میں کامیابی کی امید روشن رکھتے تھے۔ آپ انھیں خوشخبریاں دیا کرتے تھے کہ اسلام دنیا کے کناروں تک ضرور پھیلے گا اور یہ دین مکمل ہو کر رہے گا اور ہر گھر اور خیمے تک ضرور پہنچے گا۔ نیز مومنوں کے لیے امن وامان کا دور ضرور آئے گا۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اس دین کو لازماً مکمل کر کے رہے گا حتیٰ کہ ایک شترسوار صنعاء سے حضرموت تک اکیلا سفر کرے گا۔ اُسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہو گا۔'' (صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3612، و مسند أحمد: 110/5) اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد ضرور کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔'' (التوبة 33:9)

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے باوجود مشرکین آپ ﷺ کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے اور آپ کے صحابہ کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں بچ رہنے والے مسلمانوں اور مکہ کی زیارت کے لیے آنے والے مسلمانوں پر ظلم وستم اور زیادتی کا سلسلہ بھی جاری تھا، خواہ وہ قریشی تھے یا کوئی اور۔

درحقیقت مدینہ کی طرف ہجرت مسلمانوں کو قوت دینے اور اسلام واہل اسلام کے دفاع کے لیے لشکر سازی کے سلسلے میں ایک نیا مرحلہ تھا، اسی لیے آپ نے بیعت عقبہ ثانیہ میں یہ شرط لگائی تھی: ''میں تم سے اس بات کی بیعت اور عہد لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔'' یہ بیعتِ دفاع تھی خواہ اس کا نتیجہ جنگ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے انھی خطرات کو محسوس کرتے ہوئے انصار سے کہا تھا: ''یاد رکھو آپ ﷺ سے بیعت کا مطلب یہ ہے کہ تم سرخ وسیاہ تمام لوگوں سے جنگ مول لے رہے ہو۔''

ہجرت کے بعد اس نئے مرحلے میں صورتِ حال بالکل واضح تھی۔ اسی لیے مہاجرین اور انصار قربانی دینے اور جہاد کے لیے جہاد کی فرضیت سے پہلے ہی مکمل تیار تھے اور انھیں اپنے جانی و مالی نقصانات کا پورا ادراک تھا۔ اسی طرح قریش کو بھی اس مرحلہ کے نتائج کا پورا احساس تھا تبھی جب مشرکین کو بیعت عقبہ کا پتہ چلا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ہجرت سے روکنے کا پروگرام بنایا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جب یہ مظلوم مسلمان قوت حاصل کر لیں گے تو لازماً جنگیں لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تا کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 30:8)

مشرک جانتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ میں نہ خود لڑائی کی اور نہ اپنے صحابہ کو اس کی اجازت دی۔ مسلمانوں کو مشرکین سے لڑائی یا جہاد کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی۔ قرآنی نص اس پر شاہد ہے۔ اس کا مقصد مظلوم لوگوں کا دفاع اور لوگوں کو کلمۂ حق اور دین کی بات سنانا تھا اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ ان لوگوں سے جہاد کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ کے داعیوں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں اور عوام الناس کو کلمہ لا الہ الا اللہ سنانے سے روکتے تھے یا مسلمانوں کے وطن پر حملے کرتے تھے اور ان کی حرمتوں کو پامال کرتے تھے۔ جہاد کے لیے یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو اور اللہ کا کلمہ بلند کرنا مقصود ہو۔ اس راستے میں جان و مال اور ہر ضروری چیز پیش کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ ﴾

''جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ طاغوت (شیطان) کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال نہایت کمزور ہے۔''

(النسآء 76:4)

مدینہ میں مسلمانوں کے اطمینان کے ساتھ ٹھہر جانے کے کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر خصوصی عنایت فرمائی کیونکہ اب تک مسلمان انتہائی صبر کے ساتھ لڑائی نہ کرنے کے حکمِ الٰہی کے پابند رہے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ پر قرآنی آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو لڑائی کرنے کی اجازت دے دی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ ﴾

''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔'' (الحج 39:22)

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انھیں لڑنے سے روکا گیا تھا، اب اجازت دی گئی، نیز لڑنے کی صرف اجازت دی گئی، اسے فرض نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس آیت میں یہ بھی صراحت ہے کہ مسلمان مظلوم تھے، نیز ان سے مدد کا صریح وعدہ کیا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مسلمانوں پر کئی قسم کا ظلم کیا گیا جن میں سے

ایک کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾

''وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ راہبوں کے خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے، ڈھا دی جاتیں اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔'' (الحج 40:22)

اس آیت میں ایک عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے جو قیامت تک قائم رہے گی، وہ ہے:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔'' (البقرة 251:2)

آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ غلبہ اور جہاد کے لیے بنیادی طور پر افراد کی تربیت اور قوت کی ضرورت ہے۔ اسلحہ اور اس سے متعلقہ چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں قتال اور لڑائی کا مقصد ظلم روکنا ہے نہ کہ زیادتی کرنا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (البقرة 190:2)

نیز فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝﴾

''اور (اے مسلمانو!) تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے، جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار بھیج۔'' (النسآء 75:4)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی شرک کے خلاف جہاد سے بھرپور ہے لیکن اس جہاد سے اس کا عام معنی مراد ہے، یعنی جدوجہد کرنا، البتہ لڑائی کی اجازت کے بعد مشرکوں سے لڑنا بھی جہاد ہے بلکہ جہاد کا اعلیٰ درجہ ہے حتیٰ کہ بہت سے وہ لوگ جنھوں نے حیات و سیرتِ رسول ﷺ کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں، ان کے عنوانات سے یوں سمجھ آتا ہے کہ جہاد اور مغازی (غزوات) سیرتِ نبویہ پر غالب ہیں۔ جب مشرکین مسلمانوں اور نبیِ کریم ﷺ سے لڑائی کرتے تھے تو آپ ان سے کیوں نہ لڑیں؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

''اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔'' (التوبة 36:9)

رسول اللہ ﷺ کے چھوٹے بڑے غزوات وسرایا کی تعداد 60 سے زائد ہے۔ ان میں سے اٹھارہ غزوے ہیں جن کی آپ نے خود قیادت فرمائی۔ اُن میں سے آٹھ میں لڑائی ہوئی۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 353/2، تعداد میں اختلاف کی تفصیل کے لیے دیکھیے: السرايا و البعوث النبوية حول المدينة و المكة، ص: 58)

اس تعداد کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے جس کا ذکر غزوہ اور سریہ کے درمیان فرق کے بیان میں آئے گا۔ اسی طرح یہ بحث کہ کس واقعے کو غزوہ کہا گیا اور کس کو سریہ؟ ورنہ اصل واقعات کے بارے میں

کوئی اختلاف نہیں۔

نبیٔ کریم ﷺ کی زندگی میں جہاد اور مغازی اللہ ورسول کی حکومت قائم کرنے میں انتہائی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی فتوحات کا اہم مقصد لوگوں پر ظلم کا خاتمہ تھا اور یہ کہ سب لوگ کلمۂ حق سننے کا موقع پا سکیں، لہٰذا فتوحاتِ اسلامیہ کا آغاز اس سلسلے میں اہم قدم تھا ورنہ اسلام اس بات کا زبردست داعی ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ''دین میں قطعاً کوئی جبر نہیں۔'' (البقرة 256:2)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہو چکا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔'' (التوبة 33:9)

نیز فرمایا:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾

''اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملک مصر کے) وارث بنائیں۔'' (القصص 5:28)

یہ ایسا حکم ہے جو رب العالمین کی طرف سے جاری کیا گیا۔ قرآن مجید میں بیس سے زائد مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے، نیز اس بارے میں باقاعدہ ہدایات اور احکام نازل ہوئے جن کی تفصیل فقہاء نے بیان کی ہے اور امت نے ان پر عمل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اکثر سابقہ انبیاء سے ایک امتیاز جہاد بھی ہے۔ خصوصاً آپ کا بنفس نفیس مختلف جنگوں میں نہ صرف شریک ہونا بلکہ جنگ کی پوری منصوبہ بندی اور خود قیادت کرنا آپ کا اہم امتیاز ہے۔ (الرسول القائد لمحمود شیث، ص: 6) آپ ﷺ کے جہاد کی عظیم خصوصیت ہے کہ اس میں بیک وقت قوت، رحمت، عدل اور آزادی اپنی پوری شان کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

اگرچہ بعض غلط کار لوگوں نے جن کی عادت مسلمانوں و دیگر لوگوں پر زیادتی کرنا ہے، جہاد کی اصطلاح کو مجرمانہ افعال کے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ صرف ان کا مغالطہ ہے ورنہ اس سے شرعی اور حقیقی جہاد، جو بغیر استثنا کے ہر دور میں جاری رہا ہے، کو دھندلایا نہیں جا سکتا۔ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ امت اسلامیہ ہر وقت اپنے دفاع کے لیے تیار اور مستعد رہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو ملت اسلامیہ کے دشمن اس پر چڑھ دوڑتے اور اس کو بے بس کر دیتے جیسا کہ ہم موجودہ دور میں دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے۔ یہ قطعی بات ہے کہ دین کا دفاع کرنا اور دشمنوں کے مقابلے میں اپنے وطن کی حفاظت کرنا اللہ تعالیٰ کی شریعت کا ایک اہم جز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ﴾

''وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ راہبوں کے خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے، ڈھا دی جاتیں اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔'' (الحج 40:22)

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس مفہوم کو کبھی نہ بھولیں کیونکہ دشمن کو قوت اور جہاد کے ساتھ ہی روکا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف جہاد کا ذکر ہی اسلام کے دشمنوں کو مرعوب کر دیتا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ بہت سے لوگ اسلامی جہاد کے اصل مفہوم کو بگاڑ کر پیش کر رہے ہیں اور اس کی نسبت ایسے اعمال و افعال کی طرف کر رہے ہیں جو حقیقتاً اس سے خارج ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے صحیح مفہوم سے لاتعلق کر دیں بلکہ انھوں نے بہت سے مسلمان بیٹوں کو جہاد اور ظلم و دہشت گردی کے مفہوم سے نامانوس کر دیا ہے کیونکہ وہ ذرائع اطلاعات اور نشر و اشاعت کے اداروں کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔

رمضان کی فرضیت

اسلام سے قبل بھی اہل کتاب کے ہاں روزہ معروف تھا اور اب بھی کچھ اہل کتاب کے نزدیک معروف ہے اگرچہ انھوں نے اس کی کیفیت اور مدت میں اپنی اصل شریعت سے کافی تحریف کر لی ہے۔ ہجرت کے دوسرے سال شعبان میں مسلمانوں پر روزے کی فرضیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ (روزے) گنتی کے چند دن ہیں، پھر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو اس کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے (زیادہ) نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی

واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔'' (البقرة 2:183-185)

لہٰذا روزہ ارکانِ اسلام میں سے چوتھا رکن بن گیا۔

روزہ اور اس کی تفصیلات کے ساتھ بہت سے احکام تعلق رکھتے ہیں اور چھوٹے بڑے مسلمان ماہِ رمضان کریم کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں اور اس کے خاص احکام پر پابندی سے عمل کرتے ہیں، مثلاً: روزہ اور قیام تراویح وغیرہ۔ اس مہینے میں نیکی، اطاعت اور صدقہ کے بہت سے اعمال سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں اب تک بہت سی تالیفات، کتابیں، علمی مقابلے اور مختلف جائزے شائع ہو چکے ہیں۔ لیلۃ القدر رمضان المبارک کی عظیم خصوصیت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: 2013/2) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ ﴾

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔'' (القدر 1:97)

لہٰذا ساری اُمت اس رات کی تلاش میں بہت سے نیک اعمال سرانجام دیتی ہے، مثلاً: قیام (نماز)، صدقہ، صلہ رحمی اور اعتکاف وغیرہ۔ غرض روزہ قیام اور تلاوتِ قرآن کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتا ہے اور ماہِ رمضان نیکیوں، بھلائیوں، صدقات اور بہت سے دوسرے نیک اعمال کا مہینہ بن چکا ہے۔ قیامت تک امت مسلمہ ماہِ رمضان المبارک کے ساتھ یہی سلوک کرتی رہے گی۔ جو شخص بھی رمضان المبارک میں مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ کرے گا کہ ان میں انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسی عظیم تبدیلی آجاتی ہے اور کس قدر سخاوت کے مظاہرے ہوتے ہیں، اسے اُمت کی زندگی میں اس عبادت کی اہمیت اچھی طرح سمجھ آجائے گی۔

قبلہ کی تبدیلی

ہجرت سے قبل اور فوراً بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ شعبان 2 ہجری میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا قبلہ مسجدِ اقصیٰ سے تبدیل کر کے مسجدِ حرام کی طرف منتقل فرما دیا۔ (سیرت ابن هشام: 606/2، و السيرة النبوية لابن كثير: 372/2) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴾

''یقیناً ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں تو ہم آپ کو اس قبلے کی طرف ضرور پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی یقیناً وہ جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو وہ عمل کرتے ہیں۔'' (البقرة 144:2)

یہودیوں اور ان جیسے بے دین لوگوں نے اس اہم موقع پر مسلمانوں کو فتنہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو بے وقوف قرار دیا:

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

''جلد ہی بے وقوف لوگ (یہ) کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلے سے کس چیز نے پھیر

دیا جس پر یہ تھے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔'' (البقرة 142:2)

قبلے کا معاملہ مسلمانوں کے نزدیک معمولی چیز نہیں۔ تمام زمانوں اور علاقوں میں مسلمان نماز سے قبل قبلہ تلاش کرنے کے لیے پوری کوشش کرتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں سفر کرنے والا شخص مساجد میں محراب دیکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قبلہ کی طرف بنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴾

''اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے پاس کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، لہٰذا تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پاؤ۔'' (البقرة 150:2)

موجودہ زمانہ میں تو اہم ہوٹلوں، ہوائی اڈوں اور دیگر پبلک مقامات میں قبلہ کی طرف اشارات موجود ہیں۔ صرف اسلامی ممالک ہی میں نہیں بلکہ غیر اسلامی ممالک میں بھی۔ قبلہ مسلمانوں کا خصوصی امتیاز بن چکا ہے اور ہر جگہ ان کا مطلوب بھی۔

غزوات وسرایا کی ابتدا

مدینہ ہجرت کر جانے کے باوجود قریش مسلمانوں کی ایذا رسانی سے باز نہیں آئے۔ بعض مسلمانوں کو تو وہ مکہ میں قید کر دیتے تھے۔ انصار کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے اور انھیں مکہ جانے سے روکتے تھے۔ جو مسلمان ان کے قابو آجاتا اسے شدید تکلیفیں دیتے تھے۔ ان کی دھمکیاں مدینہ ہجرت کرنے والوں کو بھی پہنچتی رہتی تھیں حتیٰ کہ بعض مہاجرین کو مدینہ سے اٹھا کر بھی لے جایا گیا۔ ان کی یہ دھمکیاں علی الاعلان جاری رہیں۔

ان حالات میں لڑائی کی اجازت والی آیات نازل ہوئیں، اس لیے ضروری تھا کہ اس کی ضروری تیاری کی جاتی، مثلاً: دل کو لڑائی کے لیے تیار کرنا، اسلحہ، جانور، تربیت اور دیگر معلومات مہیا کرنا وغیرہ، پھر غزوات وسرایا کی ابتدا ہوئی۔

قریش کی مسلمانوں کے ساتھ زیادتی اور ظلم تو واضح تھے، لہٰذا مسلمان بھی ہاتھ باندھ کر نہیں رہ سکتے تھے۔ جس طرح قریش نے مسلمانوں اور ان کے مفادات کو زِک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی، مسلمانوں نے بھی لڑائی کی اجازت ملنے کے بعد قریش کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش شروع کر دی کیونکہ قریش کے تجارتی قافلے مدینہ منورہ کے قریب سے گزرتے تھے، لہٰذا مسلمانوں نے ان کا راستہ تنگ کرنے اور اسے پُرخطر بنانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ قریش کو پتہ چل جائے کہ مسلمان بھی اپنے دشمنوں کو روک کر انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

سرایا (فوجی دستے بھیجنا) دراصل مسلمانوں کی جنگی تیاری اور تربیتی کارروائیاں تھیں تاکہ اسلامی لشکر اپنے اہداف حاصل کر سکے۔ ویسے بھی یہ مسلمان جوانوں اور مردوں اور ان کی طاقت کا عملی مظاہرہ تھا۔ خصوصاً مہاجرین جو کہ مدینہ پہنچ چکے تھے۔ ان کے اکثر افراد کے لیے کوئی کام اور مصروفیت نہیں تھی جو انھیں مشغول رکھے، لہٰذا ان کے قائدین اور عوام نے جنگی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ صبر، سفر، مشقت، لڑائی اور اس

کی تیاری کے اوصاف تو ان میں پہلے سے پائے جاتے تھے، اس لیے انھیں اب مناسب موقع مل گیا۔

اولین سرایا

غزوۂ بدر سے پہلے کے سرایا اور غزوات کو اولین سرایا کہا جاتا ہے جو لڑائی کی اجازت کے فوراً بعد ہوئے۔ ان میں مسلمانوں کا غلبہ ظاہر نہیں ہوا۔ یہ تو صرف محدود اور تربیتی کارروائیاں تھیں جو جنگ بدر سے پہلے ہوئیں۔ ان میں سے اہم مندرجہ ذیل سرایا ہیں۔

① سریّۂ حمزہ بن عبدالمطلب (سیف البحر)

یہ ساحلِ سمندر کی طرف ہوا اور ہجرتِ نبوی سے سات ماہ بعد شوال یکم ہجری میں پیش آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اسلامی لشکر کا پہلا جھنڈا بنایا۔ اس لشکر کی قیادت سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے کی اور اس میں صرف مہاجرین شامل تھے۔(سیرت ابن هشام: 595/2) رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس کچھ دور ان کے ساتھ گئے اور انھیں رخصت کیا۔ اس لشکر کا مقصد قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنا تھا جو شام سے واپس مکہ آ رہا تھا۔ اس قافلے میں تین سو قریش مرد تھے۔ ان میں سے ایک ابوجہل بھی تھا۔ بعض مؤرخین نے ان کی تعداد کم بھی بتائی ہے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر جہینہ کے علاقے عیص تک پہنچ گئے لیکن فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ اس علاقے کے سردار درمیان میں آ گئے، اس میں بھی مسلمانوں کا فائدہ تھا۔
(السيرة النبوية للطبري، ص: 105، وسيرت ابن هشام: 172/2، و البعوث و الغزوات النبوية للشنقيطي، ص: 28)

② سریہ عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب

سیدنا عبیدہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد تھے اور بعد میں غزوۂ بدر میں شہید ہوئے۔(سیرت ابن هشام: 706/2) یہ سریہ شوال یکم ہجری میں ہوا۔ اس لشکر میں اسّی افراد تھے جو سب کے سب مہاجر تھے رضی اللہ عنہم۔(سیرت ابن هشام: 591/2) نبیٔ کریم ﷺ نے انھیں سفید جھنڈا باندھ کر دیا۔ یہ لشکر رابغ کے علاقہ میں گیا تھا۔ (مؤرخ ابن ہشام نے ذکر کیا ہے کہ انھیں ثنیۃ المرہ کی طرف بھیجا گیا تھا جو حجاز کا ایک مشہور چشمہ تھا: 591/2) ان کا مقصد بھی قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنا تھا جس کی قیادت ابوسفیان اور عکرمہ بن ابی جہل کر رہے تھے۔ طرفین میں

جھڑپ ہوئی، دونوں طرف سے تیر پھینکے گئے، البتہ براہِ راست لڑائی نہیں ہوئی۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بڑی مہارت سے تیر چلاتے رہے جن سے کئی مشرک زخمی ہوئے، لہٰذا وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تیر پھینکا اور مشرکوں کا خون بہایا۔(سیرت ابن هشام: 591/2) مشرکوں کے اس قافلہ میں دو مسلمان اشخاص بھی تھے۔ وہ ان سے بھاگ کر صحابہ سے آ ملے۔(طبقات ابن سعد: 7/2)

③ سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ

یہ سریہ نخلہ کی طرف گیا تھا۔(مکہ مکرمہ سے ایک رات کے فاصلہ پر ایک مقام ہے:السرايا و البعوث النبوية لأبي مائلة، ص: 95) اس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں 12 مہاجرین کی معیت میں بھیجا۔(سیرت ابن هشام: 601/2) آپ نے ان کے لیے ایک جہت مقرر کر دی اور ایک خط انھیں دیا اور فرمایا کہ دو دن چلنے کے بعد یہ خط کھولا جائے۔ دو دن چلنے کے بعد سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے خط کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا: ''جب تم میرا یہ خط پڑھو تو چلتے رہو حتیٰ کہ نخلہ مقام میں پہنچ جاؤ۔ وہاں قریش کے لیے گھات لگانا اور ان کی خبریں معلوم کرنا۔''(سیرت ابن هشام: 601/2) جب انھوں نے خط پڑھا تو کہنے لگے: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کی ہر بات سنوں گا اور اطاعت کروں گا۔'' پھر انھوں نے اپنے ساتھیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مطلع کیا اور یہ بھی بتایا کہ مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کروں، لہٰذا وہ کہنے لگے: ''تم میں سے جو شخص شہادت کی خواہش رکھتا ہے، وہ میرے ساتھ چلے اور جو ناپسند کرے وہ واپس چلا جائے۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق لازماً جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ چل پڑے اور ان کے تمام ساتھی بھی چل پڑے۔ کوئی بھی پیچھے نہیں رہا۔(سیرت ابن هشام: 601/2) اور وہ سب نخلہ کے راستہ پر مسلسل چلتے رہے۔ (سیرت ابن هشام: 602/2، والبداية و النهاية لابن كثير: 274/3)

سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نخلہ میں مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ ان کے پاس سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ گزرا جن کے پاس چمڑا اور منقّٰی تھا، نیز طائف سے قریش کا تجارتی سامان بھی ان کے پاس تھا۔ اس قافلے میں عمرو بن حضرمی بھی تھا۔ اتفاقاً اس دن رجب کی آخری تاریخ تھی اور عربوں کے نزدیک یہ حرمت والا مہینہ تھا۔ مسلمان دستے نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان سے لڑائی کی جائے تو خطرہ ہے کہ لڑائی حرمت کے مہینہ میں ہو گی اور اگر

لڑائی نہ کی جائے تو قافلہ حرم کی حدود میں داخل ہو جائے گا، پھر ہم کچھ نہ کر سکیں گے، نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ قریش ان کو بچانے کے لیے لشکر نہ لے آئیں۔ بالآخر فیصلہ یہی ہوا کہ قافلے پر حملہ کر دیا جائے۔ حملہ ہوا تو عبداللہ بن حضرمی مارا گیا (سیرت ابن هشام: 603/2، والسيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 119/2) اور دو آدمی قیدی بنا لیے گئے۔ مسلمان دستہ تجارتی سامان اور دونوں قیدیوں کو لے کر مدینہ کی طرف چل پڑا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو لوگوں نے ان پر حرمت کے مہینہ میں لڑنے کے بارے میں اعتراضات کیے۔ اُدھر نبیٔ کریم ﷺ نے بھی فرمایا: ''میں نے تمھیں حرمت کے مہینہ میں لڑنے سے منع کیا تھا۔'' سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی بہت نادم ہوئے کہ ہم تو مارے گئے۔ صحابہ بھی ان پر اعتراض کر رہے تھے۔ منافقوں اور مشرکوں نے بھی بات کو بہت بڑھایا اور مسلمانوں کو طعن و تشنیع کرنے لگے کہ تم نے تو حرمت کے مہینے بھی حلال کر لیے۔ سریہ والوں کے لیے صورتِ حال بہت مشکل ہو گئی تب اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۫ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ اور وہ (کافر) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ حالت کفر ہی پر مر جائے تو انھی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت (دونوں) میں برباد ہو گئے اور وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (البقرة 2:217)

ان آیات کے نازل ہونے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بہت خوش ہوئے اور سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا غم بھی جاتا رہا۔(تفسیر ابن کثیر: 271/1) رسول اللہ ﷺ نے غنیمت وصول کر لی اور اسے مناسب جگہ خرچ کر دیا اور قریش سے دونوں قیدیوں کا فدیہ بھی لے لیا۔(الإصابة لابن حجر: 286/2)

یہ بات قابل غور ہے کہ ان اولین سرایا میں صرف مہاجرین شریک تھے اور ان میں سے بھی اکثر قریشی تھے اور ان سرایا کے قائدین بھی قریشی، نیز نبیٔ کریم ﷺ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ یہ سب دستے قریش کے تجارتی قافلوں کو نقصان پہنچانے اور ان کی تجارت اور اہل تجارت کو تنگ کرنے کے لیے گئے کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مہاجرین کو بے انتہا تکلیفیں دی تھیں اور ان کو ان کے گھروں سے ناحق نکالا تھا، پھر ان کے گھر بار اور مال ومنال پر قبضہ بھی کرلیا تھا، لہٰذا مہاجرین نے بڑے شوق کے ساتھ ان میں شرکت کی اور ان سرایا کا دار و مدار مہاجرین ہی پر تھا۔(السرایا والبعوث النبویة حول مکة و المدینة، ص:61)

نیز ان سرایا میں شریک ہونے والے مسلمان اپنی مرضی اور خوشی سے شریک ہوئے۔ کسی نے ان کو شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ علاوہ ازیں اس مرحلہ پر انصار ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارادہ ان مہاجرین کو مشغول رکھنے کا ہو کیونکہ ان کی تعداد بڑھ چکی تھی، نیز یہ کہ ان کی جنگی تربیت ہو جائے اور انھیں مدینہ منورہ کے اردگرد علاقوں اور راستوں کی واقفیت حاصل ہو جائے کیونکہ ان کی اکثریت کے لیے یہ علاقے اور راستے نئے تھے۔ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ انصار اپنے کھیتوں اور گھر بار میں مشغول تھے۔ ویسے بھی ان کا آپ سے معاہدہ مدینہ اور رسول اللہ ﷺ کا مدینہ میں رہ کر دفاع کرنے کا تھا جیسا کہ بیعت عقبہ ثانیہ کی شقوں سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ بہرصورت اِن سرایا میں شریک ہونے والوں کو قوت اور تجربہ، نیز تربیت اور مشقت کے فوائد حاصل ہوئے۔ علاوہ ازیں انھیں اردگرد کے قبائل اور راستوں کی واقفیت بھی حاصل ہوئی اور بعد میں آنے والے غزوات کے لیے نفسیاتی اور فوجی استعداد میں اضافہ ہوا۔

یہ سرایا قریش کے قافلوں کو نشانہ بنانے میں کامیاب رہے۔ قریش کو پتہ چل گیا کہ ہمیں ایک بڑا خطرہ درپیش ہے اور مسلمان ہمیں روکنے کی قوت رکھتے ہیں اور ہم پر حملہ کر سکتے ہیں جس طرح ہم مسلمانوں، مکہ میں رہنے والوں اور یہاں سے گزرنے والے لوگوں کو تنگ کرتے رہے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے دین سے

برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

کچھ سریے تو مکہ سے انتہائی قریب، مکہ اور طائف کے درمیان ہوئے۔ کچھ ساحل سمندر پر مکہ کے شمال اور مغرب میں ہوئے۔ ان سریوں سے مکہ والوں کو یہ دھمکی دی گئی کہ خود مکہ بھی ہماری زد میں ہے اور ان کے تجارتی راستے بھی جہاں سے وہ گزر کر جاتے ہیں، نیز ہم مکہ کو ہر طرف سے گھیر سکتے ہیں خصوصاً شمال، مغرب اور مشرق کی جانبوں سے۔

اولین غزوات

غزوۂ بدر، جو سیرت نبویہ ﷺ بلکہ پوری عالمی تاریخ میں واضح فرقان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی ایسی فیصلہ کن جنگ، جس نے بہت سے معاملات کا فیصلہ کر دیا۔ اس غزوے سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ نے کئی غزوات کیے جن کی قیادت بذاتِ خود فرمائی۔ ان سرایا کے علاوہ جن کی قیادت کسی نہ کسی صحابی کے سپرد کی گئی۔ ان غزوات وسرایا کے مقاصد اور اہداف ایک جیسے تھے، یعنی دوسرے علاقوں سے قریش کی تجارت منقطع کر دینا اور ان کے تجارتی قافلوں کو نشانہ بنانا اور قریش کے سامنے مسلمانوں کی قوت کا اظہار کرنا کہ مسلمان نہ صرف اپنا دفاع کر سکتے ہیں بلکہ مکہ میں اپنے مقبوضہ مال واپس لینے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

① غزوۂ اَبواء

ابواء ایک بستی تھی جو مدینہ سے 23 میل کے فاصلے پر واقع تھی (سیرت ابن هشام، ص: 195) یہ غزوہ ہجرتِ نبوی سے تقریباً 12 ماہ بعد صفر 2 ہجری میں ہوا۔ اس میں جھنڈا سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا گیا۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 356/2) آپ ﷺ مہاجرین کو لے کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے گئے۔ اس تجارتی قافلے کا قائد اُمیہ بن خلف تھا جو قریش میں آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس غزوے میں نبیٔ کریم ﷺ کو کسی جنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، البتہ اس سفر میں آپ کی ملاقات بنوعبدمناۃ کے ایک قبیلہ بنوضمرہ سے ہوئی۔ آپ نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ (الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة، ص: 262، والبعوث والغزوات للشنقيطي، ص: 31) رسول اللہ ﷺ بغیر کوئی کارروائی کیے لوٹ آئے۔ (سيرت ابن هشام: 591/2-598)

② غزوۂ عشیرہ

یہ مدینہ کے مغرب میں ینبع کے قریب ایک جگہ ہے جہاں بنو مدلج رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے 200 صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر جمادی الاولیٰ 2 ہجری میں نکلے۔(سیرت ابن هشام: 174/2) آپ ﷺ نے کسی کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کیا۔ اس غزوے کا مقصد اور نشانہ قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ تھا جو بہت سا مال تجارت اکٹھا کر کے شام کو جا رہا تھا لیکن آپ کے پہنچنے سے پہلے یہ قافلہ گزر چکا تھا۔ آپ ﷺ بنو مدلج کے علاقے میں پہنچے۔ یہ لوگ بنوضمرہ کے حلیف تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بھی دوستی اور مدد کا معاہدہ کر لیا۔

(سیرت ابن هشام: 591/2، و السیرة النبویة لابن کثیر: 362/2)

③ غزوۂ سفوان

بدر کے علاقہ میں سفوان ایک مشہور وادی ہے۔(سیرت ابن هشام: 601/2، والطبقات ابن سعد: 9/2) غزوۂ سفوان کو بدرِ اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوۂ عشیرہ سے واپس آنے کے چند دن بعد کُرز بن جابر فہری نے مدینہ کے ان جانوروں پر حملہ کر دیا جو مدینہ سے باہر چرنے جا رہے تھے۔ وہ ان کو لوٹ کر لے گیا۔ اس مقام کا نام سرح تھا۔(سرح ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو چراگاہ کی طرف جاتے ہیں۔ تاج العروس للزبیدی: 163/2) رسول اللہ ﷺ نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ آپ ﷺ کا جھنڈا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اٹھایا ہوا تھا۔ آپ کرز بن جابر فہری کو جا ملے مگر وہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ آپ بدر کے قریب سفوان مقام تک پہنچے، پھر واپس لوٹ آئے۔ یہ کرز بن جابر فہری بعد میں مسلمان ہو گئے اور بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر خوب جہاد کیا اور فتح مکہ کے موقع پر شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ (الإصابة لابن حجر: 290/3)

غزوۂ بدر

یہ غزوہ 17 رمضان المبارک 2 ہجری میں ہوا۔ یہ جنگ مطلق طور پر اسلامی تاریخ میں مشہور ترین جنگ شمار کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یوم الفرقان (حق و باطل میں فرق کر دینے والا دن) فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان

ہے: ﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾

''اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے (بدر) کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔'' (الأنفال 41:8)

ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت میں بھی اسی کا ذکر ہے:

﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ ﴾

''جس دن ہم بہت بڑی پکڑ پکڑیں گے، یقیناً ہم انتقام لینے والے ہیں۔'' (الدخان 16:44)

اس جنگ کا سبب یہ بنا کہ رسول اللہ ﷺ قریش کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے اور ان کی گھات میں رہتے تھے کیونکہ انھوں نے آپ کو بہت تکلیفیں دی تھیں۔ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا اور ان کے مالوں پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا، نیز انھوں نے بعض مسلمانوں کو قید میں رکھا ہوا تھا اور بعض کو سخت تشدد کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ آپ کو پتہ چلا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ آ رہا ہے۔ اس کا راستہ مدینہ کے قریب پڑتا تھا، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے موجود صحابہ کو اپنے ساتھ جانے کی ترغیب دلائی۔ (فتح الباري: 147/15، و سيرت ابن هشام: 606/2) آپ ﷺ بڑی جلدی ان کو لے کر نکلے۔ جنگ کی کوئی تیاری بھی نہ تھی۔ آپ کے ساتھ تین سو دس سے زیادہ افراد تھے۔ (فتح الباري: 156/15) ان میں سے اکثر پیدل تھے، لشکر میں صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ (المغازي للواقدي: 27/1، و طبقات ابن سعد: 12/2) وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے قافلے کو قابو کرنا ہے اور وہاں کوئی لڑائی نہیں ہو گی۔ اسی لیے وہ جنگ کے لیے مکمل تیار بھی نہ تھے۔ قریش کے اس قافلے کا قائد ابوسفیان بن حرب تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے قافلے کی طلب میں نکل چکے ہیں، لہٰذا اس نے اپنا راستہ بدل لیا اور اپنے قافلے کو ساحل کے قریب ایک اور راستے پر لے گیا جس کی مسلمانوں کو توقع نہ تھی۔ اسی دوران اس نے مکہ میں پیغام بھیج دیا کہ اپنے قافلے کو مسلمانوں سے بچانے کے لیے نکلو۔ قریشی لشکر بڑی تیزی کے ساتھ اپنے قافلے کو بچانے نکلا۔ اس لشکر کا سردار ابوجہل عمرو بن ہشام تھا۔ اس کے ساتھ قریش کے بڑے بڑے سردار اور مانے ہوئے بہادر بھی نکلے۔ یہ سب کفر کے امام تھے۔ (فتح الباري: 137/15، وسيرت ابن هشام: 609/2، والطبقات ابن سعد: 13/2) اِدھر ابوسفیان اپنا قافلہ مسلمانوں

سے بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور امن و امان کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے فوراً اپنا ایک قاصد مکہ والوں کی طرف بھیج دیا کہ قافلہ بچ کر نکل آیا ہے، لہٰذا تم مکہ لوٹ آؤ۔ لیکن کفار قریش کا بڑا سردار ابوجہل اپنے تکبر، غرور اور چیلنج پر مصر رہا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ہم واپس نہیں جائیں گے بلکہ بدر کے میدان میں پہنچ کر اونٹ ذبح کر کے کھائیں گے اور شرابیں پئیں گے، ہماری لونڈیاں گانے گائیں گی، عربوں کو ہماری اس کارروائی کا پتہ چلے گا تو ہمیشہ کے لیے ہماری ہیبت قائم ہو جائے گی۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝﴾

''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوا کرتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔'' (الأنفال 47:8)

لہٰذا وہ لشکر اپنے اعلان کردہ ہدف، یعنی بدر کی طرف چلتا رہا۔

(سیرت ابن هشام: 618/2، والطبقات ابن سعد: 13/2، والمغازی للواقدی: 42/1)

ابوجہل رسول اللہ ﷺ کے صدق کو خوب جانتا تھا۔ جب وہ بدر کے دن اللہ کے رسول ﷺ کے مقابلے میں جا رہا تھا تو اس کے ساتھیوں نے اسے کہا: ''تُو جو محمد (ﷺ) کے مقابلہ میں جا رہا ہے، کیا تُو جانتا ہے کہ وہ نبی ہے؟'' وہ کہنے لگا: ہاں لیکن ہم عبدِ مناف کے تابع کیسے ہو سکتے ہیں؟'' (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 199)

آپ ﷺ کو قریش کی روانگی کا پتہ چل گیا۔ آپ نے اپنے صحابہ کو مشورہ کے لیے اکٹھا کیا۔ آپ باوجود اس کے کہ معصوم تھے اور آپ کو ہمیشہ صحیح بات ہی سجھائی جاتی تھی، ہمیشہ اپنے اہم امور میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے تھے۔ اس کے کئی فوائد ہیں جن میں سے دو اہم ہیں: ① مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد اور ان کی حوصلہ افزائی اور یہ انتہائی اہم چیز تھی خصوصاً اس مرحلہ میں انصار کے ساتھ کیونکہ وہ دارالاسلام کے اصل باسی تھے۔ ② زیادہ صحیح اور زیادہ حکمت والی بات تک پہنچنا۔ آپ نے یہ معاملہ تمام موجود صحابہ پر پیش کیا۔ فرمایا: ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔'' بہت سے مہاجرین نے اظہارِ خیال کیا جن میں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما بھی

شامل تھے۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں سیدنا مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! ہم آپ سے وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی: ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ''(چنانچہ) تو اور تیرا رب جاؤ، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' (المآئدة 24:5) لیکن ہم کہیں گے آپ بھی چلیں اور آپ کا رب کریم بھی ہم آپ کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ قسم اُس کی جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ ہمیں برکِ غماد تک بھی لے چلیں تو ہم راستے میں آنے والے ہر فرد سے لڑیں گے حتیٰ کہ آپ وہاں تک پہنچ جائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دعا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔'' دراصل آپ انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ شہر مدینہ کے اصل باسی تھے، نیز اکثریت بھی ان کی تھی۔ آپ کا مقصد تھا کہ ان کے دلوں کی بات معلوم کی جائے، نیز وہ مطمئن رہیں تاکہ مسلمانوں کی یکجہتی قائم رہے کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہی لشکر مہاجرین و انصار کا قریش اور ائمۂ کفر سے پہلا مقابلہ تھا جس میں جنگ اور موت صاف نظر آ رہی تھی، لہٰذا سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فوراً کہنے لگے: ''شاید آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' سیدنا سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کرتے ہوئے جواب دیا: ''اللہ کے رسول! ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔ آپ جہاں جانا چاہتے ہیں، چلیں۔ قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے! اگر آپ ہمیں سمندر لے چلیں اور اس میں داخل ہو جائیں تو اللہ کی قسم! ہم آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہمیں کوئی انکار نہیں اگر آپ ہمیں لے کر کل ہی دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ یقیناً ہم جنگ میں ڈٹ جانے والے اور مقابلے کے وقت قائم رہنے والے ہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری جانب سے ایسے کارنامے دکھائے گا کہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، لہٰذا اللہ کا نام لے کر چل پڑیں۔'' (سیرت ابن هشام: 615/2، والمغازی لابن أبي شيبة، ص: 177، و السيرة الصحيحة للدكتور أكرم العمري: 359/2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی بات سن کر کھل اٹھے اور انھیں اور دیگر مہاجرین و انصار کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ آپ کو اپنے لشکر کی طرف سے جنگ کے موقف پر پورا اطمینان ہو گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سمیت چل پڑے۔ آپ فرما رہے تھے: ''چلو! چلو! اور خوش ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ قافلے اور لشکرِ مشرکین میں سے ایک پر تمھیں ضرور غلبہ حاصل ہو گا۔'' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ ﴾

''اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔'' (الأنفال 7:8)

پھر رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سمیت بدر کی طرف چل پڑے۔ انھیں یقین تھا کہ ہم قریش کا تجارتی قافلہ حاصل کر لیں گے یا قریشی لشکر پر فتح یاب ہوں گے۔ مسلمان بدر کے قریب ٹھہر گئے، وہ دشمن کے بارے میں خبریں معلوم کرتے رہے۔ آپ ﷺ کو پتہ چل گیا کہ دشمن لشکر کی تعداد 900 سے 1000 تک ہے۔ نیز یہ کہ لشکر میں کون کون سے سردارانِ قریش شامل ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمھارے لیے ڈال دیے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو یقین آ گیا کہ مقابلہ مسلح لشکر سے ہو گا جس میں مکہ کے بہادر اور شاہ سوار موجود ہیں، نیز یہ کہ قافلہ نکل چکا ہے۔

سیدنا حباب بن منذر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مسلمان بدر کے پانی کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بڑے ادب کے ساتھ آپ کے سامنے ایک درست تجویز پیش کرنے آئے تھے۔ وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! کیا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ٹھہرایا ہے؟ یا یہ آپ کی رائے اور جنگی تدبیر ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف میری رائے اور جنگی تدبیر ہے۔'' وہ کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! یہ جگہ ٹھہرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو یہاں سے اٹھا کر دشمن کے قریب ترین پانی پر جا ٹھہرائیں۔ وہاں ٹھہر کر ہم اردگرد کے کنوؤں کا پانی گہرا کر دیں گے۔ ہم اس کنویں پر حوض بنا کر اسے پانی سے بھر لیں گے۔ اس طرح ہم پانی پئیں گے، دشمن لشکر پانی نہ پی سکے گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے انھیں دعا دی اور فرمایا: ''تم نے صحیح تجویز پیش کی ہے۔'' (سیرت ابن هشام: 620/2) رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل میں ایک بہت بڑا

سبق ہے کہ زیادہ محفوظ موقف تک پہنچنے کے لیے قائد کو اپنے ایک عام فوجی کی بات بھی سننی چاہیے، نیز اللہ تعالیٰ پر توکل کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب اور مادی ذرائع کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔ یہ طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کی تمام کارروائیوں میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو بہت سے سردارانِ قریش کی ہلاکت کی خبریں دے رہے تھے اور انھیں وہ جگہیں دکھا رہے تھے جہاں وہ گر کر مریں گے۔(المغازي للواقدي: 49/1، وسيرت ابن هشام: 615/2، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 206) اس بات نے مسلمانوں کے یقین کو مزید بڑھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور آئے گی۔ صحابۂ کرام نے آپ ﷺ کے لیے ایک چھپر سا بنا دیا تھا جس میں آپ کسی بھی وقت نماز اور دعا کے لیے تشریف فرما ہو سکتے تھے۔(فتح الباري: 254/18، والمغازي للواقدي: 49/1، اب اس جگہ زائرین کے لیے بڑی مسجد بنا دی گئی ہے۔) اگرچہ آپ ﷺ تو ہمیشہ لڑائی کے دوران میں اگلی صف میں موجود رہا کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ سب بہادروں سے بڑے بہادر تھے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے قریش بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ جب وہ آئے تو آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! یہ قریش اپنے تکبر اور غرور وفخر میں تیری مخالفت کرنے اور تیرے رسول کی تکذیب کرنے کے لیے آئے ہیں، لہٰذا جس مدد کا تُو نے وعدہ کر رکھا ہے، وہ آج درکار ہے۔ یا اللہ! کل صبح انھیں الٹا دے۔''(المغازي للواقدي: 59/1، والمغازی لابن أبي شيبة، ص: 18)

قریش کے بعض دانا لوگوں نے اپنی قوم کو جنگ سے روکنے کی کوشش کی اور مکہ واپسی پر مطمئن کرنا چاہا لیکن ابوجہل اور اس جیسے چند ائمۂ کفر نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا بلکہ قریش کو ضد اور بدتمیزی پر پکا رکھا تاکہ اللہ تعالیٰ وہ فیصلہ فرما دے جو لکھا جا چکا تھا۔(سيرت ابن هشام: 622/2، و المغازي للواقدي: 63/1)

مسلمانوں نے بدر کی رات اللہ سے دعائیں کرتے اور اس کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے گزاری کہ یا اللہ مدد فرما اور دشمنوں پر فتح نصیب فرما! اللہ تعالیٰ نے ان پر سکون و اطمینان نازل فرما دیا، لہٰذا وہ بالکل مطمئن ہو کر سکون سے سوئے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ہلکی ہلکی بارش بھی اتار دی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ﴾

''(یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن وسکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسے کو لے جائے اور تاکہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے۔'' (الأنفال 11:8)

رسول اللہ ﷺ اس رات نماز پڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے دعا کرتے رہے اور روتے رہے۔ اُس رات یا اگلی صبح آپ ﷺ نے چھپر میں جو دعائیں کیں ان میں سے ایک یہ ہے: ''اے اللہ! میں تجھے تیرے عہد اور وعدے کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے تو آج کے بعد کبھی تیری عبادت نہیں ہوگی۔'' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''اللہ کے رسول! آپ کو اتنی دعائیں کافی ہیں۔ آپ نے اپنے رب سے بہت اصرار کیا ہے۔'' یہ سن کر آپ نکلے۔ آپ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے:

﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ ﴾

''عنقریب وہ جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے۔''

(القمر 45:54. فتح الباري: 254/18)

اُدھر مشرکین قریش نے سیر ہو کر کھاتے، شرابیں پیتے، لونڈیوں کے گانے سنتے، اپنی قوت اور مادی فضیلتوں پر فخر کرتے ہوئے رات گزاری، نیز وہ اپنے کفر، شرک اور اللہ و رسول کی مخالفت پر پکے تھے۔ ابوجہل اپنے خلاف یوں بددعا کر رہا تھا: ''اے اللہ! جو ہم میں سے زیادہ رشتے توڑنے والا اور غیر معروف دین لانے والا ہے، اسے صبح اوندھا کر دے۔'' تب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾

''(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے ہو تو تحقیق فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک

اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔'' (الأنفال 19:8. المغازي لابن أبي شيبة، ص: 184)

جنگ والے دن کی صبح مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے خطاب فرمایا اور انھیں لڑائی اور مضبوط رہنے کی ترغیب دلائی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 187) پھر رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود مسلمانوں کی صفوں کو ترتیب دیا اور انھیں ہدایات دیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی: جب وہ تمھارے بالکل قریب آ جائیں تب ان پر تیر چلاؤ۔ اپنے تیر بچا کر رکھو، فضول ضائع نہ کرو)۔ (فتح الباري: 173/15) آپ ﷺ کو تیر اندازی بہت مرغوب ومحبوب تھی۔ آپ لوگوں کو بھی اس پر ابھارا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ صفیں سیدھی کر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ سیدنا سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف سے الگ کھڑے ہیں۔ (الإصابة لابن حجر: 95/2، وأسد الغابة لابن الأثير: 374/2) آپ ﷺ نے انھیں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تیر کے ساتھ صف میں برابر کر دیا اور فرمایا: ''سواد! سیدھے ہو کر کھڑے ہو۔'' وہ کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے بدلہ لوں۔'' آپ ان کے سامنے اپنا پیٹ مبارک ننگا کر دیتے ہیں تاکہ وہ بدلہ لے سکیں لیکن وہ آپ کے پیٹ کو بوسے دینے شروع کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''سواد! ایسے کیوں کیا؟'' وہ گزارش کرتے ہیں: ''اللہ کے رسول! حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں، میرا ارادہ تھا کہ میری آپ سے آخری ملاقات اس طرح ہو کہ میرا جسم آپ کے برہنہ جسم مبارک سے لگے۔'' آپ ﷺ نے انھیں دعا دی۔ (المغازي للواقدي: 56/1، 57، والإصابة لابن حجر: 95/2)

صحابہ رضی اللہ عنہم انتظار کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ لڑائی شروع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں لیکن رسول اللہ ﷺ پھر چھپر میں چلے گئے اور دعا کرنے لگے: ''اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہو گئی تو کبھی تیری عبادت نہ ہو گی۔ اے اللہ! فوری طور پر وہ وعدہ پورا فرما جو تُو نے مجھ سے کر رکھا ہے۔'' (فتح الباري لابن حجر: 254/18) آپ ﷺ بار بار یہ دعا کرنے لگے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس ہی کھڑے تھے۔ انھیں آپ پر ترس آنے لگا۔ وہ کہنے لگے: ''اللہ کے نبی! بس کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔'' پھر آپ ﷺ کو اونگھ سی آئی۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! خوش ہو جاؤ، اللہ کی مدد آ چکی ہے۔ یہ جبریل علیہ السلام اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے اسے لا رہے ہیں۔'' آپ کے لشکر میں تشریف لانے پر مسلمان بہت خوش

ہوئے۔آپ یہ آیات پڑھ رہے تھے:

﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝ ﴾

''عنقریب وہ جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے۔ بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت اور نہایت تلخ ہے۔''

(القمر 45:54، 46. صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4877، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 180)

رسول اللہ ﷺ لوگوں کو لڑائی پر ابھارنے لگے۔ جنت کا وعدہ فرمایا اور انھیں فرشتوں کے نازل ہونے کی خوشخبری دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ ﴾

''(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا۔'' (الأنفال 9:8)

نیز فرمایا:

﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾

''(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، لہٰذا تم ان لوگوں کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا، پس تم (ان کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر (ہر) پور پر ضرب لگاؤ۔ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الأنفال 13,12:8)

اِدھر قریش نے بھی اپنی صفیں درست کر لیں اور لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں دیکھا کہ شاید ان میں کوئی عقل مند آدمی ہو۔ واقعتاً ان میں ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار ان سے بحث کر رہا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ان میں کوئی عقل مند ہوا تو وہ سرخ اونٹ والا ہوگا۔'' سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''یہ عتبہ بن ربیعہ ہے۔'' اس نے واقعتاً انھیں لڑائی سے روکا تھا لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 187)

ایک قریشی نے مسلمانوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے پانی پینے کی کوشش کی لیکن سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔(سیرت ابن هشام: 624/2، و المغازي للواقدي: 68/1) پھر جنگ کا پہلا مقابلہ مشرکین کی طرف سے شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور مسلمانوں کی طرف سے سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے درمیان ہوا۔ یہ تینوں مسلمان آلِ نبی ﷺ میں سے تھے۔ مقابلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تینوں مشرک مارے گئے اور سیدنا عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے، پھر بعد میں وہ شہید ہو گئے۔ گویا اہل بیت ہی نے سب سے پہلے جنگ کی اور سب سے پہلا شہید بھی انھی میں سے ہوا۔

پھر دونوں فریق ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کنکریوں کی ایک مٹھی اٹھائی اور کافروں کی طرف پھینک دی اور فرمایا: ''یہ چہرے بگڑ جائیں۔''(سیرت ابن هشام: 706/2) اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

''تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''(الأنفال 17:8)

پھر فریقین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ اگلی صفوں میں تھے حتیٰ کہ صحابہ بھی آپ ﷺ کی اوٹ میں تیروں سے بچتے تھے۔ اس جنگ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد نے بہادری کے اعلیٰ کارنامے سرانجام دیے۔ مسلمانوں کی فتح کی علامات ظاہر ہو چکی تھیں اور مشرک شکست کھا کر پیچھے ہٹ چکے تھے۔ ان کے بڑے بڑے سردار مارے جا چکے تھے، مثلاً: ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، اُمیہ بن خلف اور دیگر

کفارِ قریش جن کی تعداد 70 کو پہنچ گئی۔ زندہ بچنے والے مشرکین پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔(فتح الباري: 167/15، و سيرت ابن هشام: 631/2-638، والمغازي للواقدي:88/1-100)

مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کے بعد بدر میں تین دن ٹھہرے اور اپنے شہداء دفن کیے جن کی تعداد چودہ تھی۔(سيرت ابن هشام: 706/2، 707، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 204، 206، و شهداء غزوة بدر الكبرٰى لمحمد بن عبدالله الصبحي) آپ ﷺ نے سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنی اونٹنی پر خوشخبری دینے کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا۔ مسلمان تو اس خوش خبری سے بے انتہا خوش ہوئے مگر منافق اور یہودی بھڑک اٹھے۔ انھوں نے اس خبر کی تصدیق نہ کی۔(المغازي لأبن أبي شيبة، ص: 192)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مجاہدین سمیت صحیح سالم غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس لوٹ آئے۔ مسلمانوں نے خوشی کے جذبات کے ساتھ آپ کا زبردست استقبال کیا کہ آپ ﷺ سلامت رہے اور مسلمانوں کو واضح فتح حاصل ہوئی۔(سيرت ابن هشام: 643/2، و المغازي للواقدي: 144/1) ان کے ساتھ قریش کے 70 قیدی بھی تھے۔ آپ نے اپنے صحابہ کے ساتھ مشورہ فرمایا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ صحابہ کہنے لگے: اللہ کے رسول ﷺ! ہم ان سے فدیہ لے لیتے ہیں جس کے ساتھ ہمیں جہاد میں مزید قوت حاصل ہوگی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 193) آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس وقت فقیر ومحتاج ہو، لہٰذا ان میں سے کوئی بھی فدیہ دیے بغیر چھوٹ کر نہ جائے ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔''(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 196)

مسلمانوں نے اپنے قیدیوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ وہ انھیں اپنے جیسا کھانا کھلاتے اور اپنے جیسے کپڑے پہناتے تھے۔ آہستہ آہستہ قیدیوں کے رشتہ دار آنے لگے اور ان کا فدیہ دے کر انھیں چھڑا کر لے جانے لگے۔(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 216)

یہ قیدی مسلمانوں کے درمیان کچھ عرصہ رہنے اور مسلمانوں کا خلوص اور حسن سلوک دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، لہٰذا ان میں سے اکثر بعد کے مختلف اوقات میں مسلمان ہو گئے۔

غزوۂ بدر کے واقعات کے بارے میں بہت سی آیات نازل ہوئیں جن میں سے چند آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا۔ وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے۔ اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔ (یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا۔ اور اس (مدد) کو اللہ نے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو جائے اور مدد تو اللہ ہی کے پاس سے (آتی) ہے۔ بے شک اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ (یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن و سکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسے کو لے جائے اور تاکہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے۔ (اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، لہٰذا تم ان لوگوں کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا، پس تم (ان کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر (ہر) پور پر ضرب لگاؤ۔ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس تم یہ (سزا) چکھو اور بے شک کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب (تیار) ہے۔ اے ایمان والو! جب تمھارا ان لوگوں کے لشکر سے مقابلہ ہو جنھوں نے کفر کیا تو تم ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔ اور جو شخص اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس شخص کے جو

لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو یا (اپنے) کسی گروہ کی پناہ لینے والا ہو تو یقیناً وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ یہ تھی بات (ہماری حکمت) اور بے شک اللہ کافروں کی چال کمزور کرنے والا ہے۔ (کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے ہو تو تحقیق فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔'' (الأنفال 8:5-19)

نیز فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ بلاشبہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو تو اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے (بدر) کے دن اتارا

جس دن دوفوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔ جب تم (میدان بدر کے) قریب والے کنارے پر تھے اور وہ (کافر) دور والے کنارے پر تھے اور (قریش کا تجارتی) قافلہ تم سے بہت نیچے (بحیرۂ قلزم کے ساحل کی طرف) تھا۔ اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آ گئے) تا کہ اللہ اس کام کو پورا کردے جو ہونے والا تھا تا کہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے، اور بے شک اللہ یقیناً خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ (اے نبی! یاد کریں) جب اللہ آپ کے خواب میں آپ کو ان (کفار) کی تعداد کم دکھا رہا تھا اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تم ضرور ہمت ہار دیتے اور ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑا کرتے لیکن اللہ نے (تمھیں) بچالیا۔ بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ اور (اے مسلمانو! یاد کرو) جب تم (کافروں کے) آمنے سامنے ہوئے تو اللہ نے انھیں تمھاری نظروں میں تھوڑا دکھایا اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھایا تا کہ اللہ اس کام کو پورا کردے جو ہونے والا تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔'' (الأنفال 8:41-44)

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ پر پہلی فتح حاصل ہوئی اور اس کی عربوں میں خوب تشہیر ہوئی اور لوگوں کو پتہ چل گیا کہ مسلمان ایک ایسی قوت بن چکے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ انھیں اہمیت دینا ہوگی۔

بدر اور احد کے درمیانی حالات

غزوۂ بدر کے نتائج نے قریش اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کے حالات کو بہت زیادہ بدل دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ مدینہ میں امن قائم رہے اور حالات مسلمانوں کے حق میں رہیں، نیز بدر کی فتح پر قریش اور دوسرے دشمنوں کے ردِعمل کا پورا جائزہ لیا جائے اور کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ صاف ظاہر تھا کہ قریش اپنی شکست، اتنے لوگوں کے قتل اور قید پر خاموش نہیں رہیں گے، لہٰذا ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تیاری جاری رکھیں اور فوجی کارروائیاں، یعنی غزوات و سرایا کا سلسلہ قائم رکھیں تا کہ مدینہ اور اہل مدینہ محفوظ رہیں۔ بدر کے بعد اور احد سے پہلے مشہور جنگی کارروائی یہ تھی:

غزوۂ بنوقینقاع

بنوقینقاع رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل ہی یہودیوں کے دوسرے قبائل کے ساتھ مدینہ میں رہ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کرلیا تھا جسے میثاقِ مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کا مقصد مدینہ منورہ کے دفاع میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونا اور مدینہ کے امن و امان کو بحال رکھنا تھا۔ یہودیوں کو رسول اللہ ﷺ کی سچائی کا پورا یقین تھا۔ آپ پر اترنے والی بہت سی سورتوں اور آیات میں یہودیوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے، نیز ان کے انبیاء، دیگر تاریخ اور ان کے اصل یہودیت سے انحراف کا کھل کر تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ خود بھی ان کے علماء کے ساتھ بحث کرتے رہتے تھے، نیز ان کے مدارس میں جاتے تھے تاکہ انھیں اللہ کے دین کے بارے میں مطمئن کیا جائے مگر اُن میں سے بہت کم تعداد مسلمان ہوئی۔ مسلمان ہونے والوں میں سے مشہور ترین شخصیت سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی تھی۔ (طبقات ابن سعد: 352/2، وأسد الغابة لابن الأثير: 264/3)

غزوۂ بدر کے بعد یہ تو واضح ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو قریش پر فوقیت حاصل ہے، اس کا مطلب تھا کہ مدینہ منورہ میں بھی قوت کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے مدد کا وعدہ کر رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہودیوں پر بہت رحیم وشفیق تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ہدایت قبول کر لیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور حق کو بخوبی جانتے پہچانتے تھے۔ غزوۂ بدر سے واپسی کے بعد بھی آپ نے یہودیوں کو بنوقینقاع کے بازار میں اکٹھا کیا اور فرمایا: ''اے جماعت یہود! اللہ سے ڈرو کہیں تم پر بھی وہ آفت نہ ٹوٹ پڑے جو قریش پر ٹوٹی ہے، لہٰذا تم مسلمان ہو جاؤ کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔ یہ بات تم اپنی کتاب میں پاتے ہو اور اللہ تعالیٰ کا تمھیں حکم بھی یہی ہے۔'' وہ کہنے لگے: محمد (ﷺ)! آپ سمجھتے ہیں کہ ہم آپ کی قوم کی طرح ہیں۔ آپ اس دھوکے میں نہ رہیں۔ آپ کا مقابلہ ایسے لوگوں سے ہوا جن کو جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اللہ کی قسم! اگر ہم سے آپ کی جنگ ہوئی تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ہم اصل لوگ ہیں۔''

(صحيح السيرة لإبراهيم العلي، ص: 197)

تعجب کی بات ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تو بنوقینقاع کے لیے رحمت اور ہدایت کے جذبات رکھتے ہیں اور

انھیں قریش کی حالت یاد دلا کر نصیحت کرتے ہیں مگر وہ آپ کو واضح اور صریح دھمکی کے ساتھ جواب دیتے ہیں اور آپ سے لڑنے کو تیار ہیں اور آپ کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم جنگجو اور نفری والے لوگ ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دھمکی کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝﴾

''(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے کہہ دیجیے: عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے (ہانکے) جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''

(آل عمران 12:3. سنن أبي داود، حديث:3001، و سيرت ابن هشام:47/3)

ان کی یہ دھمکی دراصل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے معاہدے کو توڑنے کے مترادف تھی، لہٰذا یہودیوں میں سے یہ پہلا قبیلہ تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑا۔ (سیرت ابن هشام:47/3)

ایک اور ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے فریقین کے درمیان دشمنی کو مزید بھڑکا دیا۔ وہ یہ کہ ایک عربی عورت اپنا کچھ تجارتی سامان لے کر بنوقینقاع کے بازار میں آئی اور اس نے اپنا سامان بیچا۔ وہ ایک سنار کے پاس بیٹھی تھی۔ یہودی اسے منہ ننگا کرنے پر مجبور کرنے لگے لیکن اس نے انکار کیا۔ سنار نے اس کے کپڑے کا ایک کنارہ چپکے سے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیا۔ جونہی وہ اٹھی اس سے اس کا ستر کھل گیا اور وہ سب ہنسنے لگے۔ اس نے مدد کے لیے پکارا تو ایک مسلمان نے اٹھ کر اس سنار کو قتل کر دیا۔ وہ یہودی تھا، لہٰذا یہودیوں نے مسلمان پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ مسلمانوں نے دوسرے مسلمانوں کو یہودیوں کے خلاف مدد کے لیے بلایا۔ اس طرح مسلمانوں اور بنوقینقاع کے درمیان جنگ کا ماحول پیدا ہو گیا۔ (سیرت ابن هشام: 48/3) کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی:

﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ۝﴾

''اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو برابری (کی سطح) پر ان کا عہد ان کے منہ پر دے ماریں۔ بے شک اللہ خیانت (بدعہدی) کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

(الأنفال 58:8. طبقات ابن سعد: 29/2)

رسول اللہ ﷺ نے فوراً مسلمانوں کا لشکر جمع کیا اور بنوقینقاع کا ان کے قلعوں میں محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پندرہ دن جاری رہا۔(سیرت ابن هشام: 49/3) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، لہٰذا انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ آپ جو فیصلہ کریں، ہمیں قبول ہوگا۔ یہ قبیلہ بعض انصار کا حلیف تھا۔ مسلمانوں نے ان سے براءت کا اظہار کر دیا۔ ان مسلمانوں کے سردار سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے اللہ اور رسول کی خاطر ان یہودیوں سے براءت کا اظہار کیا لیکن منافقوں کو خطرہ پیدا ہوا کہ آپ ﷺ یہودیوں کو قتل کر دیں گے۔ یہ دونوں گروہ اللہ کے رسول ﷺ کی مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار تھے، لہٰذا عبداللہ بن ابی ابن سلول اٹھ کر کہنے لگا: محمد (ﷺ)! میرے ان حلیفوں سے حسن سلوک کریں۔ آپ ﷺ نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی زرہ کے گریبان میں ڈال دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے چھوڑو۔'' نیز اللہ کے رسول ﷺ غصہ میں آ گئے حتیٰ کہ حاضرین نے آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''تجھ پر افسوس! مجھے چھوڑو۔'' وہ کہنے لگا: نہیں، اللہ کی قسم! میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے حلیفوں کی جان بخشی نہیں کرتے۔ یہ چار سو غیر مسلح ہیں اور تین سو زرہ پوش۔ انھوں نے مجھے سرخ و سیاہ دشمن (عرب و عجم) سے بچا رکھا ہے۔ کیا آپ ایک دن میں ان کے گلے کاٹ دیں گے؟ اللہ کی قسم! مجھے گردش زمانہ کا خطرہ رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چلو! میں تیری وجہ سے ان کی جان بخشی کرتا ہوں۔''(سیرت ابن هشام: 48/3)

نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جان بخشی تو ہوگئی لیکن انھیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے مال اور گھر مسلمانوں کے لیے غنیمت بن گئے۔ وہ تین دن کے اندر مدینہ سے نکل گئے اور شام کے علاقے کی طرف چل دیے۔ عبداللہ بن اُبی کی اس کارگزاری کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (اے نبی!) آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کی) بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم اس سے ڈرتے ہیں

کہ ہمیں کوئی مصیبت پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے تو یہ لوگ اس (منافقت) پر پچھتائیں گے جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور (اس وقت) وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، کہیں گے: کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسمیں کھائی تھیں کہ بے شک وہ تمھارے ساتھ ہیں؟ ان کے عمل برباد ہوگئے اور وہ خسارہ اٹھانے والے ہوگئے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرم ہوں گے اور کافروں پر سخت، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔ تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، ان لوگوں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور نہ ہی کافروں کو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مومن ہو۔'' (المآئدۃ 5:51-57)

بنوقینقاع کی جلاوطنی مدینہ منورہ کے یہودیوں کے لیے زبردست ضرب تھی کہ وہ اس موقع پر بے بس رہے اور اپنے یہودی بھائیوں کی کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور خوف مسلط کیے رکھا۔ (سیرت ابن ہشام: 49/3، و تفسیر ابن کثیر: 628/1) مسلمانوں کو بنوقینقاع سے بہت سا اسلحہ، زرگری کے آلات اور ہر قسم کا مال غنیمت میں ملا۔ مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیا، البتہ پانچواں حصہ (خمس) بیت المال میں رکھ لیا۔ (طبقات ابن سعد: 29/2، والسیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 7/3) ان کا اسلحہ بعد میں ہونے والی جنگوں میں کام آیا۔

سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی

نبیٔ اکرم ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا: ''فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔'' (صحيح البخاري، قبل الحديث: 3767) نیز فرمایا: ''فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جو اسے ناراض کرے گا وہ مجھے ناراض کرے گا۔'' (صحيح البخاري حديث: 3767) سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی سب سے چھوٹی اور آپ کو سب سے زیادہ پیاری بیٹی تھیں۔ اگرچہ آپ سب بیٹیوں ہی سے محبت رکھتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی واحد بیٹی تھیں جو آپ ﷺ کی زندگی کے آخر تک زندہ رہیں بلکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی چند ماہ زندہ رہیں۔ انھوں نے آپ ﷺ سے کئی احادیث بیان کیں، اس لیے امتِ مسلمہ کے ذہن آپ کی دیگر بیٹیوں کے مقابلے میں ان سے زیادہ مانوس ہیں، نیز آپ ﷺ کی نسل بھی صرف انھی سے چلی۔ اس بنا پر بھی وہ سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بعثت سے تقریباً 2 سال پہلے پیدا ہوئیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں بھی آپ ﷺ کو تکلیف دینے والوں سے آپ کا دفاع کرتی تھیں۔ انھوں نے ایک ذبح شدہ اونٹنی کی غلاظت، جو مشرکین نے آپ کے اوپر ڈال دی تھی، اٹھا کر آپ سے دور پھینکی بلکہ انھیں برا بھلا بھی کہا اور انھیں اللہ کے رسول ﷺ سے دور دفع کیا۔

ان کے فضائل میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی احادیث منقول ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: ''میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہو، اُن کے والد محترم (نبیٔ کریم ﷺ) کے علاوہ۔'' (الإصابة لابن حجر: 378/4)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے: ''ایک دفعہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی ہوئی آئیں۔ ان کی چال رسول اللہ ﷺ سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیٹی! خوش آمدید! پھر آپ نے انھیں اپنی دائیں جانب بٹھایا اور ان سے کوئی خفیہ بات کی جس سے وہ رونے لگیں، پھر ان سے آپ نے ایک اور خفیہ بات کی تو وہ ہنسنے لگیں۔

میں نے کہا: میں نے کوئی دن ایسا نہیں دیکھا جس میں خوشی غم سے اس قدر قریب ہو۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ وہ کہنے لگیں: میں اللہ کے رسول ﷺ کا راز فاش نہیں کر سکتی۔ جب آپ ﷺ فوت ہو گئے تو میں نے پھر دوبارہ ان سے پوچھا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ نے فرمایا تھا: ''جبریل ہر سال مجھ سے قرآنِ مجید کا ایک بار دور کرتے تھے لیکن اس بار انھوں نے مجھ سے دو بار دور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات کا وقت آ چکا ہے اور یقیناً تم مجھے میرے گھر والوں میں سے سب سے پہلے ملو گی۔ میں تمھارا بہترین پیش رو ہوں۔ تب میں رونے لگی تھی، پھر آپ نے فرمایا: ''تُو راضی نہیں کہ تُو تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہو؟'' تب میں ہنسنے لگی۔(صحيح البخاري، الاستيذان، حديث: 6286، والإصابة: 378/4) سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آپ کو بعد میں آ کر ملیں۔ اُس وقت وہ جوان تھیں۔(طبقات ابن سعد: 19/1، والإصابة لابن حجر:378/1، وسير أعلام النبلاء للذهبي: 118/2) سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی جوان تھے۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ نسبی، روحانی اور ایمانی طور پر رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی۔ جوانوں میں وہ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ سب لوگوں سے زیادہ آپ کی سچائی سے واقف تھے۔ ہجرت کے دن انھوں نے آپ کے لیے اپنی جان کی قربانی دی اور انھیں اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے ہاں وہ مرتبہ حاصل تھا جو کسی اور کو نہیں تھا۔

محرم 2 ہجری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ سے سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ طلب کرنے کی خواہش کی مگر وہ حیا دار تھے اور اللہ کے رسول ﷺ سے ڈرتے بھی تھے۔ ویسے بھی وہ جوان تھے انھیں ایسے معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کچھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ طلب کیا تھا مگر آپ ﷺ نے انھیں نرمی سے جواب دے دیا۔ گویا آپ ﷺ چاہتے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ خود رشتہ طلب کریں۔ انصار کی بعض خواتین نے اس سلسلے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حوصلہ بڑھایا۔(طبقات ابن سعد: 19/8، و السيرة النبوية لابن كثير: 544/2)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں: جب میں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا تو میں چپ سا ہو گیا۔ اللہ کی قسم! مجھ میں بات کرنے کی سکت نہ رہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیسے آئے؟'' میں چپ رہا۔ تو آپ ﷺ فرمانے لگے: ''شاید تم فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کا رشتہ طلب کرنے آئے ہو؟'' میں نے کہا: جی ہاں! فرمایا: ''تیرے پاس کوئی چیز

مہر دینے کے لیے ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُس زرہ کا کیا کیا ہے جو میں نے تجھے دی تھی؟'' میں نے کہا: ''اللہ کے رسول! وہ تو میرے پاس ہے۔ فرمایا: ''بس وہی اُس کو دے دو۔'' (طبقات ابن سعد: 21/8، و السيرة النبوية لابن كثير: 543/2)

کہا گیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور انھیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے رشتہ طلب کرنے کے بارے میں بتایا۔ وہ خاموش ہوگئیں۔ آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ اُن کا اقرار ہی ہے۔

یہ بڑی سادہ اور فقیرانہ شادی تھی جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بساط کے مطابق اخراجات کیے۔ مذکور ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بار برداری کا کام کیا اور مدینہ کے ایک سنار کے لیے ایندھن وغیرہ لائے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں: جب میں نے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر بسانے کا ارادہ کیا تو میں نے بنوقینقاع کے ایک سنار سے معاہدہ کیا کہ وہ میرے ساتھ باہر جائے اور ہم اذخر (گھاس) لے کر آئیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہ زرگروں کو بیچ کر اپنی شادی کے ولیمہ کے لیے رقم حاصل کروں گا۔'' (صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2089) بعض مہاجرین و انصار نے بھی اس بابرکت اور سادہ ولیمے میں تعاون کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سادہ سا جہیز دیا جس میں پانی کے دو مٹکے بھی شامل تھے۔ (طبقات ابن سعد: 23/8) یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سہاگ کی پہلی رات فرمایا تھا: ''میرے ساتھ ملاقات کرنے سے پہلے کچھ نہ کرنا۔'' پھر آپ ﷺ نے پانی منگوایا، وضو فرمایا اور وہ پانی ان دونوں پر بہایا اور دعا دی ''اے اللہ! ان میں برکت فرما! ان پر برکت نازل فرما اور ان کے لیے ان کی نسل میں برکت فرما!''

(طبقات ابن سعد: 24/8)

رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما آپ کے پڑوس میں رہیں۔ سیدنا حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کو آپ کی اس خواہش کا پتہ چل گیا۔ مسجد نبوی کے قریب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے شمال میں ان کا ایک حجرہ تھا۔ انھوں نے وہ حجرہ خالی کر دیا اور آپ ﷺ سے گزارش کی کہ آپ یہ حجرہ سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کے لیے قبول فرمائیں۔ وہ کہنے لگے: خدا کی قسم! جو آپ لیں گے وہ مجھے زیادہ پیارا ہوگا اُس سے جو آپ نہیں لیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تُو نے سچ کہا۔'' اس طرح سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما اس حجرے

میں رہنے لگے، لہٰذا وہ آپ ﷺ کے پڑوسی تھے۔ آپ آتے جاتے ان سے ملتے، انھیں دعائیں دیتے اور انھیں نصیحتیں فرماتے۔ (طبقات ابن سعد: 488/3، وسير أعلام النبلاء للذهبي: 380/2) ان مبارک ملاقاتوں کے بارے میں بہت سی روایات آئی ہیں۔ یہ وہ مبارک گھر تھا جس سے جنتی جوانوں کے سردار سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما نیز سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ام کلثوم اور زینب جوان ہو کر نکلے۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي: 122/2، 134، والسيرة النبوية لابن كثير: 544/2)

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ انتہائی سادہ اور مشقت والی زندگی گزارتی تھیں۔ دنیا ان کا مقصود ہی نہ تھا۔ اس کے باوجود زیادہ کام کاج کی وجہ سے انھیں تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ روایات میں مذکور ہے کہ ایک دن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اللہ کی قسم! ایسے لگتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں حتیٰ کہ میرے سینے میں درد رہنے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والدِ محترم (ﷺ) کے پاس کچھ قیدی بھیجے ہیں۔ جاؤ، ان سے کوئی خادم لے آؤ۔ وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! میرے ہاتھوں میں بھی چکی پیس پیس کر چھالے پڑ چکے ہیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبیٔ کریم ﷺ کے پاس گئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیٹی! کیسے آئی ہو؟'' وہ کہنے لگیں: ابّا جان! آپ کو سلام کرنے کے لیے۔ انھیں آپ سے غلام مانگتے ہوئے شرم آئی، پھر دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں حتیٰ کہ میرے سینے میں درد رہنے لگا ہے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس کچھ قیدی بھیجے ہیں۔ کچھ فراخی بھی کر دی ہے، لہٰذا ہمیں کوئی خادم عطا فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے: ''اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو تو نواز دوں اور اہل صفہ کو محروم رکھوں جو اکثر خالی پیٹ رہتے ہیں۔ میرے پاس انھیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، لہٰذا میں یہ قیدی بیچ دوں گا اور ان کی قیمت صفہ والوں پر خرچ کروں گا۔'' (طبقات ابن سعد: 25/8) وہ دونوں واپس چلے آئے، پھر نبیٔ کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے جب وہ اپنی چادر میں لیٹ چکے تھے۔ چادر اتنی تھی کہ جب وہ سر ڈھانپتے تھے تو پاؤں ننگے ہو جاتے تھے اور جب پاؤں ڈھانپتے تو اُن کے سر ننگے ہو جاتے تھے۔ وہ فوراً اٹھنے لگے مگر آپ نے فرمایا: ''اپنی جگہ لیٹے رہو۔'' پھر فرمانے لگے: ''میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جو

تمھارے مطالبے سے بہت اچھی ہے؟'' وہ دونوں کہنے لگے: ضرور، اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ چند کلمے ہیں جو مجھے جبریل نے سکھائے ہیں۔ تم ہر نماز کے بعد دس دفعہ سبحان اللہ، دس دفعہ الحمدللہ اور دس دفعہ اللہ اکبر کہا کرو اور جب تم اپنے بستر پر لیٹو تو 33 دفعہ سبحان اللہ، 33 دفعہ الحمدللہ اور 34 دفعہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔'' (طبقات ابن سعد: 25/8)

عام انسانوں کی طرح ان کے درمیان بھی کبھی چپقلش ہو جاتی تو اللہ کے رسول ﷺ ان میں صلح کروا دیا کرتے تھے حتیٰ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں کہا: ''اللہ کی قسم! میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جسے تم ناپسند کرتی ہو۔'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ تُو تکار ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور صلح کروانے تک وہیں رہے، پھر آپ چلے گئے۔ آپ سے گزارش کی گئی: ''جب آپ تشریف لے گئے تھے تو آپ کچھ پریشان سے تھے اور اب واپس آئے ہیں تو آپ بہت خوش خوش نظر آ رہے ہیں؟'' فرمایا: ''خوش کیوں نہ ہوں؟ جبکہ میں نے ان دو افراد کے درمیان صلح کروائی ہے جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔'' (الإصابة لابن حجر: 379/4، و طبقات ابن سعد: 26/8)

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝﴾

''اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور گزشتہ دورِ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش کے مانند (اپنی) زیب و زینت کی نمائش نہ کرتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اے اہل بیت! بس اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمھیں بالکل پاک صاف کر دے۔'' (الأحزاب 33:33)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ، سیدنا علی، سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہم کو بلا لیا اور فرمانے لگے: ''یہ (بھی) میرے اہل بیت ہیں۔'' (تفسیر ابن کثیر: 1497/2) دراصل یہ آیت تمام اہل بیت کے بارے میں

ہے جن میں امہات المومنین اولین طور پر داخل ہیں کیونکہ اس آیت میں ذکر ہی ان کا ہو رہا ہے۔ یہ بات قطعاً عقل میں نہیں آتی کہ امہات المومنین سے بغض رکھنے والا کوئی شخص امہات المومنین کو تو اہل بیت سے نکال دے اور سمجھے کہ یہ آیت صرف سیدنا علی، سیدہ فاطمہ اور ان کے بیٹوں رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہے۔ ان کو اہل بیت کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اور کوئی اہل بیت میں سے نہیں۔ ازواجِ نبی تو حتمی طور پر اہل بیت ہیں جس طرح عام لوگوں میں ہوتا ہے (کہ بیوی بچوں ہی کو اہل بیت کہا جاتا ہے) کیونکہ یہ آیت تو ان کے اہل بیت ہونے پر نص ہے بلکہ یہ ہے ہی ازواجِ مطہرات کے لیے۔ انھی سے خطاب ہو رہا ہے، لہٰذا ازواجِ مطہرات کو کسی صورت بھی اہل بیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ آپ نے سیدنا علی، سیدہ فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس لیے فرمایا تاکہ کوئی شکی مزاج ان کے اہل بیت میں داخل ہونے کا انکار نہ کرے ورنہ آیت تو قطعاً ثابت کر رہی ہے کہ ازواجِ مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں۔

غزوۂ اُحد (شوال 3 ہجری)

قریش بدر کی ذلت آمیز شکست کے بعد چپ نہیں بیٹھے بلکہ وہ زور وشور کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کرنے کی تیاری میں جت گئے اور ہر ایک نے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں کے باپ یا بیٹے یا کوئی رشتے دار جنگ بدر میں مارے گئے تھے، وہ لوگوں میں چل پھر کر انھیں اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف بھڑکاتے تھے۔(سیرت ابن هشام:473/3) یہودی بھی مکہ میں گھومتے پھرتے تھے اور مکہ کے قائدین کو ابھارنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ مدینہ کے منافقین بھی قریش سے مختلف وعدے کرتے تھے اور انھیں اپنی مدد کا یقین دلاتے تھے تاکہ محمد ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ وہ اس کے لیے مادی اور نفسیاتی دونوں قسم کی تیاری کرتے رہے۔ انھی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہوجائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“

(الأنفال 36:8. سيرت ابن هشام:60/3، و المغازي للواقدي:199/1، و سبل الهدىٰ والرشاد:271/4)

قریش اور تہامہ کے قبائل میں سے ان کے حلیف اور دیگر لوگ پوری تیاری کر کے مسلح ہو کر آزاد، غلام حتیٰ کہ بعض عورتیں بھی ساتھ چل پڑیں۔ ان کا مقصد مدینہ پر حملہ کرنا تھا۔ ان کی تعداد تین ہزار جنگجوؤں سے زائد تھی۔(سيرت ابن اسحاق، ص:302، و المغازي للواقدي:202/1، 203، و سبل الهدىٰ والرشاد:273/4)

اس دوران میں رسول اللہ ﷺ کو ان کے مکی جاسوسوں کے ذریعے سے مشرکین کے تفصیلی حالات پہنچ رہے تھے۔ (المغازي للواقدي: 207/1، والطبقات لابن سعد: 37/2، وسبل الهدىٰ والرشاد: 273/4) رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے حسب عادت اس بارے میں مشورہ فرمایا تو ان میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ کا خیال تھا کہ دشمن کا مقابلہ شہر سے باہر نکل کر کرنا چاہیے۔ اکثریت اس خیال کی حامی تھی اور کچھ کا مشورہ یہ تھا کہ مدینہ میں ٹھہرا جائے اور اگر دشمن آ جائے تو اس کا مقابلہ شہر کے اندر رہ کر کیا جائے۔ بالآخر اللہ کے رسول ﷺ گھر چلے گئے، پھر نکلے تو آپ نے زرہ اور دیگر اسلحہ پہن رکھا تھا اور لڑائی کے لیے تیار تھے۔ آپ کو دیکھ کر اصرار کرنے والے بھی نادم ہو گئے اور کہنے لگے: ''اللہ کے رسول ﷺ ہم نے غلطی کی کہ آپ کو مجبور کیا۔ ہمیں یہ حق نہ تھا، لہٰذا آپ پسند فرمائیں تو یہیں ٹھہریں لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ جب وہ اسلحہ پہن لے تو لڑائی کیے بغیر اتار دے۔''

(صحيح البخاري، المغازي، قبل الحديث: 7563، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 242)

آپ ﷺ نے ایک خواب دیکھا تھا، وہ آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنے اس خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے تلوار چلائی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا۔ میں سمجھتا ہوں اس سے مراد وہ مصیبت ہے جو اُحد کے دن مومنوں کو پہنچی۔ میں نے پھر دوبارہ تلوار چلائی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی اور خوبصورت ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں اس سے مراد ہے مومنوں کا دوبارہ جمع ہونا اور اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہونا ہے۔ اسی طرح میں نے خواب میں ایک گائے (ذبح ہوتی) دیکھی۔ یہ اللہ کی وہ خیر ہے جو اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4081، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 242)

قریش مدینہ کے قریب ایک وادی میں ٹھہرے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ایک ہزار اہل مدینہ کو لے کر چل پڑے لیکن احد کے راستہ ہی میں منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی ابن سلول رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر لشکر کا تیسرا حصہ لے کر واپس چل دیا۔ اس نے بہانے یہ بہانا بنایا کہ میں چاہتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن میری بات نہیں مانی گئی، اس لیے واپس جا رہا ہوں۔ اُدھر مومنین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلتے رہے۔ (المغازي للواقدي: 219/1، و الطبقات لابن سعد: 39/2، و فتح الباري: 232/15)

اُحد رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی منزل تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جگہ کا انتخاب خود فرمایا اور وہاں مسلمانوں کی صف بندی کی۔ آپ نے گھاٹی کو اسلامی لشکر کا مرکز قرار دیا اور احد پہاڑ اپنی پشت کی جانب رکھا۔ ایک چھوٹا پہاڑ مسلمانوں کے سامنے رکھا اور اُس پر تیر انداز مقرر کر دیے۔ ان کا امیر سیدنا عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ آپ نے انھیں تاکید کی کہ جب تک میرا حکم نہ آئے تم نے اسی جگہ ڈٹے رہنا ہے اور تیروں کے ساتھ مشرکوں کو مسلمانوں سے دور رکھنا ہے تاکہ وہ پیچھے سے آ کر حملہ نہ کر دیں۔ آپ نے انھیں پُرزور تاکید کی کہ جنگ کا نتیجہ جو بھی ہو، تم یہیں ڈٹے رہنا اور میرے حکم کا انتظار کرنا۔ صحیح بخاری میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دن ہمارا دشمنوں سے آمنا سامنا ہوا تو نبیٔ کریم ﷺ نے تیر اندازوں کا ایک دستہ بٹھا دیا اور ان پر سیدنا عبداللہ کو امیر بنا دیا اور فرمایا: ''تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ اگر تم دیکھو کہ ہم دشمنوں پر غالب آ گئے ہیں، تب بھی یہ جگہ نہ چھوڑنا اور اگر تم دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تب بھی ہماری مدد نہ کرنا۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4067، و سيرت ابن إسحاق، ص: 305، والمغازي للواقدي: 219/1، و سبل الهدٰى والرشاد: 282/4)

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کا جھنڈا تھامنے کے لیے سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا اور اپنے صحابہ کی صفوں کی ترتیب خود فرمائی۔ آپ ﷺ نے انھیں اللہ تعالیٰ کا وعدۂ جنت یاد دلایا اور لڑائی کے وقت صبر اور ثابت قدمی کی تلقین فرمائی، پھر آپ نے بعض نابالغوں کو واپس مدینہ بھیج دیا۔ (سيرت ابن إسحاق، ص: 203، 308، والمغازي للواقدي: 221/1، و سبل الهدىٰ والرشاد: 282/4، 283)

ادھر مشرکین کے لشکر کی ترتیب و تنظیم ان کے قائد ابوسفیان بن حرب نے کی۔ وہ تقریباً تین ہزار جنگجو تھے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں چار گنا سے بھی زیادہ۔ ابوسفیان نے میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، پھر بینڈ باجے والوں نے ان کو جنگ پر بھڑکانا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ اور مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ دو نیز قریش کی عورتوں نے بھی مردوں کو لڑائی پر برانگیختہ کرنا شروع کر دیا اور انھیں پچھلے سال جنگ بدر میں ان کے مقتولین یاد دلائے۔ (سيرت ابن إسحاق، ص: 306، و المغازي للواقدي: 220/1، والطبقات لابن سعد: 41/2)

اب جنگ شروع ہو گئی اور ہر شخص نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار نکالی اور فرمایا: ''کون اس کو پکڑ کر اس کا حق ادا کرے گا؟'' سیدنا ابودجانہ سماک بن خرشہ رضی اللہ عنہ لپک کر اٹھے اور عرض کیا: ''اللہ کے رسول ﷺ! اس کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اسے مشرکین کی کھوپڑیوں پر اس قدر مارو کہ یہ مڑ

جائے۔'' سیدنا ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار پکڑ لی۔ اپنی جیب سے سرخ رنگ کی ایک پٹی نکالی اوسر پر باندھ لی، پھر تلوار پکڑ کر اکڑ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ایسی چال ہے جسے اللہ اور اس کا رسول پسند نہیں کرتے علاوہ اس جیسے موقع کے۔''(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 236) سیدنا ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے لڑائی شروع کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے ساتھ بڑی دلیری سے لڑائی کی۔(سيرت ابن إسحاق، ص: 305، و الإصابة: 58/4) اسی طرح سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے بے مثال بہادری کے نمونے پیش کیے۔ دوسرے بہادر مسلمانوں نے بھی بہادری کے جوہر دکھائے حتیٰ کہ مشرکین کی صفوں میں شکست کے آثار نظر آنے لگے اور مومنوں کی فتح واضح ہوگئی۔ مسلمانوں نے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ جب تیرانداز دستے نے پہاڑ کے اوپر سے یہ منظر دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹنے لگے۔ سیدنا عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یاد دلا کر روکنے کی بہت کوشش کی لیکن انھوں نے نافرمانی کرتے ہوئے میدانِ جنگ کی راہ لی اور عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دس سے بھی کم افراد رہ گئے۔(فتح الباري: 225/15، و سيرت ابن إسحاق، ص: 306)

ادھر خالد بن ولید اپنے شہسوار دستے کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان تیرانداز بہت کم رہ گئے ہیں جو ہمیں نہیں روک سکتے تو انھوں نے ان پر حملہ کرتے ہوئے قائد سمیت انھیں شہید کر دیا، پھر وہ اپنے شہسواروں کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان پیچھے سے غیر محفوظ ہو چکے تھے۔ اس حملے سے شہ پا کر قریش کا تتر بتر ہوتا لشکر بھی جم گیا۔ اب لڑائی کا رخ بدل چکا تھا اور لڑائی کا پلڑا مشرکین کے حق میں جھک چکا تھا۔(فتح الباري: 225/15، و سيرت ابن إسحاق، ص: 307)

مشرکین نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر آپ کو قتل کر دیں۔ ان کے بہادروں نے پوری توجہ اسی طرف مبذول کر دی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈٹ کر کھڑے رہے اور بہادروں کی طرح لڑتے رہے، حتیٰ کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے ابی بن خلف کو قتل کیا۔ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید مخالف تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے پر بضد تھا اور بار بار کہہ رہا تھا: ''اگر آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بچ گئے تو میرا زندہ رہنا بے سود ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ کو اس کے سامنے آنے سے روک دیا اور بذاتِ خود اُسے گردن پر نیزہ مارا جس کی وجہ سے وہ بعد میں مر گیا۔(سيرت ابن إسحاق، ص: 310، و المغازي للواقدي: 252/2، و سبل الهدىٰ والرشاد: 307/4)

پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک گڑھے میں گر گئے حتیٰ کہ آپ کا سر پھٹ گیا، رباعی دانت ٹوٹ گیا اور آپ کا ہونٹ مبارک چر گیا۔(فتح الباري: 243/15، و سيرت ابن إسحاق، ص:311) مگر صحابہ کی ایک جماعت آپ ﷺ کے اردگرد ڈٹی رہی اور آپ کے دفاع میں جانیں قربان کرتے رہے۔ ان دفاع کرنے والوں میں سیدنا ابوطلحہ انصاری، سہل بن حنیف، مسلمانوں کے علم بردار سیدنا مصعب بن عمیر (جو کہ عین آپ کے سامنے شہید ہوئے)، علی بن ابی طالب، ابودجانہ اور سعد بن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم اجمعین نمایاں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو جو آپ ﷺ کے دفاع میں بے جگری سے تیر چلا رہے تھے، فرمایا: ''سعد! تیر چلاؤ، تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہو جائیں!''(صحيح البخاري، حديث: 2905، و المغازي لابن أبي شيبة، ص: 238) نبیٔ کریم ﷺ کا دفاع کرنے والوں میں سیدہ ام عمارہ رضی اللہ عنہا بھی پیش پیش تھیں۔(فتح الباري: 235/15، وسيرت ابن إسحاق، ص:307)

مشرکین نے مشہور کر دیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا ہے۔ اس جھوٹی افواہ نے تو مسلمانوں کے اوسان ہی خطا کر دیے۔ ایک صحابی سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہنے لگے: کیسے بیٹھے ہو؟ وہ کہنے لگے: محمد رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ وہ کہنے لگے: تو پھر آپ ﷺ کے بعد زندہ رہ کر تم کیا کرو گے؟ اٹھو اور مر جاؤ اس بات پر جس پر اللہ کے رسول ﷺ اللہ کو پیارے ہوئے، پھر وہ دشمنوں کی طرف چلے اور لڑائی کرتے کرتے شہید ہو گئے۔ اس دن ان کے جسم پر 70 زخم پائے گئے، حتیٰ کہ کوئی انھیں پہچان بھی نہیں سکا۔ صرف ان کی بہن نے انھیں ہاتھ کے پوروں سے پہچانا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ 70 صحابہ شہید ہوئے، مثلاً: سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب، انھیں ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا،(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4072، و سيرت ابن إسحاق، ص:308) سعد بن ربیع، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش اور حنظلہ (جنھیں فرشتوں نے غسل دیا تھا) و دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ چند صحابہ نے گھاٹی میں پناہ حاصل کی۔ ابوسفیان اس پہاڑ پر ان کے قریب آیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! یہ لوگ ہم تک نہ پہنچ سکیں۔'' سیدنا عمر بن خطاب اور دیگر بعض صحابہ نے ان پر پتھر مار مار کر انھیں نیچے اتار دیا۔ ابوسفیان کہنے لگا: کیا تم میں محمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''جواب نہ دینا۔'' پھر وہ کہنے لگا: کیا تم میں ابن ابی قحافہ (سیدنا ابوبکر) ہیں؟ پھر کہنے لگا: کیا تم میں عمر بن خطاب

ہیں؟ جواب نہ پا کر ابوسفیان کہنے لگا: یہ تو سب مارے گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ضبط قائم نہ رکھ سکے، فرمانے لگے: او اللہ کے دشمن! تُو جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابھی تیرے لیے رسوائی باقی رکھی ہوئی ہے، پھر ابوسفیان کہنے لگا: ہبل زندہ باد۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے جواب دو۔'' حاضرین نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! کیا کہیں؟ فرمایا: ''تم کہو: «اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ» ''اللہ ہی بلند و برتر ہے۔'' ابوسفیان کہنے لگا: ہمارے پاس عزیٰ (بت) ہے جبکہ تمھارے پاس کوئی عزیٰ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے جواب دو۔'' وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! کیا کہیں؟ فرمایا: «اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ» ''کہو اللہ ہمارا مولیٰ ہے جبکہ تمھارا کوئی مولا نہیں۔'' ابوسفیان کہنے لگا: آج کا دن بدر کے دن کے برابر ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب میں کہا: ہرگز نہیں، قطعاً برابر نہیں۔ ہمارے شہید جنت میں ہیں جبکہ تمھارے مقتول جہنم میں، پھر ابوسفیان کہنے لگا: آئندہ سال بدر میں ملاقات ہوگی۔ (فتح الباري: 227/15، وسيرت ابن إسحاق، ص: 313)

مسلمان عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ''اُحد کے دن عورتیں مشرکین کے زخمیوں کا کام تمام کرتی تھیں اور مسلمان فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں، نیز زخمیوں کا علاج بھی کرتی تھیں۔''

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 232)

قریشی لشکر نے میدانِ جنگ چھوڑ دیا جبکہ ان کے چوبیس جنگجو مارے گئے لیکن مسلمانوں نے (وہیں رہ کر) انھیں دفن بھی کیا۔ (فتح الباري: 225/15، وسيرت ابن إسحاق، ص: 313) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ جب وہ داخل ہوئے تو عورتیں اپنے مقتولوں پر رو رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت متاثر ہوئے اور آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ (المغازي للواقدي: 311/1، 315، 316، وسيرت ابن هشام: 98/3)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطرہ تھا کہ کہیں قریش مدینہ کی طرف نہ لوٹ آئیں، لہٰذا آپ اگلے دن دشمن کے پیچھے چلے تاکہ وہ ڈر جائیں اور مدینہ کی طرف منہ نہ کریں۔ فرمایا: ''ہمارے ساتھ صرف وہی لوگ چلیں جو کل ہمارے ساتھ تھے۔'' (فتح الباري: 253/15، و طبقات ابن سعد: 48/2، و سيرت ابن هشام: 101/3)

مسلمان حمراء الاسد تک گئے۔ (یہ مدینہ کے جنوب مغرب میں ایک علاقہ تھا جو اب مدینہ منورہ کا ایک محلّہ بن چکا ہے۔) یہ مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ آپ وہاں تین دن سے زائد ٹھہرے۔ ان کی خبر قریش تک بھی

پہنچتی رہی۔ ورنہ انھوں نے واپس لوٹ کر مدینہ منورہ پر حملے کا پروگرام سوچا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کا پیچھا کرنے سے نہ صرف وہ اس ارادے سے باز رہے بلکہ تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف جانے لگے۔

(فتح الباري: 253/15، و طبقات ابن سعد: 104/3)

احد میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتا، اس کے بارے میں قرآن مجید کی کئی آیات نازل ہوئیں، مثلاً:

''اور یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور حکمِ (رسول) کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا چاہتے تھے اور کچھ لوگ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ بلاشبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔ جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے چوک جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے، پھر اس نے غم کے بعد تم پر سکون نازل کیا جس سے تمھارے ایک گروہ پر اونگھ طاری ہوگئی اور دوسرا گروہ جن کے نزدیک ساری اہمیت یقیناً اپنی ذات ہی کی تھی، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: بے شک سب اختیار اللہ ہی کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ (ﷺ) کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا تھا وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے اور یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور تاکہ تمھارے دلوں میں سے وسوسے صاف کر دے اور اللہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ بے شک جب دو لشکر (احد

میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی یقیناً وہ اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تھے اور بلا شبہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت حوصلے والا ہے۔'' (آل عمران 3:152-155)

نیز فرمایا:

﴿ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

''بھلا (تمھارا کیا حال ہے) جب (احد میں) تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالانکہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور احد کے دن جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں۔ اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے

میں لڑو یا مدافعت کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو پیچھے بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے (جو لڑائی میں مارے گئے) کہنے لگے: اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ (ان سے) کہہ دیجیے: اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنی موت آنے پر اسے ٹال کر دکھانا۔ ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان (مومنوں) کے بارے میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں کہ انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل عطا ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ میں زخم لگنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانا، ان میں سے جو لوگ نیکوکار اور پرہیز گار ہیں، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ انھی سے لوگوں نے کہا تھا کہ تمھارے خلاف ایک بڑی فوج یقیناً جمع ہوئی ہے، لہٰذا تم ان سے ڈرو تو اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انھوں نے کہا: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے، پھر وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔'' (آل عمران 3:165-174)

اس طرح یہ جنگ مومنوں کے لیے آزمائش بھی تھی اور ان کو خالص کرنے کا ذریعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں کچھ صحابہ کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا، منافقوں کو رسوا کیا اور مومنوں کی توبہ قبول فرمائی، لہٰذا یہ رسول اللہ ﷺ کے غزوات میں سے انتہائی اہم غزوہ تھا جس میں آپ بنفس نفیس حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ اور دیگر مومنوں کو بہت سے زخم اور تکلیفیں پہنچیں، نیز اس جنگ میں نبیٔ کریم ﷺ کی زندگی میں صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کی سب سے بڑی تعداد شہید ہوئی۔

رجیع کے مقام پر شہید ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم

رجیع، مکہ اور عُسفان کے درمیان بنو ہذیل کے علاقہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔(معجم مااستعجم: 641/1) یہ واقعہ صفر 4 ہجری میں پیش آیا۔ مُضَری قبائل میں سے عضل اور قارہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ آ کر کہنے لگے: اللہ کے رسول! ہم میں اسلام پھیل رہا ہے۔ آپ چند صحابہ ہمارے پاس بھیج دیں جو ہمیں دین سمجھائیں اور شریعت اسلام سکھائیں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے ایک دستہ بطور جاسوس بھیج دیا اور ان پر سیدنا عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرما دیا۔ یہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عاصم کے نانا تھے۔(الإصابة لابن حجر: 244/2) یہ لوگ چل پڑے۔ جب وہ عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو ہذیل کے ایک قبیلے بنولحیان کو ان کا پتہ چل گیا۔ ان میں سے تقریباً 100 تیر انداز اس دستے کے پیچھے لگ گئے۔ وہ ان کے قدموں کا کھوج لگاتے لگاتے اس جگہ جا پہنچے جہاں وہ دستہ ٹھہرا تھا۔ وہاں انھوں نے ان کھجوروں کی گٹھلیاں دیکھیں جو دستہ مدینہ سے لایا تھا۔ وہ گٹھلیاں دیکھ کر کہنے لگے: یہ واقعتاً یثرب کی کھجوریں ہیں۔ وہ مزید کھوج لگا کر ان تک پہنچ گئے۔ جب دستے والوں نے انھیں دیکھا تو وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ اتنے میں پیچھا کرنے والے بھی پہنچ گئے اور انھیں گھیر لیا۔ وہ ان سے کہنے لگے: ''ہم تمھیں ہر قسم کا عہد و وعدہ دیتے ہیں کہ اگر تم نیچے اتر آؤ تو ہم تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ سیدنا عاصم رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں تو کسی کافر کی پناہ لے کر نہیں اترتا۔ اے اللہ! ہمارے بارے میں نبیٔ کریم ﷺ کو اطلاع فرما دے۔'' اور کافروں سے لڑائی شروع کر دی۔ کافروں نے ان میں سے سات آدمی تیروں کے ساتھ شہید کر دیے جن میں سیدنا عاصم رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ تین صحابہ بچ گئے۔ سیدنا خبیب، زید اور ایک اور آدمی۔(ان کا نام سیدنا عبداللہ بن طارق تھا رضی اللہ عنہ۔ دیکھیے سیرت ابن هشام: 2441/3، والمغازي للواقدي: 357/1) کافروں نے انھیں امان کا پختہ وعدہ کیا۔ آخر کار وہ تینوں اتر آئے۔ جونہی کافروں

نے ان پر قابو پایا تو فوراً ان کی کمانوں کی تندیاں کھول کر ان کو باندھ دیا۔ وہ تیسرا آدمی کہنے لگا: ''یہ تمھارا پہلا دھوکا ہے، لہٰذا میں تو تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' انھوں نے اسے گھسیٹا اور بہت کوشش کی کہ وہ ساتھ چلے مگر وہ نہ مانا۔ انھوں نے اسے شہید کر دیا اور سیدنا خبیب اور زید رضی اللہ عنہما کو لے کر چل دیے اور مکہ جا کر انھیں فروخت کر دیا۔ سیدنا خبیب کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ نے جنگِ بدر کے دن حارث کو قتل کیا تھا۔ وہ ان کے پاس چند دن قید رہے، حتیٰ کہ انھوں نے سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا پختہ پروگرام بنا لیا۔ تب سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ نے ان کی کسی عورت سے استرا مانگ لیا تاکہ اپنی صفائی کر سکیں جو انھیں مل گیا۔ وہ عورت خود کہتی ہے: میں اپنے ایک بچے سے غافل ہوگئی۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا خبیب کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے اسے پکڑ کر اپنی ران پر بٹھا لیا۔ جب اچانک میری نظر پڑی تو میں زبردست گھبرا گئی کیونکہ استرا انھوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ وہ میری گھبراہٹ کو بھانپ کر کہنے لگے: کیا تجھے یہ خطرہ ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ عورت کہتی تھی: میں نے کوئی قیدی خبیب سے بڑھ کر اچھا نہیں دیکھا۔ میں نے انھیں دیکھا کہ وہ انگور کا خوشہ کھا رہے ہیں، حالانکہ اس وقت مکہ میں کوئی پھل نہ تھا، ویسے بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو دیا ہوا رزق تھا۔

بالآخر کافر انھیں قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے۔ وہ کہنے لگے: مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کافروں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم سمجھو گے مجھے موت کی گھبراہٹ ہے تو میں اس سے زیادہ نماز پڑھ لیتا۔ سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قتل کے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کی سنت رائج کی، پھر وہ کہنے لگے: ''اے اللہ! ان کافروں کو گن لے (کوئی ان میں سے عذاب سے بچ نہ پائے۔) پھر وہ شعر پڑھنے لگے ؎

وَلَسْتُ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰى أَيِّ شِقٍّ كَانَ لِلّٰهِ مَصْرَعِي

وَذٰلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلٰهِ وَ إِنْ يَّشَأْ يُبَارِكْ عَلٰى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعِ

''جب میں اسلام کی حالت میں (اور اسلام کی وجہ سے) قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پروا نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کس پہلو پر گروں گا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے، اگر وہ چاہے گا تو

اس ٹکڑے ٹکڑے جسم کے جوڑوں پر برکت نازل کرے گا۔''

پھر عقبہ بن حارث اٹھا اور انھیں قتل کر دیا۔ اُدھر قریش نے سیدنا عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کی طرف کچھ لوگ بھیجے تاکہ وہ ان کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر لائیں تاکہ ان کی پہچان ہو کیونکہ انھوں نے جنگِ بدر کے دن کافروں کا ایک بڑا سردار قتل کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش کی حفاظت کے لیے بھڑوں کا ایک چھتا بھیج دیا جس نے ان کو لاش کے قریب نہ آنے دیا، لہٰذا کافر ان کے جسم کا کچھ بھی حصہ نہ کاٹ سکے۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 3989، و سيرت ابن هشام: 108/3)

یقیناً یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اسلام پر قربان ہو گئے۔ انھوں نے اپنے دین کی حفاظت کی خواہ انھیں اس کی کوئی سی بھی قیمت ادا کرنی پڑی۔ منقول ہے کہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو جب کافر قتل کرنے کے لیے لائے تو ابوسفیان بن حرب ان سے کہنے لگا: (یہ اس وقت ابھی مشرک تھے) اے زید! کیا تو چاہتا ہے کہ اس وقت تیری بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں ہوتے اور ان کی گردن اڑا دی جاتی اور تو اپنے اہل وعیال میں ہوتا؟ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے تڑپ کر جواب دیا: اللہ کی قسم! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ ہی میں ہوں اور انھیں کانٹا بھی چبھے جبکہ میں اپنے گھر بیٹھا رہوں۔ ابوسفیان کہنے لگا: میں نے کسی کو کسی سے اس قدر محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرتے ہیں۔

(سيرت ابن هشام: 248/3، و البداية و النهاية لابن كثير: 76/8، والإصابة لابن حجر: 418/1)

سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل صاف ظاہر کرتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک بے گناہ کا خون محفوظ ہے جبکہ بچہ گھسٹتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہ اسے اپنی گود میں بٹھا لیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں استرا کھلا موجود ہے۔ بچے کی ماں کو اپنے بچے کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں لیکن سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کمال اطمینان سے بچے کی ماں سے پوچھتے ہیں: کیا تُو سمجھتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں: ان شاء اللہ! میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو محبت اور دعوت دینے والے تھے۔ وہ انتقام لینے والے نہ تھے۔ اسی لیے ان کے اس طرزِ عمل کا اثر بچے کی ماں پر اس قدر ہوتا ہے کہ وہ انھیں فراموش نہیں کرتی بلکہ لوگوں کے سامنے ان کی تعریف وتوصیف کرتی ہے۔ رضي الله عنه وأرضاه.

یہ عظیم مصیبت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے برداشت کرنا انتہائی مشکل تھی مگر یہ دعوت کا میدان ہے۔ اس میں ایسا ہوتا رہتا ہے اور یقیناً یہ قافلہ شہدائے دعوت کا سرخیل ہے۔

واقعۂ بئر معونہ

صفر 4 ہجری میں بنوعامر کا ایک وفد مدینہ آیا۔ اس کی قیادت ابو براء عامر بن مالک کر رہا تھا۔ وہ **مُلَاعِبُ الْأَسِنَّه** (نیزوں سے کھیلنے والا) کے لقب سے مشہور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر اسلام پیش کیا۔ وہ مسلمان تو نہ ہوا لیکن اس نے انکار بھی نہیں کیا۔ وہ کہنے لگا: آپ میرے ساتھ قاریٔ قرآن صحابہ رضی اللہ عنہم بھیج دیں تاکہ وہ نجد والوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ ﷺ ان کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے تھے لیکن ابو براء نے اطمینان دلایا کہ وہ میری پناہ میں ہوں گے۔ آپ ﷺ مطمئن ہو گئے اور عامر بن طفیل کی طرف ایک خط لکھ دیا، نیز سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں 70 انصار و مہاجرین بھیج دیے۔ ان میں عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4090، و سيرت ابن هشام: 120/3) یہ سیدنا حرام رضی اللہ عنہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ماموں تھے۔

یہ لوگ چلتے گئے حتیٰ کہ نجد کے ایک علاقے بئر معونہ میں پہنچ گئے۔ سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ نے عامر بن طفیل سے ملاقات کی اور اسے رسول اللہ ﷺ کا خط سپرد کر دیا۔ عامر نے خط پڑھنے سے قبل ہی اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا جس نے سیدنا حرام رضی اللہ عنہ کی پشت میں نیزہ آر پار کر دیا۔ نیزہ مہلک ثابت ہوا۔ سیدنا حرام رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا، پھر عامر بن طفیل نے بنوعامر کو مدد کے لیے پکارا۔ انھوں نے ابو براء کی دی ہوئی پناہ کو توڑنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کا سردار تھا، لہٰذا اس نے بنوعامر کے پڑوسی قبیلے بنوسلیم کو پکارا۔ یہ قبیلہ رعل، ذکوان اور عُصَیَّہ پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ عامر بن طفیل کے ساتھ چل پڑے۔ اس نے ان قبائل کے افراد کے ساتھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گھیر لیا اور ان کا محاصرہ کر کے ان سب کو شہید کر دیا۔ صرف دو مسلمان بچے سیدنا عمرو بن امیہ ضمری اور منذر بن محمد بن عقبہ۔ یہ دونوں جانور چرانے میں مشغول تھے، پھر منذر بن محمد کو بھی شہید کر دیا گیا اور عمرو بن امیہ کو قید کر لیا گیا لیکن جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ ضمری ہے تو

عامر بن طفیل نے ان کی پیشانی کے بال کاٹنے کے بعد انھیں چھوڑ دیا۔ وہ نبیٔ کریم ﷺ کی طرف چل دیے۔ راستے میں انھیں بنوعامر کے دو آدمی ملے جن کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کا معاہدہ تھا لیکن عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اس معاہدے کا علم نہ تھا، لہٰذا انھوں نے مقتول مسلمانوں کا انتقام لیتے ہوئے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ جب وہ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو انھوں نے آپ کو ان قرائے کرام کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے ان دو مقتولوں کا بھی ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تُو نے دو آدمی مار دیے ہیں۔ میں ضرور ان کی دیت ادا کروں گا۔'' (سیرت ابن هشام: 121/3، و السيرة النبوية لابن كثير: 143/3) جب ابو براء کو اس واقعے کا پتہ چلا کہ میں نے جن اصحابِ رسول کو پناہ دی تھی، انھیں میرے بھتیجے عامر بن طفیل نے قتل کر دیا ہے تو اسے شدید صدمہ ہوا، لہٰذا اس کا بیٹا ربیعہ عامر بن طفیل سے انتقام لینے چلا کہ اس نے میرے باپ کی پناہ توڑی ہے لیکن اس نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

رسول اللہ ﷺ ان بدعہدوں پر پورا مہینہ قنوت پڑھتے رہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے بئر معونہ کے قرائے کرام کے قاتلین کے خلاف 30 دن بددعا کی۔ آپ ﷺ صبح کی نماز میں رعل، ذکوان اور عصیہ کا نام لے کر ان پر بددعا کیا کرتے تھے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان تھے۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4090) اسی طرح آپ نے عامر بن طفیل کا نام لے کر بددعا کی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے طاعون کی بیماری لگا دی۔ وہ بنوسلول کی ایک عورت کے گھر بیمار ہو گیا جسے اس نے بہت ناپسند کیا۔ وہ کہنے لگا: مجھے اونٹ کے غدود کی طرح غدود نکل آیا ہے ایک سلولی عورت کے گھر؟ وہ فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نکل گیا لیکن وہ گھوڑے کی پشت ہی پر مر گیا اور اسے درندوں اور چیلوں نے کھا لیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے جب قرائے کرام کی وفات کی خبر دی تو فرمایا: تمھارے ساتھی تو مارے گئے لیکن انھوں نے اپنے ربِ کریم سے گزارش کی کہ اے ہمارے رب! ہمارے بارے میں ہمارے بھائیوں کو بتا دینا کہ ہم تجھ سے راضی ہو گئے ہیں اور تو ہم سے راضی ہو گیا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور ان کے بارے میں قرآن اتارا جو کچھ دیر پڑھا جاتا رہا: «بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا أَنَّا لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَأَرْضَانَا» ''ہماری طرف سے ہمارے رشتہ داروں تک یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم اپنے ربِ کریم کو ملے تو وہ ہم سے راضی ہو

گیا اور اُس نے ہم کو بھی راضی کر دیا۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4090، و السيرة النبوية لابن كثير: 140/3) رسول اللہ ﷺ کو شہدائے رجیع کی طرح شہدائے بئرِ معونہ پر بھی شدید غم لاحق ہوا کیونکہ آپ ﷺ کو یہ دونوں خبریں ایک ہی دن میں ملیں۔ واقعتاً یہ دونوں واقعات بہت بڑی مصیبت تھے کیونکہ اتنے صحابہ تو تمام جنگوں میں شہید نہیں ہوئے جو بدعہدی کی وجہ سے شہید ہو گئے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ یہ سب حفاظِ قرآن تھے اور اللہ کی طرف دعوت دینے والے مبلغین تھے۔ دین کے لیے ان عظیم لوگوں کی یہ قربانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے دین کا پیغام پہنچانے اور اسلام کی دعوت دینے میں کس قدر عظیم قربانیاں دی ہیں۔

سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کا یہ طرزِ عمل کہ جب ان کے نیزہ آر پار ہوا تو انھوں نے کہا: «فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ» ''رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔'' اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ وہ قتل ہو گئے مگر حقیقتاً وہی فاتح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے بس ایک (فتح یا شہادت) کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے حق میں یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تمھیں اپنے پاس سے عذاب دے یا ہمارے ہاتھوں (عذاب دلوائے)، لہٰذا تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں۔'' (التوبة 52:9)

دراصل وہ شہادت کے معنی سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کے قول «فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ» کا حاضرین کے دلوں پر کس قدر اثر ہوا ہو گا کہ وہ بیک وقت مقتول بھی ہیں اور کامیاب بھی۔ ان عظیم معانی اور حقیقتوں کو سیدنا حرام بن ملحان اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی سمجھ سکتے تھے ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غزوۂ بنی نضیر (ربیع الاوّل 4 ہجری)

بنونضیر ان یہودی قبائل میں سے ایک تھے جو ہجرتِ رسول ﷺ سے قبل مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور وہ ان یہودِ مدینہ میں شامل تھے جن کے ساتھ آپ ﷺ نے معاہدہ کیا تھا اور میثاقِ مدینہ کی صورت ایک تحریر تیار کی تھی۔ اس معاہدے میں یہ شامل تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ صلح رکھیں گے۔ مدینہ کا دفاع اور اس کی حفاظت مل کر کریں گے۔ اگر کہیں دیت دینا پڑی تو سب ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اس قسم کی چند اور شقیں بھی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ بنونضیر کی طرف ان کے علاقے میں گئے جو مدینہ کے ایک طرف واقع تھا۔ آپ کا مقصد ان سے ان دو آدمیوں کی دیت میں تعاون طلب کرنا تھا جنھیں سیدنا عمرو بن اُمیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے بئر معونہ کے حادثے میں نجات پانے کے بعد نادانستہ طور پر قتل کر دیا تھا جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا۔ آپ ﷺ ان کی کسی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ بنونضیر کے یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آپ ﷺ پر اوپر سے ایک بھاری پتھر پھینک کر آپ کو قتل کر دیا جائے لیکن سیدنا جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو ان کے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ جب وہ آپ ﷺ پر پتھر گرانے کے لیے چھت پر چڑھے تو رسول اللہ ﷺ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے گویا آپ قضائے حاجت کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھ موجود صحابہ کو بھی کچھ نہ بتایا۔ انھوں نے یہی سمجھا کہ آپ جلد ہی واپس آ جائیں گے لیکن جب انتظار کا وقت طویل ہو گیا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی تلاش میں نکلے حتیٰ کہ وہ مدینہ پہنچ گئے۔ تب آپ ﷺ نے انھیں یہودیوں کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں اطلاع کر دیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کو تمھاری بدعہدی کا پتہ چل گیا ہے، لہٰذا دس دن کے اندر مدینہ سے جلاوطن ہو جاؤ ورنہ ہلاکت تمھارا مقدر ہو گی اور ہم سے جنگ بھی کرنا ہو گی۔ وہ

یہ دھمکی سن کر دہشت زدہ ہو گئے۔ ان کو پتہ چل گیا کہ ان کی بدعہدی کا راز اللہ تعالیٰ نے فاش کر دیا ہے۔ (سیرت ابن هشام: 682/2) پھر انھوں نے مدینہ کے منافقوں سے رابطہ کیا جن کا سردار عبداللہ بن اُبی تھا کہ شاید اس مشکل کا کوئی حل نکل آئے یا ان سے کوئی مدد مل سکے۔ منافقوں نے ان کو مطمئن کر دیا اور کہا: تم ڈٹے رہو۔ مت نکلنا۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔'' (صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4884)

ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا يَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِهِمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَكُمۡ وَلَا نُطِيۡعُ فِيۡكُمۡ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝ لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا يَخۡرُجُوۡنَ مَعَهُمۡ ۚ وَلَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا يَنۡصُرُوۡنَهُمۡ ۚ وَلَئِنۡ نَّصَرُوۡهُمۡ لَيُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) کیا آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے جنھوں نے منافقت کی! وہ اپنے ان بھائیوں سے جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے، کہتے ہیں: یقیناً اگر تم (مدینہ سے) نکالے گئے تو ہم ضرور بالضرور تمھارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمھارے معاملے میں کبھی کسی کی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم ضرور بالضرور تمھاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ یقیناً اگر وہ (یہود) نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر ان کی مدد کو پہنچے بھی تو ضرور بالضرور پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔'' (الحشر 59: 11، 12)

رسول اللہ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ لوگ ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ نیز منافقوں نے ان سے مدد کا وعدہ کیا ہے تو آپ نے اپنے صحابہ کو تیاری کا حکم دے دیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں سیدنا عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور جھنڈا سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور بنونضیر کا محاصرہ کر لیا۔ (طبقات ابن سعد: 58/2) یہ محاصرہ دس دن سے زائد جاری رہا۔ اس دوران میں ان سے جنگ بھی ہوتی رہی، پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹنے شروع

کر دیے تاکہ وہ ناامید ہو جائیں اور ان پر رعب طاری ہو جائے، نتیجتاً وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ بنونضیر کہنے لگے: ''محمد (ﷺ) دوسروں کو فساد سے روکتا ہے لیکن اب وہ ہمارے درختوں کو کاٹ رہا ہے اور آگ لگا رہا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝﴾

''تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ سب) اللہ کے حکم سے ہے تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔'' (الحشر 5:59. سیرت ابن هشام: 283/2)

ادھر آپ ﷺ کا محاصرہ سخت تھا، ادھر منافقوں نے وعدہ توڑ دیا اور کوئی مدد نہ کی۔ یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ ہمیں بدعہدی کی سزا مل کر رہے گی، نیز اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، حالانکہ وہ قلعوں میں محفوظ تھے اور ان کی جنگی تیاری بھی پوری تھی، لہٰذا انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ہماری جان بخشی کر کے ہمیں مدینہ سے نکال دیا جائے، نیز ہمیں اجازت دی جائے کہ ہر گھرانہ ایک اونٹ پر جو کچھ لاد سکتا ہے، لاد کر لے جائے، البتہ اسلحہ آپ ﷺ کا ہو گا۔ (سیرت ابن هشام: 190/3) آپ ﷺ نے یہ درخواست قبول فرمائی، لہٰذا انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور انھیں مدینہ خالی کرنے کے لیے چند دن دے دیے گئے۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۝﴾

''وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلا وطنی کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے

گمان بھی نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔'' (الحشر 2:59. سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس سورت کو سورتِ بنی نضیر کہتے تھے: صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4882، و تفسير ابن كثير: 1844/2)

یہ لوگ مدینہ سے بڑی شان وشوکت کے ساتھ نکلے۔ بڑی قوت، صبر اور بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے بیوی بچوں اور مال ومنال کے ساتھ، دفیں اور بانسریاں بجاتے ہوئے۔ پیچھے گانے گاتی لونڈیاں ایسی سج دھج کے ساتھ جو اُن سے قبل اس دور کے کسی قبیلہ میں نہ دیکھی گئیں۔ (سيرت ابن هشام: 192/3) غرض ان کی جلاوطنی سے مسلمان ان کے شر وتکلیف سے محفوظ ہو گئے، البتہ ان میں سے دو افراد مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے مال پر قبضہ نہیں کیا۔ (سيرت ابن هشام: 192/3) سورۂ حشر تقریباً پوری کی پوری خصوصاً پہلی آیات بنونضیر کے بارے میں نازل ہوئیں:

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾

''اللہ کے لیے تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلا وطنی کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا

جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان کا جلاوطن ہونا لکھ دیا تھا تو وہ انھیں ضرور دنیا ہی میں عذاب دیتا اور ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ سب) اللہ کے حکم سے ہے تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس پر تم نے کوئی گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' (الحشر 59:1-6)

اس سورت کی باقی آیات میں غنیمت، مالِ فے اور ان کے احکام کا ذکر ہے۔ یہ آیات اسلام کا مالی نظام اور شرعی حکم بن گئیں، لہٰذا دشمن سے جو مال بغیر لڑے حاصل ہو اُس کے بارے میں ان آیات پر عمل کیا جائے گا:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُو مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اللہ نے اپنے رسول پر ان بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے

رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ (مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں سے نکالے گئے، اس حال میں کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہی سچے ہیں۔ اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور (فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحشر 59:7-10)

ان آیات میں مہاجرین و انصار کی بہت تعریف کی گئی ہے اور مہاجرین کے فقر اور انصار کے ایثار کا ذکر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اگر تم چاہو تو میں بنونضیر سے حاصل ہونے والے مالِ فے کو تم اور مہاجرین دونوں میں تقسیم کر دیتا ہوں اور مہاجر اُسی طرح تمھارے گھروں اور مالوں میں شریک رہیں جس طرح پہلے تھے اور اگر تم چاہو تو میں یہ مالِ فے صرف مہاجرین میں تقسیم کر دیتا ہوں اور مہاجر تمھارے گھروں سے نکل جائیں۔ سیدنا سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما دونوں انصاری سردار بیک زبان کہنے لگے: اللہ کے رسول! آپ یہ مالِ فے صرف مہاجرین میں تقسیم فرما دیں اور مہاجر پہلے کی طرح ہمارے گھروں ہی میں رہیں۔ دیگر انصار نے بھی عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم راضی ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ''اے اللہ! انصار اور ان کے بیٹوں پر رحمتیں فرما۔''(شرح الزرقاني: 82/2، و معين السيرة لصالح الشامي، ص: 287) تب رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کے مال اور گھر مہاجرین میں تقسیم کر دیے، البتہ دو فقراء انصار کو بھی آپ نے حصہ دیا۔ بنونضیر کے مالدار لوگوں میں سے ایک حضرت مخیّریق تھے۔ وہ احد سے قبل مسلمان ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ بھی لیا۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ اگر میں جنگ میں مارا جاؤں تو میرا مال محمد ﷺ کی ملکیت ہوگا۔ آپ ﷺ جو چاہیں کریں، پھر وہ واقعتاً شہید ہو گئے۔ ان کے پاس سات جگہ زمین تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان زمینوں کو محتاج مسلمانوں پر خرچ فرما دیا۔(الإصابة لابن حجر: 394/3، و المغازي للواقدي: 378/3) انصار نے ثابت کر دکھایا کہ وہ واقعتاً اس تعریف و توصیف کے اہل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمائی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔''(الحشر 9:59)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب زمین پر خراج لگانے اور باقاعدہ رجسٹروں میں نقل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو مدینہ کے مجتہد صحابہ کو اکٹھا کیا اور اس بارے میں بحث کی کہ کیا مفتوحہ زمین فاتحین میں تقسیم کر دی جائے یا اُسے سرکاری ملکیت قرار دے کر اس پر خراج لگایا جائے تاکہ عام مسلمان بھی اس کی آمدن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہونے والی آیات سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آیندہ آنے والی نسلوں کا بھی ایسی زمین میں حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اور (فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔اے ہمارے رب! بے شک تو بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحشر 10:59)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الخراج'' میں ذکر کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عراق کی مفتوحہ زمین کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ زمین فاتحین میں تقسیم کر دی جائے۔سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اس بارے میں بہت متشدد تھے جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے اس پر خراج لگا دیا جائے۔ وہ فرمانے لگے: ''یا اللہ! مجھے بلال اور اس کے ہمنوا لوگوں سے کفایت فرما۔'' دو، تین دن بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ آخر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''مجھے ایک بہت بڑی دلیل مل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

''اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس پر تم نے کوئی گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''
(الحشر 6:59)

حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کا پورا ذکر کیا، لہٰذا یہ آیت ہر قسم کے فَے کے بارے میں عام ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾

''اللہ نے اپنے رسول پر ان بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الحشر 7:59)

پھر فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں سے نکالے گئے، اس حال میں کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہی سچے ہیں۔'' (الحشر 8:59)

پھر اللہ تعالیٰ اتنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ انصار کو بھی شریک کیا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴾

''اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الحشر 9:59)

ہمارے علم کے مطابق ان سے انصار مراد ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید لوگوں کو

بھی شریک فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اور (فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔اے ہمارے رب! بے شک تو بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحشر 10:59)

لہٰذا فَے کا مال بعد میں آنے والے لوگوں کا بھی ہے۔ گویا یہ مالِ فے ان سب کا حق ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم یہ زمین فاتحین میں تقسیم کر دیں اور بعد والوں کو محروم چھوڑ دیں، لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ زمین کو اسی طرح رہنے دیا جائے اور اس پر خراج لگا دیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے کہ زمین کو فاتحین میں تقسیم نہ کیا جائے، یہ دراصل ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق کے ساتھ سجھایا تھا۔ اس سے تمام مسلمانوں کا بھلا ہو گیا۔ کیونکہ اس پر خراج وصول کر کے تمام مسلمانوں پر خرچ کیا جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ لوگوں کو عطیات اور تنخواہیں ملتیں اور نہ سرحدوں کی حفاظت ہوسکتی بلکہ فوج جہاد کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتی۔'' (كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 23، و الأحكام السلطانية لأبي يعلٰى، ص: 166)

سورۂ حشر کی ان آیات کو منافقوں اور ان کے یہودیوں کے ساتھ رابطے کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) کیا آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے جنھوں نے منافقت کی! وہ اپنے ان بھائیوں سے، جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے، کہتے ہیں: یقیناً اگر تم (مدینہ سے) نکالے گئے تو ہم ضرور بالضرور

تمھارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمھارے معاملے میں کبھی کسی کی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم ضرور بالضرور تمھاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ یقیناً اگر وہ (یہود) نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر ان کی مدد کو پہنچے بھی تو ضرور بالضرور پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔'' (الحشر 59:11,12)

ان آیات نے یہودیوں کی فطرت، ان کی بزدلی اور ان کے طریقِ جنگ کو بھی واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''وہ سب مل کر تم سے نہیں لڑیں گے مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں، یا دیواروں کی اوٹ سے، ان کی آپس کی لڑائی (دشمنی) بہت سخت ہے، آپ انھیں اکٹھے سمجھتے ہیں، جبکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔'' (الحشر 59:14)

اور جو دیواریں یہودی اب فلسطین میں بنا رہے ہیں وہ دراصل ان آیات کی ہی تصدیق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے بارے میں خصوصاً اور سب یہودیوں کے بارے میں عموماً بلکہ ہر زمان و مکان کے یہودیوں کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں۔

غزوۂ احزاب یا خندق (شوال 5 ہجری)

اس غزوے کا سبب یہ تھا کہ مدنی یہودیوں کے کچھ سردار مکہ گئے اور قریش کو رسول اللہ ﷺ پر مدینہ میں حملہ کرنے پر ابھارا۔ نیز وعدہ کیا کہ ہم بھی محمد اور اس کے ساتھیوں کی جڑ اکھاڑنے میں تمھاری مدد کریں گے۔ انھوں نے قریش کو یہ فتویٰ بھی دیا کہ قریش کا دین محمد کے دین سے بہتر ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَآءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ۝ ﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت والے ہیں۔'' (النسآء 51:4. المغازي للواقدي: 442/2، وسيرت ابن هشام: 215/3)

قریش نے ابوسفیان کی قیادت میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، پھر یہ یہودی گروہ نجدی قبائل غطفان وغیرہ کے پاس پہنچے اور انھیں مدینہ میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی، نیز ان سے جھوٹے وعدے کیے اور قریش کی طرح ان کو بھی تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اس طرح یہودی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں سے جنگ کرنے کے لیے مختلف جماعتیں اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

(فتح الباري لابن حجر: 275/15، و سيرت ابن هشام: 215/3)

نبیٔ کریم ﷺ اپنی عادت کے مطابق دشمن کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے۔ آپ کے جاسوسوں نے دشمن کی روانگی سے قبل ہی آپ کو اطلاع کر دی۔ نتیجتاً آپ نے مشورے کے لیے اپنے صحابہ کو اکٹھا کیا کہ ان کے مقابلے کے لیے کون سی حکمت عملی اختیار کی جائے کیونکہ دشمن کثیر تعداد میں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ مدینہ منورہ اتنی

قوتوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پیش کردہ تجاویز میں سے ایک تجویز سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تھی کہ مدینہ منورہ کے اردگرد ایک بڑی خندق کھدوا دی جائے جسے نہ کوئی پیدل پھلانگ سکے نہ شہسوار، نیز وہ خندق مدینہ کے دفاع کی ضامن ہو۔ مدینہ منورہ کا محل وقوع بھی اسی تجویز کا تقاضا کرتا تھا، لہٰذا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو قبول فرما لیا۔(فتح الباري لابن حجر: 275/15، والمغازي للواقدي: 445/2) آپ نے خندق کی تجویز کردہ جگہ پر نشانات لگا دیے اور خندق کی کھدائی کا کام صحابہ پر تقسیم کر دیا۔ ہر دس افراد کے ذمے چالیس ہاتھ (ساٹھ فٹ) جگہ آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کھدائی میں حصہ لیا۔ آپ اپنے مبارک ہاتھوں کے ساتھ کدال بھی چلاتے تھے اور مٹی بھی اٹھاتے تھے، حتیٰ کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ غبار آلود ہو گیا۔ آپ صحابہ کرام کے یہ اشعار بھی بار بار پڑھتے تھے ؎

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا
فَأَنْزِلَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا
إِنَّ الْأُلَى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا إِذَا أَرَادُوا فِتْنَةً أَبَيْنَا

''اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت و توفیق نہ ہوتی تو ہم ہرگز ہدایت نہ پاتے، نہ صدقے کرتے نہ نمازیں پڑھتے۔ لہٰذا اے اللہ! ہم پر سکینت (اطمینان) نازل فرما اور اگر دشمن سے مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھنا۔ ان دشمنوں نے ہم پر ظلم و زیادتی کی ہے۔ جب وہ گمراہ کرنے کا ارادہ کریں گے تو ہم ان کی بات ماننے سے انکار کریں گے۔''(المغازی لابن أبی شیبة، ص: 257)

منافقین کسی نہ کسی بہانے کھسک جاتے تھے اور اپنے فریضہ کی ادائیگی سے راہِ فرار اختیار کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں کیا ہے:

﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''تم رسول کے بلانے کو اپنے درمیان ایک دوسرے کو بلانے کے مانند نہ بنا لو، یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا چاہیے کہ جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی

خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں (دنیا میں) کوئی آزمائش آپڑے یا انھیں (آخرت میں) دردناک عذاب پہنچے۔'' (النور 63:24)

جبکہ مومنین میں سے کسی کو ضرورت پڑتی تو وہ اجازت لیے بغیر اِدھر اُدھر نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف یوں فرمائی:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی جمع کرنے والے کام پر ہوتے ہیں تو آپ سے اجازت لیے بغیر (وہاں سے) نہیں جاتے، (اے نبی!) بلاشبہ جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

(النور 62:24. تفسیر ابن کثیر: 248/2، وہ اس آیت کو عام سمجھتے ہیں لیکن منافقین عموماً اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی مخالفت کرتے تھے، لہٰذا وہ بدرجہ اولیٰ اس آیت میں داخل ہیں۔)

خندق کی کھدائی کے دوران میں مسلمانوں کے سامنے ایک بڑا پتھر آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ اسے توڑنے کے لیے اٹھے۔ جب آپ ﷺ نے اس پر ضرب لگائی تو اس سے چنگاریاں نکلیں۔ آپ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کہا، پھر دوبارہ ضرب لگائی، پھر چنگاریاں نکلیں تب آپ ﷺ نے پھر اللہ اکبر کہا۔ مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ اللہ اکبر کہا، پھر آپ نے تیسری ضرب لگائی۔ تب بھی چنگاریاں نکلیں۔ آپ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ اللہ اکبر کہا۔ آپ نے پہلی ضرب کے بعد فرمایا تھا: ''اللہ اکبر! مجھے شام کی چابیاں دے دی گئی ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت اس کے سرخ محل دیکھ رہا ہوں۔'' دوسری ضرب کے بعد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے یمن کی چابیاں دے دی گئی ہیں۔ اللہ کی قسم! میں مدائن

کا سفید محل دیکھ رہا ہوں۔'' اور تیسری ضرب کے بعد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے فارس کی چابیاں دے دی گئی ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اب اس جگہ سے صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔'' (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 261، ومسند أحمد: 303/4) مسلمان انتہائی خوش ہوئے۔ اس سے آپ ﷺ اور مومنوں کو یقین ہو گیا کہ ہم ضرور ان بادشاہوں پر غالب آئیں گے اور ان کے شہر فتح کریں گے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے وعدے کی تصدیق کی لیکن منافقین آپ کی ان باتوں کا مذاق اڑانے لگے:

﴿ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾

''اور جب منافق اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض تھا، کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے نہیں وعدہ کیا مگر دھوکے فریب کا۔'' (الأحزاب 12:33)

قریش اپنے حمایتی جتھوں کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے۔ ان سب کی تعداد دس ہزار تھی۔ انھوں نے مدینہ منورہ کے اردگرد پڑاؤ ڈال دیا، البتہ وہ خندق دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ عرب میں اس کا رواج نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی خندق کی اندرونی جانب پڑاؤ ڈال لیا۔ آپ کے ساتھی مجاہدین کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ مسلمانوں نے اپنے بیوی بچے انصار کے قلعوں میں منتقل کر دیے تھے۔ (سيرت ابن هشام: 219/3، والمغازي للواقدي: 443/2) یہ بڑا سخت وقت تھا کیونکہ مسلمان ہر وقت دن رات خطرے میں تھے۔ خصوصاً بنوقریظہ کے یہودیوں کی جانب سے جو کہ مدینہ منورہ کے ایک کنارے میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان سے مدینہ کے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر رکھا تھا اس کے باوجود خطرہ تھا کہ شاید یہودی معاہدہ پر قائم نہ رہیں، لہٰذا مسلمان اپنے آپ کو ہر طرف سے خطرات میں گھرا محسوس کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۠ ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴾

''جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف و ہراس کی وجہ سے اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا

مارے گئے۔'' (الأحزاب 33:10، 11. فتح الباري: 283/15، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 255)

دشمن کے جاسوس اور مقدمہ کے فوجی خندق کا جائزہ لینے لگے کہ کہیں کوئی تنگ جگہ مل سکے جہاں سے وہ داخل ہوسکیں۔ ان کے چند شہسواروں کو ایک جگہ ایسی نظر آئی جہاں سے وہ خندق عبور کر کے اندر آ گئے مگر ایک اسلامی دستہ جس کی قیادت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، ان کے سر پر پہنچ گیا اور انھوں نے ان میں سے بعض افراد قتل کر دیے۔ باقی واپس بھاگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے مقتولوں کی لاشیں واپس کر دی جائیں۔ آپ نے ان کا کوئی معاوضہ لینا پسند نہ فرمایا۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 263، و سيرت ابن هشام: 225/3) مسلمانوں نے دن رات خندق کی نگرانی جاری رکھی اور دشمن کو خندق عبور نہ کرنے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود خندق کے کمزور مقامات کی نگرانی کو بڑی اہمیت دی، لہٰذا دشمن کے جتھوں نے مسلمانوں کا دفاع خراب کرنے کے لیے کوئی اور حربہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ ان جتھوں میں یہودی بھی شامل تھے جن کی قیادت حُیَی بن اخطب کر رہا تھا، لہٰذا وہ بنوقریظہ کے پاس ان کے قلعوں میں گیا اور اپنے مکر و حیلہ بازی کے ساتھ سرتوڑ کوشش کی کہ بنوقریظہ کے سردار کو مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اِدھر نبیٔ کریم ﷺ کے جاسوسوں نے حیی بن اخطب کی بنوقریظہ سے ملاقات اور بنوقریظہ کی بدعہدی کی خبر آپ کو پہنچا دی کہ بنوقریظہ نے نبیٔ کریم ﷺ کے خلاف قریش سے تعاون کا وعدہ کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس اطلاع سے بہت پریشان ہوئے۔ آپ نے بذاتِ خود اس خبر کی تصدیق کرنا چاہی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں سے کسی کو اس کا پتہ تک نہ چلے تاکہ کہیں وہ بے حوصلہ نہ ہو جائیں اور ان کی نفسیاتی کیفیت پر کوئی برا اثر نہ پڑے، اس لیے آپ نے چار ایسے انصاری ان کی طرف بھیجے جن کا بنوقریظہ سے حلیفانہ تعلق تھا۔ ان میں سیدنا سعد بن معاذ اوس کے سردار اور سعد بن عبادہ بنوخزرج کے سردار بھی شامل تھے۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ بنوقریظہ سے ان کے قلعے میں ملاقات کریں اور اس خبر کی تصدیق کریں اور اگر واقعتاً وہ بدعہدی پر آمادہ ہوں تو یہ خبر عام لوگوں سے مخفی رکھی جائے۔ صرف مجھے اشارے سے سمجھا دیا جائے۔ یہ لوگ بنوقریظہ کے پاس پہنچے اور ان سے ملاقات کی۔ بحث وتمحیص ہوئی تو یہودیوں نے نبیٔ کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سخت بدزبانی کی اور کہنے لگے:

کون اللہ کا رسول؟ ہمارا محمد کے ساتھ کوئی وعدہ اور معاہدہ نہیں۔ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جو ان کے حلیف تھے، انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور انھیں بدعہدی کے نتائج سے ڈرایا لیکن انھوں نے انتہائی بدزبانی کرتے ہوئے ان کو صاف جواب دے دیا۔ وہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آیا اور کہا: عضل وقارہ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں نے بھی عضل وقارہ کی طرح بدعہدی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ (فتح الباري: 584/15، و سيرت ابن هشام: 221/3، والمغازي للواقدي: 458/2) کیونکہ ان دو قبیلوں نے رجیع کے مقام پر دس صحابہ سے بدعہدی کی تھی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ نیز یہودیوں، مشرکوں اور منافقوں نے اس خبر کو عام کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا اور منافقوں کا نفاق مکمل طور پر ظاہر ہو گیا۔

﴿ وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴾

”اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا، وہ کہتے تھے: بے شک ہمارے گھر تو غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، وہ تو صرف (جنگ سے) فرار چاہتے تھے۔“ (الأحزاب 13:33)

مسلمانوں کے لیے سخت پریشانی بن گئی کیونکہ بنوقریظہ کے دشمن کے ساتھ مل جانے سے دشمن کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا، نیز بعض یہودیوں نے قلعہ میں موجود مسلمان عورتوں پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن مسلمان عورتوں نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنا دفاع کیا۔ ان عورتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا ممتاز تھیں۔ (سيرت ابن هشام: 228/3، و المغازي للواقدي: 460/2، 462) ان حوصلہ شکن حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا نُعَیم بن مسعود اشجعی رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی۔ یہ ان مشرک جتھوں کے ساتھ ہی آئے تھے مگر ان کا ذہن بدل گیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے: اللہ کے رسول! میں مسلمان ہو گیا ہوں لیکن میری قوم کو میرے مسلمان ہونے کا کوئی علم نہیں، لہٰذا آپ مجھے جو چاہیں حکم دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجہول مجاہد سے حتی الامکان فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے انھیں فرمایا: ”تُو صرف ایک آدمی ہے

(کوئی جسمانی مدد تو نہیں کر سکتا، البتہ) تُو کسی ترکیب سے ان جتھوں کو متفرق کر دے کیونکہ جنگ میں دھوکا جائز ہے۔" (سیرت ابن هشام: 228/3، و سبل الهدٰی و الرشاد: 528/4، 529) سیدنا نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ چل پڑے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارات سمجھ چکے تھے۔ وہ بنوقریظہ کے پاس پہنچے۔ دورِ جاہلیت ہی سے ان کی آپس میں جان پہچان تھی۔ یہ ان سے کہنے لگے: تم جانتے ہی ہو کہ میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ وہ کہنے لگے: ہمیں تم پر کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ کہنے لگے: تم نے محمد سے جنگ کرنے کے لیے قریش اور غطفان سے مدد کا وعدہ کیا ہے لیکن وہ تم جیسے نہیں کیونکہ یہ شہر تمھارا شہر ہے۔ یہاں تمھارے مال اور اہل وعیال ہیں۔ تم یہاں سے کسی اور جگہ منتقل نہیں ہو سکتے۔ جبکہ قریش و غطفان کو اگر غلبہ اور غنیمت حاصل ہو گئی تو ٹھیک ہے لیکن اگر صورت حال مختلف ہوئی تو وہ اپنے علاقوں میں چلے جائیں گے اور تمھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں گے۔ تم اکیلے محمد کا مقابلہ نہیں کر سکو گے، اس لیے میرا خیال ہے کہ جب تک تم ان سے کوئی ضمانت حاصل نہ کر لو محمد سے لڑائی شروع نہ کرنا، مثلاً: تم ان سے ان کے کچھ لوگ بطورِ گروی اور ضمانت طلب کرو تاکہ تمھیں اعتماد ہو جائے کہ وہ ہم کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ بنوقریظہ نے ان کی بات کو معقول سمجھا۔

پھر سیدنا نعیم رضی اللہ عنہ قریش کے پاس گئے اور ان کے سردار ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں سے کہنے لگے: تم جانتے ہو کہ میں تم سے محبت رکھتا ہوں اور محمد سے لاتعلق ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ بنوقریظہ محمد کا عہد توڑنے پر نادم ہیں۔ انھوں نے محمد کو پیغام بھیجا ہے: اگر ہم قریش و غطفان کے چند سردار قسم کے لوگ کسی طریقے سے قابو کر کے آپ کو دے دیں تو کیا آپ ہم سے راضی ہو جائیں گے؟ آپ بے شک انھیں قتل کر دیں۔ بعد میں ہم آپ سے مل کر باقی لوگوں سے نمٹ لیں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی ہے، لہٰذا اگر بنوقریظہ تم سے ضمانت اور گروی کے بہانے کچھ آدمی مانگیں تو انھیں ایک آدمی بھی نہ دینا، پھر وہ غطفان کے پاس گئے اور ان کے ساتھ بھی ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں اور انھیں بنوقریظہ پر اعتماد نہ کرنے کی تلقین کی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 256) اس سے قبل غطفان، بنوقریظہ اور قریش کا آپس میں اتفاق ہو چکا تھا کہ وہ اگلے دن مل کر جنگ شروع کر دیں گے۔ اتفاقاً یہ ہفتے کا دن تھا۔ قریش نے بنوقریظہ کو پیغام بھیجا کہ مقررہ دن تم بھی جنگ میں ہمارے ساتھ شریک ہو جانا۔ بنوقریظہ نے جواب دیا: یہ دن تو ہفتہ کا دن ہے۔ (ہم اس دن

کوئی کام نہیں کرتے صرف عبادت کرتے ہیں) دوسری بات یہ ہے کہ ہم تمھارے ساتھ مل کر اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک تم ہمیں اپنے چند افراد بطور ضمانت نہیں دے دیتے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ تم اپنے علاقوں کو واپس چلے جاؤ گے اور ہمیں اس شخص (نبیٔ کریم ﷺ) کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤ گے۔ قریش اور غطفان آپس میں کہنے لگے: اللہ کی قسم! نعیم بن مسعود ہمیں سچ ہی کہتا تھا، پھر انھوں نے بنوقریظہ کو جواب بھیجا: اللہ کی قسم! ہم تمھیں ایک آدمی بھی نہیں دیں گے۔ بنوقریظہ بھی کہنے لگے: واقعتاً نعیم بن مسعود سچ ہی کہتا تھا۔ اس طرح ان جتھوں کا اتفاق ختم ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان ہو گئے۔

(سیرت ابن هشام: 229/3، و المغازي للواقدي: 480/2، و طبقات ابن سعد: 69/2)

اسی حیص بیص میں شام ہو گئی اور کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ رات کو اللہ تعالیٰ نے تیز آندھی چلا دی اور ٹھنڈک بھی زیادہ ہو گئی۔ آندھی کا نشانہ یہی جتھے تھے۔ اس نے ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے اور دیگیں الٹا دیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ ﴾

”اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب تمھیں (کفار کے) لشکروں نے آلیا تھا، پھر ہم نے ان پر آندھی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔“ (الأحزاب 9:33)

مشرکین کے لشکر میں افراتفری پیدا ہو گئی بلکہ چیخ پکار تک سنائی دیتی تھی۔

(سیرت ابن هشام: 231/3، و سبل الهدٰی والرشاد: 545/4)

نبیٔ کریم ﷺ نے سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو مشرکین کی خبر لانے کے لیے بھیجا، نیز حکم دیا کہ کوئی کارروائی نہ کرنا، خواہ کوئی موقع بھی مل جائے۔ صرف اطلاع حاصل کرنا مقصود ہے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ چلے اور قریش کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ بلکہ ان کی ایک جماعت کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ وہ بیچارے آگ کے اردگرد چادریں لپیٹے بیٹھے تھے۔ سیدنا حذیفہ بھی ان میں گھس گئے مگر ان میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کیونکہ سردی شدید تھی اور ہوا نے انھیں بدحواس کر رکھا تھا۔ ابوسفیان بھی ان میں موجود تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی جاسوس

موجود نہ ہو، لہٰذا وہ بات شروع کرنے سے پہلے کہنے لگا: بھئی! ہر شخص اپنے ساتھ بیٹھے شخص کی پہچان حاصل کرلے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنے دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا: تُو کون ہے؟ پھر بائیں طرف بیٹھے شخص سے سوال کر دیا: تُو کون ہے؟ ان کی اس چالاکی سے کوئی ان سے پوچھ نہ سکا اور کسی کو ان کا پتہ نہ چل سکا۔ اب ابوسفیان نے بات شروع کی۔ کہنے لگا: ''قریشیو! اللہ کی قسم! تمھارے یہاں ٹھہرنے کی گنجائش نہیں رہی۔ ہمارے جانور بھیڑ بکریاں اور اونٹ مر چکے ہیں۔ بنوقریظہ نے بھی اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ آندھی کی شدت کا حال تم دیکھ رہے ہو۔ نہ ہماری کوئی ہنڈیا قائم رہی ہے نہ آگ جل سکتی ہے اور نہ ہمارا کوئی خیمہ ہی باقی رہا ہے، لہٰذا کوچ کر چلو۔ میں تو واپس جا رہا ہوں، پھر ابوسفیان چلنے کی نیت سے اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا مگر لوگوں نے اسے روک لیا کہ ٹھہرو ہم بھی تمھارے ساتھ چلتے ہیں۔ اس طرح قریش تو کوچ کر گئے، البتہ کچھ شہسوار بچ گئے وہ بھی کوچ کرنے والوں کی حفاظت کے لیے۔ قریش کو یوں بھاگتا دیکھ کر باقی قبائل بھی نو دو گیارہ ہو گئے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بھاگے آئے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے کوچ کر جانے کی خوشخبری دیں۔ اس طرح 25 دن کا طویل محاصرہ آناً فاناً ختم ہو گیا۔

(فتح الباري: 284/15، و سيرت ابن هشام: 231/3، والمغازي للواقدي: 489,488/2)

جب مدینہ دشمن کے جتھوں سے خالی ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''اب ہم ان سے جنگ کرنے جائیں گے وہ کبھی جنگ کرنے نہ آئیں گے۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4109) واقعتاً آئندہ ایسے ہی ہوا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کی نگرانی پر بیٹھے مجاہدین صحابہ کو اپنے گھروں میں جانے کی اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ ﴾

''اور (غزوۂ احزاب میں) اللہ نے کافروں کو ان کے (ناکامی کے) غصے میں لوٹا دیا، وہ کوئی خیر و بھلائی نہ پا سکے اور اس لڑائی میں اللہ مومنوں کے لیے کافی ہو گیا اور اللہ بڑی قوت والا، نہایت غالب ہے۔''

(الأحزاب 25:33)

اس پوری جنگ میں صرف چھ مسلمان شہید ہوئے جبکہ مشرکین کے تین افراد ہلاک ہوئے۔ (سیرت ابن

ہشام: 252/3، 253، والمغازي للواقدي: 495/2، 496) اس جنگ کے بارے میں سورۂ احزاب نازل ہوئی جس کا نام بھی اسی جنگ کے نام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب تمھیں (کفار کے) لشکروں نے آلیا تھا، پھر ہم نے ان پر آندھی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔ جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف و ہراس کی وجہ سے اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے۔ اور جب منافق اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض تھا، کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے نہیں وعدہ کیا مگر دھوکے فریب کا۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا، وہ کہتے تھے: بے شک ہمارے گھر تو غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، وہ تو صرف (جنگ سے) فرار چاہتے تھے۔ اور اگر اس (مدینہ) کے اطراف سے ان پر (کفار کے) لشکر داخل کیے جاتے، پھر اِن سے فتنہ وفساد (خانہ جنگی یا شرک) کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ (فوراً) اس میں کود پڑتے اور اس (شرکتِ فتنہ) میں بس تھوڑا ہی توقف کرتے۔ اور بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے عہد کی پوچھ گچھ تو ہونی ہے۔ آپ کہہ دیجیے: اگر تم موت سے یا قتل ہونے سے بھاگو تو تمھارا بھاگنا تمھیں ہرگز نفع نہیں دے گا اور تب تم بہت کم فائدہ اٹھاؤ گے۔ کہہ دیجیے: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکے اگر وہ تمھارے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے یا وہ تم پر رحمت کا ارادہ کرے؟ اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔ بے شک اللہ انھیں جانتا ہے جو تم میں سے (جہاد میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں اور انھیں بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں: ہمارے پاس آجاؤ اور وہ جنگ میں کم ہی آتے ہیں۔ اس حال میں کہ وہ تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں، پھر جب خوف

(کا وقت) آئے تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ دور ہوجائے تو مال (غنیمت) کے انتہائی حریص بن کر تیز زبانوں کے ساتھ تمھارے بارے میں زبان درازی کرنے لگتے ہیں، یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ (ابھی تک) لشکر نہیں گئے اور اگر یہ لشکر چڑھ آئیں تو وہ تمنا کرتے ہیں کاش! بے شک وہ صحرانشین دیہاتیوں میں جا بسے ہوتے اور (وہاں) تمھاری خبریں دریافت کیا کرتے اور اگر وہ تم میں موجود ہوتے تو وہ (دشمن سے) لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔ بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں ہمیشہ سے بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور مومنوں نے جب لشکر دیکھے تو کہا: یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس (چیز) نے ان کے ایمان اور فرماں برداری کو اور زیادہ کردیا۔ مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، پھر ان میں سے بعض نے اپنی نذر پوری کردی (شہادت پاگئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔ تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (غزوۂ احزاب میں) اللہ نے کافروں کو ان کے (ناکامی کے) غصے میں لوٹا دیا، وہ کوئی خیر و بھلائی نہ پاسکے اور اس لڑائی میں اللہ مومنوں کے لیے کافی ہوگیا اور اللہ بڑی قوت والا، نہایت غالب ہے۔'' (الأحزاب 33:9-25)

ان جتھوں کے فرار ہونے کے باوجود جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ جونہی رسول اللہ ﷺ گھر واپس لوٹے اور اپنا اسلحہ اتارا، سیدنا جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ ﷺ سے کہنے لگے: ''آپ نے تو اپنا اسلحہ اتار دیا ہے جبکہ اللہ کی قسم! ہم نے تو نہیں اتارا، لہٰذا آپ ان کی طرف چلیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہاں؟'' وہ کہنے لگے: ''اِدھر۔'' اور بنوقریظہ کی طرف اشارہ کیا، لہٰذا نبیٔ کریم ﷺ بنوقریظہ کی طرف نکل پڑے۔ (فتح الباري:

293/15، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 264) آپ سمجھ گئے کہ بنوقریظہ سے لڑائی کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ آپ نے اپنا جھنڈا سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا اور مسلمانوں میں اعلان کروایا: ''تم میں سے ہر شخص عصر کی نماز بنوقریظہ میں پڑھے۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4119) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود نکلے تاکہ اپنے صحابہ سے جاملیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے بنوقریظہ کے قلعوں کے اردگرد گھیرا ڈال لیا اور ان کا محاصرہ شروع ہوگیا جو دس دن سے زائد جاری رہا۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور ان کے دل دہلا دیے۔ وہ انتہائی خوفزدہ ہو گئے حتیٰ کہ انھوں نے اوس قبیلے میں سے اپنے حلیف تلاش کرنا شروع کر دیے لیکن اوس کو ان کی بدعہدی اور مکر وفریب کا پورا پورا علم تھا کہ اب وہ کس سزا کے مستحق ہیں حتیٰ کہ وہ محاصرے کے دوران میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدزبانی کرتے رہے تھے۔

(سیرت ابن هشام: 234/3، و المغازی للواقدی: 499/2)

جب بنوقریظہ کے یہودیوں کا محاصرہ سخت ہوگیا اور انھیں یقین ہوگیا کہ اب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی گرفت میں آنے سے نہیں بچ سکتے، اِدھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دل دہلا دیے تھے تو انھوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے سپرد کر دیا۔ تب اوس قبیلے کے کچھ لوگ اللہ کے رسول کے پاس آکر ان کے لیے سفارش کرنے لگے۔ آپ نے فیصلہ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ وہ کہنے لگے: ''میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے لڑائی کے قابل مرد قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر لیے جائیں۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4121، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 266) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کا تھا۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4121) سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے دراصل ان سے خندق کے محاصرے کے دوران میں رابطہ کیا تھا اور ان کو یہودیوں کی بدعہدی کا بخوبی علم ہوگیا تھا جب انھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مذاکرات کرنے والے وفد کے ساتھ بھیجا تھا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے فریقین سے عہد لے لیا تھا کہ وہ ان کا فیصلہ قبول کریں گے۔ یہودیوں نے بھی ہاں کر دی تھی۔ تب انھوں نے بنوقریظہ کے یہودیوں کے بارے میں قطعی فیصلہ سنا دیا۔ وہ یہودی جنھوں نے عہد توڑا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں سے خیانت کی اور اپنے وطن سے خیانت کی، لہٰذا وہ اسی فیصلے کے مستحق تھے کہ ان کے لڑائی کے

قابل مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتیں اور بچے قید کر لیے جائیں۔ نیز ان کے مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں، پھر یہ فیصلہ ان پر نافذ کر دیا گیا۔ یہودی خود بھی جانتے تھے کہ ہم واقعتاً اسی فیصلہ کے مستحق ہیں، البتہ بنوقریظہ کا ایک سردار اور اس کے چند ساتھی اس فیصلہ سے محفوظ رہے کیونکہ اس سردار نے اپنی قوم کو علانیہ کہا تھا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے معاہدے کو توڑ کر جرم کر رہے ہو میں تمھاری اس بدعہدی میں شریک نہیں ہوں۔ اس کے چند ساتھیوں نے بھی اس خیانت سے براءت (لاتعلقی) کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ اگرچہ اپنی یہودیت پر قائم رہے مگر ان کے اس اظہارِ حق نے ان کو سزا سے بچا لیا۔ (سیرت ابن هشام: 238/3، والمغازي للواقدي: 503/2)

غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خصوصی مدد فرمائی اور تمام جتھوں کو رسوا کن شکست دی۔ وہ مسلمانوں سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سامنے ان کی حقیقت آشکار کر دی اور مدینہ منورہ کو بنوقریظہ سے پاک کر دیا اور مسلمانوں کو مال اور کھیت غنیمت میں دے دیے۔ بنوقریظہ کے بارے میں کئی آیات نازل ہوئیں، مثلاً:

﴿ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ ﴾

”اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی انھیں اللہ نے ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، تم ان (بنوقریظہ) کے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے تھے۔ اور اللہ نے تمھیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں، ان کے مالوں اور اس زمین کا وارث بنا دیا جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا اور اللہ ہمیشہ سے ہر شے پر خوب قادر ہے۔“ (الأحزاب 27,26:33)

غزوۂ بنی مصطلق (مریسیع) شعبان 6 ہجری

اس غزوے کا نام بنومصطلق قبیلہ کے نام پر رکھا گیا۔ یہ خزاعہ کا ایک اہم قبیلہ تھا جو قحطانی تھے۔ اس غزوے کا نام غزوۂ مُرَیسِیع بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے کتاب المغازی میں ایک باب ان الفاظ کے ساتھ قائم کیا ہے۔ **بَابُ غَزْوَةِ بَنِي الْمُصْطَلِقِ مِنْ خُزَاعَةَ وَهِيَ غَزْوَةُ الْمُرَيْسِيعِ.** مریسیع اس جگہ اور پانی کا نام تھا جس کا مسلمانوں نے قصد کیا تھا۔ یہ مکہ و مدینہ کے درمیان بنومصطلق کا رہائشی علاقہ تھا۔ عسفان اور قدید بھی اس کے قریب قریب ہیں۔ یہ قبیلہ چونکہ قریش مکہ کے قریبی علاقہ میں رہتا تھا، اس لیے اس کا قریش سے مضبوط تعلق تھا۔ ویسے بھی یہ قریش سے ڈرتے تھے، لہٰذا شروع میں اسلام کے بارے میں ان کا موقف واضح نہ تھا، حالانکہ خزاعہ کے باقی قبائل رسول اللہ ﷺ کے حلیف تھے لیکن اس قبیلے نے اپنی قوم کی مخالفت کی اور غزوۂ احد سے قبل انھوں نے قریش کو مدد کی پیشکش کی۔ (معجم المعالم الجغرافية فی السيرة الذاتية للبلادی، ص: 290) بلکہ انھوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ ان پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان کی حرکات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ (سیرت ابن هشام: 290/3، و السيرة النبوية لابن كثير: 297/3) جب ان کا مدینہ پر حملے کا پکا پروگرام بن گیا تو آپ ﷺ نے ایک لشکر تیار کیا جس میں سات سو جنگجو تھے۔ آپ نے مدینہ پر سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور شعبان 6 ہجری میں خود بنومصطلق کا قصد فرمایا۔ (سیرت ابن هشام: 290/3، و الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 63/2) اس لشکر میں مہاجرین کا جھنڈا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور انصار کا جھنڈا سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے مرکز میں پہنچ کر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منادی کروائی: ''لا الٰہ الا اللہ پڑھ لو۔ اس سے تمھارے

جان و مال محفوظ ہو جائیں گے۔'' مگر انھوں نے تیر چلانے شروع کر دیے۔ مسلمانوں نے بھی جواب دیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے حملۂ عام کا حکم دیا۔ (المغازي للواقدي:200/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 298/3) مسلمانوں نے ان پر یکبارگی حملہ کر دیا، پھر فریقین میں گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے بنومصطلق کو شکست دے دی۔ ان میں سے بہت سے لوگ مارے گئے اور بہت سے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گئے۔ قیدیوں میں سیدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ (سیرت ابن هشام: 291/3) جو بعد میں ام المومنین بنیں۔

اس جنگ میں بہت سے صحابہ نے بہادری اور جرأت کے کارنامے سرانجام دیے، مثلاً: سیدنا علی بن ابی طالب، عبدالرحمٰن بن عوف اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ (سیرت ابن هشام: 294/3) رسول اللہ ﷺ نے اس حملہ کے ساتھ خزاعہ کے اس قبیلہ کو سزا دی جو مسلمانوں کے خلاف قریش کی مدد کرتے تھے اور انھوں نے خود بھی مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بنوخزاعہ کے قبائل مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد تھے لیکن بنومصطلق کا مسلمانوں کے خلاف دشمنی کرنا اور ان کے دشمنوں کا ساتھ دینا جبکہ بنوخزاعہ کے دوسرے قبیلے مسلمانوں کے ساتھ اور ان کے حلیف تھے، مسلمانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ ان پر کاری ضرب لگائی جائے تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے۔ یہ غزوہ آپ ﷺ کی دور اندیشی کی بہترین مثال ہے۔

واقعۂ اِفک

واقعۂ اِفک غزوۂ بنی مصطلق کا انتہائی اہم واقعہ ہے۔ اس واقعے کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی عزت سے تھا جو سب سے بڑھ کر پاکیزہ ہے۔ وہ آپ ﷺ کی تمام بیویوں میں سے آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں بلکہ پوری امت کے لیے ان کی عزت سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ واقعہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ روایت انتہائی صحیح، تفصیلی اور باریکیوں سے پُر ہے۔ یہ صحیح بخاری کی طویل ترین روایت ہے جس میں تمام تر جزئیات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ان سے یہ روایت ان کے بھانجے سیدنا عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ روایت کامل طور پر ذکر کر دی جائے۔

اِفک کو **اَفَك** بھی پڑھا جا سکتا ہے جس طرح **نَجَس** کو **نِجْس** بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح **اِفْكُهُمْ** کو **اَفَكُهُمْ** بھی پڑھا جا سکتا ہے، تب معنی یوں ہوں گے کہ اس واقعے نے ان کو ایمان سے پھیر دیا اور انھیں جھوٹا ثابت کر دیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝ ﴾ ''اس قرآن سے وہی پھیرا جاتا ہے جو ہر خیر سے پھیر دیا گیا۔'' (الذٰریٰت 9:51) ابن شہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ روایت عروہ بن زبیر، سعید بن مسیّب، علقمہ بن وقاص اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رحمہم اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی ہے جو نبیٔ کریم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں۔ جب ان کے بارے میں الزام تراشی کرنے والوں نے کہا جو کہا۔ مجھے مذکورہ اساتذہ میں سے ہر ایک نے کچھ کچھ حدیث بیان کی ہے۔ ان میں سے بعض نے اس حدیث کو زیادہ یاد رکھا ہے اور بعض نے کم۔ میں نے ان میں سے ہر ایک سے بخوبی وہ حدیث حفظ کی ہے جو اس نے مجھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی اور ان کی بیان کردہ حدیث ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہے اگرچہ بعض اساتذہ نے اس کو بعض سے زیادہ یاد رکھا ہے۔ ان چاروں اساتذہ کا بیان ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''اللہ کے رسول ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو آپ اپنی ازواجِ مطہرات کے بارے میں قرعہ ڈالتے جس کا قرعہ نکل آتا اسے ساتھ لے جاتے۔ ایک جنگ میں آپ نے ہمارے درمیان قرعہ ڈالا تو میرا قرعہ نکل آیا، لہٰذا میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ چل پڑی۔ اس سے قبل حجاب کا حکم نازل ہو چکا تھا، لہٰذا مجھے ڈولی ہی میں اٹھایا جاتا اور ڈولی ہی میں اتارا جاتا تھا۔ ہم چلے حتیٰ کہ جب اللہ کے رسول ﷺ اس جنگی سفر سے فارغ ہوئے تو واپس چل پڑے یہاں تک کہ مدینے کے قریب پہنچ گئے۔ ایک رات آپ نے کوچ کا اعلان کیا تو میں اعلان کے وقت اٹھی اور چلتے چلتے لشکر سے باہر نکل گئی۔ جب میں قضائے حاجت سے فارغ ہوئی تو واپس اپنے خیمے کی طرف چل دی۔ اچانک میں نے اپنا سینہ ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرا ظفار کے منکوں سے بنا ہوا ہار ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ میں واپس لوٹ کر اپنا ہار تلاش کرنے لگی۔ ہار کی تلاش میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ اس دوران میں میرا پالان کسنے والے میرے خیمے میں آئے، میری ڈولی اٹھائی اور اسے میرے اونٹ کے پالان پر کس دیا۔ وہ سمجھتے رہے کہ میں ڈولی میں موجود ہوں کیونکہ ان دنوں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں، وزنی نہیں ہوتی تھیں اور ان پر زیادہ گوشت نہیں چڑھا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ کم کھانا کھاتی تھیں، لہٰذا انھوں نے میری ڈولی اٹھا کر اونٹ پر لا دی تو انھیں اس کے ہلکا ہونے پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ علاوہ ازیں میری عمر بھی کم تھی۔ انھوں نے اونٹ کو کھڑا کیا اور چل دیے۔ مجھے میرا ہار لشکر کے چلے جانے کے بعد ملا۔ میں جب پڑاؤ کی جگہ پہنچی تو وہاں نہ کوئی بلانے والا تھا نہ جواب دینے والا۔ میں نے اپنے خیمے والی جگہ کا قصد کیا اور وہاں بیٹھ گئی۔ میرا گمان یہ تھا کہ جونہی وہ مجھے نہیں پائیں گے، فوراً لوٹیں گے۔ ابھی میں اپنی جگہ میں بیٹھی تھی کہ مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا اور مجھے نیند آ گئی۔ صفوان بن معطل سلمی ذکوانی رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ وہ صبح کے وقت میری جگہ پر پہنچے تو انھیں ایک انسانی ڈھانچہ سویا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا کیونکہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے قبل انھوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ میں ان کے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھنے سے جاگ اٹھی۔ میں نے فوراً اپنی چادر کے ساتھ اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم! ہم نے ایک بھی بات نہیں کی اور نہ میں نے ان سے اِنَّا لِلّٰهِ کے علاوہ کوئی بات سنی۔ وہ نیچے اترے۔ اپنی اونٹنی کو بٹھایا

اور اس کی ٹانگ پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ میں اٹھی اور اونٹنی پر سوار ہو گئی۔ وہ اونٹنی کو پکڑ کر چلنے لگے حتیٰ کہ ہم عین دوپہر کے وقت لشکر میں پہنچے۔ لشکر والے پڑاؤ ڈال چکے تھے۔ تب میرے بارے میں بدزبانی کر کے ہلاک ہوا جو ہوا۔ اس الزام تراشی میں سب سے بڑا کردار عبداللہ بن ابی ابن سلول کا تھا۔''

عروہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے پاس یہ باتیں بیان کی جاتی تھیں وہ ان کی تائید کرتا تھا بلکہ کرید کرید کر پوچھتا تھا۔ عروہ رحمہ اللہ نے فرمایا: الزام تراشوں میں سے صرف حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کا نام لیا گیا۔ کچھ اور بھی ہوں گے مگر مجھے ان کا کوئی علم نہیں۔ اتنی بات ہے کہ وہ ایک جتھہ تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، البتہ سب سے بڑا کردار عبداللہ بن ابی ابن سلول ہی کا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو برا کہا جائے۔ وہ فرماتی تھیں کہ یہ شعر بھی تو اسی نے کہا ہے ؎

فَإِنَّ أَبِي وَوَالِدَهُ وَ عِرْضِي لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْكُمْ وِقَاءُ

''بلاشبہ میرا باپ، دادا اور میری عزت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر قربان ہو جائے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم مدینہ آئے تو میں بیمار پڑ گئی اور ایک ماہ بیمار رہی۔ لوگ الزام تراشوں کی باتوں میں مشغول رہے مگر مجھے کسی بات کا پتہ نہ چلا، البتہ مجھے اپنی بیماری کے دوران میں یہ بات مشکوک لگتی تھی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وہ مہربانی اور پیار نہیں دیکھتی تھی جو اس سے قبل اپنی بیماری کے دوران میں دیکھا کرتی تھی۔ بس آپ میرے پاس آتے، سلام کہتے اور فرماتے: ''تمھارا کیا حال ہے؟'' اور چل دیتے۔ اس بات کو میں مشکوک سمجھتی تھی لیکن مجھے اس شر کا کوئی علم نہیں تھا (جو باہر پھیلا ہوا تھا) حتی کہ جب میں کچھ صحت یاب ہوئی تو میں مسطح رضی اللہ عنہ کی ماں کے ساتھ مناصع کی طرف نکلی۔ (مناصع سے مراد وہ مقامات ہیں جن کی طرف لوگ قضائے حاجت کے لیے جایا کرتے تھے۔ (تاج العروس للزبیدی: 535/5) ہم چوبیس گھنٹے بعد صرف رات ہی کو قضائے حاجت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس وقت تک ہم نے گھروں میں بیت الخلا نہیں بنائے تھے۔ ہمارا رواج پہلے عربوں والا ہی تھا کہ قضائے حاجت کے لیے باہر کھلی جگہ جائیں۔ ہم بیت الخلا گھروں میں تعمیر کرنے سے تکلیف محسوس کرتے تھے۔ خیر! میں اور اُمِ مسطح بنت ابی رُہم بن مطلب بن عبدمناف قضائے حاجت کے لیے چلیں۔ اُمِ مسطح کی والدہ صخر بن عامر کی بیٹی تھیں جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ لگتی تھیں۔ اُمِ مسطح کا بیٹا مسطح

اثاثہ بن عباد بن مطّلب کا بیٹا تھا۔ جب ہم قضائے حاجت سے فارغ ہوئیں تو میں اور ام مسطح گھر کو چل پڑیں۔ راستے میں ام مسطح اپنی چادر میں الجھ کر لڑکھڑائیں تو کہنے لگیں: مسطح ہلاک ہو جائے! میں نے انھیں کہا: تم نے بڑی بری بات کہی ہے کہ تم ایسے شخص کو بددعا دے رہی ہو جو جنگ بدر میں شریک ہوا ہے۔ وہ کہنے لگی: او پگلی! تو نے نہیں سنا اس نے کیا کہا ہے؟ میں نے کہا: کیا کہا ہے؟ تب انھوں نے مجھے الزام تراشوں کی باتیں بتائیں۔ میں کچھ تو پہلے ہی بیمار تھی، مزید بیمار ہوگئی۔ جب میں گھر واپس آئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور سلام فرمایا، پھر فرمانے لگے: ''کیسی ہو؟'' میں نے کہا: کیا آپ مجھے میرے والدین کے گھر جانے کی اجازت دیتے ہیں؟ دراصل میں اپنے والدین سے اس خبر کی توثیق کرنا چاہتی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا: امی جان! لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ وہ کہنے لگیں: بیٹی! زیادہ اثر نہ لینا۔ اللہ کی قسم! کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عورت خوبصورت بھی ہو اور اس کا خاوند اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتا ہو، پھر اس کی سوکنیں اس کے بارے میں باتیں نہ بنائیں۔ میں نے کہا: سبحان اللہ! کیا لوگوں نے اس حد تک باتیں بنا لی ہیں؟ میں وہ ساری رات روتی رہی حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ نہ میرے آنسو رکتے تھے نہ نیند آتی تھی، پھر میں روتی رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو مشورے کے لیے بلایا کہ کیا میں اپنی بیوی کو چھوڑ دوں؟ کیونکہ اس بارے میں کوئی وحی نہیں آ رہی تھی۔ اُسامہ رضی اللہ عنہ نے تو وہی مشورہ دیا جس کا اسے آپ کے گھر والوں کے بارے میں یقین تھا کہ وہ بالکل پاک صاف ہیں۔ ویسے بھی وہ ہم سے محبت رکھتا تھا، لہٰذا اس نے کہا: وہ آپ کی بیوی ہے۔ ہمیں تو ان کی پاکیزگی ہی کا علم ہے (لہٰذا انھیں مت چھوڑیے۔) لیکن علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ عورتیں اور بھی بہت ہیں۔ ویسے آپ لونڈی (بریرہ رضی اللہ عنہا) سے پوچھ لیجیے وہ آپ کو سچ بتا دے گی۔ آپ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا: ''بریرہ! کیا تُو نے عائشہ میں کوئی مشکوک چیز دیکھی ہے؟'' وہ کہنے لگی: قسم اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے! میں نے ان میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کا ان پر عیب لگا سکوں، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ نوعمر لڑکی ہے۔ آٹا گوندھ کر اس سے غافل ہو جاتی ہے یا سو جاتی ہے، بکری آ کر آٹا کھا لیتی ہے۔

اسی دن اللہ کے رسول ﷺ نے خطاب فرمایا اور عبداللہ بن ابی کے بارے میں فرمایا: ''مسلمانو! اگر میں

اس شخص کے خلاف کارروائی کروں جس نے مجھے میری بیوی کے بارے میں سخت صدمہ پہنچایا ہے تو کیا مجھے معذور قرار دو گے؟ اللہ کی قسم! میں اپنی بیوی میں کوئی خرابی نہیں جانتا، نیز ان الزام تراشوں نے ایسے آدمی کا نام لیا ہے جس میں میں کوئی خرابی نہیں جانتا۔ وہ میرے بغیر کبھی بھی میرے گھر نہیں گیا۔'' سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر کہنے لگے جو کہ بنو عبدالاشہل کے اہم آدمی تھے: اللہ کے رسول! میں آپ کو معذور قرار دوں گا۔ اگر وہ شخص اوس قبیلے سے ہے تو اس کی گردن میں اتارتا ہوں اور اگر وہ ہمارے بھائی بنو خزرج سے ہے تو آپ ہمیں حکم دیں ہم آپ کے حکم پر عمل درآمد کریں گے۔ خزرج میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا۔ وہ بنو خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ سعد رضی اللہ عنہ نیک آدمی تھے لیکن خاندانی حمایت نے ان کو ابھار دیا کیونکہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کے خاندان سے بلکہ ان کی چچازاد تھی۔ وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: تُو غلط کہتا ہے۔ اللہ کی قسم! تو اسے قتل نہیں کر سکتا نہ تجھ میں اتنی طاقت ہے۔ اگر وہ تیرے قبیلے سے ہوتا تو تُو کبھی نہ چاہتا کہ اسے قتل کیا جائے۔ سیدنا اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ یہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچازاد تھے۔ وہ سعد بن عبادہ سے کہنے لگے: اللہ کی قسم! تُو غلط کہتا ہے۔ ہم اسے ضرور قتل کریں گے۔ تُو منافق ہے اور منافقوں کی طرف سے جھگڑا کرتا ہے، پھر تو دونوں قبیلوں اوس و خزرج کے بہت سے لوگ بھڑک اٹھے اور قریب تھا کہ وہ تلواروں سے لڑ پڑتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے تھے اور انھیں چپ کرا رہے تھے۔ بالآخر لوگ چپ ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خاموش ہو گئے۔ لیکن میں سارا دن روتی رہی نہ آنسو رکتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ اگلی صبح میرے والدین میرے پاس آ گئے جبکہ میں دو رات اور ایک دن روتی رہی تھی نہ میرے آنسو رکتے تھے نہ مجھے نیند آتی تھی حتیٰ کہ میں سمجھتی تھی کہ اس قدر رونے سے میرا جگر پھٹ جائے گا۔ ابھی میرے والدین میرے پاس ہی بیٹھے تھے اور میں مسلسل رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت نے مجھ سے گھر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اسے اجازت دے دی۔ وہ بھی بیٹھ کر میرے ساتھ رونے لگی۔ اتنے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے۔ آپ سلام کہہ کر بیٹھ گئے۔ جب سے مجھ پر الزام لگا تھا اس وقت سے اب تک آپ میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں میرے بارے میں کوئی وحی بھی نہیں اتری تھی۔ آپ نے بیٹھ کر کلمۂ تشہد پڑھا اور فرمانے لگے: ''عائشہ! مجھے تیرے بارے میں ایسی ایسی بات پہنچی

ہے۔ اگر تو بے گناہ ہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ تجھے بے گناہ قرار دے دے گا لیکن اگر تجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو اللہ سے بخشش مانگ کر توبہ کر لے کیونکہ جب کوئی شخص اپنی غلطی مان کر توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔'' جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بات پوری فرمائی تو میرے آنسو خشک ہو گئے حتیٰ کہ میں ایک قطرہ بھی محسوس نہ کرتی تھی۔ میں نے اپنے والد سے کہا: میری طرف سے اللہ کے رسول ﷺ کو جواب دیجیے۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ آپ کو کیا جواب دوں؟ میں نے اپنی والدہ سے کہا: میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیں۔ وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! میں بھی نہیں جانتی کہ آپ سے کیا کہوں؟ میں نوعمر لڑکی تھی۔ زیادہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھا تھا۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ بات بار بار سنی ہے حتیٰ کہ تمھارے دلوں میں جم چکی ہے اور تم دلوں میں اسے سچ بھی سمجھ چکے ہو۔ اب اگر میں تمھیں کہہ بھی دوں کہ بلاشبہ میں بے گناہ ہوں تب بھی تم مجھے سچا نہیں سمجھو گے اور اگر میں تمھارے سامنے ایسے گناہ کا اعتراف کر لوں جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھ لو گے۔ لہٰذا اللہ کی قسم! میں اپنے اور تمھارے لیے سیدنا یوسف علیہ السلام کے والد محترم کی مثال ہی مناسب سمجھتی ہوں کہ انھوں نے فرمایا تھا: میں صبر جمیل کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہی سے ان باتوں کے خلاف مدد طلب کی جا سکتی ہے جو تم کر رہے ہو، پھر میں منہ پھیر کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا کہ میں قطعاً بے گناہ ہوں، اس لیے مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی مجھے بے گناہ قرار دے دیں گے لیکن اللہ کی قسم! یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں قرآنی وحی نازل فرمائیں گے جو قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی۔ واللہ! میرے ذہن میں میرا مرتبہ اس سے بہت کمتر تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں براہِ راست کلام فرمائیں گے۔ مجھے صرف اتنی امید تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ سوتے میں کوئی خواب دیکھ لیں گے جو مجھے بری کر دے گا۔ اللہ کی قسم! اللہ کے رسول ﷺ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہ تھے اور نہ گھر کے افراد میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ آپ پر وحی اترنا شروع ہو گئی اور آپ کو پسینہ چھوٹنے لگا جیسا کہ وحی کے وقت ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ آپ کے چہرۂ مبارک سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے گرنے لگے۔ حالانکہ وہ سرد دن تھا لیکن اترنے والی وحی کا بوجھ ہی اتنا زیادہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ سے وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو آپ مسکرا رہے تھے۔ سب سے پہلی

بات آپ نے یہ کہی: ''عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تجھے بے گناہ قرار دے دیا ہے۔'' میری والدہ مجھے کہنے لگیں: اٹھو! اور آپ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ میں کہنے لگی: اللہ کی قسم! میں آپ ﷺ کا شکریہ ادا کرنے نہیں اٹھوں گی۔ میں صرف اللہ بزرگ و برتر کا شکر ادا کروں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وحی میں ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ ﴾ سورۂ نور آیات: 11 تا 20 نازل فرمائیں۔ جب میری بے گناہی نازل ہوئی تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! میں مسطح پر کبھی ایک پیسہ تک خرچ نہیں کروں گا کیونکہ اس نے عائشہ کے بارے میں کہا جو کہا۔ دراصل وہ مسطح سے رشتہ داری اور فقر کی وجہ سے اس پر بہت کچھ خرچ کیا کرتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡکُمۡ وَالسَّعَۃِ اَنۡ یُّؤۡتُوۡۤا اُولِی الۡقُرۡبٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَالۡمُهٰجِرِیۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۖ وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (النور 22:24)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوراً فرمانے لگے: کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! میں تو ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ لہٰذا انھوں نے مسطح رضی اللہ عنہ پر دوبارہ خرچ کرنا شروع کر دیا جو پہلے کرتے تھے، نیز فرمایا: اللہ کی قسم! میں کبھی بھی یہ خرچ بند نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھی میرے بارے میں پوچھا تھا: ''زینب! تُو نے کیا دیکھا اور جانا؟'' وہ کہنے لگیں: اللہ کے رسول! میں نے نہ کوئی غلط بات سنی نہ دیکھی۔ اللہ کی قسم! میں تو اس کی خوبیاں ہی جانتی ہوں۔ حالانکہ ازواجِ مطہرات میں سے یہی خاتون تھیں جو میرا مقابلہ کرتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے تقویٰ کی وجہ سے (غلط بات کرنے سے) محفوظ رکھا، البتہ ان کی بہن حمنہ خواہ مخواہ ان کی حمایت میں مخالفانہ باتیں کرتی تھی، لہٰذا وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو کر ہلاک ہو گئی جو ہلاک ہوئے۔''

ابن شہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ تھی وہ حدیث جوان چار اساتذہ کے ذریعے سے مجھ تک پہنچی، پھر عروہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ شخص جس کے بارے میں کہا گیا جو کہا گیا، (یعنی سیدنا صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ) وہ کہا کرتا تھے: ''سبحان اللہ! قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے تو کبھی کسی بھی عورت کا پہلو ننگا نہیں کیا۔'' بعدازاں وہ اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4141، والسيرة النبوية لابن هشام: 3/297-307)

یقیناً اس واقعے سے متعلقہ شخصیت کا اس بارے میں اپنا بیان ہی انتہائی معتبر ہے۔ اس واقعے کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں جو قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی اور ان میں امت کے لیے کئی عظیم اسباق موجود ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ
امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لَوْلَاۤ اِذْ
سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ لَوْلَا
جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِيْهِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ۚ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ
وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ
نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ۚ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ
تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ
بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ
اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ
يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ

اَنْ يَّعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

”بے شک جولوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہے، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے؟ وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔ جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات تھی۔ اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔ اور اللہ تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ بے شک جولوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، خوب رحم کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو! تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی پیروی کرتا ہے تو بلاشبہ وہ تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک کبھی بھی پاک نہ ہوتا لیکن اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اور تم میں سے فضل

اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔'' (النور 24:11-23)

کوئی شک نہیں کہ منافقوں کا مقصد پوری امت کے اخلاق کو تباہ کرنا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اہل بیت ہی اپنی عزت اور اخلاق کے بارے میں مشکوک ہو جائیں تو پھر امت کا کوئی گھرانہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صراحتاً فرمایا کہ ان منافقوں کا مقصد اور نشانہ یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (النور 24:19)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے بچنے کی تلقین فرمائی جو لوگوں کو شیطان کے قدموں کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی پیروی کرتا ہے تو بلاشبہ وہ تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک کبھی بھی پاک نہ ہوتا لیکن اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' (النور 24:21)

کوئی شک و شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمام پاکیزہ لوگوں کے سردار ہیں اور امہات المومنین تمام پاکیزہ عورتوں میں سے پاکیزہ تر ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کے متعلق) کہتے ہیں، ان کے لیے بہت بڑی مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے۔'' (النور 26:24)

آپ ﷺ تو تمام پاکیزہ لوگوں سے بڑھ کر پاکیزہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے پاکیزہ ترین عورتوں ہی کو منتخب فرمایا جن میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کی مدح یوں کی ہے ؎

حَصَانٌ رَزَانٌ مَّا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ وَتُصْبِحُ غَرْثٰى مِنْ لُّحُومِ الْغَوَافِلِ
عَقِيلَةُ حَيٍّ مِّنْ لُّؤَيِّ بْنِ غَالِبٍ كِرَامِ الْمَسَاعِي مَجْدُهُمْ غَيْرُ زَائِلِ
مُهَذَّبَةٌ قَدْ طَيَّبَ اللّٰهُ خِيمَهَا وَطَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ سُوءٍ وَّبَاطِلِ

''وہ پاکدامن اور باوقار ہیں، ان پر کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ گناہ سے غافل عورتوں کی عیب جوئی اور غیبت نہیں کرتیں۔ وہ لُوَی بن غالب کے ایک معزز گھرانے کی معزز اور سردار خاتون ہیں، ان کے کارنامے بلند ہیں اور ان کی بزرگی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ وہ انتہائی مہذب ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں بہترین خصلتیں رکھی ہیں اور انھیں ہر خرابی اور گناہ سے پاک رکھا ہے۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4146، و سيرت ابن هشام: 306/3)

سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا ہے:

فَإِنَّ أَبِي وَوَالِدَهُ وَ عِرْضِي لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْكُمْ وِقَاءُ

''بے شک میرے والد، میری والدہ اور میری عزت تمھارے مقابلے میں محمد ﷺ پر فدا وقربان ہو جائیں۔''(سیرت ابن هشام:306/3)

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض جھوٹے مدعی طاہرہ وطیبہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بدزبانی کرتے ہیں جو کہ انتہائی پاکیزہ اور پاکیزہ لوگوں کے سردار ابوطیب ﷺ، جو زندگی بھر پاکیزگی کے حامل اور داعی رہے، کی زوجۂ محترمہ ہیں۔ اسی صورت میں مردوں اور عورتوں کو نظر نیچی رکھنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے تاکہ آپ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کی اقتدا کر کے اس امت (امت محمدیہ) کی عزت وعصمت محفوظ رہ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، بلاشبہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو (ازخود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوندوں پر یا اپنے باپ دادا پر، یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر، یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر، یا اپنے

بھائیوں پر، یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر، یا اپنے دائیں ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر، یا عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر، یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور سے زمین پر) مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے وہ (لوگوں کو) معلوم ہو جائے اور اے مومنو! تم سارے ہی اللہ سے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (النور 24:30، 31)

یہ واضح بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان منافقوں کا نشانہ اور ہدف تھے جنھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام تراشی کی۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایسے شخص کی طرف سے بھی صدمے کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ حسنِ سلوک کرتے تھے اور اس کے اخراجات پورے کرتے تھے اور اپنا خالص مال اس پر خرچ کرتے تھے، اسی لیے آپ کو اس بے وفائی اور ناشکری پر بہت غم و افسوس ہوا۔ اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس پر آیندہ کچھ بھی خرچ نہیں کریں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

(النور 24:22)

تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوراً فرمانے لگے: ''کیوں نہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔'' اور اس پر دوبارہ خرچ کرنا شروع کر دیا بلکہ فرمایا: ''میں کبھی بھی اس پر خرچ کرنا بند نہیں کروں گا۔''

(تفسیر ابن کثیر: 2/1322)

غزوۂ بنی مصطلق کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ منافقین خصوصاً عبداللہ بن ابی کا مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ منافقین صرف اس دور ہی میں نہ

تھے بلکہ ہر دور میں رہے ہیں اور ان کے بارے میں نازل ہونے والی آیات ہر دور کے منافقوں پر صادق آتی ہیں۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ پانی کے سلسلے میں دو آدمی لڑ پڑے۔ ایک بنو غفار میں سے تھا جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نوکر تھا اور دوسرا کسی انصاری کا حلیف تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نوکر نے مدد کے لیے آواز دی: او مہاجرو! میری مدد کرو۔ انصاری کے حلیف نے بھی پکارا: او انصار! میری مدد کرو۔ قریب تھا کہ مسلمانوں میں لڑائی پھیل جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جاہلیت والی پکار پکارتے ہو جبکہ میں تم میں موجود ہوں؟ ایسی باتیں چھوڑ دو۔ یہ شدید گندی باتیں ہیں۔''

(صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4907)

عبداللہ بن ابی چند انصار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے جو چھوٹی عمر کے صحابی تھے۔ وہ بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ عبداللہ بن ابی نے اس جھگڑے کے بارے میں مہاجرین کو نشانہ بناتے ہوئے کہا: اچھا! تو یہ اب اس حد تک بھی پہنچ چکے ہیں؟ یہ لوگ باہر سے آ کر ہمارے شہر میں ہم کو چیلنج کر رہے ہیں؟ اللہ کی قسم! ہماری اور ان پناہ گیر قریشیوں کی حالت وہی ہے جو کسی نے یوں بیان کی ہے: ''اپنے کتے کو خوب پالو پوسو، وہ تمھیں ہی کاٹے گا۔ اللہ کی قسم! مدینہ واپسی کے بعد ہم میں سے عزت والا ان ذلیلوں کو مدینہ سے نکال دے گا، پھر وہ اپنے اردگرد بیٹھے انصاریوں کو ملامت کرتے ہوئے کہنے لگا: اللہ کی قسم! اگر تم ان کا خرچہ پانی روک لیتے تو یہ تمھارے شہر سے نکل کر کہیں اور چلے جاتے۔''

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نوجوان لڑکے تھے۔ وہ برداشت نہ کر سکے اور جا کر عبداللہ بن ابی کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دی۔ اتفاقاً وہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے تھے۔ وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! آپ حکم فرمائیں تو میں اسے قتل کر دیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمر! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تب لوگ کہیں گے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے۔'' (صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4907، و السيرة النبوية لابن كثير: 291/3)

عبداللہ بن ابی نے آ کر حلف دے دیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کی۔ زید بن ارقم جھوٹ بولتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ موقع پر موجود نہیں تھے، وہ سمجھنے لگے کہ عبداللہ بن ابی سچ کہتا ہے جبکہ انھوں نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ملامت بھی کی کہ یہ نوجوان ہے، اسے غلطی لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت میں کوچ کا حکم دے دیا جس

وقت آپ عموماً کوچ نہیں کرتے تھے۔ سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ حاضر ہو کر آپ سے اس وقت کوچ کرنے کے بارے میں سوال کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھیں پتہ نہیں کہ تمھارے سردار نے کیا کہا ہے؟'' وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! کون؟ فرمایا: ''عبداللہ بن ابی۔'' وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! اس نے کیا کہا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ کہتا ہے: اگر ہم مدینہ پہنچ گئے تو ہم عزت والے ان ذلیلوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔'' سیدنا اسید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی عزت والے ہیں۔ ذلیل تو وہی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم اسے نکال دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارا دن چلتے رہے بلکہ اگلی رات بھی اور اگلے دن کا ابتدائی حصہ بھی، حتیٰ کہ لوگ تھک گئے، لہٰذا اترتے ہی سو گئے۔ بحث وتمحیص کا موقع ہی نہ ملا، لہٰذا یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں سے نکل گیا۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 269)

اس دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ منافقون نازل ہوئی جس سے سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ (تفسیر ابن کثیر: 1876/2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش طبعی کے طور پر ان کا کان پکڑتے ہوئے فرمایا: ''یہ وہ شخص ہے جس کے کان کی اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی ہے۔'' (سیرت ابن هشام: 292/3، والإصابة لابن حجر: 560/1، وسير أعلام النبلاء للذهبي: 165/3) اس بارے میں نازل ہونے والی آیات میں سے چند یہ ہیں:

﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''ان کے حق میں برابر ہے کہ آپ ان کے لیے بخشش کی دعا کریں یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کریں، اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا، بے شک اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ وہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ تم ان پر خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں اور آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں لیکن منافق سمجھتے نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یقیناً اگر ہم لوٹ کر مدینے گئے تو

زیادہ عزت والا ذلیل تر کو ضرور وہاں سے نکال دے گا اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔'' (المنافقون 63:6-8)

عبداللہ بن ابی کا ایک نیک بیٹا تھا۔ اس کا نام بھی عبداللہ تھا۔ وہ صحابی بھی تھا۔ جب اسے اپنے باپ کے اس کرتوت کا پتہ چلا تو وہ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا: اللہ کے رسول! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کروانا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے حکم دیجیے، میں اس کا سر کاٹ کر آپ کے حضور پیش کر دیتا ہوں۔ اللہ کی قسم! ہمارے قبیلے خزرج والے لوگ جانتے ہیں کہ پورے قبیلے میں کوئی اور شخص مجھ سے بڑھ کر اپنے والد سے حسن سلوک کرنے والا نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ نے کسی اور کو میرے باپ کے قتل کا حکم دے دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو مجھ سے میرے باپ کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھا نہ جائے گا۔ اگر میں اسے قتل کر بیٹھا تو ایک مومن کو کافر کے بدلے قتل کرنے کی وجہ سے آگ میں داخل ہو جاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بیٹے! ہم تیرے باپ کے ساتھ نرمی برتیں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے ہم اس سے حسن سلوک کریں گے۔'' (سیرت ابن هشام: 292/3)

اس واقعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ منافقین مسلمانوں میں اختلاف و فتنہ ڈالنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ وہ اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں اور ان کی وحدت کمزور پڑ جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ خاندانی عصبیت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی کا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دینے کی دھمکی دینا بھی واضح ثبوت ہے کہ منافقین مسلمانوں اور نبیٔ کریم ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی نہ کسی موقع کے انتظار میں رہتے تھے، نیز عبداللہ بن ابی کا اپنی بات سے مکر جانا منافقوں کی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر کر کے اسے خوب رسوا کیا۔ یہ ذکر قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کا کردار صدق و وفا کا اعلیٰ نمونہ ہے کہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھا حتیٰ کہ اپنے باپ کو بھی آپ پر قربان کر سکتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے والد کے ساتھ انتہائی حسن سلوک کرنے میں مشہور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کے مومن بیٹے کی دلجوئی کر کے حکمت، شفقت

اورحسن سلوک کی اعلیٰ مثال پیش کی، حالانکہ ایسے مشکل موقعوں پر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کوچ کا حکم دے کرلشکر کوسفر میں مشغول کر دیا اور پھر سفر کوطویل سے طویل تر کر کے ان کو اتنا تھکا دیا کہ ان کو جھگڑے اور تبصرے کا ہوش ہی نہ رہا۔کس قدر عظیم اور حکیم تھا یہ قائد جس نے ایسے مواقع پر حکمت اور تحمل کے بے مثال نمونے پیش کیے۔

غزوۂ بنی مصطلق کا ایک بہترین نتیجہ سیدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ کے نکاح کی صورت میں نکلا۔سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا اپنی قوم کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ جب عورتیں اور بچے قیدی بنائے گئے تو سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا سیدنا ثابت بن قیس بن شماس انصاری رضی اللہ عنہ کے حصے میں آگئیں۔سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا نے ان سے اپنی آزادی کا معاہدہ کرلیا، پھر وہ آپ ﷺ کے پاس آئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ نبیٔ کریم ﷺ انتہائی رحیم وشفیق ہیں۔ وہ عرض کرنے لگیں: اللہ کے رسول! میں اپنی قوم کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔ مجھ پر جو مصیبت ٹوٹ پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں۔ میں تقسیم میں ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھی۔ میں نے ان سے آزادی کا معاہدہ کرلیا ہے۔اب آپ کے پاس تعاون کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کی حالت پر بہت ترس آیا۔آپ ﷺ نے انھیں پیشکش کی کہ میں تمھاری پوری رقم ادا کرکے تم سے شادی کر لیتا ہوں۔اس سے تمھارا مرتبہ بھی بلند ہوگا اور ضائع ہونے والے عز وشرف کی جگہ بہترین عز وشرف بھی حاصل ہو جائے گا۔ (مرويات غزوة بنى المصطلق، ص: 351، والإصابة لابن حجر: 265/4) انھوں نے یہ پیشکش بصد خوشی قبول کر لی۔آپ ﷺ نے ان سے شادی کرلی۔ یہ شادی ان کی قوم کے لیے بڑی مبارک ثابت ہوئی جس سے ان کی تمام مشقتیں ختم ہوگئیں۔ ہوا یوں کہ جونہی آپ ﷺ نے ان سے شادی کی تو مسلمانوں نے بنومصطلق کے تمام قیدی آزاد کردیے اور کہنے لگے کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کے سسرال ہیں۔اس طرح یہ عظیم خاتون اپنی قوم کے لیے انتہائی بابرکت ثابت ہوئیں۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے بنومصطلق کے ایک سو خاندان آزاد کر دیے۔ میں نہیں جانتی کوئی دوسری عورت اپنی قوم کے لیے اس قدر بابرکت ثابت ہوئی ہو۔(الإصابة لابن حجر: 265/4)

سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ انتہائی عبادت گزار اور کثرت سے نفل روزے رکھنے والی خاتون تھیں۔ ان سے کئی احادیث بھی مروی ہیں۔ ان کی وفات 50 ہجری میں ہوئی۔

(الإصابة لابن حجر: 266/4)

یہ بات بھی انتہائی قابل لحاظ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کی ان سے شادی میں بنومصطلق کے ساتھ بہترین صلہ رحمی ہے۔ بنوخزاعہ کی اسی شاخ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بلاوجہ جنگ کی جبکہ عین اسی وقت خزاعہ کے دوسرے قبائل رسول اللہ ﷺ کے حلیف تھے۔ بہرصورت اس شادی نے بنومصطلق کو مسلمانوں کے قریب کر دیا اور یہ قبیلہ بھی قریش کی جنگ میں قریش کے خلاف مسلمانوں کا معاون بن گیا۔ والحمدللہ!

غزوۂ حدیبیہ شوال 6 ہجری

رسول اللہ ﷺ نے عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ جانے کا عزم ظاہر کیا اور عام لوگوں کو بھی ہمراہ جانے کی دعوت دی، مہاجرین، انصار اور دیگر اہل ایمان چودہ سو افراد اس کے لیے تیار ہوگئے۔ آپ انھیں ساتھ لے کر اس مقدس سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ (صحيح البخاري، حديث: 4150) آپ نے ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچ کر عمرے کا احرام باندھا۔ آپ کے ہمراہ ہدی (قربانی) کے جو جانور تھے آپ نے عربوں کے دستور کے مطابق ان کو قلادے (ہار) پہنائے۔ (صحيح البخاري، حديث: 4179,4178) تاکہ قریش مکہ کو اطمینان ہو کہ آپ بیت اللہ کی زیارت، حرم کی تعظیم اور محض عمرہ ادا کرنے کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا ان سے لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں۔

اس غزوے کے حوالے سے سب سے مفصل روایت وہ ہے جسے امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ہشام بن عروہ بن زبیر بن عوام کے طریق سے بیان کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ شوال میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ جب آپ عُسفان کے مقام پر پہنچے تو بنو کعب کا ایک آدمی آپ سے ملا۔ اس نے بتلایا کہ اللہ کے رسول! ہم قریش کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ انھوں نے اپنے حلیف قبائل کو جمع کر رکھا ہے۔ وہ انھیں گوشت اور چربی کی یخنی مہمان نوازی کے طور پر دے رہے ہیں۔ یہ لوگ آپ سے لڑائی کرنے اور آپ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روکنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

نبی ﷺ عسفان سے آگے گئے تو راستے میں قریش کے جاسوس خالد بن ولید سے سامنا ہوگیا۔ آپ نے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والا عام راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا اور ''كراع الغميم'' (یہ مکہ مکرمہ سے 16 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب کی جانب عسفان کے قریب واقع ہے۔ (معجم المعالم الجغرافية للسيرة النبوية، ص: 263)

جا پہنچے۔ وہاں آپ نے اپنے رفقائے سفر کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا: ''قریش نے تمھارا مقابلہ کرنے اور تمھارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اپنے حلیف قبائل کو جمع کر رکھا ہے اور وہ گوشت اور چربی کی یخنی سے ان کی ضیافت کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں بیت اللہ تک جانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اب تم مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم مکہ مکرمہ کی طرف سفر جاری رکھیں یا ہم قریش کے حلیف قبائل کی غیر موجودگی میں ان کے اہل وعیال پر حملہ کر دیں۔ اگر وہ لوگ بے حس و حرکت بیٹھے رہے تو ان کی خاموشی انھیں شکست سے دوچار کر دے گی اور اللہ ان کی گردن توڑ دے گا۔ اگر وہ ہمارے مقابلے میں آئے تو وہ کمزور اور شکست سے دوچار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں رسوا کرے گا۔

یہ سن کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ اگر مکہ مکرمہ کا رخ کریں تو بہتر ہے۔ ہم عمرہ کرنے کی نیت سے آئے ہیں۔ ہمارا کسی سے لڑائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، البتہ اگر کوئی شخص ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل ہوا تو ہم اس سے مقابلہ کریں گے۔ اللہ آپ کی مدد اور نصرت فرمائے گا اور آپ کو غلبہ دے کر فتح و نصرت سے ہم کنار کرے گا۔

سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ عرض گزار ہوئے: اللہ کے رسول! آپ جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہی تھی:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾

''وہ کہنے لگے: اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز اس زمین میں داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، (چنانچہ) تو اور تیرا رب جاؤ، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' (المائدۃ 24:5)

سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے مزید کہا: اللہ کے رسول! ہم تو یوں کہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا رب ان دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ تبدیل کرتے اور تصادم سے بچتے ہوئے حدودِ حرم کے قریب جا پہنچے۔ وہاں جا کر آپ کی اونٹنی ''جدعاء'' رک کر بیٹھ گئی۔ لوگ کہنے لگے: یہ آگے جانے اور چلنے سے انکاری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اس نے کوئی ضد نہیں کی اور ایسا کرنا اس کی عادت بھی نہیں۔ دراصل اسے اس ذات نے آگے جانے سے روک دیا ہے جس نے ہاتھی والوں کو مکہ مکرمہ کی طرف جانے سے روک دیا تھا۔ یہ قریش مجھ سے کسی بھی ایسی بات کا مطالبہ کریں جس میں اللہ کی حرمتوں کی تعظیم ہو، میں اسے تسلیم کروں گا۔ میں اس بارے میں ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔

پھر آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اب آگے چلو۔ وہاں سے داہنی طرف ہوتے ہوئے ''ذات الحنظل'' کے راستے سے حدیبیہ میں جا کر فروکش ہوگئے۔

لوگوں نے ایک کنویں سے اپنی ضرورت کے لیے پانی لینا شروع کیا تو وہ جلد ہی خشک ہوگیا اور حسبِ ضرورت پانی نہ مل سکا۔ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے پانی نہ ہونے کی شکایت کی تو آپ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر انھیں دیتے ہوئے فرمایا: جا کر اسے کنویں میں گاڑ دو، چنانچہ صحابہ نے ایسے ہی کیا تو کنویں میں پانی جوش مارتا ہوا ابلنے لگا، یہاں تک کہ سب حضرات نے اپنی اپنی ضرورت پوری کر لی اور آسودہ خاطر ہوگئے۔

قریش نے جب مسلمانوں کی آمد کے متعلق سنا تو بنوحلیس کے ایک آدمی کو گفت وشنید کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ لوگ ہدی کے جانوروں کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اسے آتے دیکھا تو صحابۂ کرام سے فرمایا: تم ان جانوروں کو کھڑا کر دو تاکہ وہ دیکھ لے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ ہم واقعی عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے دور سے جب ہدی کے جانوروں اور ان کے گلے میں قلادوں کو دیکھا تو اس نے مزید کوئی بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ جانوروں کو دور سے دیکھتے ہی واپس پلٹ گیا اور جا کر قریش سے کہا: لوگو! میں وہاں اونٹ اور ہدی کے جانور اور ان کے گلوں میں قلادے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ مسلمان لڑنا نہیں چاہتے۔ اس نے قریش کو خوب خوب سنائیں۔

مگر اس کی باتوں کا قریش پر کچھ اثر نہ ہوا۔ الٹا انھوں نے اسے بہت برا بھلا کہا اور اس پر خوب چڑھائی کی اور اسے گنوار دیہاتی قرار دیتے ہوئے کہا: ہمیں تیری باتوں پر نہیں اپنے آپ پر افسوس ہے کہ ہم نے تجھے ادھر بھیج دیا۔

چل ادھر ہو جا۔ یہ تیرے جیسے آدمی کا کام نہیں، پھر قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی سے کہا کہ تم جا کر

محمد (ﷺ) سے بات کرو اور ان سے کہو کہ وہ واپس چلے جائیں۔

چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی نے آ کر آپ سے کہا: اے محمد! میں نے پورے عرب میں کسی کو ایسا کام کرتے نہیں دیکھا جیسا کام آپ کر رہے ہیں۔ آپ چند سر پھرے لوگوں کو ساتھ لے کر اپنی ہی قوم اور بھائی بندوں پر چڑھائی کے لیے چلے آئے ہیں تا کہ ان کو تہس نہس کر دیں۔ یاد رکھو! میں کعب بن لوَی اور عامر بن لوَی وغیرہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہ لوگ تمھارے مقابلے کے لیے چیتوں کی کھالیں زیب تن کر چکے ہیں اور اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر تمھارے مقابلے کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔ عورتوں نے اپنے دودھ پیتے بچے بھی ساتھ اٹھائے ہوئے ہیں، یعنی وہ مرنے مارنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔ آپ مٹھی بھر ناتجربہ کار لوگوں کے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ گویا اس نے اس قسم کی باتیں کر کے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی پوری کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ قریش نے قسمیں کھائی ہیں کہ آپ ان کے سامنے جو بھی تجویز رکھیں گے وہ اس سے زیادہ سخت اور شدید قسم کا رویہ اپنائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے انتہائی صبر و تحمل سے اس کی باتیں سنیں اور فرمایا: ہمارا لڑائی کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں، نہ ہم کسی سے لڑنا چاہتے ہیں۔ ہم تو مکہ مکرمہ میں جا کر عمرہ ادا کر کے ہدی کے یہ جانور ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ تم جا کر اپنی قوم سے کہو کہ بار بار کی لڑائیوں نے انھیں خوب مزے چکھائے ہیں۔ ہمارے ساتھ جنگوں میں انھیں سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ ہمارے مد مقابل نہ آئیں اور ہمیں بیت اللہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے دیں۔ ہم جا کر عمرہ ادا کریں گے اور جانوروں کو ذبح کریں گے۔ وہ ہمارے ساتھ معاہدہ کر کے ایک مدت طے کر لیں۔ تب تک ان کی عورتیں پر امن اور ان کی نسلیں پرسکون رہیں گی۔ قریش لوگوں کے ساتھ میرے میل جول اور تعلقات میں آڑے نہ آئیں۔ اللہ کی قسم! میں اس دین کی خاطر ہر ہر آدمی سے ٹکر لوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے سرفراز کر دے یا اس راہ میں میری جان چلی جائے۔ اگر وہ لوگ مجھ پر غالب آ جائیں اور وہ یہی چاہتے ہیں۔ اور اگر اللہ مجھے ان پر غلبہ عطا کر دے تو انھیں اختیار ہوگا کہ وہ عداوت کا اظہار کرتے ہوئے میرے ساتھ قتال کریں یا اپنی جانوں کو بچاتے ہوئے میرے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیں۔ یہ باتیں سن کر عروہ قریش کی طرف گیا اور ان سے کہا: آپ لوگ جانتے ہیں کہ روئے زمین پر تم لوگ مجھے سب سے زیادہ

محبوب ہو۔تم میرے بھائی بند ہو اور مجھے سب سے زیادہ تمھارے ساتھ محبت ہے۔ میں نے لوگوں کے مجمعوں میں تمھارے لیے مدد مانگی، جب کسی نے تمھاری مدد نہ کی تو میں اپنے اہل وعیال کو لے کر تمھاری معاونت کے لیے تمھارے پاس چلا آیا۔ اللہ کی قسم! مجھے تمھارے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ تمھارے بغیر میں جینا بھی پسند نہیں کرتا۔تم جانتے ہو کہ اس آدمی (محمد ﷺ) نے تم سے انصاف کی بات کہی ہے۔تمھیں علم ہے کہ میں دنیا کے بہت سے بادشاہوں کے ہاں گیا ہوں اور میں بڑے بڑے لوگوں کو بھی دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کسی بھی بادشاہ یا بڑے آدمی کا اتنا احترام نہیں دیکھا جتنا محمد (ﷺ) کے ساتھی ان کا احترام کرتے ہیں۔

ان کی محفل میں کوئی آدمی ان کی اجازت کے بغیر کلام تک نہیں کرتا۔ وہ اجازت دیں تو کوئی آدمی بات کرتا ہے ورنہ خاموش ہی رہتا ہے۔ وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے صحابہ وضو کا گرنے والا پانی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں اور اسے حاصل کر کے اپنے سروں پر ڈال لیتے ہیں اور اسے اپنے لیے بابرکت سمجھتے ہیں۔

قریش نے عروہ کی باتیں سن کر سہیل بن عمرو اور مکرز بن حفص سے کہا: تم محمد (ﷺ) کے پاس جا کر کوئی ایسا معاملہ طے کرو کہ یہ مصیبت ٹل جائے اور وہ بیت اللہ تک بھی نہ آسکیں تا کہ عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ ہم نے ان کو بیت اللہ تک نہیں آنے دیا، چنانچہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور گفت وشنید شروع کی۔ انھوں نے جس قدر بھی شرطیں رکھیں، آپ ﷺ نے ان کی ہر بات قبول کر لی تا کہ لڑائی نہ ہو۔اس طرح بات چیت طے ہونے کے بعد معاہدہ لکھنے کی نوبت آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: لکھو **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! ہم یہ الفاظ ہرگز نہیں لکھیں گے۔آپ نے فرمایا: تم بتلاؤ، کیا لکھا جائے؟ انھوں نے کہا: یوں لکھیں: **بسمك اللهم**. آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔آپ نے لکھنے والے سے فرمایا: وہی لکھو جو یہ کہتے ہیں، چنانچہ ان کی بات کے پیش نظر یہی الفاظ لکھے گئے، پھر آپ نے فرمایا: اب لکھو: یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ مصالحت کر رہے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے: یہی بات تو ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا سبب ہے۔آپ نے فرمایا: تو پھر کیا لکھواؤں؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ کی بجائے آپ اپنی ولدیت کے حوالے سے یوں لکھیں: ''محمد بن عبداللہ۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بھی

ٹھیک ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں، لہٰذا اسی طرح لکھو، چنانچہ لکھنے والے نے ''محمد رسول اللہ'' کی بجائے ''محمد بن عبداللہ'' لکھا۔

انھوں نے معاہدے میں ایک شرط یہ بھی رکھی کہ مسلمان آئندہ سال عمرے کے لیے آئیں تو ان کی تلواریں میانوں میں ہوں گی اور وہ اپنے ساتھ زرہیں نہیں لائیں گے۔

نیز یہ کہ اگر اہل مکہ میں سے کوئی آدمی مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس (مدینے) چلا جائے تو آپ اسے ہمارے حوالے کریں گے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی ان کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے پاس آئے تو ہم اسے مسلمانوں کے حوالے نہیں کریں گے۔

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیگر قبائل میں سے جو لوگ ہمارے حلیف بن جائیں، وہ ہماری طرح ہی ہوں گے تو قریشی نمائندوں نے کہا کہ اسی طرح جو قبائل ہمارے حلیف بن جائیں، وہ ہماری طرح ہی ہوں گے۔

اس پر بنو کعب کے لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول! ہم آپ کے ساتھ ہیں اور بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے ساتھ رہیں گے۔

ابھی معاہدہ لکھا جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو کا بیٹا ابوجندل (ابوجندل رضی اللہ عنہ نے مکہ میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے والد نے انھیں ہجرت کرنے سے روک دیا تھا۔ انھوں نے ہجرت کی تو اس نے آپ پر بہت ظلم ڈھائے۔ آپ نے معرکۂ یمامہ میں 11ھ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ الإصابة لابن حجر: 34/4) جو کہ مسلمان ہو چکا تھا اور قریش نے اسے قید کر رکھا تھا، بیڑیاں گھسیٹتا ہوا وہاں آ پہنچا۔

اسے دیکھ کر مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہمارا بھائی ابوجندل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا کہ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ اس پر اس کا باپ سہیل بولا: نہیں، اسے میں اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔ آپ معاہدے کی دفعات پڑھیں۔ ان کی رو سے اس پر میرا حق ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے آمادگی کا اظہار کیا تو ابوجندل پکار پکار کر کہنے لگا: اللہ کے رسول! اے مسلمان بھائیو! میں بڑی مشکل سے ان کی قید سے بھاگ کر آیا ہوں، کیا مجھے واپس مشرکوں کے حوالے کر دیا جائے گا؟

اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چپکے سے ابوجندل سے فرمایا: (تمھارا باپ) اکیلا ہی ہے، یہ لو میری تلوار اور اس کا

کام تمام کر دو۔ یہ بات سہیل نے سن لی اور کہا: عمر! تم میرے قتل کے در پے ہو اور اسے اس پر اکسا رہے ہو؟ آخر رسول اللہ ﷺ نے سہیل سے فرمایا: تم میرا لحاظ کرتے ہوئے اسے میرے حوالے کر دو۔ اس نے بات نہ مانی اور اسے آپ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: اچھا میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ میری خاطر اس کا خاص خیال رکھنا اور اس پر ظلم نہ کرنا مگر اس نے یہ بات بھی نہ مانی۔

اس پر مکرز نے کہا: اے محمد! میں آپ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ ہم اس پر ظلم نہیں کریں گے۔ بہرحال ابوجندل کو قریش کی قید سے رہائی نہ ملی۔ (المغازي لابن أبي شيبة: 275,274)

حدیبیہ کا معاہدہ طے پانے کے دوران بہت سے اہم واقعات پیش آئے۔ ان میں سے بعض واقعات کی طرف قرآن کریم میں بھی اشارے پائے جاتے ہیں۔

بیعتِ رضوان

اس دوران میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی طرف روانہ فرمایا تاکہ وہ انھیں جا کر اطمینان دلائیں کہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کی زیارت، اس کی تعظیم اور محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں۔ ان کا قریش سے لڑائی کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں، چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سعید بن عاص کی پناہ اور حفاظت میں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور سردارانِ قریش کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچایا۔ قریش نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو بیت اللہ کی زیارت (عمرہ) کی اجازت دے دی مگر انھوں نے قریش کی اس پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کو عمرے کی اجازت نہیں دی جاتی، وہ اکیلے عمرہ نہیں کریں گے۔ قریش نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاں روک رکھنے کے منصوبے بھی بنائے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 315/3)

اس دوران میں رسول اللہ ﷺ تک یہ افواہ پہنچی کہ قریش نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ہے۔ یہ سن کر آپ کو غصہ آ گیا۔ آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہو کر صحابہ کرام سے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے بیعت لینے لگے۔ (صحيح البخاري، حديث: 4163، والسيرة النبوية لابن هشام: 316/3)

تمام مسلمان بڑے ذوق شوق سے بڑھ چڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ ان کے

ذوق کا یہ عالم تھا کہ سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے متعدد بار بیعت کی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا ہاتھ بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک سے لگتا رہے۔ اس موقع پر صرف ایک منافق جس کا نام جد بن قیس تھا، وہ اونٹنی کے پیچھے اوٹ میں چھپا بیٹھا رہا۔ اس نے بیعت نہیں کی تھی۔

اس موقع پر جن اہل ایمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی ستائش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے راضی اور خوش ہوگیا ہے جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ اور اس کے بدلے میں اس نے انھیں بہت جلد فتح سے نوازا۔'' (الفتح 18:48)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن بیعت کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«أَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ»

''روئے زمین پر آج جتنے لوگ بھی موجود ہیں، تم ان سب سے افضل ہو۔''

(صحيح البخاري، حديث: 4154، وصحيح مسلم، حديث: 1856)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کی اور انھیں بھی اس سعادت میں شامل فرمایا۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 284، والسيرة النبوية لابن هشام: 316/3)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ساتھ صلح کرنے میں اس حد تک کوشاں تھے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس پر بہت زیادہ غمگین اور متعجب ہوئے۔ بالآخر وہ کہہ اٹھے: اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ انھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ (قریش) باطل عقیدے پر نہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، ایسا ہی ہے تو عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جب یہ سب کچھ صحیح ہے تو ہم دین کے بارے میں اس قدر کمزوری کیوں دکھائیں؟ آپ نے فرمایا: ''عمر! میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔'' عمر رضی اللہ عنہ بولے: اللہ کے

رسول! آپ تو ہم سے فرماتے تھے کہ ہم بیت اللہ جا کر اس کا طواف کریں گے۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں، میں نے یہ بات کہی تھی۔ مگر کیا یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال ہی عمرہ کریں گے؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے چاہا تو تم اللہ کے گھر کا طواف ضرور کرو گے۔'' اس کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا۔ وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا: ابوبکر! ہم دین کے بارے میں کمزوری کیوں دکھا رہے ہیں؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی ساری باتیں تحمل سے سن کر ایک سمجھ دار اور فقیہ عالم کے انداز میں فرمایا: عمر! وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و مددگار ہے۔ تم خوش دلی سے ان کی بات مان لو۔ اللہ کی قسم! وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہی حق اور درست ہے۔

(صحيح البخاري، حديث: 2732، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 379، والسيرة النبوية لابن هشام: 317/3)

بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین طے پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دفعہ عمرہ نہیں کریں گے بلکہ عمرہ کرنے کے لیے آئندہ سال تشریف لائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ اٹھو اور ذبح کے لیے جو جانور ساتھ لائے ہو، انھیں ذبح کرو اور حلق کرا لو، یعنی سر منڈوا لو۔

آپ نے یہ حکم بار بار صادر فرمایا مگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ وہ ابھی تک پُر امید تھے کہ انھیں عمرہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس طرزِ عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبیدہ خاطر ہوئے اور آپ نے اپنی اس کیفیت کا ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اظہار فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا: آپ اس بارے میں ان سے مزید کچھ نہ کہیں۔ آپ جا کر اپنا اونٹ (نحر) ذبح کر دیں اور سر منڈوا لیں۔

چنانچہ آپ نے ایسے ہی کیا۔ صحابہ کرام نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی جلدی سے اٹھے اور اپنے اپنے جانور نحر (ذبح) کیے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 319/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 290)

ان تمام امور سے فراغت پانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ واپسی کا سفر شروع کیا۔ دوران سفر آپ پر سورۂ فتح نازل ہوئی۔ اس سے آپ کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

صحیح بخاری کی روایت ہے، زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں رواں دواں تھے۔ رات کا وقت تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی ہم سفر تھے۔ چلتے چلتے عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے دوبارہ سوال دہرایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے تیسری مرتبہ سوال دہرایا تو بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے دل میں کہا: عمر! تیری ماں تجھے گم پائے تو نے تین مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور انھوں نے تینوں دفعہ تجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اونٹ کو ایڑ لگائی اور آگے جا کر دوسرے مسلمان بھائیوں سے جاملا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا میرے بارے میں قرآن نازل ہو جائے۔ اتنے میں ایک پکارنے والے نے پکار کر مجھے بلایا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوا ہوگا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کیا تو آپ نے فرمایا: آج رات مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے پوری روئے زمین سے بڑھ کر محبوب ہے، پھر آپ نے سورۂ فتح پڑھ کر سنائی۔

(صحيح البخاري، حديث: 4177، المغازي لابن أبي شيبة، ص: 278)

سورۂ فتح کی پہلی آیت اور اس بارے میں وارد احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لیے فتح مبین ثابت ہوئی۔ اس کے ذریعے سے، یعنی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سارے عرب اور پوری دنیا میں دعوتِ اسلام کے پھیلنے کے اسباب پیدا کر دیے۔ بہت سے قبائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے بہت سے بادشاہوں اور امراء کے نام خطوط لکھ کر روانہ فرمائے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو فتح مبین قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں واقعی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دین الٰہی کی دعوت سننے اور قبول کرنے کی عام توفیق بخشی۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

''اسلام میں ''صلح حدیبیہ'' سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں، البتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رب کے مابین جو اسرار و رموز تھے، ہم لوگ ان کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ بندے جلد باز اور عجلت پسند ہیں۔ اللہ تعالیٰ عجلت پسند نہیں۔ وہ اپنی

مشیئت اور فیصلے کے مطابق معاملات کو انجام تک پہنچاتا ہے۔'' (السيرة النبوية للدكتور محمد أبو شهبة: 338/2)

اس صلح سے اہل اسلام کو کس قدر فوائد اور منافع حاصل ہوئے، انھیں شمار کرنا ناممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ''فتح مبین'' قرار دیا۔ یہ صلح کفار کی طرف سے واضح اعتراف تھا کہ اب وہ مسلمانوں کو ایک ناقابل تسخیر قوت تسلیم کرتے ہیں جن کی ایک الگ حکومت اور ایک قائد اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ ورنہ اس سے قبل وہ مسلمانوں کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے، نیز اس صلح (معاہدے) سے مسلمانوں کو اطمینان وسکون کے ساتھ اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا۔

اس صلح میں طے کردہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ قریش کا کوئی فرد مسلمان ہو کر اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر مکہ چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس مدینے گیا تو وہ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ بظاہر یہ شرط مسلمانوں کے حق میں بڑی سخت تھی۔ مگر بعد میں پیش آنے والے حالات سے واضح ہو گیا کہ یہ شرط مسلمانوں کے حق میں انجام کار کے طور پر بہتر ثابت ہوئی۔

بہت سے مسلمان اپنے آقاؤں اور سرپرستوں کی اجازت کے بغیر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آ گئے تھے۔ ان میں ایک نام ابوبصیر عروہ بن اسد ثقفی رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ قریش نے اپنے آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجے تاکہ معاہدے کے مطابق آپ انھیں واپس کر دیں، چنانچہ نبیٔ کریم ﷺ نے ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو ان قریشی نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ ابوبصیر رضی اللہ عنہ پختہ ایمان والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ابوبصیر! ہم ان قریشیوں کو اس بارے میں عہد و پیمان دے چکے ہیں۔ اس کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ ہمارے دین میں وعدہ خلافی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور تمھارے جیسے باقی مجبور اور بے بس مسلمانوں کے لیے کشادگی اور رہائی کا کوئی سبب پیدا فرما دے گا۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 323/3)

چنانچہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ، ان قریشی نمائندوں کے ہمراہ واپس روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر انھوں نے موقع پا کر ان میں سے ایک کی تلوار سنبھال لی اور اسے قتل کر ڈالا۔ دوسرا آدمی اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اسے بچاؤ کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ وہ خوف کے مارے دوڑتا ہوا مدینے کی طرف بھاگا۔ وہ انتہائی خوف کی حالت میں دوڑتا کانپتا جان بچا کر مدینہ پہنچا اور سارا ماجرا نبیٔ کریم ﷺ کے گوش گزار کیا۔ آپ نے اسے تسلی دی اور

فرمایا کہ فکر نہ کرو، وہ اب تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔

اتنے میں ابوبصیر رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے ان لوگوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اللہ نے وہ آپ سے پورا کرا دیا، آپ نے مجھے ان لوگوں کی طرف واپس بھیج دیا تھا۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے چھڑا دیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی ماں کی بردباری ہو (یہ کلمہ بددعا کے طور پر نہیں بلکہ عربوں کے طرز کلام کے مطابق ہے) یہ تو قریش کے ساتھ جنگ کی آگ بھڑکا دے گا۔ کاش کوئی آدمی اسے مکے پہنچا آتا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 324/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 290)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے ابوبصیر سمجھ گئے کہ انھیں دوبارہ کافروں کے حوالے کر دیا جائے گا، چنانچہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر نکل بھاگے اور عیص مقام کے قریب چلے گئے۔ یہ جگہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ قریش کی تجارتی گزرگاہ تھی۔

جو بے کس مسلمان کفار مکہ کی قید میں تھے موقع پا کر وہ بھی وہاں سے بھاگ نکلے اور ابوبصیر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی تعداد تقریباً ستر ہوگئی۔ قریش کا کوئی تجارتی قافلہ ادھر سے گزرتا تو یہ اسے لوٹ لیتے۔ آخر تنگ آ کر قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا اور قرابت داری کا واسطہ دیتے ہوئے کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ ان لوگوں کو اپنے پاس بلا لیں۔ آج کے بعد مکہ سے جو شخص بھی آپ کے پاس آئے گا، ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 324/3، وصحيح البخاري، حديث: 2733)

اس طرح صلح حدیبیہ میں بظاہر اپنے فائدے اور غلبے کے اظہار کے لیے جو کڑی شرط شامل کی گئی تھی، قریش خود ہی اس سے دست بردار ہوگئے، چنانچہ معاہدے کی یہ شق جو ابتدا میں بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ تھی، اللہ کی مشیت سے مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدۂ حدیبیہ کے پیش نظر ایفائے عہد کرتے ہوئے ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو کفار کے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: فکر نہ کرو۔ تم ان کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور تمھارے باقی مجبور اور بے بس مسلمان ساتھیوں کے لیے کشادگی اور رہائی کا کوئی سبب پیدا فرما دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے کشادگی کا سبب پیدا کر دیا۔

بادشاہوں اور امراء کے نام نبی ﷺ کے خطوط

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو پوری کائنات کی طرف مبعوث کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اے نبی! ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (الأنبياء 107:21)

آپ اللہ کے حکم سے مخلوق کو خالق کی عبادت کی طرف دعوت دیتے، اللہ کے حکم سے انھیں گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نورِ ہدایت کی طرف بلاتے اور انھیں صراطِ مستقیم کی راہ نمائی کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔'' (الأعراف 158:7)

اور یہ امر زیادہ گہرے مطالعہ کا متقاضی نہیں کیونکہ یہ جہان، موجوداتِ عالم اور اس میں انسانیت کے احوال خالق کی نظر میں برابر ہیں، اس لیے اس نے فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝﴾

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔'' (الحجرات 13:49)

رسول اکرم ﷺ نے تمام لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور بتایا کہ وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور اس شرف میں سب برابر ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے کسی کو دوسرے پر کوئی شرف و امتیاز نہیں ہے۔ یہی دعوت اسلام ہے۔ قبائل کی تفریق کا فلسفہ صرف اتنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿لِتَعَارَفُوْٓا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

''کہ تمھارا باہمی تعارف ہو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا آدمی وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔''

(الحجرات 13:49)

کسی گورے کو کالے پر کسی بھی لحاظ سے فضیلت و برتری حاصل نہیں۔ سب لوگ کنگھی کے دندانوں کی مانند ایک جیسے اور باہم برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت آفاقی ہے، اس لیے آپ ﷺ عالم عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کے احوال، وہاں کے نظام ہائے حکومت، وہاں کے قبائل اور ان کے امراء و سرداران کے حوالے سے بھی بخوبی واقف تھے اور آپ کی ان سب پر نظر تھی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب مسلمانوں پر مکہ میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے تو ان حالات میں آپ کا صحابۂ کرام کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم، جبکہ حبشہ سمندر پار دوسرے براعظم میں واقع تھا، اسی بنیاد پر تھا۔ آپ ﷺ وہاں کے نظامِ حکومت اور حکمرانوں کے عدل و انصاف اور رواداری سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ جانتے تھے کہ وہاں ایسا منصف مزاج شخص برسر اقتدار ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی پر بھی ظلم نہیں کیا جاتا، اس لیے آپ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے متعدد بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خطوط لکھے اور اس کے

لیے خصوصی اہتمام فرمایا۔ آپ نے ہر بادشاہ کی طرف خط بھیجنے کے لیے صحابۂ کرام میں سے ایسے ذہین اور قابل افراد کا انتخاب کیا جو ان ممالک، وہاں کے حکمرانوں اور رعایا کے مزاج سے بخوبی آگاہ اور واقف تھے۔ آپ نے انھیں روانہ کرتے ہوئے خصوصی ہدایات دیں اور ان کو ذمے داری کی نزاکت و اہمیت سے بھی آگاہ فرمایا۔

ابن ہشام رحمہ اللہ رقم طراز ہیں کہ حدیبیہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو قریش مکہ نے عمرہ ادا نہ کرنے دیا تو اس کے بعد ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ایک مجمعے میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے کائنات کے لیے رحمت بنا کر سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہے، لہٰذا تم میرے ساتھ کسی بھی بات کے بارے میں اس طرح اختلاف نہ کرنا، جیسے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ان کے حواریوں نے اختلاف کیا تھا۔''

صحابہ کرام نے عرض کیا: اللہ کے رسول! سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان کے ساتھ کس طرح اختلاف کیا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''انھوں نے بھی اپنے حواریوں کو اسی چیز کی دعوت دی اور اسی کی طرف بلایا تھا جس کی طرف میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں۔ ان میں سے جو لوگ دل و جان سے ان کے ساتھ تھے، وہ ان سے راضی رہے اور ان کی ہر بات کو انھوں نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا لیکن جو لوگ دلی طور پر ان کے ساتھ نہ تھے، انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے فرمودات کو سن کر ناگواری کا اظہار کیا اور ان کی باتوں کو بوجھ سمجھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس کا شکوہ کیا۔ اس کے بعد یہ لوگ ان لوگوں کی بولی میں باتیں کرنے لگے جن کی طرف انھیں مبعوث کیا گیا تھا۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 607,606/4، وإسناه ضعيف جداً)

رسول اللہ ﷺ نے مختلف ممالک کے بادشاہوں کے نام خطوط لکھ کر انھیں قبولِ اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے یہ خطوط انتہائی ذمے دار صحابہ کے ہاتھ متعلقہ بادشاہوں کو بھجوائے۔ (رسول اللہ ﷺ کے خطوط کے حوالے سے متعدد کتب تصنیف کی گئی ہیں، مثلاً: ❁ المصباح المغنى فى كتاب النبى الأمى إلى ملوك الأرض لجمال الدين ابن أبى حديده الأنصارى. ❁ الوثائق السياسية للعهد النبوى والخلافة الراشدة لمحمد حميد اللّٰه. ❁ رسائل النبى ﷺ إلى الملوك والأمراء لخالد سيد على)

رسول اللہ ﷺ کا شاہِ روم کے نام خط

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں روم کی سلطنت سپر پاور سمجھی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں ایک سورت، سورۂ روم ہے۔ یہ قبل از ہجرت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں روم کا ذکر آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝﴾

''الٓمّٓ۔ رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب ترین سرزمین میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں، سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس (غلبے والے) دن مومن بھی خوش ہوں گے۔ اللہ کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ نہایت غالب، بہت رحم کرنے والا ہے۔'' (الروم 30:1-5)

ان دنوں اہل روم اور اہل فارس فلسطین اور اردن کے علاقوں میں باہم برسر پیکار تھے اور پوری دنیا میں اس جنگ کا چرچا تھا۔ یہ بات معروف ہے کہ ان دنوں مصر، شام اور شمالی افریقہ کے علاقے بازنطینی روم کی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ اس پوری سلطنت کا بادشاہ قیصر حکمران تھا، اس نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالحکومت بنایا ہوا تھا۔

(الحضارة البيزنطية، ص: 89)

اس کے ماتحت علاقائی حکام (گورنر اور وزراء) اور عوام سب کے سب عیسائی تھے۔

(الإمبراطورية البيزنطية، از نورمان بينز ص: 173)

اس دور میں ایک ایسا نظام جاری تھا کہ چھوٹی علاقائی ریاستیں، مرکزی سلطنت کو باقاعدہ ٹیکس ادا کرتی تھیں اور اس ٹیکس کو پورا کرنے کے لیے ان حکمرانوں نے اپنے عوام پر بے تحاشا جرمانے اور ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ وہ مرکزی سلطنت کو بھاری ٹیکس ادا کرنے کی خاطر اپنے عوام پر ظلم کرتے اور ان سے بے تحاشا ٹیکس اور جرمانہ وصول کرتے۔ (الحضارة البيزنطية، ص: 112، والنظم الإسلامية، ص: 24)

روم کی سلطنت میں لوگوں کا عمومی مذہب اگرچہ عیسائیت تھا مگر ان کے بھی بہت سے فرقے وجود میں آچکے تھے۔ ہر فرقے کے عقائد و اعمال دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ ان کے آپس میں اس قدر اختلافات اور عداوت تھی کہ وہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے تھے اور ان کی عبادت گاہیں (گرجا گھر اور کنیسے) تک الگ الگ تھیں۔

بلکہ بہت سی چھوٹی حکومتیں اور بے شمار قبائل مرکزی سلطنت کے ساتھ عداوت رکھتے تھے اور نفرت کی حد تک بیزار تھے۔

رومی بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بعض صوبوں میں، بالخصوص مصر میں اس عیسائی عقیدے کو جبراً نافذ کرنے اور پھیلانے کی کوشش کی جو قسطنطنیہ میں رائج تھا۔ اس بنا پر مصر کے قبطیوں اور روم کے عیسائیوں کے درمیان عداوت پھوٹ پڑی۔

(الفتوح الإسلامية عبرالعصور، ص: 97-99، والروم فی سیاستهم وحضارتهم ودینهم وأخلاقهم:138/1)

عہد نبوی میں روم کا بادشاہ ہرقل (610ء-641ء) تھا۔ وہ ایک یونانی خاندان کا فرد تھا۔ اس کی ولادت قرطاجہ (Carthage) میں ہوئی تھی۔ آج کل یہ شہر تیونس میں واقع ہے۔ اس کا والد مصر کا یونانی گورنر تھا۔ جب رومیوں کی ایرانیوں سے جنگ جاری تھی تو اس دوران ہرقل کو دارالحکومت قسطنطنیہ بلایا گیا اور روم کی حکومت اس کے سپرد کی گئی۔ اب یہ روم کا قیصر بن گیا تو اس نے ایرانیوں کو شکست فاش دی اور رومیوں کی کھوئی ہوئی طاقت اور ہیبت کو دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''الٓمّٓ۔ رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب ترین سرزمین میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں، سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس (غلبے والے) دن مومن بھی خوش ہوں گے۔'' (الروم30:1-4)

یہ واقعہ 616ء کا ہے۔ ہرقل عیسائی بادشاہ تھا۔ وہ صلیب کو مقدس سمجھتا تھا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام

کو اس پر سولی چڑھایا گیا ہے؟ ہرقل نے اس صلیب کا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کیا تو اس واقعے پر عیسائیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ خوب جشن منایا اور ہر جگہ محافل کا انعقاد کیا بالخصوص بیت المقدس میں تو بہت زیادہ خوشی کا سماں رہا۔ (السيرة النبوية للندوی، ص: 296، تجربة مؤثة للدكتور علی العتوم، ص: 92) اسی دوران ہرقل کے پاس رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی پہنچا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کے نامۂ مبارک کی عبارت درج ذیل تھی:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . مِنْ مُحَمَّدٍ، عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ» ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (ﷺ) کی طرف سے شاہِ روم ہرقل کے نام۔ اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس کے بعد، میں تجھے کلمۂ اسلام (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ) کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جا تو محفوظ رہے گا۔ اللہ تجھے دہرا اجر دے گا۔ اگر تو یہ بات نہ مانے تو تیری رعایا کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا۔ اور ''اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔'' (آل عمرٰن 64:3، صحيح البخاري، حديث: 7، وزاد المعاد: 681/3)

رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کی طرف اپنا یہ نامہ مبارک سیدنا دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کیا۔ ان کی قوم کے لوگ روم میں شام کے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا قبیلۂ کلب سرزمین شام کے جنوبی اطراف

میں آباد تھا۔ (الأنساب للسمعاني: 452/10) اس لیے وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ شاہِ روم ہرقل کے پاس پہنچنے اور اس کے ساتھ گفتگو کے آداب کیا ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کا مکتوب ہرقل کے پاس پہنچا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ خود صاحب علم عیسائی تھا۔ وہ اگرچہ اپنے علاقے کا بادشاہ تھا، پھر بھی اس نے آپ کے خط کو بہت اہمیت دی اور آپ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

اس نے حکم دیا کہ ملک میں ایسے افراد کو ڈھونڈا جائے جو اس نبی کی قوم اور علاقے سے تعلق رکھتے ہوں اور اس نبی اور اس کے احوال سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ابوسفیان بن حرب جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ صلح حدیبیہ کے بعد قریش کا ایک تجارتی قافلہ لے کر بیت المقدس کے اطراف و اکناف میں تجارت کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ ہرقل کے کارندے ابوسفیان اور باقی قریشی تاجروں کو ہرقل کے دربار میں لے آئے تاکہ وہ ان لوگوں سے نبیٔ کریم ﷺ کے بارے میں معلومات لے سکے۔

یہ لوگ شاہی دربار میں پہنچے تو ہرقل نے ایک ترجمان کی وساطت سے ان لوگوں سے خاصی طویل گفتگو کی اور نبی ﷺ کے بارے میں سوالات کیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ مجھے خود ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم معاہدہ حدیبیہ کے دوران جو رسول اللہ ﷺ اور کفار قریش کے درمیان ہوا تھا، تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے کہ ہرقل نے مجھے اور قافلے کے دیگر لوگوں کو بلا بھیجا۔ ہمیں ہرقل کے پاس لے جایا گیا۔ وہ اس وقت ایلیاء، یعنی بیت المقدس میں تھا۔ ہرقل نے ہمیں اپنے دربار میں بلایا۔ اس وقت اس کے اردگرد سلطنت روم کے بڑے بڑے لوگ، یعنی مختلف علاقوں کے حکمران، سلطنت کے پادری اور اہل علم موجود تھے۔ اس نے ہم سب سے اپنے ترجمان سے مخاطب ہو کر کہا: ''وہ شخص جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، تم میں سے کس آدمی کا اس کے ساتھ سب سے زیادہ قریبی نسبی اور خاندانی تعلق ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کہا: میں نسب میں اس کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔

ہرقل نے کہا: اسے میرے قریب لے آؤ۔ اور اس کے باقی ساتھیوں کو بھی قریب لا کر اس کے پیچھے بٹھا دو۔

اس کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا: ان لوگوں کو بتا دو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس آدمی (نبی ﷺ) کے بارے میں کچھ سوالات کروں گا۔ اگر یہ جھوٹ بولے اور غلط بیانی کرے تو تم فوراً بتا دینا کہ

یہ غلط کہہ رہا ہے۔

ابوسفیان کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! اگر جھوٹ بولنے کی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو میں آپ ﷺ کے متعلق وہاں ضرور جھوٹ بولتا۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہرقل نے مجھ سے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ اس نبی کا تم لوگوں میں نسب کیسا ہے؟

میں نے کہا: وہ اونچے نسب کا حامل ہے۔

اس نے کہا: کیا تمھارے ہاں اس سے پہلے بھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے کہا: کیا اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے کہا: بڑے اور مال دار قسم کے لوگ اس کے ساتھ مل رہے ہیں یا عام اور کمزور لوگ؟

میں نے کہا: کمزور اور عام قسم کے لوگ۔

ہرقل نے دریافت کیا: اس نبی کے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا وہ کم ہو رہے ہیں؟

میں نے کہا: وہ دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔

ہرقل نے پوچھا: کیا اس کے دین میں داخل ہو جانے کے بعد کوئی آدمی اس دین سے برگشتہ ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے دریافت کیا: اس شخص کے دعویٰ نبوت سے قبل کبھی تم نے اس سے کوئی جھوٹ سنا؟

میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے پوچھا: کیا وہ شخص کبھی بدعہدی کا مرتکب ہوا؟ یا اس نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے؟

میں نے کہا: نہیں، البتہ ہم نے آج کل اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے معلوم نہیں اس میں وہ کیا کرتا ہے؟

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ساری گفتگو میں محمد ﷺ کے خلاف مجھے اس جملے کے سوا کچھ کہنے کی جسارت نہ ہوئی۔

ہرقل نے پوچھا: کیا تمھارے اور اس کے درمیان جنگ ہوئی ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں۔

ہرقل نے پوچھا: وہ جنگ انجام کے لحاظ سے کیسی رہی؟

میں نے کہا: جنگ ہمارے اور اس کے درمیان برابر کی چوٹ رہی۔ کبھی وہ ہمیں شکست سے دوچار کر دیتا ہے اور کبھی ہم ان کو زک پہنچا لیتے ہیں۔

ہرقل نے پوچھا: وہ نبی تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟

میں نے کہا: وہ کہتا ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ تمھارے آباء و اجداد جو کچھ کہتے اور کرتے تھے، اسے چھوڑ دو، نیز وہ ہمیں نماز، سچائی، پاک دامنی اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا:

ابوسفیان سے کہو:

میں نے تم سے اس (نبی) کے حسب ونسب کے متعلق دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ وہ اعلیٰ نسب والا ہے۔ اور دستور یہی چلا آرہا ہے کہ اعلیٰ نسب والوں ہی کو نبوت سے سرفراز کیا جاتا اور رسول بنا کر مبعوث کیا جاتا ہے۔

میں نے تم سے پوچھا: کیا اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے بتلایا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: اگر اس سے پہلے تم میں سے کسی نے ایسا دعویٰ کیا ہوتا یا ایسی بات کہی ہوتی تو میں سمجھتا کہ اس نے ایک ایسی بات کی نقالی کی ہے جو اس سے پہلے کہی جا چکی ہے۔ میں نے تم سے پوچھا: کیا اس کے آباء واجداد میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ تم نے بتلایا: نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس کے باپ دادوں میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ اپنے باپ کے ملک، سلطنت اور بادشاہت کا طلبگار ہے۔

میں نے تم سے پوچھا: اس نے نبوت کا جو دعویٰ کیا ہے، آیا اس سے پہلے تم نے کبھی اس سے جھوٹ سنا؟

تم نے بتلایا: نہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ جو آدمی لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ کے بارے میں کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے۔

میں نے تم سے دریافت کیا کہ بڑے لوگ اس کے ساتھ مل رہے ہیں یا کمزور قسم کے لوگ؟ تو تم نے بتلایا کہ کمزور لوگ۔ حقیقت یہی ہے کہ ایسے لوگ ہی اللہ کے نبیوں کا ساتھ دیا کرتے ہیں۔

میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے پیروکاروں اور ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی؟ تو تم نے بتلایا کہ ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ایمان کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے تا آنکہ وہ غالب آجائے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے دین کو قبول کر لینے کے بعد کوئی آدمی اس سے برگشتہ ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟ تم نے بتلایا کہ نہیں۔ ایمان واقعی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب اس کی بشاشت (خوشی اور لذت) دل میں گھر کر جائے تو وہ نکلتی نہیں۔

میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا وہ نبی بدعہدی بھی کرتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں۔ اللہ کے رسول ایسے ہی عظیم اخلاق کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بدعہدی اور وعدہ خلافی نہیں کرتے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ وہ لوگوں کو کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ وہ تمھیں اللہ واحد کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیتا ہے، بت پرستی سے منع کرتا ہے۔ نماز، سچائی اور پاک دامن رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر یہ ساری باتیں صحیح ہیں تو یاد رکھو وہ عنقریب میری اس حکومت وسلطنت کا مالک بن جائے گا۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک نبی کا ظہور ہونے ہی والا ہے لیکن میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تم (عربوں) میں سے ہوگا۔ اگر مجھے یقین ہو کہ میں اس نبی تک پہنچ پاؤں گا تو ان سے ملنے کی پوری کوشش کرتا۔ اور اگر میں ان کی خدمت میں ہوتا تو ضرور ان کے پاؤں دھوتا۔

پھر اس نے وہ خط منگوا کر پڑھا جو رسول اللہ ﷺ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ذریعے حاکم بصریٰ کی وساطت سے ہرقل کے نام بھیجا تھا۔ اس میں تحریر تھا:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . مِنْ مُحَمَّدٍ، عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ إِلٰى هِرَقْلَ

عَظِيمِ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ» ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بندے اور رسول محمد (ﷺ) کی طرف سے شاہِ روم ہرقل کے نام۔ راہِ ہدایت اختیار کرنے والے پر سلام ہو۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ دین اسلام قبول کر لو، سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم نے دعوت حق کو قبول کرنے سے اعراض کیا تو عام لوگوں کی گمراہی اور دعوت حق کو قبول نہ کرنے کا سارا وبال تمھی پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے اہل کتاب! تم ایک ایسے کلمے (بات) کی طرف آ جاؤ (اور اسے قبول کر لو) جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی بھی ایک اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اپنا پروردگار نہ ٹھہرائے، پھر اگر (وہ لوگ) قبول حق سے اعراض کریں تو آپ ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ تم اس بات پر گواہ رہو کہ بے شک ہم مسلمان ہیں۔''

(آل عمرٰن 64:3)

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہرقل میری باتیں سن کر جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا اور نامۂ مبارک پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے دربار میں بہت زیادہ شور بپا ہوگیا۔ آوازیں خوب بلند ہوئیں۔ ہمیں وہاں سے باہر بھیج دیا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے اپنے رفقاء سے کہا: ابو کبشہ کے بیٹے، یعنی محمد ﷺ کا معاملہ تو اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے ڈرتا ہے۔ اس کے بعد مجھے برابر یقین رہا کہ بالآخر رسول اللہ ﷺ کا دین غالب آ کر رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں بھی اسلام داخل کر دیا۔ (صحيح البخاري، حديث: 7)

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ہرقل نے علیحدگی میں سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ سے انفرادی ملاقات بھی کی تھی۔

اس میں اسلام، مسیح علیہ السلام کے بارے میں اس کے نظریات اور مسیح علیہ السلام کن لوگوں کے حق میں دعائیں کرتے تھے، وغیرہ موضوعات پر ان کی گفتگو ہوئی۔ اس نے گفتگو کے دوران میں اللہ کے خوف کا ذکر کیا اور اس نے اپنے برے انجام، حکومت کے خاتمے کے خوف اور آخرت میں اپنے برے انجام کے خدشے کا بھی اظہار کیا۔

پھر ہرقل نے نبیٔ کریم ﷺ کے نام ایک خط لکھا اور بہت سے تحائف دے کر سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاں سے روانہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بھیجے ہوئے تحائف مسلمانوں میں تقسیم کر دیے اور آپ نے ہرقل کے متعلق فرمایا کہ اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ برابر عیسائیت ہی پر قائم ہے۔

(المصباح المضيء فی کتاب النبي الأمي، از جمال الدين، ص: 198)

اس موضوع سے متعلقہ اس قسم کی روایات اور ان کی تفصیلات محدثین کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق واضح سند نہیں رکھتیں، اس لیے مؤرخین ان روایات کی صحت کے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہیں، تاہم ہرقل کا سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھنا اور بالخصوص سوال و جواب کرنا معمول کی بات ہے، پھر صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ہرقل نے اس نامۂ نبوی کو خصوصی اہمیت دی گویا وہ آپ کی صداقت کا قائل ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے اسلام کا اظہار نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے اس نے عربوں کے تجارتی وفد کو تلاش کر کے اپنے ہاں بلوایا اور ان سے سوالات کر کے جوابات حاصل کیے۔ اس کے بعد بھرے دربار میں آپ کا خط پڑھا اور رسول اکرم ﷺ کے غالب آنے کا اظہار کیا، ان تمام تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دلی طور پر آپ کی صداقت کا اقرار کر چکا تھا اگرچہ اس نے قبولِ اسلام کا کھلم کھلا اظہار نہیں کیا۔ اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ محمد ﷺ نے اسے دین حق ہی کی دعوت دی ہے۔ اور آپ ختنہ کرنے والوں میں، یعنی عربوں میں مبعوث ہوئے ہیں اور آپ ہی آخرالزمان نبی ہیں۔ اسے یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد ضرور کرے گا اور اللہ تعالیٰ عنقریب ان کے دین کو مقبولیت دے گا اور ان کی دعوت کو غالب کرے گا۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو ابھی تک اپنے آبائی دین، شرک پر قائم تھے اور باقی قریش کی طرح وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے شدید مخالف اور دشمن تھے، ہرقل کی باتیں سن کر کہہ اٹھے کہ رومیوں کا یہ بادشاہ بھی محمد ﷺ سے ڈرتا ہے۔ ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ جس سے وہ دشمنی رکھتا ہے، دورِ حاضر کی سپر پاور کا حکمران بھی اس سے خوف زدہ ہے۔

ہرقل رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آخری نبی کی صداقت اور ان پر ایمان لانے کے بارے میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی وصیت پر عمل کرنے میں متردد اور حیران تھا۔ وہ کوئی واضح فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ عیسائیت ہی پر قائم رہے یا اسلام قبول کر لے۔ آخر کار اس نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دی۔

وہ روم کی حکومت وسلطنت سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی حکومت کے وزراء وغیرہ کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے بارے میں اس کی موافقت کرتے ہیں یا مخالفت؟ شام کے عیسائیوں کا ایک پادری ابن ناطور، ہرقل کا مصاحب اور اس کا دوست تھا۔ اس کا بیان ہے کہ بعدازاں ہرقل نے رومیہ میں اپنے ایک دوست کو اس بارے میں خط لکھا۔ وہ علم میں ہرقل کا ہم پلہ تھا۔ خط لکھنے کے بعد ہرقل حمص کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابھی وہ حمص نہیں پہنچا تھا کہ رومیہ والے اس کے دوست کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس نے بھی ہرقل کے خیالات کی تائید کی اور کہا: واقعی نبی ﷺ دنیا میں تشریف لا چکے ہیں اور وہ سچے نبی ہیں۔

اس کے بعد ہرقل نے حمص میں واقع ایک بہت بڑے میٹنگ ہال میں سلطنت کے اہم ذمے داروں کو جمع کر کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ دروازے بند کر دیے گئے تو اس نے اٹھ کر کہا: اے میرے رومی رفقاء! اگر تم دنیا کی کامیابی اور آخرت کی فلاح چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ تمھاری سلطنت ہمیشہ ہمیشہ تمھارے پاس رہے تو تم سب اس نبی کی بیعت کر لو۔ ہرقل کی یہ بات سن کر سب لوگ غصے اور نفرت کے عالم میں اٹھ کر دروازوں کی طرف ایسے دوڑے جیسے وحشی گدھے دوڑتے ہیں مگر دروازے بند تھے۔ ہرقل نے دیکھا کہ یہ لوگ اسلام سے نفرت کرتے ہیں اور قبولِ اسلام و ایمان سے گریزاں ہیں تو اس نے اپنے کارندوں سے کہا: ان حضرات کو میری طرف واپس لاؤ۔ وہ لوگ واپس آئے تو اس نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا: میں تو صرف تمھیں آزما رہا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے دین اور عقیدے پر کس حد تک ثابت قدم ہو، چنانچہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم اپنے دین و مذہب پر مضبوط ہو۔ اس کی یہ بات سن کر وہ لوگ اس کے سامنے سجدے میں جھک گئے اور اس سے راضی ہوگئے۔ (صحيح البخاري، حديث: 7)

سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہرقل کے بارے میں سچ ثابت ہوا۔

﴿بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''بلکہ جن لوگوں نے ظلم کیا انھوں نے بغیر علم کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی، پھر جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ہیں، چنانچہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی جائز نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

(الروم30:29,30)

آگے چل کر اسی سورت میں اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا ہے:

﴿فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

''تو (اے نبی!) بلاشبہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ آپ بہروں کو (اپنی) پکار سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں۔ اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت کی طرف لا سکتے ہیں، آپ تو صرف انھیں سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، لہٰذا وہی فرماں بردار ہیں۔''

(الروم30:52,53)

آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں مزید ارشاد فرمایا:

﴿فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝﴾

''پس قیامت کے دن ظالموں کو ان کی کوئی بھی معذرت کسی بھی قسم کا فائدہ نہ دے گی اور نہ ان سے یوں کہا جائے گا کہ اب معافی مانگ لو۔'' (الروم30:57)

انسان سورۂ روم کا مطالعہ کرتے ہوئے ان مقامات پر رُک کر ذرا غور کرے تو پتہ چلتا ہے کہ اس سورت میں ان امور کا تذکرہ کرتے ہوئے روم کے بادشاہ اور دوسرے حکمرانوں کے موقف کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے اس میں عظیم درس اور نصیحت ہے۔

ہرقل نے کھلم کھلا اعتراف کیا کہ مستقبل قریب میں مسلمان دنیا پر غلبہ پالیں گے اور ان کی حکومت، اس کی سلطنت، یعنی فلسطین اور شام کے ملکوں تک پھیل جائے گی۔

اہل اسلام اور رومیوں کے درمیان سب سے پہلا باقاعدہ فوجی ٹکراؤ معرکۂ موتہ میں ہوا۔ مسلمانوں کے لشکر کی قیادت سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام، جاں نثار ساتھی اور آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اس معرکے کے دوران میں سیدنا زید بن حارثہ، سیدنا جعفر بن ابی طالب اور سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اور متعدد صحابہ نے جام شہادت نوش کیا اور خلعت شہادت سے سرفراز ہو کر اللہ کے ہاں جا پہنچے۔

ہرقل، جو ایک سپر پاور کا حکمران تھا اور اپنے ہم عصر اہل فارس کے ساتھ برسر پیکار رہ کر اپنی فتح کا جھنڈا بھی گاڑ چکا تھا، اس قدر قوت اور شان و شوکت کے باوجود اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لشکر پر حملہ کرنے کی جرأت یا جسارت نہیں کی۔ قرآن کریم نے سورۂ روم میں جن ظالم اقوام و افراد کا عمومی تذکرہ کیا ہے، رومی بھی انھی میں سے ہیں، جن کی نسبت سے ایک سورۂ مبارکہ موجود ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں، پھر وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے اور انھوں نے زمین کو (ان سے زیادہ) جوتا بویا اور جتنا اُنھوں نے زمین کو آباد کیا تھا اتنا انھوں نے آباد نہیں کیا ہے اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، پھر اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے، پھر جن لوگوں نے برے کام کیے تھے ان کا انجام بھی برا ہی ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔'' (الروم 30: 10,9)

میرا خیال ہے کہ اول تا آخر ان آیات کے مخاطب رومی لوگ ہیں جنھوں نے بہت سے علاقوں کو فتح کیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر کے زمین کو آباد کیا۔ جب انھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تو ان کا انجام بہت برا ہوا۔ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، یعنی اللہ کی نافرمانیاں کیں تو اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو ان کے علاقوں کا مالک بنا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا بھیجا ہوا لشکر موتہ سے واپس لوٹا تو مدینہ منورہ کے نوجوان مسلمان ان سے کہنے لگے: اے میدانِ جنگ سے بھاگ آنے والو!

تو نبی ﷺ نے ان کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ میدانِ جنگ سے بھاگ آنے والے نہیں بلکہ بھرپور تیاری کر کے دشمن پر دوبارہ لشکر کشی کرنے والے ہیں۔ ان شاء اللہ!'' (السيرة النبوية لابن هشام: 382/3، المغازی للواقدی: 795/2) چنانچہ چند ہی سال بعد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لشکر اسلام کی قیادت کرتے ہوئے یرموک کے مقام پر رومیوں کے خلاف سب سے بڑی اور سخت جنگ کی تھی۔

چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''سَيْفٌ مِّنْ سُيُوفِ اللهِ'' (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) قرار پائے۔ (صحيح البخاري، حديث: 3757)

رسول اللہ ﷺ کی جس حدیث میں رومیوں پر دوبارہ لشکر کشی کا ذکر ہے، اس میں یرموک اور اس علاقے میں ہونے والے دیگر معرکوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس معرکے کے پیش آنے کی خبر دینا رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ اس واقعے میں جو آدمی تدبر کرے گا، وہ اس میں مزید حکمتیں پائے گا۔

غزوۂ موتہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے عہد ہی میں دوسرا معرکہ غزوۂ تبوک کی صورت میں ہوا۔ اس کی قیادت اللہ کے رسول ﷺ نے خود فرمائی۔ آغاز اسلام سے اب تک کے معرکوں میں سے اس غزوے میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اس غزوے میں مسلمانوں کا ہدف روم اور اس کی حکومت کے جنوبی علاقے تھے۔ یاد رہے کہ تبوک سرزمین شام کی سرحد کے قریب ہے۔ اس موقع پر اللہ کے رسول ﷺ لشکر کے ہمراہ وہاں پندرہ دن تک مقیم رہے۔

اس دوران میں آپ نے قریب قریب کے علاقوں میں فوجی دستے بھی روانہ فرمائے اور رومی سرحد کے علاوہ حدودِ روم کے اندر واقع مختلف حکومتوں کے امراء اور متعدد قبائل کے سرکردہ افراد سے ملاقاتیں کر کے ان

کے ساتھ معاہدے بھی کیے۔ آپ نے کوشش کی کہ ان ملاقاتوں اور معاہدوں کی اطلاع ہرقل کو بھی ہو جائے۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رومی لشکر رسول اللہ ﷺ کے مدمقابل نہیں آئے، حالانکہ وہ عسکری قوت اور مقابلہ کرنے کے تمام وسائل سے مالا مال تھے۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ معنوی طور پر وہ ہزیمت وشکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں یہ بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیام تبوک کے دنوں میں ہرقل کے نام ایک خط لکھا کہ وہ درج ذیل تین باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے:

① وہ اسلام قبول کر لے۔ اس صورت میں اس کا ملک اور حکومت اسی کے پاس رہے گی۔

② وہ خراج (ٹیکس) ادا کرے۔

③ وہ جنگ کے لیے تیار رہے۔

آپ کا خط ملنے کے بعد ہرقل نے اپنے ارکانِ حکومت اور دینی رہنماؤں کو اپنے محل میں بلوایا۔ دروازے بند کروا دیے اور ان سے کہا: محمد (ﷺ) نے مجھے خط لکھ کر تین باتوں میں سے کسی ایک بات کو اختیار کرنے کا کہا ہے:

① میں اسلام قبول کر لوں۔ اس طرح میرا ملک میرے قبضے میں رہے گا۔

② میں (اس کی ماتحتی قبول کر لوں اور) اسے خراج ادا کروں۔

③ میں اس سے جنگ کے لیے تیار رہوں۔

تم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہو کہ وہ (آخری نبی) میری حکومت وسلطنت کا مالک بن جائے گا۔ یہ سن کر وہ لوگ آپے سے باہر ہو گئے اور شدید غصے کے عالم میں کہنے لگے: کیا ہم ایک ایسے عربی آدمی کو خراج ادا کریں جو فقط دو چادریں اور جوتا پہن کر اس علاقے میں آیا ہے، یعنی وہ کسی بھی حوالے سے شان وشوکت نہیں رکھتا۔

ہرقل نے اعیانِ حکومت کے تیور دیکھتے ہوئے انھیں خاموش کرایا اور انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا: میں تو صرف تمھیں آزمانا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کس حد تک اپنے دین پر پختہ ہو اور تمھیں اس میں کتنی رغبت ہے؟

(الأموال لابن زنجوية، ص: 123-125، المعجم الكبير للطبراني: 8/14-16)

شاید یہ دوسرا موقع تھا کہ ہرقل نے اپنے اعیانِ حکومت سے رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول کرنے کے بارے میں رائے طلب کرنے کی خاطر انھیں آزمانا چاہا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ وہ دعوت اسلام قبول

کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اس نے اللہ کے دین کے مقابلے میں اپنی حکومت اور سلطنت کو ترجیح دی اور حق کو قبول کرنے سے باز رہا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جن دنوں رسول اللہ ﷺ تبوک میں اقامت گزیں تھے، اس دوران میں ہرقل نے اپنا ایک نمائندہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں بھیجا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں ایک عرب عیسائی سے مروی طویل حدیث ذکر کی ہے۔ اس عیسائی کو ہرقل نے تبوک میں نبی ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

امام احمد نے اس حدیث پر «حديث التنوخي عن النبي ﷺ» کا عنوان قائم کیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حمص میں ہرقل کے قاصد تنوخی سے ملا جسے ہرقل نے اپنے نمائندے کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ وہ میرا ہمسایہ تھا اور بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔

میں نے اس سے عرض کیا: کیا آپ مجھے ہرقل کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے نام اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل کے نام بھیجے جانے والے خطوط اور ان کی تفصیلات سے آگاہ کر سکتے ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، کیوں نہیں؟

رسول اللہ ﷺ جب تبوک تشریف لائے تو آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ایک خط دے کر اپنے قاصد کی حیثیت سے ہرقل کی طرف روانہ کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک اس کے پاس پہنچا تو اس نے سردارانِ مملکت اور عیسائی اہل علم کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ ہال کے سب دروازے بند کروا دیے، پھر ان لوگوں سے کہا: تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کہاں تک جا پہنچا ہے۔ اس نے خط لکھ کر مجھے تین باتوں کی دعوت دی ہے۔

① میں اس کا دین قبول کر کے اس کا پیروکار بن جاؤں۔

② ہم اسے جزیہ (خراج، ٹیکس) ادا کرتے رہیں اور یہ ملک اور حکومت ہمارے قبضے ہی میں رہے۔

③ ہم اس کے ساتھ جنگ کے لیے تیار رہیں۔

اللہ کی قسم! تم اللہ کی کتابوں (تورات و انجیل) میں پڑھ چکے ہو کہ وہ ضرور بالضرور ہمارے ملک پر قبضہ کر لے گا، لہٰذا آؤ ہم اس کا دین قبول کر کے اس کے پیروکار بن جائیں۔ یا ہم اپنی حکومت اور ملک کو بچا لیں اور

اسے جزیہ ادا کریں۔

یہ سن کر وہ لوگ ناک بھوں چڑھانے لگے۔ وہ شدت غضب سے مغلوب ہو کر بیک آواز چیخ چیخ کر بولنے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پھٹ کر اپنے کپڑوں سے باہر آجائیں گے۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہمیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم عیسائیت چھوڑ کر حجاز سے آنے والے ایک عام سے دیہاتی کی پیروی کر لیں۔ ہرقل نے محسوس کیا کہ اگر یہ لوگ اسی حالت میں یہاں سے باہر چلے گئے تو روم کی آبادی کو اس کے خلاف اکسا اور بھڑکا کر بغاوت پر آمادہ کر سکتے ہیں تو اس نے انھیں خاموش کروا کر اطمینان دلایا کہ میں نے تم سے یہ بات محض تمھیں آزمانے کے لیے کی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم لوگ اپنے دین پر کس حد تک پختہ ہو، پھر اس نے عرب کے تجیب قبیلے کے ایک آدمی کو بلوایا جو عرب کے عیسائیوں کا ذمے دار تھا۔ ہرقل نے اس سے کہا: تم ایک ذمے دار قسم کا آدمی لے کر آؤ جو عربی زبان سے خوب واقف ہو۔ میں اسے رسول اللہ ﷺ کے خط کا جواب دے کر بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ آدمی مجھے ہرقل کے پاس لے گیا۔ اس نے ایک خط میرے حوالے کیا اور کہا: تم میرا یہ خط اس آدمی (محمد رسول اللہ ﷺ) کے پاس لے جاؤ۔ انھوں نے، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ اپنے خط میں میرے نام لکھا تھا، مجھے وہ سب یاد ہے۔ تم وہاں پہنچ کر جب یہ خط انھیں دو تو تین باتوں پر خاص توجہ رکھنا۔

① انھوں نے میرے نام جو خط ارسال کیا تھا، وہ کسی بھی حوالے سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں یا نہیں؟

② جب وہ میرا خط پڑھیں تو کسی پہلو سے رات کا ذکر کرتے ہیں یا نہیں؟

③ دیکھنا کہ تمھیں ان کی پشت پر کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو تمھیں عجیب لگے۔

میں ہرقل کا خط لے کر تبوک پہنچا۔ آپ پانی کے ایک چشمے کے قریب آلتی پالتی مارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آپ کے آقا کہاں تشریف فرما ہیں؟

مجھے اشارہ کر کے بتایا گیا کہ وہ ہیں۔ میں چلتا ہوا آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور خط آپ کو تھما دیا۔ آپ نے وہ خط اپنی گود میں رکھ لیا اور مجھ سے دریافت کیا: ''تم کس قبیلے سے ہو؟'' میں نے عرض کیا کہ میں تنوخ قبیلے کا فرد ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں اپنے روحانی باپ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیف، یعنی صحیح دین اسلام کی رغبت ہے؟'' میں نے عرض کیا: اس وقت تو میں اپنی قوم کا نمائندہ (قاصد) ہوں اور اسی کے

دین پر ہوں۔ میں اپنی قوم کے پاس واپس جانے تک اپنے سابق دین سے پھر نہیں سکتا۔

میری بات سن کر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ ﴾

''جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، البتہ اللہ ہی ہے جسے چاہے ہدایت سے سرفراز کردے اور وہی راہ یاب ہونے والوں کو بہتر طور پر جانتا ہے۔'' (القصص 56:28)

پھر آپ نے فرمایا: ''اے تنوخی! میں نے کسریٰ کے نام ایک خط لکھا تھا، اس نے اسے اہمیت نہ دی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اور اس کی حکومت کو پاش پاش کر دے گا۔ میں نے نجاشی کے نام بھی خط لکھا تھا۔ اس نے اسے پھاڑ ڈالا، اللہ اسے اور اس کی سلطنت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ (یاد رہے کہ حبشہ کے بہت سے حکمران تھے، ان سب کا لقب نجاشی تھا۔ ان میں سے ایک نے سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی وفات پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ مذکورہ حدیث میں جس نجاشی کا ذکر ہے، وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نجاشی ہے۔)

اور میں نے تمھارے بادشاہ کے نام بھی خط لکھا۔ اس نے اسے احترام سے رکھا۔ جب تک اس کا دور حکومت ہے، لوگوں کو اس کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہرقل نے مجھ سے جو تین باتیں کہی تھیں، یہ ان میں سے ایک ہے، یعنی ہرقل کے نام بھیجے ہوئے اپنے خط کا تذکرہ کرنا۔

میں نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اس جواب کو اپنی تلوار کی میان پر لکھ لیا، پھر آپ نے ہرقل والا خط اپنی بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو تھمایا۔ میں نے عرض کیا: اس خط کو کون پڑھے گا؟ لوگوں نے بتلایا کہ معاویہ پڑھیں گے۔ میرے آقا (ہرقل) کے خط میں لکھا تھا کہ آپ (محمد ﷺ) مجھے اس جنت کی دعوت دیتے ہیں جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ جو پرہیزگاروں کے لیے بنائی گئی ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ازراہِ تعجب فرمایا: ''«سبحان الله» یہ کیا بات ہوئی؟ بتلاؤ جب دن آتا ہے تو رات کہاں چلی جاتی ہے؟ یہ سن کر میں نے ترکش سے ایک اور تیر نکال کر اپنی تلوار کے میان پر یہ جواب بھی لکھ لیا۔ جب آپ میرے لائے ہوئے خط کے پڑھنے (اور سننے) سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''تم

ایک قاصد ہو اور ہمارے ذمے تمھارا (اکرام واحترام) حق ہے۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو بطورِ تحفہ تمھیں کچھ نہ کچھ ضرور دیتا۔ اب تو ہم سفر میں ہیں اور زادِ راہ ختم ہے۔''

یہ سن کر صحابہ میں سے ایک آدمی نے پکار کر کہا: میں اسے تحفہ دیتا ہوں۔ اس نے اپنا سامان (تھیلا) کھول کر اُردن کے علاقے صفوریہ کا تیار شدہ ایک سوٹ لا کر میری گود میں رکھ دیا۔ میں نے پوچھا: اس تحفہ دینے والے کا تعارف کیا ہے؟ مجھے بتلایا گیا کہ ان کا نام عثمان ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کون اس کی مہمان نوازی کرے گا؟'' ایک انصاری نے کھڑے ہوے کر عرض کیا: میں۔ وہ انصاری اٹھا اور میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب میں مجلس سے ذرا باہر پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے پکار کر مجھے بلایا اور فرمایا: ''بھئی تنوخی! ذرا ادھر تو آؤ۔'' میں جلدی سے آپ کے قریب آ کر اسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں میں کچھ دیر پہلے آپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ آپ نے اپنی پشت مبارک سے چادر ہٹاتے ہوئے فرمایا: تم سے آتے ہوئے جو بات کہی گئی تھی، آؤ اور وہ بھی دیکھ لو۔ میں گھوم کر آپ کی پشت کی طرف آیا تو وہاں کندھے کی نرم ہڈی والی جگہ پر سینگی کے بڑے نشان کی مانند مہر (مہر نبوت) تھی۔ (مسند أحمد: 442,441/3 (ضعيف))

نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی ﷺ اور ہرقل کے مابین متعدد بار خطوط کا تبادلہ ہوا اور اس ساری سفارت میں خطوط لے کر جانے اور ہرقل کے ساتھ بات چیت کرنے کے حوالے سے سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کا نام نمایاں ہے۔ (العلاقات الإسلامية النصرانية فى العهد النبوى لفاروق حماده، ص: 45) تاریخ میں یہ بیان بھی ملتا ہے کہ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں ایک خط لے کر ہرقل کے پاس گئے ہوئے تھے اور ہرقل ابھی اس کا جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے پاس رسول اکرم ﷺ کی وفات کی خبر پہنچ گئی۔ (الروض الأنف: 249/4)

اس کے بعد ہرقل ایک عرصے تک زندہ رہا اور اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی مملکت کو شام، فلسطین اور بیت المقدس میں تقسیم ہوتے دیکھا۔ بالخصوص مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی مملکت کے تباہ ہونے کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس نے اپنی ہی کہی ہوئی بات کو حقیقت کے روپ میں بھی دیکھ لیا کہ یہ رسول (اور اس کے نام لیوا) میری حکومت وسلطنت کے مالک بن جائیں گے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں رومی علاقوں کی فتوحات کا سلسلہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہو کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جب مسلمانوں نے ہرقل کی سلطنت کو فتح کر لیا تو شام کی وہ سرزمین جسے مسلمانوں نے اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا، وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے کر انتہائی حسرت اور افسوس کی حالت میں وہاں سے ملک بدر ہو گیا۔ وہ زبانِ حال سے کہتا جا رہا تھا: اے سوریا (شام) کی سرزمین! تجھے الوداعی سلام۔ آج کے بعد میں کبھی یہاں نہیں آ سکوں گا۔

(فتوح الشام للأزدی: 231، وتاریخ الطبري: 38/4، وفتح الباري: 43/1)

مؤرخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہرقل نے نبیٔ کریم ﷺ کے خط کو ادب و احترام کے ساتھ محفوظ رکھا۔ اور اپنے بعد آنے والوں کو اس کی حفاظت کی تاکید بھی کی۔

رومی بادشاہ کئی صدیوں تک اس خط کو اپنے بعد آنے والے بادشاہوں کے حوالے کرتے رہے اور اپنے ہاں آنے والے مسلم خلفاء اور سلاطین کے وفود کو اس کی زیارت سے مستفید کرتے رہے۔

(الروض الأنف: 197/2، وفتح الباري: 44/1، والعلاقات الإسلامية النصرانية فی العهد النبوی، ص: 47,46)

ہرقل کے نام رسول اکرم ﷺ کے اس نامۂ مبارک کا اصل نسخہ اپنی اصل حالت میں دستیاب ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق محققین و باحثین نے خوب تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ واقعی وہی نامہ مبارک ہے اور اس کی سند بالکل صحیح ہے۔ (الوثائق السیاسیة للعهدالنبوي والخلافة الراشدة، ص: 108) (الحمدللہ)

رسول اللہ ﷺ کا فارس کے کسریٰ کے نام خط

بلادِ عرب سے بالکل متصل ''فارس'' کے نام سے ایک طاقتور اور مضبوط سلطنت قائم تھی۔ مختلف زمانوں میں انھوں نے عرب خطے کے اندر بالخصوص یمن اور بحرین پر اپنا تسلط جما رکھا تھا۔

فارس مختلف تہذیبی مراحل سے گزرتا رہا۔ ہم فارس کے حوالے سے خاص طور پر ان ایام کا تذکرہ کریں گے جب دعوتِ اسلام، فتوحات اور جہاد کی نسبت سے ان کے اور اہل اسلام کے مابین عسکری مقابلے ہوتے رہے۔

فارس اور اس کے زیر اثر علاقوں میں مجوسیت کا دور دورہ تھا۔ وہ لوگ آگ کو مقدس سمجھتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، البتہ اس کے علاوہ وہاں یہودیت، عیسائیت کا بھی اثر و رسوخ تھا۔ یہ مذاہب فارس سے باہر عراق

اور بحرین کے علاوہ ان عرب علاقوں میں بھی پھیلے جہاں فارس کی حکومت تھی۔ اس حکومت کا دائرۂ کار فارس، خراسان، عراق اور جزیرۂ عرب کے شرقی اور جنوبی حصوں تک پھیلا ہوا تھا۔

فارس کا نظام حکومت ملکی اور حکومتی جبر و استبداد پر استوار تھا۔ وہاں کے ماحول میں نسلی امتیاز اور طبقاتی تقسیم کا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ ہر طبقے کے لیے حقوق، امتیازات اور واجبات کے لیے الگ الگ حدود اور اصول متعین تھے۔ (النظم الإسلامية، لصبحي الصالح، ص: 30، وقصة الحضارة: 415/1)

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں فارس کے حکمران ''کسریٰ'' کا اصل نام پرویز تھا۔ وہ ہرمز چہارم کا بیٹا اور نوشیرواں کسریٰ اول کا پوتا تھا۔ اس نے 615ء میں فارس کی حکومت کو روم کی بازنطینی حکومت کے مقابلے میں اس حد تک ترقی دی اور بامِ عروج تک پہنچایا جہاں تک اس کے آباء واجداد نہیں پہنچا پائے تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور امراء کے نام خطوط لکھے، انھی دنوں آپ نے کسریٰ کے نام ایک خط لکھ کر سیدنا عبداللہ بن حذافہ سہمی کے ہاتھ روانہ کیا اور فرمایا کہ جا کر یہ خط حاکم بحرین کو دے دیں۔ وہ اسے کسریٰ تک پہنچا دے گا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 607/4، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 157)

کسریٰ کے نام نامۂ نبوی

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ . مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰه إِلٰى كِسْرىٰ عَظِيمِ فَارِسَ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدىٰ، وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهِ وَشَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ: أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ اللّٰهِ، فَإِنِّي أَنَا رَسُولُ اللّٰهِ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَ يُحِقَّ الْقَوْلَ عَلَى الْكَافِرِينَ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، فَإِنْ أَبَيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْمَجُوسِ»

''اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان، بے حد رحم کرنے والا ہے۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے شاہِ فارس کسریٰ کے نام۔ ہر اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اللہ اور اس کے

رسول پر ایمان لے آئے اور گواہی دے کہ اکیلے اللہ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمھیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں کیونکہ میں سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ ہر زندہ آدمی کو دنیا اور آخرت کے برے انجام سے ڈراؤں اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔ تم اسلام قبول کر لو، سلامت رہو گے اور اگر تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو اسلام نہ لانے والے تمام مجوسیوں کے گناہ کا بار تم پر ہوگا۔''

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 156، الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 260/1، وزاد المعاد: 688/3)

رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک جب خسرو پرویز کسریٰ کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے پڑھا گیا تو اسے تکبر اور سرکشی نے آن گھیرا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف شدید غصے کا اظہار کیا اور طیش میں آ کر آپ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا: «أَن يُّمَزَّقُوا كُلَّ مُمَزَّقٍ» ''ان کی حکومت وسلطنت پارہ پارہ ہو جائے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 2939، واليمن فى صدر الإسلام، ص: 28)

575ء سے اہل فارس، یمن پر حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ خسرو پرویز نے نہ صرف یہ کہ آپ کا نامہ مبارک چاک کر دیا بلکہ یمن میں اپنے گورنر باذان کو لکھا کہ یہ جو شخص حجاز میں ہے، اس کی طرف اپنے ہاں سے دو توانا اور مضبوط آدمی بھیجو۔ جو اسے گرفتار کر کے میرے پاس لائیں تاکہ میں اسے اس جرأت کا مزہ چکھاؤں۔

(فتح الباري: 257/16)

چنانچہ باذان نے یمن سے طاقتور اور مضبوط قسم کے دو آدمی رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کرنے کے لیے مدینہ روانہ کیے۔ وہ دونوں آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا: کسریٰ نے شاہِ باذان کو ایک خط کے ذریعے حکم دیا ہے کہ وہ آپ کے پاس دو آدمی بھیج کر آپ کو گرفتار کر کے کسریٰ کے پاس بھیج دے۔ انھوں نے آپ سے دھمکی آمیز لہجے میں گفتگو کی اور آپ کو ساتھ چلنے کا کہا۔ آپ نے فرمایا: فی الحال تم جاؤ، آرام کرو، کل آ کر مجھ سے ملنا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسریٰ پرویز پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے اور اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 155، والطبقات لابن سعد: 265/1)

چنانچہ آپ نے اگلی صبح ان دونوں کو بلوا کر اس واقعے سے آگاہ کیا۔ وہ طیش میں آ کر بولے: آپ ہوش میں تو ہیں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے تو آپ کی پہلی بات جو اس سے معمولی اور کم تر تھی، اسے برداشت نہیں کیا تھا، کیا ہم آپ کی یہ بات شاہ باذان کو لکھ بھیجیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اسے میری اس بات سے آگاہ کرو۔ یہ بھی بتا دو کہ میرا دین اور میری حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جہاں تک کسریٰ پہنچ چکا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے وہاں تک پہنچے گی جہاں تک اونٹ اور گھوڑے پہنچ سکتے ہیں۔ اور تم اس سے یہ بھی کہہ دو کہ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو جو کچھ اس کے پاس اور اس کے زیر تسلط ہے وہ سب اسی کے پاس رہے گا اور اسے اس کی قوم ''اَبناء'' کا بادشاہ قرار دیا جائے گا۔'' (اَبنا ایرانیوں کی اس اولاد کو کہتے ہیں جو یمن فتح کرنے کے بعد وہیں آباد ہو گئی تھی۔ یہ فوج کسریٰ نوشیرواں نے سیف بن ذی یزن کی درخواست پر حبشیوں سے لڑنے کے لیے بھیجی تھی۔ (أسد الغابة: 163/1))

آپ نے باذان کے بھیجے ہوئے ان دو آدمیوں میں سے ایک کو، جس کا نام خرخرہ تھا، ایک کمر بند عنایت فرمایا جس میں سونا چاندی جڑا ہوا تھا۔ یہ کمر بند کسی بادشاہ نے آپ کی خدمت اقدس میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں مدینہ طیبہ سے روانہ ہو کر باذان کے پاس چلے گئے اور اسے سارے احوال سے آگاہ کیا۔ ان کی باتیں سن کر باذان نے کہا: اللہ کی قسم! اس کی یہ باتیں عام بادشاہوں کی سی نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ واقعی نبی ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اگر وہ درست ہے تو وہ واقعی اللہ کی طرف سے بھیجے گئے نبی ہیں۔ اور اگر ان کی کہی ہوئی باتیں درست ثابت نہ ہوئیں تو ہم ان کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لیں گے اور کوئی نئی حکمت عملی اپنائیں گے۔

اس واقعے کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ باذان کے پاس شیرویہ کا خط آ گیا۔ اس نے لکھا کہ میں نے کسریٰ کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اسے فارس کے مفاد میں قتل کیا ہے کیونکہ وہ فارس کے اشرافیہ سرِعام قتل اور انھیں ان ہی کے علاقوں میں ذبح کر رہا تھا۔ میرا خط ملتے ہی اپنے علاقے کے لوگوں سے میری اطاعت کا عہد لے لو اور تم بلا تاخیر اس آدمی (محمد رسول اللہ ﷺ) کی خدمت میں پہنچو جن کی گرفتاری کا کسریٰ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ خیال رکھنا جب تک میں تمھیں اس بارے میں کچھ نہ لکھوں، کوئی کارروائی نہ کرنا اور انھیں برانگیختہ نہ

کرنا۔ شیرویہ کا خط باذان کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: وہ آدمی واقعی اللہ کا رسول ہے۔ اس کے بعد سلطنت فارس میں یمن کے ''أَبْنَاء'' نے اسلام قبول کر لیا۔ راوی کا بیان ہے کہ باذویہ نے باذان سے یہ بھی کہا کہ میں آج تک ان، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی بارعب آدمی سے نہیں ملا۔ باذان نے پوچھا: کیا ان کے ہمراہ کوئی محافظ (باڈی گارڈ) بھی تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 510,509/3)

9 ہجری کے اہم واقعات

احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهُ وَإِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرُ بَعْدَهُ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتُنْفِقُنَّ كُنُوزَهُمَا فِي سَبِيلِ اللهِ»

''جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ پیدا نہیں ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر پیدا نہیں ہوگا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً تم ان دونوں (حکومتوں) کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔'' (صحيح البخاري، حديث: 3120)

اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول ﷺ نے فارس کے دارالحکومت مدائن کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا کہ اسے مسلمان فتح کر لیں گے۔ آپ نے فرمایا:

«لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ كُنُوزَ كِسْرَى الَّتِي فِي الْقَصْرِ الْأَبْيَضِ»

''ضرور مسلمانوں کی ایک جماعت کسریٰ کے خزانوں کو فتح کر کے لائے گی جو وائٹ ہاؤس میں ہیں۔''

(دلائل النبوة للبيهقي، حديث: 1728، المغازي لابن أبي شيبة: 142)

بعد میں باذان اور یمن میں اس کے دیگر ہم نواؤں تک خبر پہنچی کہ خسرو پرویز واقعی اس رات قتل ہوا تھا جس رات کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ نے یہ خبر دی تھی، چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ ان باتوں کی صداقت کو دیکھتے ہوئے باذان نے کہا: وہ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ (الإصابة في تمييز الصحابة: 170/1)

نیز اس نے کہا کہ وہ واقعی سچے رسول ہیں۔ کوئی بادشاہ ان پر ایمان لانے میں مجھ سے سبقت نہ لے جائے،

چنانچہ اس نے اور یمن کے ''اَبناء'' سب نے اسلام قبول کر لیا۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 510/3)

بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری دنوں میں وفد کی صورت میں مدینہ طیبہ بھی آئے تھے۔ (تاريخ الطبري: 656/2) اور رسول اللہ ﷺ نے یمن میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دیگر امراء کو بھیجا تو ان کے ساتھ فارس کی مرکزی حکومت کی طرف سے یمن کے حکمران اَبناء اور باذان وغیرہ نے بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔

نیز سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جھوٹے مدعیٔ نبوت اسود عنسی کے فتنۂ ارتداد کی سرکوبی میں بھی یہ لوگ برابر شریک رہے۔ اسود عنسی کو قتل کرنے کے لیے ان کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ میدان میں آئیں۔ باذان، ان ''اَبناء'' میں سب سے نمایاں تھا۔ (فتوح البلدان للبلاذری، ص: 114)

بلادِ فارس میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں شروع ہوا۔ ان میں سے معرکۂ قادسیہ مشکل ترین معرکہ تھا۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں معرکۂ قادسیہ سے قبل رستم نے مسلمانوں کے وفد کو اپنے پاس بلوایا تاکہ وہ خود ان سے براہ راست کلام کر کے ان کا موقف جان سکے۔

مسلمانوں کے اس وفد میں سیدنا ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ اس سے قبل مذاکرات کے حوالے سے مسلمانوں کے خصوصی نمائندے کے طور پر مشہور تھے۔ رستم نے ان سے ملاقات کا خوب اہتمام کیا۔ شاندار قسم کی محفل سجائی، سونے اور ریشم سے مزین خوبصورت تکیے رکھوائے۔ ہیرے جواہرات کی خوب نمائش کی۔ ماحول کی آرائش کے لیے مختلف خوبصورت اشیاء رکھوائیں۔ سونے چاندی سے مزین بیش قیمت قالین بچھوائے اور مقامِ ملاقات کے عین وسط میں سونے سے بنا ہوا تخت بچھا کر اس پر براجمان ہوا۔ غرضیکہ اس نے شاہانہ شان وشوکت کے اظہار میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

ادھر سیدنا ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ رستم سے ملاقات کے لیے اس حالت میں تشریف لائے کہ انھوں نے پیوند لگے پرانے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ ہاتھ میں انتہائی معمولی قسم کا ہتھیار تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے گھوڑے پر سوار تھے۔ آپ بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ بادشاہ اور آدابِ محفل کی پروا کیے بغیر گھوڑے پر سوار ہی محفل میں داخل ہو گئے۔ رستم کے ریشمی قالینوں کو پاؤں سے روند ڈالا، نیچے بچھائے گئے ریشمی قالین کا ایک کونہ اٹھا

کر گھوڑے کو اس کے ساتھ باندھ دیا۔ محفل کی سجاوٹ اور آرائش کے لیے رکھی گئی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

نیچے اتر کر اسلحہ ہاتھ میں تھامے رستم کی طرف چل دیے۔ اس کے محافظوں نے کہا: آپ اپنا ہتھیار ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ اسے ایک طرف رکھ دیں۔ اس درویش نے کہا: میں ازخود نہیں آیا بلکہ آپ حضرات نے مجھے بلوایا ہے۔ اگر مجھے میری مرضی کے مطابق جانے دو تو ٹھیک ورنہ میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ رستم نے ان کی باتیں سنیں تو بولا: انھیں کچھ نہ کہو اور اسی طرح آنے دو۔ یہ مرد درویش اپنے نیزے کو بطور لاٹھی استعمال کرتے ہوئے اور اس کی نوک سے قالینوں کو پھاڑتے اور کاٹتے ہوئے رستم کے قریب چلے گئے۔ رستم نے ان سے پہلا سوال یہ کیا: آپ (مسلمان اور ان کے لشکر) اس علاقے میں کس مقصد کے تحت آئے ہیں؟

سیدنا ربعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے نکال کر وسعت وفراخی کی طرف اور دنیوی ادیان کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اللہ کے دین کی دعوت کے ساتھ لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی دعوت دیں۔ جو لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کر لیں، ہم انھیں کچھ نہیں کہتے۔ اور جو لوگ اس دین کے قبول کرنے سے انکاری ہوں، ہم اللہ کے وعدہ کو حاصل کرنے تک ان سے جنگ کریں گے۔

رستم نے پوچھا: تمھارے ساتھ اللہ نے کس چیز کا وعدہ کیا ہے؟

سیدنا ربعی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جو لوگ قبولِ حق سے انکار کریں اور ہم ان سے جنگ کرتے ہوئے مارے جائیں تو اللہ کی طرف سے ہمارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ جنگ کے بعد ہم میں سے جو زندہ بچ رہے، اس کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ سیدنا ربعی رضی اللہ عنہ کی جرأت وسادگی اور کھری کھری باتیں سن کر رستم سہم گیا۔ وہ بولا: کیا آپ لوگ اس بارے میں غور وفکر کرنے کے لیے ہمیں مہلت دے سکتے ہیں؟ لڑائی کو مؤخر کر سکتے ہیں؟ ربعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہاں۔ ہم آپ لوگوں کو تین دن کی مہلت دے سکتے ہیں۔ رستم نے اس مدت میں کچھ اضافے کی درخواست کی تو ربعی رضی اللہ عنہ نے بڑی بے پروائی سے کہا: اس سے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ ہمارے رسول ﷺ نے لڑائی کے موقع پر دشمن کو تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی اجازت نہیں دی۔ رستم نے کہا: کیا

آپ ان مسلمانوں کے رئیس (سردار) ہیں؟

ربعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، میں ان کا سردار نہیں ہوں بلکہ ایک عام کارکن ہوں، البتہ تمام اہل اسلام ایک جسم کی مانند ہیں۔ ان کا ایک عام سا آدمی بھی دشمن کو پناہ دے دے (یا ان کے ساتھ کوئی معاملہ طے کر لے) تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین فرد بھی اسے پورا کرنے کا پابند ہے۔

اس ملاقات کے بعد رستم نے اپنے اعیان حکومت کو بلا کر ساری صورت حال سے آگاہ کیا، پھر اس بارے میں ان سے رائے لی۔ سب نے متفقہ طور پر کہا: ہم اسلام قبول کریں گے نہ جزیہ ہی دیں گے بلکہ اپنے مذہب اور ملک کے لیے مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ آخر کار اہل فارس اور اہل اسلام کے مابین خوں ریز جنگ ہوئی اور اللہ کے فضل سے میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ فارس کی حکومت اپنے انجام کو جا پہنچی۔ (فتوح البلدان للبلاذری: 126-131، وتاريخ الطبري: 4/106، والكامل لابن الأثير: 2/463 والفتوح الإسلامية عبر العصور: 124-133)

اس جنگ سے تقریباً نو سال قبل جب رسول اللہ ﷺ نے شاہِ فارس کے نام خط لکھا تھا تو اس نے اس نامہ مبارک کو پھاڑ دیا تھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس نے میرے خط کو چاک کیا، اللہ تعالیٰ اسے تباہ و برباد اور اس کی حکومت کو پارہ پارہ کر دے گا۔ آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ کسریٰ قتل ہوا اور اس کی حکومت بھی ناپید ہوگئی۔

امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدائن کی فتح کے بعد وہاں کے اولین مسلم حکمران سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ اپنی تواضع، انکساری، زہد و تقویٰ اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ جیسی اعلیٰ صفات اور بلند اخلاق کے ساتھ اہل فارس کے سامنے اسلام کا بہترین نقشہ پیش کرتے رہے۔ فارس میں اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں سیدنا سلمان فارسی اور دیگر عالی قدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم خدمات ہیں۔

مصر کے قبطی حکمران مقوقس کے نام نبوی مکتوب

مصر قدیم زمانے ہی سے ترقی اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے خاصی شہرت کا حامل ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ

وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور وہ شخص جس نے یوسف کو مصر میں خریدا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کی رہائش اچھی رکھ، امید ہے کہ یہ ہمیں نفع دے یا یہ کہ ہم اسے بیٹا بنالیں اور اسی طرح ہم نے یوسف کو زمین (مصر) میں جگہ دی تاکہ ہم اسے باتوں کی تاویل (خوابوں کی تعبیر) سکھائیں اور اللہ اپنے (ہر) کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (یوسف 21:12)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝

''پھر جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا: تم مصر میں امن سے داخل ہو جاؤ اگر اللہ نے چاہا۔'' (یوسف 99:12)

نیز سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے تذکرے میں بھی مصر کا خاصی تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے الفاظ میں مصر کا ذکر یوں کیا ہے:

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

''اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی، اس نے کہا: اے میری قوم! کیا میرے لیے مصر کی بادشاہی اور یہ نہریں نہیں جو میرے (محلات کے) نیچے بہتی ہیں؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟'' (الزخرف 51:43)

نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اور مقام پر مصر کا یوں ذکر کیا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر بناؤ اور تم اپنے گھروں کو قبلہ رُخ بناؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو خوشخبری دے دیجیے۔'' (یونس 87:10)

مطلب یہ کہ اپنے گھروں ہی کو مسجدیں بنا لو اور اپنے گھروں کا رخ بیت المقدس کی طرف رکھو اور تمھیں عبادت کے وقت گھروں سے باہر کنیسے میں جانے کی ضرورت ہی نہ رہے جہاں تمھیں فرعون کے کارندوں کے ظلم وستم کا ڈر رہتا ہے۔(تفسیر احسن البیان، یونس 87:10)

ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات میں نام کی صراحت کے بغیر مصر کا ذکر آیا ہے۔

(حسن المحاضرة فی تاریخ مصر و القاهرة للسیوطی، ص: 7-10)

نیز رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر امت کو بشارت دی کہ امت مسلمہ عنقریب مصر کو فتح کر کے اس پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّكُمْ سَتَفْتَحُونَ مِصْرَ وَهِيَ أَرْضٌ يُسَمّٰى فِيهَا الْقِيرَاطُ، فَإِذَا فَتَحْتُمُوهَا فَأَحْسِنُوا إِلٰى أَهْلِهَا، فَإِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَّرَحِماً»

''بلاشبہ عنقریب تم لوگ مصر کو فتح کر لو گے۔ وہ ایسی سرزمین ہے جہاں قیراط (وزن کا پیمانہ) کا نام (کثرت سے) لیا جاتا ہوگا۔ جب تم ان علاقوں کو فتح کر لو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا کیونکہ ان کا حق بھی ہے اور رشتہ بھی۔''(صحیح مسلم، فضائل الصحابة، حدیث: 2543)

یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ ان کی والدہ ماجدہ سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کا تعلق مصر سے تھا، نیز فرزند رسول سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا بھی اہل مصر میں سے تھیں۔

رومی حکومت کی طرف سے مقوقس سائرس مصر کا حکمران تھا۔ وہ اصلاً یونانی تھا اور ہرقل کی طرف سے مصر پر حاکم تھا۔ اس کے ساتھ وہ اسکندریہ کے علاقے کا پادری بھی تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا اور اس کا عقیدہ قسطنطنیہ والے عیسائیوں سے ہم آہنگ تھا۔(تاریخ ولاة مصر لابن الکندی، ص: 15)

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت مصر کے اصل باشندے قبطی تھے۔ ان کے ساتھ وہاں رومی لوگ بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔(القول الإبریز للمقریزی، ص: 43) مقوقس بھی انھی میں سے تھا۔ مصر کے یہ لوگ مسیح علیہ السلام کے بارے میں اصل اور صحیح عقیدہ رکھتے تھے۔ ان قبطیوں کا مذہب شرک کی آلائش سے پاک اور خالص توحید والا تھا جبکہ قسطنطنیہ کے علاقوں میں آباد عیسائی شرکیہ عقائد کے حامل تھے۔(مصر من الإسکندر حتی الفتح العربی،

ص: 192) دونوں گروہوں کے عقائد میں شدید مذہبی اختلافات تھے، اس لیے رومی علاقوں کے امراء و حکام قبطیوں کی مذہبی شخصیات پر سختیاں اور شدت روا رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ قریش مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ کے بعد جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے حکومت روم کی طرف سے مصر کے حاکم اور قبطیوں کے رئیس مقوقس کے نام ایک خط روانہ فرمایا جس کی عبارت درج ذیل تھی:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَ رَسُولِهِ إِلَى الْمُقَوقِسِ، عَظِيمِ الْقِبْطِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ، فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْقِبْطِ» ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے شاہِ قبط مقوقس کے نام۔ جس نے ہدایت کی پیروی کی، اس پر سلام ہو۔ میں تمھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے اور اللہ تمھیں دہرا اجر دے گا۔ اگر تم نے قبولِ حق سے منہ موڑا تو قبطیوں کے اسلام نہ لانے کا وبال بھی تم پر ہوگا۔'' ''آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔'' (آل عمرٰن 3:64، ومرويات الوثائق المكتوبة من النبي ﷺ وإليه، ص: 673-675)

رسول اللہ ﷺ نے مقوقس کی طرف خط روانہ کرنے کے لیے سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 706/3، والطبقات لابن سعد: 26/10، سيرأعلام النبلاء: 300/1) وہ مقوقس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کا خط اس کے سپرد کیا۔ اس نے اس خط کا بہت احترام کیا۔

وہ خود پادری تھا۔ اس نے بہت سے مذہبی رہنماؤں کو اپنے دربار میں طلب کر لیا اور ان کی موجودگی میں اس نے سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے کچھ تیکھے سوالات کیے۔ اس کا ایک سوال یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ واقعی اللہ کے نبی ہیں تو جب ان کی قوم نے انھیں اپنے شہر (مکہ) سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تو انھوں نے اپنے دشمنوں کے لیے بددعا کیوں نہ کی؟ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ نے بڑے تحمل اور وقار کے ساتھ اسے ایسا علمی جواب دیا کہ وہ نہ صرف خاموش ہو گیا بلکہ ششدر رہ گیا۔ انھوں نے فرمایا: پہلے آپ یہ واضح فرمائیں کہ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم نے پکڑ کر پھانسی دینے کا پروگرام بنایا تھا تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی ہلاکت کی بددعا کیوں نہ کی؟ (اس بارے میں جو جواب آپ کا ہے، وہی ہمارا سمجھ لیں) یہ جواب سن کر مقوقس کہنے لگا: آپ ایک سمجھ دار اور صاحب علم آدمی ہیں اور آپ کو بھیجنے والا بھی بڑا دانا ہے۔

پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کے خط کا جواب تحریر کرایا۔ اس میں اس نے اپنے اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے جس بات کی دعوت دی تھی، وہ اسے اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے مکتوب گرامی کے جواب میں مقوقس نے مندرجہ ذیل خط لکھوا کر بھیجا:

«لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، مِنَ الْمُقَوْقِسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ، سَلَامٌ عَلَيْكَ، أَمَّا بَعْدُ، فَقَدْ قَرَأْتُ كِتَابَكَ وَفَهِمْتُ مَا ذَكَرْتَ فِيهِ وَمَا تَدْعُو إِلَيْهِ، وَقَدْ عَلِمْتُ أَنَّ نَبِيًّا قَدْ بَقِيَ، وَكُنْتُ أَظُنُّهُ بِالشَّامِ وَقَدْ أَكْرَمْتُ رَسُولَكَ وَبَعَثْتُ لَكَ بِجَارِيَتَيْنِ، لَهُمَا مَكَانٌ عَظِيمٌ فِي الْقِبْطِ وَبِثِيَابٍ وَأَهْدَيْتُ لَكَ بَغْلَةً تَرْكَبُهَا وَالسَّلَامُ»

''محمد بن عبداللہ کے نام قبطیوں کے رئیس و حاکم مقوقس کی طرف سے۔ آپ پر سلام ہو! اما بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس میں آپ کی ذکر کردہ بات اور دعوت کو خوب سمجھ لیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ابھی ایک نبی کی آمد باقی ہے، تاہم میں سمجھتا تھا کہ وہ سرزمین شام سے نمودار ہوگا۔ میں نے آپ کے قاصد کا (حتی المقدور) اعزاز و اکرام کیا ہے۔ میں آپ کی خدمت عالیہ میں دو لونڈیاں بھیج رہا ہوں جو

قبطیوں میں بہت بلند مقام کی حامل ہیں۔ میں آپ کے لیے کچھ کپڑے اور آپ کی سواری کے لیے ایک خچر بھی ارسال کر رہا ہوں۔ والسلام!''

(الطبقات لابن سعد: 260/1، والسيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 362/2)

ان لونڈیوں کے نام ماریہ اور سیرین ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ماریہ کو اپنے پاس رکھا۔ انھی کے بطن سے آپ کے فرزند سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ اور سیرین کو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ خچر کا نام ''دُلدُل'' تھا جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور تک باقی رہا۔

(زاد المعاد: 61/3، والرحيق المختوم، اردو، ص: 573)

حالات و واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مقوقس نے سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سے زائد مرتبہ ملاقاتیں کیں۔ اسے رسول اللہ ﷺ کی نبوت وصداقت کا پورا یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب مستقبل میں مصر کو فتح کر کے اس پر قابض ہو جائیں گے۔

(الإصابة: 531/3، وفتوح مصر و أخبارها لابن عبدالحكيم، ص: 45-47، والعلاقات الإسلامية النصرانية، ص: 54)

مقوقس نے سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک لونڈی ماریہ قبطیہ بھیجی جو آپ کے فرزند سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ بنیں۔ ان کے علاوہ ایک اور لونڈی بھی بھیجی۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 515/3) نیز اس نے ایک حبشی غلام، موزے اور جوتے بھی بھیجے تھے۔

مقوقس کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے لیے احترام کے جذبات تھے اور وہ جانتا تھا کہ آپ ہی اللہ کی طرف سے آنے والے آخری نبی ہیں۔ حق کو اچھی طرح جان لینے کے باوجود اس نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس نے دنیا، دنیوی مناصب اور حکومت وسلطنت کو دین اور آخرت کے مقابلے میں ترجیح دی۔ حق کو جان لینے اور اس سے بے توجہی برتنے کے سلسلے میں اس نے بھی وہی طرز عمل اختیار کیا جو ہرقل نے اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی طرح مقوقس کو بھی پورا یقین تھا کہ مسلمان بالآخر مصر کو فتح کر کے اپنے زیر نگیں کر لیں گے، چنانچہ مقوقس کی زندگی ہی میں مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کر لیا اور 20 ہجری میں سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فاتح کی حیثیت سے مصر میں داخل ہو گئے۔ (فتوح البلدان للبلاذري، ص: 214، والمواعظ والاعتبار للمقريزي: 288/1، والفتوح الإسلامية عبرالعصور، ص: 103) انھوں نے مقوقس سے مسلمانوں کے اخلاق اور

رویے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ان کی مدح وتعریف کرتے ہوئے کہا: ''یہ لوگ عزم و ہمت کے ایسے پیکر ہیں کہ اگر پہاڑوں سے ٹکرا جائیں تو انھیں بھی اکھیڑ کر رکھ دیں۔''

(النجوم الزاهرة: 24/1، والمواعظ و الاعتبار فی ذکر الخطط والآثار: 299/1)

مقوقس کو مسلمانوں کی قوت و طاقت اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کا خوب اندازہ تھا، چنانچہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کرنے ہی میں عافیت سمجھی اور جزیہ (ٹیکس) ادا کرنے پر رضا مند ہوگیا۔

(المواعظ و الاعتبار: 129/1، والفتوح الإسلامية عبرالعصور، ص: 144,143)

حبشہ کے حکمرانوں کے نام نبی ﷺ کے خطوط

شمالی افریقہ میں یمن کے بالمقابل ساحلی علاقے کو حبشہ کہا جاتا ہے۔ مختلف زمانوں میں اس کے حدود اربعہ میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ راجح ترین بات یہ ہے کہ عہد نبوت میں موجودہ صومالیہ، اریٹیریا، ایتھوپیا اور سوڈان وغیرہ کے وسیع تر علاقے حبشہ میں شامل تھے۔ قدیم زمانے میں اسے ''ایبے سینیا'' (Abyssinia) اور آج کل ''ایتھوپیا'' (Ethiopia) کہا جاتا ہے۔

یہاں کی سلطنت سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ چوتھی صدی میں یہاں عیسائیت پنپنے لگی اور 525ء میں یمن پر بھی اس کا غلبہ ہوگیا اور ''اکسوم'' (Axum) شہر اس کا دارالحکومت تھا۔

(السيرة النبوية للندوی: 30، وسيرت ابن كثير: 2031/2)

اہل مکہ کے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے بھی بہت پہلے سے اہل حبشہ کے ساتھ روابط تھے اور وہاں آنا جانا تھا۔ حبشہ قریش مکہ کی تجارتی منڈی تھی۔ یہ لوگ اپنے علاقوں سے سامان تجارت لے جا کر وہاں فروخت کرتے اور واپسی پر ان علاقوں سے تجارتی سامان لا کر عرب میں فروخت کیا کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے کچھ عرصے قبل کچھ شر پسند قسم کے لوگ حبشہ سے یمن آ کر یہاں کی حکومت پر قابض ہوگئے۔ حکومت کے معاملے میں ان کی فارس کی حکومت کے ساتھ چپقلش رہنے لگی۔ ان سر پھرے لوگوں میں سب سے مشہور حکمران کا نام ''ابرہہ حبشی'' ہے۔ وہی ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اسی کے بارے میں سورۂ فیل نازل ہوئی:

﴿ اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ۞ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۞ وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۞ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۞ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۞ ﴾

''(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی چال کو بے کار نہیں کر دیا؟ اور اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔ جو ان پر کھنگر (پکی ہوئی مٹی) کی کنکریاں پھینکتے تھے، پھر اللہ نے انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔''

(الفیل 105:1-5)

جب مکہ مکرمہ میں نبیٔ کریم ﷺ پر اور آپ کے اصحاب پر قریش کی طرف سے ظلم وستم ڈھائے گئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حبشہ چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اور انھیں بتلایا کہ وہاں کا حکمران عادل اور منصف مزاج ہے۔ عربوں کے ہاں وہ ''نجاشی'' کے لقب سے مشہور تھا۔ یہ بادشاہ کا نام نہیں بلکہ اس کے عہدے کا نام تھا۔ حبشہ کے ہر حاکم کو ''نجاشی'' کہا جاتا تھا۔ دورِ نبوت والے نجاشی کا نام ''اصحمہ'' تھا۔ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مہاجرین کے پہلے قافلے میں رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہاتھ نجاشی کے نام مندرجہ ذیل خط بھی بھیجا تھا:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللهِ ﷺ إِلَى النَّجَاشِيِّ الْأَصْحَمِ مَلِكِ الْحَبَشَةِ، سَلَامٌ عَلَيْكَ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ الْمَلِكَ الْقُدُّوسَ السَّلَامَ الْمُؤْمِنَ الْمُهَيْمِنَ، وَأَشْهَدُ أَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ رُوحُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ الْبَتُولِ، الطَّاهِرَةِ الطَّيِّبَةِ الْحَصِينَةِ، فَحَمَلَتْ بِعِيسٰى فَخَلَقَهُ مِنْ رُّوحِهِ وَنَفْخَتِهِ، كَمَا خَلَقَ آدَمَ بِيَدِهِ وَ نَفَخَتِهِ وَإِنِّي أَدْعُوكَ إِلَى اللهِ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ وَالْمُوَالَاةَ عَلٰى طَاعَتِهِ، وَأَنْ تَتَّبِعَنِي وَتُؤْمِنَ بِالَّذِي جَاءَنِي فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ، وَقَدْ بَعَثْتُ إِلَيْكَ ابْنَ عَمِّي جَعْفَرًا وَّمَعَهُ نَفَرٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ، فَإِذَا جَاءُوكَ فَأَقْرِهِمْ وَدَعِ التَّجَبُّرَ، فَإِنِّي أَدْعُوكَ وَجُنُودَكَ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ، وَقَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ فَاقْبَلُوا نَصِيحَتِي وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ

اتَّبَعَ الْهُدٰى»

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے حاکم حبشہ اصحم کے نام۔ سلامت رہیں، ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو کائنات کا بادشاہ، نہایت پاک، امن وسلامتی دینے والا، امن مہیا کرنے والا اور نگہبان ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کی طرف سے روح اور اس کا ایک کلمہ ہیں جسے اس نے پاک باز، عفت مآب، پاکیزہ نفس سیدہ مریم بتول کی طرف اِلقا کیا جس کے نتیجے میں وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں۔ اللہ نے انھیں (عیسیٰ علیہ السلام کو) اپنی طرف سے روح اور پھونک سے معجزانہ طور پر پیدا کیا جیسے اس نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ اور اپنی پھونک سے معجزانہ طور پر پیدا کیا تھا۔ میں آپ کو اس اللہ کی دعوت دیتا ہوں جو اکیلا اور یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس سے دوستی اور محبت کی بنیاد پر اس کی اطاعت کو اختیار کرنے کا پیغام دیتا ہوں۔ آپ میرا اتباع کریں اور اس شریعت پر ایمان لے آئیں جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں اپنے چچا زاد جعفر بن ابوطالب کو آپ کے ہاں بھیج رہا ہوں۔ ان کے ہمراہ کچھ مزید فرزندان اسلام بھی ہیں۔ یہ آپ کے پاس پہنچیں تو ان کا خاص خیال رکھنا، ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آنا اور کسی بھی قسم کے ظلم وزیادتی سے اجتناب کرنا۔ میں آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو اللہ عزوجل کے دین کی دعوت دیتا ہوں۔ میں نے اللہ کا پیغام آپ تک پہنچا دیا۔ آپ کی خیر خواہی میرے پیش نظر ہے۔ میری ان نصیحتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا۔ جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا، اس پر سلام ہو۔'' (السيرة النبوية لابن كثير: 15/2، وزاد المعاد: 689/3)

خط کی عبارت سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیگر امراء وزعماء کے نام جو خطوط لکھے تھے، اس کا اسلوب ان سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ خط کسی ایسے آدمی کے نام لکھا گیا ہے جو اللہ کے رسول ﷺ پر کچھ نہ کچھ ایمان رکھتا ہے، نیز یہ بھی ثابت ہے کہ اصحمہ نجاشی نے متعدد بار سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقات بھی کی۔ ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب قریش کے ایک وفد نے نجاشی کے ہاں سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے باقی مہاجر ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت اصحمہ نے

ملاقات کا اہتمام کر کے فریقین کو بلوایا۔ فریقین کا موقف سنا۔ دونوں طرف کی گفتگو سننے کے بعد اس نے دعوتِ حق اور اسلام کی طرف اپنے میلان کا اظہار کیا۔

نجاشی نے واضح کیا کہ وہ بھرپور انداز سے ان مہاجرین صحابہ کا دفاع کرے گا اور انھیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دے گا، چنانچہ اس کے بعد نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کے خط کے جواب میں آپ کے نام ایک خط لکھ کر آپ کو اطلاع دی کہ وہ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکا ہے۔ نجاشی کے خط کے مندرجات درج ذیل ہیں:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، إِلٰى مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللهِ، مِنَ النَّجَاشِيِّ أَصْحَمَةَ، سَلَامٌ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ، مِنَ اللهِ وَرَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الَّذِي هَدَانِي إِلَى الْإِسْلَامِ، أَمَّا بَعْدُ، فَقَدْ بَلَغَنِي كِتَابُكَ يَا رَسُولَ اللهِ! فِيمَا ذَكَرْتَ مِنْ أَمْرِ عِيسٰى فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَنَّ عِيسٰى لَا يَزِيدُ عَلٰى مَا ذَكَرْتَ ثَفْرُوقاً، إِنَّهُ كَمَا ذَكَرْتَ وَ قَدْ عَرَفْنَا مَا بَعَثْتَ بِهِ إِلَيْنَا، وَقَدْ قَرَّبْنَا ابْنَ عَمِّكَ وَأَصْحَابَهُ، فَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللهِ صَادِقاً مُصَدِّقاً، وَقَدْ بَايَعْتُكَ وَبَايَعْتُ ابْنَ عَمِّكَ، وَأَسْلَمْتُ عَلٰى يَدَيْهِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»

''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی خدمت میں اصحمہ نجاشی کی جانب سے۔ اللہ کے نبی! آپ پر اللہ کی طرف سے سلامتی، رحمت اور اس کی برکتوں کا نزول ہو۔ وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا کی۔ حمد و ثنا کے بعد، اللہ کے رسول! آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ آپ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، آسمان و زمین کے رب کی قسم! وہ آپ کے ذکر کردہ مقام و مرتبے سے کھجور کی گٹھلی والے چھلکے سے بھی بڑھ کر نہیں ہیں۔ واقعی وہ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے ذکر فرمایا۔ آپ نے ہماری طرف جو دعوت بھیجی ہے، ہم نے اسے خوب سمجھ لیا ہے۔ ہم نے آپ کے چچازاد اور ان کے رفقاء کی

حتی المقدور مہمان نوازی کی ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے گواہی دیتا اور اقرار کرتا ہوں کہ آپ واقعی اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں (غائبانہ طور پر) آپ سے بیعت ہوتا ہوں اور (عملاً) آپ کے چچازاد کے ہاتھ پر بیعت کر کے اللہ رب العالمین کے لیے اسلام قبول کر چکا ہوں۔''

(زادالمعاد: 690/4، والبداية والنهاية: 84/3، ووفاء الوفاء فی أحوال المصطفی: 75/2)

مہاجرین حبشہ کو نجاشی کے ہاں انتہائی عزت و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا تھا۔ اس کی ان صحابۂ کرام سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ان کی خوب آؤ بھگت کرتا رہا۔

تاریخی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حبشہ کے حاکم اصحمہ نجاشی کے نام جو خط لکھا تھا، یہ دوسرا خط ہے اور اس کا مضمون پہلے خط کے مندرجات سے مختلف ہے۔ 6ھ میں رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے نام جو خط لکھا تھا، اسے سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ اس کا مضمون حسب ذیل ہے:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللهِ إِلَى النَّجَاشِيِّ مَلِكِ الْحَبَشَةِ، سِلْمٌ أَنْتَ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، الْمَلِكَ الْقُدُّوسَ السَّلَامَ الْمُؤْمِنَ الْمُهَيْمِنَ وَأَشْهَدُ أَنَّ عِيسٰى ابْنَ مَرْيَمَ رُوحُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ الْبَتُولِ الطَّيِّبَةِ الْحَصِينَةِ، فَحَمَلَتْ بِعِيسٰى فَخَلَقَهُ مِنْ رُّوحِهٖ وَنَفْخِهٖ كَمَا خَلَقَ آدَمَ بِيَدِهٖ، وَإِنِّي أَدْعُوكَ إِلَى اللهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَالْمُوَالَاةَ عَلٰى طَاعَتِهٖ، وَأَنْ تَتَّبِعَنِي وَتُؤْمِنَ بِالَّذِي جَاءَنِي فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ، وَإِنِّي أَدْعُوكَ وَجُنُودَكَ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَقَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ، فَاقْبَلُوا نَصِيحَتِي، وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى...»

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے حاکمِ حبشہ (نجاشی) کے نام۔ تم سلامتی حاصل کرلو۔ ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس

کے سوا کوئی برحق معبود نہیں۔ وہی حقیقی بادشاہ، نہایت پاک، سراپا سلامتی، ہر ایک پر نظر رکھنے والا اور نگرانی کرنے والا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کی طرف سے روح اور اس کے کلمہ کو سیدہ مریم کی طرف پھونکے جانے کا نتیجہ ہیں۔ اور انھیں اللہ تعالیٰ نے (بغیر باپ کے اسی طرح معجزانہ طور پر) تخلیق کیا جس طرح اس نے آدم علیہ السلام کو (معجزانہ طور پر ماں باپ کے بغیر) پیدا کیا تھا۔ میں آپ کو اس اللہ کے دین کی دعوت دیتا ہوں جو اکیلا اور یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ آپ کو اس سے دوستی اور محبت کی بنیاد پر اس کی اطاعت کو اختیار کرنے کا پیغام دیتا ہوں۔ آپ میرا اتباع کریں اور اس شریعت پر ایمان لے آئیں جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو اللہ عزوجل کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں نے اللہ کا پیغام آپ تک پہنچا دیا۔ آپ کی خیر خواہی میرے پیش نظر ہے۔ میری ان نصیحتوں کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ سلام ہو اس پر جس نے راہِ ہدایت اختیار کر لی۔'' (زاد المعاد: 689/4)

رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد نجاشی اور سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے مابین سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور نبیٔ کریم ﷺ کی دعوتِ اسلام کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے نجاشی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''اصحمہ! میں جو کچھ کہوں، آپ اسے توجہ سے سنیں اور اس پر غور کریں۔ آپ ہمارے لیے ازحد محترم اور لائقِ تکریم ہیں۔ ہمیں آپ کی اچھائی اور بھلائی میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ ہم نے آپ سے جو بھی امید باندھی، وہ بر آئی۔ ہمیں جب بھی کسی طرف سے خوف وخطرہ درپیش آیا، ہمیں اس کے مقابلے کے لیے آپ کی طرف سے امن وسکون ملا۔ دین و مذہب کے حوالے سے ہمیں آپ کی گفتگو سے ثبوت اور دلائل ملے۔ ہمارے اور آپ کے موقف میں حق کی وضاحت کے لیے اللہ کی کتاب انجیل بہترین فیصلہ کرنے والی ہے جسے آپ مانتے، پڑھتے اور اس پر عمل پیرا ہیں۔

یہ کتاب ایسا گواہ ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فیصلہ کرنے والی ایسی کتاب ہے جو کسی پر زیادتی نہیں کرتی۔ اب سوچ سمجھ کر دیانت داری سے فیصلہ کرنے کا موقع ہے۔ اگر آپ محمد ﷺ اور ان کی شریعت پر

ایمان نہ لائیں تو آپ کی حالت یہودیوں کی سی ہوگی جو اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان رکھتے ہیں مگر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے۔ (اسی طرح آپ عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان رکھیں اور محمد ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم نہ کریں۔) اللہ کے رسول ﷺ نے اطراف واکناف کے حکمرانوں اور بادشاہوں کی طرف اپنے قاصد اور نمائندے روانہ فرمائے ہیں۔ انھیں آپ سے اچھی اور بہترین توقعات ہیں۔ انھوں نے کسی بھی دوسرے بادشاہ سے آپ کی سی امیدیں وابستہ نہیں رکھی ہیں۔ انھیں دوسرے بادشاہوں اور حکمرانوں سے بدسلوکی کا اندیشہ ہے مگر سابقہ تجربے کی روشنی میں وہ آپ سے اچھی امید رکھتے ہیں۔''

سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کی یہ تمہیدی گفتگو سن کر نجاشی گویا ہوا: میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ (محمد ﷺ) اللہ کے وہی امی نبی ہیں جن کی آمد کے اہل کتاب منتظر تھے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ جس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے گدھا سوار (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کی آمد کی بشارت دی تھی اور وہ پوری ہوئی، اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے شتر سوار نبی کی آمد کی بشارت دی تھی۔ ان کی یہ بشارت اب محمد ﷺ کی صورت میں پوری ہوچکی ہے۔ آنکھوں سے مشاہدہ کی ہوئی چیز سنی ہوئی بات کی نسبت زیادہ اطمینان بخش ہوتی ہے ؎ شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اس کے بعد نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کے بھیجے ہوئے خط کا جواب تحریر کرایا۔ (زادالمعاد: 690,689/4)

اس خط کی عبارت اور بہت سی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نجاشی نے سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا تھا۔ میری اور دیگر کئی محققین کی رائے ہے کہ یہ وہ نجاشی نہیں ہے جس کے دورِ حکومت میں سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے بلکہ یہ دوسرا نجاشی تھا۔

روایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس دوسرے نجاشی کا نامہ ''اصحمہ بن ابحہ'' تھا۔ سیدہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئی تھیں۔ وہاں ان کا شوہر مرتد ہوکر عیسائی ہوگیا، یعنی اس نے عیسائیت قبول کر لی اور اسی حالت میں مر گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنا کر نجاشی کے پاس پیغام بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا نکاح ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے کر دے، چنانچہ اصحمہ نجاشی نے آپ کے وکیل کی حیثیت سے سیدہ ام

حبیبہ کا نکاح نبی ﷺ سے کر دیا اور مہر کی رقم بھی اپنی طرف سے ادا کر دی۔

(سنن النبي ﷺ وأيامه لابن سعد: 608/1، والسيرة النبوية لابن كثير: 273/3)

بعض روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حبشہ کے حاکم نے 8 ہجری میں حبشہ سے کچھ مسلمانوں کو مدینہ منورہ کی طرف روانہ کیا تھا، البتہ وہ سب دورانِ سفر کسی سمندری حادثے کا شکار ہو کر سمندر میں ڈوب گئے تھے۔

(إنا لله وإنا إليه راجعون) (المغازي لابن إسحاق، ص: 219، والإصابة: 102/1)

سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے مہاجرین حبشہ کو ساتھ لیا اور انھیں دو کشتیوں پر سوار کر کے مدینہ منورہ لے آئے۔ یہ 6 ہجری میں ان دنوں کا واقعہ ہے جب غزوۂ خیبر پیش آیا تھا۔ حبشہ سے آنے والے ان مہاجرین میں سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ ﷺ ان حضرات کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ آپ بار بار فرما رہے تھے: «مَا أَدْرِي بِأَيِّهِمْ أُسَرُّ بِفَتْحِ خَيْبَرَ أَمْ بِقُدُومِ جَعْفَرَ؟»

''مجھے معلوم نہیں ہو رہا کہ مجھے کس چیز کی زیادہ خوشی ہو رہی ہے جعفر کی آمد کی یا خیبر کی فتح کی؟''

(المعجم الصغير للطبراني: 19/1)

بہر حال یہ بات طے ہے کہ ان مسلمانوں کے حبشہ سے مدینہ منورہ کی طرف سفر کے تمام تر انتظامات اور اخراجات نجاشی نے اپنی جیب سے ادا کیے تھے۔

سیرت نگار ابن ہشام نے اس حوالے سے ایک خاص عنوان قائم کر کے ان مہاجرین کے اسمائے گرامی بھی ذکر کیے ہیں۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 359/3)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی کئی ایک روایات میں مروی ہے کہ نجاشی کی وفات ہوئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ (صحيح البخاري، حديث: 1245، وصحيح مسلم، حديث: 951)

البتہ اہل علم کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ اس کی وفات کس سال ہوئی؟ تاہم رسول اللہ ﷺ کا اس کی نماز جنازہ پڑھانا اس کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ اکثر اہل علم نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ نجاشی نے اپنے قبول اسلام کی خبر عام لوگوں سے مخفی رکھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ پہلا نجاشی ہو جس نے سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دیگر مہاجرین حبشہ کا استقبال کیا تھا۔

بعض مؤرخین رقم طراز ہیں کہ ہرقل ہر سال نجاشی کی خدمت میں مالی تعاون بھیجا کرتا تھا کیونکہ نجاشی کا

رومی حکومت کے ساتھ مذہبی اور انتظامی تعلق تھا، البتہ جب اسے نجاشی کے قبولِ اسلام کا پتہ چلا تو اس نے تعاون کا یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔(زاد المعاد: 694/3)

رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی حنفی کے نام

نجد کے علاقے میں ''یمامہ'' کا علاقہ معروف ہے۔ اسے ''العروض'' یا ''العارض'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مرکزی مقام ''حجر'' ہے جو بحرین سے مغرب کی جانب واقع ہے۔ وادیٔ حنیفہ اور اس کے اردگرد کے علاقے میں اس کی بستیوں کی وجہ سے اس کی بہت شہرت ہے۔ یہ علاقے آج کل مملکت سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر مشتمل ہیں۔ یمامہ کی سرزمین زراعت کے حوالے سے نہایت زرخیز ہے۔ عہد رسالت میں یہاں سے گندم مکہ مکرمہ اور دوسرے علاقوں کی طرف برآمد کی جاتی تھی۔

(معجم البلدان: 442/5، ومعجم اليمامة: 15/1)

وادیٔ یمامہ بہت سی بستیوں اور بڑے بڑے دیہاتوں پر مشتمل تھی۔ یہاں دنیوی جاہ و جلال کے حامل متعدد قبائل آباد تھے۔ یہ وادی چشموں اور نخلستان کے حوالے سے بھی معروف ہے۔ اس وادی کے مرکز میں واقع شہر ''حجر'' اور ''عیینہ'' کے قریب ''عقرباء'' نامی بستی میں ایک مشہور قبیلہ ''بنوحنیفہ'' آباد تھا۔

اس کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک کا نام ''ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ'' ہے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کے قبول اسلام کا واقعہ معروف ہے۔(صحيح البخاري، حديث: 4372)

اسلام قبول کر لینے کے بعد انھوں نے اپنے علاقے سے قریش مکہ کی طرف گندم کی سپلائی بند کر دی تھی۔ آخر تنگ آ کر اہل مکہ نے نبیٔ کریم ﷺ سے اس بارے میں درخواست کی کہ آپ ثمامہ رضی اللہ عنہ کو ہمارے ساتھ گندم کی تجارت اور لین دین کا حکم فرمائیں۔

یمامہ کے مشہور رؤساء میں ایک نام ہوذہ بن علی حنفی کا بھی ہے وہ جو الخضارم، یعنی الخرج کے نواح میں رہتا تھا۔ یہ بنوحنیفہ کا رئیس اور حاکم تھا۔ 6 ہجری میں جب اللہ کے رسول ﷺ نے اطراف و اکناف کے مختلف امراء اور بادشاہوں کے نام خطوط ارسال کیے تو آپ نے اس کے نام بھی ایک خط روانہ فرمایا۔ اس خط کی عبارت یوں تھی:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُّحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ إِلٰى هَوْذَةَ بْنِ عَلِيٍّ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، وَاعْلَمْ أَنَّ دِينِي سَيَظْهَرُ إِلٰى مُنْتَهَى الْخُفِّ وَالْحَافِرِ، فَأَسْلِمْ تَسْلَمْ وَأَجْعَلُ لَكَ مَا تَحْتَ يَدَيْكَ...»

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے ہوذہ بن علی کے نام۔ ہدایت کی پیروی کرنے والے پر سلام۔ تمھیں معلوم ہو کہ میرا دین وہاں تک پہنچے گا جہاں تک اونٹوں اور گھوڑوں کی رسائی ہے، لہٰذا اسلام لے آؤ سلامت رہو گے، اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میں تمھارا مال ومتاع اور ریاست سب کچھ تمھیں عطا کر دوں گا۔''

جب آپ ﷺ کے قاصد سیدنا سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ آپ کا سر بمہر خط لیے اس کے ہاں پہنچے تو اس نے ان کے شایانِ شان عزت وتوقیر کی۔ انھیں خوش آمدید کہا۔ سلیط رضی اللہ عنہ نے اسے وہ خط سنایا تو اس نے مبہم اور گول مول سا جواب دیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف جواب لکھا کہ آپ جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں، اس کی بہتری اور عمدگی کے کیا کہنے۔ میں قومی سطح کا شاعر اور خطیب ہوں۔ سارے عرب پر میرا رعب اور دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ سب لوگ مجھ سے ہیبت کھاتے ہیں، اس لیے کچھ امور میرے سپرد کر دیں تو میں آپ کی پیروی میں آجاؤں گا۔ اس نے سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ کو تحائف اور مقام حجر کے تیار شدہ کپڑے تحفے کے طور پر دیے۔

سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ یہ تحائف لے کر خدمت نبوی میں آئے اور آپ کو احوال سے آگاہ کیا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اس کا خط سن کر فرمایا: ''اگر وہ مجھ سے زمین کا معمولی سا ٹکڑا بھی طلب کرے تو نہیں دوں گا۔ وہ خود اور اس کا ملک تباہ ہو جائے گا۔'' (زادالمعاد: 696/3)

اس سفارت کی ذمے داری نبھانے والے سیدنا سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ اولین دور کے مسلمانوں اور مہاجرین حبشہ میں سے ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ ہجرت حبشہ کے موقع پر انھوں نے اپنے اہل وعیال سمیت ہجرت کی تھی اور وہاں ان کے ہاں اولاد بھی ہوئی تھی۔ (الإصابة: 71/2)

رسول اللہ ﷺ کا خط جب ہوذہ بن علی کے پاس پہنچا تو اس وقت شام کے شہر دمشق کا ایک نامی گرامی عیسائی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ہوذہ نے اس سے نبیٔ کریم ﷺ کے متعلق دریافت کیا اور آپ کی طرف سے آئے ہوئے خط اور اس کے جواب میں اپنے خط کا بھی تذکرہ کیا۔ اس نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اب تو اسے اپنی حکومت اور سلطنت کا بھی خطرہ ہے۔ مہمان نے کہا: اگر تم اس کی پیروی کر لو تو وہ تمھیں ہی اس ملک کا بادشاہ رہنے دے گا۔ ان کا اتباع کر لینے ہی میں تمھاری بھلائی ہے۔ یہ وہی عربی نبی ہے جس کی آمد کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی اور انھی کے متعلق ہماری انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

(زاد المعاد: 697/3)

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوا کہ ہوذہ اسلام قبول نہ کرنے پر مصر رہا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خط میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے اسلام قبول کرنے کو مشروط رکھا اور اسلام قبول نہ کیا۔ اس کے اسی رویے کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے حق میں یہ کہہ کر بددعا فرمائی تھی: **بَادَ وَ بَادَ مُلْكُهُ** ''وہ خود بھی تباہ ہوگا اور اس کا ملک بھی تباہ ہو جائے گا۔'' چنانچہ آپ کی یہ بددعا پوری ہوئی اور بعد میں فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

جب اللہ کے رسول ﷺ غزوۂ فتح مکہ سے واپس تشریف لائے تو جبریل علیہ السلام نے آ کر آپ کو اطلاع دی کہ ہوذہ مر چکا ہے۔ اس پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سنو! میرے بعد یمامہ میں ایک کذاب آدمی نمودار ہوگا جو نبوت کا دعویٰ کرے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا۔'' ایک پوچھنے والے نے دریافت کیا: اللہ کے رسول! اسے کون قتل کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اور تمھارے ساتھی۔'' (زاد المعاد: 696/3)

9ھ میں جب بنو حنیفہ قبیلے کا ایک وفد مدینے آیا تو اس میں مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا۔ اسی نے کہا تھا کہ اگر محمد ﷺ نبوت کا معاملہ اپنے بعد میرے حق میں دے دیں تو میں ان کی پیروی میں آ جاتا ہوں۔

مسیلمہ اپنی قوم کی بہت بڑی تعداد سمیت آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ، سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر اس سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی۔ آپ مجمع میں مسیلمہ کے قریب کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''اگر تم مجھ سے یہ چھڑی بھی مانگو تو میں نہیں دوں گا۔ اللہ تیرے

حق میں جو فیصلہ کر چکا ہے، اس سے تو آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اگر تو پیچھے ہٹا تو اللہ تعالیٰ تجھے خاک آلود کر دے گا۔ تیرا انجام وہی ہوگا جو مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے۔ میرا یہ ساتھی ثابت بن قیس میری طرف سے تیری باتوں کا جواب دے گا۔'' یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ (صحيح البخاري، حديث:4373)

نبیٔ کریم ﷺ کی حیات مستعار کے آخری دنوں میں مسیلمہ اور قبیلۂ بنو حنیفہ کے بہت سے لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے خود مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ وہ بے فائدہ قسم کی مسجع عبارتیں مرتب کر کے لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ یہ (میرا) قرآن ہے۔ یوں وہ لوگوں کو گمراہ کرنے لگا۔ لوگ عصبیت میں آ کر اس کا ساتھ دینے اور اس کی پیروی کرنے لگے۔ اس کی عقیدت میں بعض لوگ اس قدر آگے نکل گئے کہ وہ یوں کہنے لگے: ربیعہ قبیلے کا کذاب، یعنی مسیلمہ قبیلۂ مضر کے سچے، یعنی محمد ﷺ سے بہتر ہے۔ (تاريخ الطبري: 246/3، واضح رہے کہ مضر بن نزار رسول اللہ ﷺ کے نسب مبارک کی اٹھارویں پشت میں تھے) مسیلمہ یہ بھی کہنے لگا کہ اسے امر نبوت میں محمد ﷺ کے ساتھ شریک کر دیا گیا ہے۔

پھر وہ اس حد تک دلیر ہو گیا کہ اس نے نبیٔ کریم ﷺ کے نام ایک خط لکھا۔ خط کی عبارت درج ذیل تھی:

مِنْ مُّسَيْلَمَةَ رَسُولِ اللّٰهِ إِلٰى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ، سَلَامٌ عَلَيْكَ، أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي قَدْ أُشْرِكْتُ فِي الْأَمْرِ مَعَكَ وَإِنَّ لَنَا نِصْفَ الْأَرْضِ وَلِقُرَيْشٍ نِصْفَ الْأَرْضِ وَلٰكِنَّ قُرَيْشاً قَوْمٌ يَّعْتَدُونَ.

''اللہ کے رسول مسیلمہ (کذاب) کی طرف سے محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں۔ آپ پر سلام ہو۔ مجھے امر نبوت میں آپ کا شریک کار بنا دیا گیا ہے۔ آدھا ملک میرا اور آدھا قریش کا ہوگا، البتہ قریش بڑے ظالم لوگ ہیں۔''

اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل خط لکھا:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ (ﷺ) إِلٰى مُسَيْلَمَةَ الْكَذَّابِ: اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ» ﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ﴾

يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ ہدایت کے پیروکار پر سلام ہو۔ اما بعد، یہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث (مالک) بنا دیتا ہے۔ اور بہتر انجام ان لوگوں کا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔'' (الوثائق السياسيه للدكتور حميدالله. الأعراف 128:7)

ارتداد کا فتنہ زور پکڑتا گیا اور مسیلمہ کذاب مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر ترتیب دینے لگا۔

امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے سیدنا عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر اس کے مقابلے کے لیے روانہ فرمایا۔ لیکن مسیلمہ کے مقابلے میں یہ لشکر کامیاب نہ ہوسکا، تب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم کے لیے روانہ فرمایا اور فوراً بعد ان کی نصرت کے لیے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی مزید کمک دے کر ان کے پیچھے روانہ کر دیا۔ سیدنا شرحبیل رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ جہاں پر ہیں، وہیں رک جائیں اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے آنے کا انتظار کریں۔ (تاريخ الطبري: 243/3)

اس لشکر میں مہاجرین اور انصار صحابہ بھی شامل تھے۔ مہاجروں کے دستے کے رئیس سیدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے علم بردار سیدنا سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما تھے۔ جبکہ انصار کا دستہ سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کی ماتحتی اور نگرانی میں تھا۔

اسلامی لشکر جب یمامہ کے قریب پہنچا اور مسیلمہ کذاب کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنا لشکر لے کر ''عقرباء'' کی طرف نکلا اور ان کے مقابلے میں صف آرا ہوا۔ مسلمانوں نے مسیلمہ کذاب کے ایک دستے کو کاری نقصان پہنچایا اور ان کے تقریباً چالیس سے ساٹھ تک آدمی قتل کر دیے۔ بعدازاں مسیلمہ اور اس کی باقی فوج کے ساتھ عمومی جنگ ہوئی۔ (تاريخ الإسلام و عصر الراشدين، ص: 40)

قریب تھا کہ مسلمان ہزیمت سے دوچار ہو جاتے لیکن مسلمانوں نے ایک دوسرے کو ہمت دلائی اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ دشمن کی طرف سے صالح بنی حنیفہ کا دستہ آگے آگے تھا، پھر روز کارن پڑا اور

دونوں طرف کا بہت سا جانی نقصان ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی فتح اور غلبے کے آثار دکھائی دینے لگے اور دشمن پسپا ہونے لگا۔ مسیلمہ کے طرف داروں نے اس سے کہا: تو جس مدد اور فتح کا ہم سے وعدہ کرتا تھا، وہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: تم لڑو اور اپنے حسب نسب کا دفاع کرو۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے اللہ کی نصرت سے مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے کیفر کردار تک پہنچایا۔ سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کیا اور اس سلسلے میں ایک انصاری صحابی نے بھی ان کی معاونت کی۔

حاکم بحرین منذر بن ساویٰ کے نام خط

عُمان اور بصرہ (عراق) کے درمیان ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ کے طویل وعریض علاقے کو ''بحرین'' کہا جاتا ہے۔ ہَجر، جواثا اور قطیف یہاں کے بڑے بڑے شہر ہیں۔ فارس کی حکومت کی طرف سے سی بخت (سی بخت) اور عربوں میں سے منذر بن ساویٰ العبدی یہاں کے حکمران تھے۔

(معجم البلدان: 346/1، وفتوح البلدان، ص: 90، والطبقات لابن سعد: 263/1)

رسول اللہ ﷺ نے منذر بن ساویٰ کے نام بھی خط ارسال کیا تھا۔ اس نے اہل عمان کے سامنے وہ خط پڑھا تو ان میں سے بعض لوگ کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے اور بعض نے قبولِ اسلام سے انکار کیا۔ منذر نے آپ ﷺ کے نام ایک خط لکھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں درج ذیل خط لکھا:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ إِلَى الْمُنْذِرِ بْنِ سَاوٰى، سَلَامٌ عَلَيْكَ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ، فَإِنِّي أُذَكِّرُكَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ فَإِنَّهُ مَنْ يَّنْصَحْ فَإِنَّمَا يَنْصَحُ لِنَفْسِهِ وَإِنَّهُ مَنْ يُّطِعْ رُسُلِي وَيَتَّبِعْ أَمْرَهُمْ فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ نَّصَحَ لَهُمْ فَقَدْ نَصَحَ لِي، وَإِنَّ رُسُلِي قَدِ اثْنَوْا عَلَيْكَ خَيْرًا وَإِنِّي قَدْ شَفَعْتُكَ فِي قَوْمِكَ فَاتْرُكْ لِلْمُسْلِمِينَ مَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ وَعَفَوْتُ عَنْ أَهْلِ الذُّنُوبِ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَإِنَّكَ مَهْمَا تَصْلُحْ فَلَنْ نَّعْزِلَكَ عَنْ

عَمَلِكَ وَمَنْ أَقَامَ عَلَى يَهُودِيَّةٍ أَوْ مَجُوسِيَّةٍ فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ»

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منذر بن ساویٰ کی طرف۔ آپ پر سلام ہو۔ میں آپ کے سامنے اس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق اور معبودِ برحق نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اما بعد! میں تمھیں اللہ عزوجل کی یاد دلاتا ہوں، یاد رہے کہ جو شخص بھی بھلائی اور خیر خواہی کا راستہ اختیار کرے گا، اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو شخص میرے قاصدوں کی اطاعت اور ان کی پیروی کرے گا، اس نے درحقیقت میری اطاعت کی۔ جس نے ان کے ساتھ خیر خواہی اور اچھا سلوک کیا، درحقیقت اس نے میرے ساتھ خیر خواہی کی اور اچھا سلوک کیا۔ میرے قاصدوں نے آپ کے ہاں سے آ کر میرے سامنے آپ کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے، لہٰذا میں تمھیں اپنی رعایا سے حسن سلوک کا معاملہ کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ مسلمان ہونے والے لوگ جس حالت میں ایمان لائے ہیں، انھیں ان کے حال پر رہنے دو۔ میں خطا کاروں کو معاف کرتا ہوں، لہٰذا آپ بھی ان کی معذرت قبول کر لیں۔ جب تک آپ ہمارے ساتھ صحیح رویہ رکھیں گے، ہم بھی آپ کو آپ کے منصب سے معزول نہیں کریں گے اور جو شخص یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہے وہ جزیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔'' (زادالمعاد: 692/3)

اس خط کے نامہ بردار سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ آٹھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد بحرین میں اسلام پھیلنے لگا۔ جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، وہ زکاۃ ادا کرنے لگے اور جو لوگ یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہے، وہ جزیہ دینے لگے۔ (معجم البلدان: 348/1)

رسول ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں بحرین کا علاقہ حکومت اسلامیہ کا حصہ بن چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے مختلف حصوں پر مختلف صحابہ کو والی اور نگران بنا کر بھیجا۔ عہدِ نبوی میں وہاں کے مشہور حاکموں میں ایک نام جلیل القدر صحابی سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی وہاں کا والی اور حاکم بنا کر روانہ فرمایا تھا۔

(سیر أعلام النبلاء: 262/1، التاریخ لخلیفة بن خیاط، ص: 123)

رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک فروہ بن عمرو جذامی کے نام

فروہ بن عمرو بلادعرب سے متصل سرزمین شام کا حکمران تھا۔ اس کا انتظامی تعلق سلطنت روم کے ساتھ تھا اور اردن کے نواح میں مقام ''معان'' اس کا دارالحکومت تھا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 591/4)

اس نے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے نام خط لکھ کر اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع بھی دی، نیز اس نے آپ کی خدمت عالیہ میں تحفے تحائف بھی ارسال کیے۔ اس کے خط کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل خط بھیجا تھا:

«مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ إِلٰى فَرْوَةَ بْنِ عَمْرٍو، أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَدِمَ عَلَيْنَا رَسُولُكَ وَبَلَّغَ مَا أَرْسَلْتَ بِهِ وَخَبَّرَ عَمَّا قِبَلَكُمْ وَأَتَانَا بِإِسْلَامِكَ، وَإِنَّ اللّٰهَ هَدَاكَ بِهُدَاهُ إِنْ أَصْلَحْتَ وَأَطَعْتَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَأَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتَ الزَّكَاةَ»

اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے فروہ بن عمرو کے نام۔ حمد وثنا کے بعد! آپ کا قاصد ہمارے ہاں آیا۔ آپ نے جو تحائف اس کے ہاتھ ارسال کیے، وہ بھی پہنچائے، آپ کے احوال سے بھی ہمیں آگاہ کیا۔ اور آپ کے اسلام قبول کرنے کی خبر بھی دی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپ کو اسلام قبول کرنے کی توفیق سے نوازا ہے۔ اب آپ اچھے اعمال بجا لاتے رہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، باقاعدگی سے نماز ادا کریں اور زکاۃ ادا کریں۔''

پھر آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انھوں نے فروہ کے قاصد مسعود بن سعد کو ساڑھے بارہ اوقیے چاندی بطور تحفہ عنایت کی۔ (ساڑھے بارہ اوقیے چاندی، پانچ سو درہم کے برابر ہوتی ہے۔ رائج الوقت اوزان کے مطابق اس کا وزن ڈیڑھ کلوگرام بنتا ہے۔)

رومی بادشاہ کو فروہ کے قبول اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے فروہ کو اپنے ہاں بلوا کر حکم دیا کہ دین اسلام چھوڑ کر واپس اپنے دین میں آجاؤ، ہم تمھیں حسب سابق بادشاہ رہنے دیں گے۔ فروہ نے جواب دیا: میں کسی بھی

صورت میں محمد ﷺ کے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی آمد کی بشارت دی تھی لیکن آپ کو اپنی حکومت عزیز رہی، چنانچہ شاہِ روم نے انھیں کچھ عرصے تک قید رکھا اور پھر پھانسی دے کر شہید کر دیا۔ (الطبقات لابن سعد: 281/1، وفاء الوفاء لابن الجوزی: 740/2)

شاہ روم نے انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن فروہ رحمہ اللہ اسلام پر ثابت قدم رہے اور شہادت کے اعزاز سے ہمکنار ہوئے۔ شہید کیے جانے سے قبل انھوں نے کچھ اشعار بھی کہے تھے۔ ان میں سے ایک شعر درج ذیل ہے:

بَلِّغْ سَرَاةَ الْمُسْلِمِينَ بِأَنَّنِي سِلْمٌ لِّرَبِّي أَعْظُمِي وَ بَنَانِي

''اہل اسلام کے سربراہوں اور سرکردہ رہنماؤں کو یہ اطلاع ہو کہ میری ہڈیاں اور ہاتھوں کے پور، یعنی میرے جسم کا ایک ایک عضو اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان ہے۔ (السیرة النبویة لابن هشام: 592/4)

معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اسباب کے پہلو بہ پہلو فروہ رحمہ اللہ کا قتل بھی غزوۂ موتہ کے اسباب میں سے ایک سبب تھا۔ (غزوۂ موتة لعلی العتوم، ص: 104)

تاریخ میں یہ بات معروف ہے کہ اس کے بعد بھی قبیلہ جذام کے بہت سے لوگ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ جب بعض قبائل سیدنا دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کے قافلے کو لوٹنے کے درپے ہوئے تو ان لوگوں نے ان کا دفاع اور مدد کی تھی۔ (السیرة النبویة لابن هشام: 612/4، وتجریة مؤتة لعلی العتوم، ص: 10)

تاریخ کے صفحات پر یہ بھی مرقوم ہے کہ فروہ رحمہ اللہ نے اپنی شہادت سے قبل رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک گھوڑا بھی بطور تحفہ بھجوایا تھا۔

(الطبقات لابن سعد: 490/1، وعیون الأثر لابن سید الناس: 422/2، والعلاقات الإسلامیة النصرانیة، ص: 131)

عمان کے دو فرمانرواؤں کے نام آپ ﷺ کا خط

عُمان، جزیرہ عرب کے جنوب مشرق میں خلیج عربی، خلیج عمان اور بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ عہد رسالت میں عمان کی سرحدیں دورِ حاضر کے عمان کے قریب قریب تھیں جو غربی جانب موصل تک اور شمالی

جانب بحرین تک پھیلی ہوئی تھیں۔

(معجم البلدان: 150/4، وتاریخ عمان والخلیج فی صدرالإسلام لعبد المنعم عبدالحمید سلطان، ص: 12)

یہ سرزمین کھجوروں کی کاشت اور جانوروں کی پرورش و پرداخت کے حوالے سے پورے عرب میں مشہور تھی۔ یہاں کے لوگوں نے ہندوستان اور دور دراز کے علاقوں سے سمندر کے راستے تجارتی روابط اور تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔

یہاں ایک عرصے تک آل جلندیٰ برسر اقتدار رہے۔ ان کا دارالحکومت ''صُحار'' تھا۔ یہاں کے مشہور ترین قبائل میں سے ایک قبیلہ ''ازد'' تھا۔ اس قبیلے کے بہت سے لوگ بادشاہ بھی رہے۔ دیگر عرب علاقوں کی طرح عمان میں بھی بت پرستی زوروں پر تھی۔ ان کے علاوہ اگرچہ مجوسی اور عیسائی مذہب کے حامل لوگ بھی پائے جاتے تھے مگر وہ کسی شمار وقطار میں نہیں آتے تھے۔

بحرین، یمن، حضرموت اور اطراف واکناف میں مسلمانوں کی لشکر کشی کی بدولت اسلام کی کرنیں اولین دور ہی سے عمان تک پہنچ چکی تھیں۔ (تاریخ عمان والخلیج فی صدر الإسلام، ص: 26)

رسول اللہ ﷺ نے 7 ہجری میں عمرۃ القضا کے بعد مدینہ منورہ آ کر جلندیٰ خاندان کے دو حکمرانوں جیفر اور عبد کے نام بھی خط لکھ کر انھیں اسلام کی دعوت دی۔ یہ خطوط سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ذریعے بھجوائے گئے۔ آپ ﷺ کے ایک خط کے مندرجات یوں ہیں:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ إِلٰى جَيْفَرٍ وَّ عَبْدِ ابْنَيِ الْجَلَنْدٰى، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكُمَا بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمَا تَسْلَمَا، فَإِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً، لِأُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ، فَإِنَّكُمَا إِنْ أَقْرَرْتُمَا بِالْإِسْلَامِ وَلَّيْتُكُمَا، وَإِنْ أَبَيْتُكُمَا أَنْ تُقِرَّا بِالْإِسْلَامِ فَإِنَّ مُلْكَكُمَا زَائِلٌ عَنْكُمَا وَخَيْلِي تَحُلُّ بِسَاحَتِكُمَا وَتَظْهَرُ نُبُوَّتِي عَلٰى مُلْكِكُمَا»

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بندے محمد ﷺ کی طرف سے جلندیٰ قبیلے کے فرماں رواؤں جیفر اور عبد کے نام۔ سلام اس پر جو راہ ہدایت کی اتباع کرے۔ امابعد! میں آپ دونوں کو اللہ کے دین، اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کائنات کے لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ زندہ لوگوں کو اللہ کی نافرمانی اور آخرت کے عذاب سے ڈراؤں اور کافروں پر اللہ کے دین کی حقانیت ثابت ہو جائے۔ اگر تم دونوں اسلام کا اقرار کر کے اسے قبول کر لو تو میں حسب سابق علاقے کی حکمرانی تمھارے ہاتھ میں رہنے دوں گا۔ اور اگر تم اسلام قبول کرنے سے انکار کرو تو یاد رکھو کہ تمھاری حکومت ختم ہو جائے گی اور میرے لشکر تمھارے علاقوں کو روند ڈالیں گے اور عنقریب تمھاری سلطنت پر میری نبوت کا غلبہ ہوگا۔''

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ عمان میں اپنی آمد اور ان دونوں فرمانرواؤں سے ملاقات کے احوال بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ میں عمان پہنچ کر سیدھا عبد کے ہاں گیا۔ وہ دوسرے کی نسبت زیادہ حوصلہ مند اور اچھے اخلاق کا مالک تھا۔ میں نے جا کر بیان کیا کہ مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے آپ اور آپ کے بھائی کی خدمت میں بھیجا گیا ہے۔ اس نے کہا: میرا بھائی عمر اور حکومت کے لحاظ سے مجھ سے مقدم (سینئر) ہے۔ میں آپ کو ان کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں تاکہ پہلے وہ اس خط کو ملاحظہ کر لے جو آپ لے کر آئے ہیں۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے اس کی ملاقات کے لیے کئی دن انتظار کرنا پڑا، بالآخر میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے جا کر وہ خط اس کے حوالے کیا۔ یہ خط سربمہر تھا۔ اس نے مہر کو کھولا اور پورا خط پڑھنے کے بعد اپنے بھائی کو دیا۔ اس نے بھی پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے چھوٹا بھائی بڑے کی نسبت زیادہ نرم خو ہے۔ اس نے مجھ سے کہا: آپ آج انتظار کریں اور کل آنا۔ میں دوسرے دن اس کے پاس گیا تو اس نے کہا: آپ نے مجھے جس چیز کی دعوت دی ہے اس کا مطلب ہے کہ اگر میں اپنی زمامِ حکومت اس شخص (رسول اللہ ﷺ) کو دے دوں تو گویا میں پورے عرب میں کمزور ترین حکمران ہوں۔

اس کی بات سن کر میں نے کہا: ٹھیک ہے، میں کل واپس جا رہا ہوں۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ میں واقعی

واپس جانے والا ہوں تو انھوں نے صبح سویرے مجھے بلا کر میرے سامنے اسلام قبول کرنے کا اظہار کیا۔ دونوں نے نبیٔ کریم ﷺ کے رسول ہونے کی تصدیق اور اقرار کیا، نیز انھوں نے نہ یہ کہ مجھے اپنے علاقے سے صدقات وصول کرنے اور آزادی سے فیصلے کرنے کی اجازت دے دی بلکہ اگر کسی نے میرے ساتھ کسی قسم کی مزاحمت کی تو وہ میرے معاون ثابت ہوئے، چنانچہ میں نے وہاں کے مالداروں سے صدقات (زکاۃ وغیرہ) وصول کر کے وہیں کے غرباء ومساکین میں تقسیم کر دیے۔ (الطبقات لابن سعد: 263,262/1)

معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان دونوں فرمانروا بھائیوں کے درمیان لمبی چوڑی ملاقاتیں رہیں جن میں اطراف واکناف کے بادشاہوں کے نام لکھے گئے خطوط اور ان کے ردعمل پر بھی تبصرے ہوئے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی قوم قریش اور ان کے طرز عمل پر بھی گفتگو ہوئی۔ اسی دوران عمرو رضی اللہ عنہ نے ان کو نجاشی کے اسلام اور دعوت اسلام قبول کرنے کے واقعے سے بھی آگاہ کیا۔ یوں انھیں نجاشی کے اسلام قبول کرنے کے بعد ہرقل کے موقف سے بھی آگاہی ہوئی۔ ان کے مابین زکاۃ وصدقات کی وصولی اور ان کی تقسیم کے معاملات بھی طے پائے۔ مزید یہ کہ اس گفتگو میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور آپ کے پیغام کے حوالے سے تفصیلی مباحث زیر غور آئے۔ غرضیکہ دونوں فرمانرواؤں نے اسلام قبول کر لیا اور سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنے ملک میں آزادی سے زکاۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم کی اجازت دے دی۔ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخر تک مسلسل جاری رہا۔

ان امور کی انجام دہی میں سیدنا ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ ان کے معاون رہے۔ (فتوح البلدان، ص: 93، وتاريخ عمان والخليج فی صدر الإسلام، ص: 30، ابوزید کا نام ثابت رضی اللہ عنہ ہے اور یہ زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے والد گرامی ہیں۔ الإصابة: 193/1)

سیدنا ابوزید رضی اللہ عنہ لوگوں تک قرآن وسنت اور اسلام کی تعلیم پہنچانے میں سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی شریک کار رہے۔ نیز سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ امیر البحرین کی حیثیت سے بھی بعض سرکاری خدمات سرانجام دیتے رہے۔ (الولاية على البلدان فی عصر الخلفاء الراشدين للعمری، ص: 46) رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخر تک عبد اور جیفر ہی سلطنت عمان کے فرمانروا رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عمان کے علاقوں میں ارتداد کے فتنے نے سر اٹھایا تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمان کے ان دونوں حکمران بھائیوں کے تعاون سے اس فتنے کی سرکوبی کے سلسلے میں مرتدوں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں۔ متعدد جنگوں کے بعد سیدنا حذیفہ بن محصن اور سیدنا عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہما نے دُباء کے نواح میں مسلمانوں کی قیادت کی۔ (التاريخ لخليفة بن خياط، ص: 97، وفتوح البلدان، ص: 87۔ دُبا، عمان کا مشہور تاریخی شہر ہے۔ یہ قبل از اسلام ہی سے عرب کی مشہور تجارتی منڈیوں میں سے ایک ہے۔ معجم البلدان: 434/2)

فتنۂ ارتداد میں تیزی آئی تو اہل عمان کی اکثریت اسلام پر ثابت قدم رہی اور انھوں نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھرپور ساتھ دیا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی ستائش کی۔ (تاريخ الطبرى: 263,262/3)

خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی فتوحات میں بالعموم اور عراق و فارس کی فتح میں بالخصوص عمان کے قبائل کا خاص کردار ہے۔

حارث بن ابی شمر غسانی کے نام نامۂ مبارک

حارث سرزمین شام میں بلقاء اور دمشق کے گرد و نواح کا حاکم تھا۔ (العلاقات الإسلامية النصرانية فى العهد النبوي، ص: 83) یہ رومی حکومت کے زیر اثر اور اپنے عیسائی مذہب کے بارے میں بہت زیادہ متعصب تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے نام درج ذیل مکتوب ارسال فرمایا تھا:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُولِ اللهِ (ﷺ) إِلَى الْحَارِثِ بْنِ أَبِي شِمْرٍ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، وَآمَنَ بِاللهِ وَصَدَّقَ، وَإِنِّي أَدْعُوكَ إِلٰى أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، يَبْقٰى لَكَ مُلْكُكَ»

''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے حارث بن ابی شمر کے نام۔ سلام ہو اس پر جو راہِ ہدایت پر چلے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کرے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اس اللہ پر ایمان لے آئیں جو اکیلا ہے،

اس کا کوئی شریک نہیں۔ ایمان لے آنے کے بعد آپ کا ملک (حکومت وسلطنت) آپ ہی کے پاس رہے گا۔'' (الطبقات لابن سعد: 561/1، وزادالمعاد: 697/4، والبداية والنهاية: 468/4)

یہ خط پڑھ کر حارث غضب ناک ہوگیا اور طیش میں آ کر اس نے آپ کے خط مبارک کو پھینک دیا۔ اس خط کو سیدنا شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 607/4، والإصابة: 138/2)

حارث نے سیدنا شجاع رضی اللہ عنہ کو ڈرایا اور سخت قسم کی دھمکیاں بھی دیں اور شاہِ روم قیصر سے مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ پر حملہ کرنے کی اجازت بھی طلب کی۔ مگر قیصر نے اسے سختی سے روک دیا اور کہا کہ خبردار! ایسا کام نہ کرنا اور اس بارے میں کبھی سوچنا بھی مت۔ (السيرة الحلبية: 306/3)

جبلہ بن ایہم غسانی کے نام نامۂ مبارک

سرزمین شام میں قبل از اسلام سے غسانیوں کی حکومت چلی آ رہی تھی۔ جبلہ بن ایہم اس خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ قبل از اسلام دورِ جاہلیت میں عربوں اور ان کے شعراء کا ان کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مدینے کے اوس اور خزرج کے قبائل کی ان کے ساتھ رشتے داری بھی تھی۔ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور مدینے کے دوسرے بہت سے شعراء ان کے درباروں میں جا کر ان کی مدح سرائی کر کے تحائف اور نذرانے وصول کیا کرتے تھے۔ (ابن حبيب، المحبر لابن حبيب، ص: 372)

غسانی حکمران مرکزی رومی حکومت کے باجگزار ہونے کے ساتھ اپنے ملک شام میں عرب عیسائیوں کی مذہبی پیشوائی بھی کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے غسانی بادشاہ جبلہ بن ایہم کے نام خط لکھ کر اسے اسلام کی دعوت دی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 607/3، والطبقات الكبرىٰ: 265/8، وسبل الهدىٰ والرشاد: 359/11)

رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ خط سیدنا شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ کے ذریعے بھجوایا۔ انھیں نصرانیوں اور غسانیوں کے مابین تعلقات، روابط اور رشتے داریوں کا بخوبی علم تھا۔ ملاقات اور گفتگو کے دوران سیدنا شجاع رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: جبلہ! آپ کی قوم کے لوگ، یعنی انصار اس نبی کو اس کے گھر (مکہ مکرمہ) سے اپنے ہاں (یثرب میں) لے آئے ہیں۔ انھوں نے ان کو اپنے ہاں رہنے کی جگہ دی، ان کی مدد کی اور انھیں پورا پورا

تحفظ بہم پہنچایا ہے۔ آپ جس دین اور عقیدے کو تھامے ہوئے ہیں، درحقیقت یہ آپ کے آباء و اجداد کا دین نہیں ہے۔ آپ چونکہ شام کے بادشاہ ہیں اور آپ کی سیاسی وابستگی رومیوں کے ساتھ ہے، اس لیے آپ اور آپ کے آباء و اجداد نے ان سے ہم آہنگی کے طور پر ان کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اگر آپ کا سیاسی تعلق کسریٰ کے ساتھ ہو جائے تو آپ اہل فارس کا دین اپنا لیں گے۔

آپ اگر اسلام قبول کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں تو پورا شام آپ کی اطاعت کرے گا۔ روم کی حکومت آپ سے مرعوب ہو جائے گی۔ اور اگر لوگ آپ کی اطاعت نہ بھی کریں تو ان کی محض دنیوی شان و شوکت قائم رہے گی اور آخرت کی کامیابی آپ کا مقدر ہوگی۔

تم گرجا گھروں کو مساجد میں، ناقوس کو اذان سے، عید شعانین کو جمعہ سے اور صلیب کو قبلے کے ساتھ بدل لو گے۔ یقیناً جو کچھ اللہ کے ہاں ہے، یعنی آخرت وہی بہتر اور دائمی ہے۔

سیدنا شجاع رضی اللہ عنہ کی گفتگو سن کر جبلہ نے کہا: اللہ کی قسم میں دلی طور پر چاہتا ہوں کہ سب لوگ اس نبی کو اس طرح مان لیں جیسے وہ خالق ارض و سماء پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے باعث مسرت ہے کہ میری قوم اس نبی کا بھرپور ساتھ دے رہی ہے۔

غزوۂ موتہ کے موقع پر قیصر نے مجھے محمد ﷺ کے لشکر کے ساتھ جنگ کے لیے بلایا تھا مگر میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ فی الحال میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے سامنے موجود مذاہب میں سے حق کیا ہے اور باطل کیا؟ البتہ میں اس بارے میں غور کروں گا۔ (السيرة الحلبية: 306/3)

حالات و واقعات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس نے عہد نبوی میں اسلام قبول کیا تھا یا نہیں، البتہ یہ واضح ہے کہ اسے اسلام کے بارے میں علم اور فہم حاصل ہو چکا تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ جو دین و شریعت لے کر آئے ہیں، وہ بہت حد تک اس کی صحت و صداقت کو مانتا تھا۔ اس نے قبول اسلام کا واضح طور پر اقرار نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے معرکۂ یرموک میں اپنی قوم کے ہمراہ رومیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اس جنگ میں بنفس نفیس شریک تھا۔

(فتوح البلدان، ص: 184، والبداية والنهاية: 63/8)

البتہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس نے اپنی قوم کے بہت سے شاہ سواروں کی معیت میں مدینہ منورہ آ کر قبولِ اسلام کا اظہار کیا۔ یہ لوگ اس قدر شاہی شان وشوکت اور سج دھج کے ساتھ آئے تھے کہ انھیں دیکھ کر اہل مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ (البداية والنهاية: 63/8)

ان لوگوں کی آمد اور قبول اسلام سے امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل اسلام کی خوشی دیدنی تھی، تاہم بعدازاں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس کے باعث جبلہ دین اسلام سے مرتد ہو کر سلطنت روم کی طرف فرار ہو گیا۔

یحنہ بن روبہ اور سردارانِ ایلہ کے نام نامۂ مبارک

خلیج عقبہ کے شمال مغرب میں فلسطین کی جانب ''اَیلہ'' نام کی ایک بندرگاہ ہے۔ یہی بندرگاہ آج کل مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) میں ''اَیلات'' کہلاتی ہے۔

(معجم البلدان: 292/1، والروض المعطار فی خبر الأقطار، ص: 70)

گزشتہ زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی پر مشتمل یہ ایک سنہری آبادی تھی۔ عیسائیوں کا مذہبی پیشوا یحنہ (یوحنا) بن روبہ ان کا رئیس اور حکمران تھا۔ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب تبوک پہنچے تو آپ نے ایک وفد تشکیل دے کر ایک خط ان کے حوالے کیا اور انھیں حکم دیا کہ اسے ایلہ کے حاکم یحنہ (یوحنا) بن روبہ تک پہنچا دیں۔ اس خط کا مضمون درج ذیل ہے:

«إِلٰى يُحَنَّةَ بْنِ رُؤْبَةَ وَ سَرَوَاتِ أَهْلِ أَيْلَةَ، سِلْمٌ أَنْتُمْ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكُمُ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَإِنِّي لَمْ أَكُنْ لِأُقَاتِلَكُمْ حَتّٰى أَكْتُبَ إِلَيْكُمْ، فَأَسْلِمْ أَوْ أَعْطِ الْجِزْيَةَ، وَأَطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ وَرُسُلَ رَسُولِهِ، أَكْرِمْهُمْ وَاكْسُهُمْ كِسْوَةً حَسَنَةً غَيْرَ كِسْوَةِ الْغُزَّاءِ وَاكْسُ زَيْدًا كِسْوَةً حَسَنَةً، فَمَهْمَا رَضِيَتْ رُسُلِي فَإِنِّي قَدْ رَضِيتُ وَقَدْ عُلِمَ الْجِزْيَةُ، فَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَأْمَنَ الْبَرُّ وَالْبَحْرُ فَأَطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيُمْنَعُ عَنْكُمْ كُلُّ حَقٍّ كَانَ لِلْعَرَبِ وَالْعَجَمِ إِلَّا حَقَّ اللهِ وَحَقَّ رَسُولِهِ، وَإِنَّكَ إِنْ رَدَدْتَّهُمْ وَلَمْ تُرْضِهِمْ لَآخُذُ مِنْكُمْ شَيْئًا حَتّٰى أُقَاتِلَكُمْ

فَأَسْبِيَ الصَّغِيرَ وَأَقْتُلَ الْكَبِيرَ فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ بِالْحَقِّ، أُؤْمِنُ بِاللهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَبِالْمَسِيحِ ابْنِ مَرْيَمَ أَنَّهُ كَلِمَةُ اللهِ، وَإِنِّي أُؤْمِنُ بِهِ أَنَّهُ رَسُولُ اللهِ وَأْتِ قَبْلَ أَنْ يَّمَسَّكُمُ الشَّرُّ، فَإِنِّي قَدْ أَوْصَيْتُ رُسُلِي بِكُمْ، وَأَعْطِ حَرْمَلَةَ ثَلَاثَةَ أَوْسُقٍ شَعِيرًا وَإِنَّ حَرْمَلَةَ شَفَعَ لَكُمْ وَإِنِّي لَوْلَا اللهُ وَ ذٰلِكَ لَمْ أُرَاسِلْكُمْ شَيْئًا حَتّٰى تَرَى الْجَيْشَ، وَإِنَّكُمْ إِنْ أَطَعْتُمْ رُسُلِي فَإِنَّ اللهَ لَكُمْ جَارٌ وَّمُحَمَّدٌ وَّمَنْ يَّكُونُ مِنْهُ وَإِنَّ رُسُلِي شُرَحْبِيلَ وَأُبَيًّا وَّحَرْمَلَةَ وَ حُرَيْثَ بْنَ زَيْدٍ الطَّائِيَّ فَإِنَّهُمْ مَهْمَا قَاضُوكَ عَلَيْهِ فَقَدْ رَضِيتُهُ وَإِنَّ لَكُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَذِمَّةَ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ إِنْ أَطَعْتُمْ وَجَهِّزُوا أَهْلَ مَقْنَا إِلٰى أَرْضِهِمْ»

’’یحنہ بن روبہ اور ایلہ کے شرفاء ومعززین کے نام۔تم سلامتی پالو۔ میں تمھارے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی برحق معبود نہیں۔ میں تمھارے ساتھ اس وقت تک جنگ نہیں کرنا چاہتا جب تک کہ میں اس بارے میں تمھارے ساتھ خط کتابت نہ کرلوں۔آپ لوگ یا تو دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں یا جزیہ ادا کریں۔ آپ لوگ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور رسول کے بھیجے ہوئے قاصدوں کی بات تسلیم کرلیں۔ ان کے ساتھ اکرام کا برتاؤ کریں۔ انھیں عمدہ لباس دیں لیکن جنگی لباس نہ دیں، بالخصوص زید کو عمدہ ترین خلعت عنایت کریں۔ میرے قاصد جس بات پر راضی ہو جائیں (اور تمھارے ساتھ جو بات بھی طے کرلیں) وہ میرے لیے بھی قابل قبول ہوگی۔اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ بحر و بر میں امن وسکون رہے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔تم سے عرب وعجم کا ہر حق روک دیا جائے گا سوائے اللہ اور اس کے رسول کے حق کے۔اگر تم نے میرے ان قاصدوں کو مطمئن اور راضی کیے بغیر واپس بھیجا تو میں تمھاری کوئی بات تسلیم نہیں کروں گا اور میری تمھارے ساتھ جنگ ہوگی، پھر میں تمھارے چھوٹے بچوں کو قیدی بنالوں گا اور بڑوں کو قتل کردوں گا،

میں اللہ کا سچا رسول ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ، اس کی نازل کردہ کتابوں، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ اللہ کا کلمہ ہیں۔ میرا اس پر بھی ایمان ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔تم برے حالات پیش آنے سے پہلے پہلے ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ میں نے اپنے ان قاصدوں کو تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے تلقین کی ہے۔تم حرملہ (رضی اللہ عنہ) کو تین وسق (تقریباً 10 من) جَو ادا کر دو۔ اسی نے میرے پاس تمھاری سفارش کی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حرملہ کی سفارش نہ ہوتی تو میں تمھارے ساتھ خط کتابت نہ کرتا یہاں تک کہ تم میرے لشکر ہی دیکھتے۔ اگر تم لوگ میرے ان قاصدوں کی بات مانو گے تو تمھیں اللہ تعالیٰ، محمد ﷺ اور ان کے نمائندوں کی پناہ حاصل ہو جائے گی۔ میرے نمائندے شرحبیل، اُبیّ، حرملہ اور حریث بن زید طائی تمھارے ساتھ جو بھی معاہدہ کر لیں، میں پیشگی اس پر اپنی رضا مندی کا اظہار کرتا ہوں اور تمھارے لیے اللہ اور اس کے رسول محمد (ﷺ) کا عہد و پیمان ہوگا۔ اگر تم ہماری باتیں مان لو تو تمھارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔تم مقنا والوں کو ان کے علاقوں تک پہنچنے کے لیے ضروریات فراہم کر دو۔'' (الطبقات الكبرىٰ: 280/1، ومعجم ما استعجم: 217/1، ومعجم البلدان: 292/1، مقنا: سعودی عرب کے شمال مغرب میں خلیج عقبہ کے ساحل پر واقع ایک بستی ہے۔)

رسول اللہ ﷺ کے اس نامۂ مبارک میں ایلہ والوں کے لیے واضح طور پر امان کا اعلان تھا بشرطیکہ وہ اسلام قبول کر لیں، بصورت دیگر ان کے ملک اور ان کی بری و بحری تجارت کے خاتمے کی علانیہ دھمکی دی گئی۔ چونکہ ان کا شہر یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے بحری جہازوں اور شام کی طرف سے آنے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا، اس لیے یحنہ (یوحنا) آئندہ پیش آنے والے ممکنہ حالات و واقعات سے خوف زدہ ہو کر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے تبوک پہنچا۔ شام اور یمن وغیرہ کے بحری و بری تاجروں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے ہمراہ تھی۔ ملاقات کے وقت یحنہ (یوحنا) عیسائیوں کا مخصوص مذہبی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا جس پر سونے سے بنی ہوئی صلیبیں جڑی ہوئی تھیں۔ (الطبقات الكبرى: 290/1، والمغازي للواقدي: 1031/3)

یحنہ (یوحنا) جب اپنے وفد کے ہمراہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے ہمراہ آگے جا کر اس کا شایانِ شان استقبال کیا۔ اس کے ساتھ معاہدہ طے کیا جس میں خاص طور پر بحری جہازوں کے بارے میں طے پایا

کہ مسلمان ان تجارتی جہازوں کے درپے نہیں ہوں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قافلوں کی آمد و رفت، بحری تجارت کی اہمیت اور ان کی حفاظت سے کس قدر آگاہ تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی خط کتابت کا یہ طویل سلسلہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ادائے رسالت کی ذمہ داری کے حد درجہ حریص تھے اور آپ نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سلامتی کے ساتھ اور بہتر انداز سے دوسروں کو دین کی دعوت دینا، دعوتِ اسلام کی اساس ہے، لہٰذا بعض لوگ جو یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ان خطوط سے یہ بھی واضح ہوا کہ آپ کے ان خطوط کی بدولت عیسائیوں کے معززین اور ذمہ داران نے بالعموم اور ہرقل نے بالخصوص رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ اسلام کو اہمیت دی، آپ کی نبوت کا اقرار کیا اور صداقت کی گواہی دی۔ انھیں یقین کامل تھا کہ دینِ اسلام ان کے علاقوں، ان کی سرزمین اور ان کے مذاہب پر غالب آ کر رہے گا، پھر یہ سب کچھ ان کی زندگی میں حقیقت بن کر سامنے آیا اور انھوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا۔

نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اگرچہ دنیوی اسباب بہت تھوڑے تھے اور مادی طور پر بھی آپ کی امت بظاہر حد درجہ کمزور تھی لیکن اس کے باوجود آپ کو کامل یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت فرما کر اسے دنیا میں غالب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ساتھ دین کے غلبے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا ہو کر رہا۔

یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی تھی کہ آپ نے اپنے یہ خطوط ایسے باصلاحیت افراد کے ذریعے سے بھجوائے جو ان خطوط کے مقاصد کی تکمیل اور مطلوبہ افراد تک ان کو پہنچانے اور حسب موقع ان سے گفتگو کرنے کی خوب صلاحیت رکھتے تھے۔ نیز آپ کے یہ قاصد ان حکمرانوں کے مزاج، ان کے معاشرتی احوال اور مذہبی رجحانات سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شجاعت و بہادری اور صبر و حکمت کی خصوصیتوں سے بھی متصف تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے بھیجے ہوئے ان خطوط میں اختصار کے باوصف اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا اور خطوط لکھے جانے کے بنیادی مقاصد و اہداف کو صراحت کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے۔

نیز آپ ﷺ نے اپنے ان خطوط میں ایسی قرآنی آیات کو بطور استشہاد (دلیل) ذکر کیا جن میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو روئے زمین کے سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور عام لوگوں کو مخاطب کیا ہے۔

آپ ﷺ نے عیسائی حکمرانوں اور معززین کے نام جو خطوط لکھے، ان کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کی اور اکیلے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت پر زور دیا۔ نیز یہ بات بھی معروف تھی کہ بادشاہوں کے ہاں مہر کے بغیر کسی خط کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس مقصد کی خاطر ایک خاص قسم کی مہر بنوائی۔ اس پر جو عبارت کندہ کرائی وہ اس انداز سے لکھی گئی تھی:

اللہ

رسول

محمد

اس میں اللہ رب العزت کے نام کا ادب کامل طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے اسے سب سے اوپر لکھا گیا ہے۔ دوسری سطر میں آپ نے اپنے منصب کا ذکر کیا اور اپنا نام سب سے نیچے لکھوایا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب نبیٔ کریم ﷺ نے رومی حکمرانوں کے نام خطوط بھجوانے کا ارادہ کیا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ جو خطوط مہر کے بغیر ہوں، وہ ایسے خطوط کو اہمیت نہیں دیتے اور انھیں پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تو آپ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی اور اس پر ''محمد رسول اللہ'' کی عبارت کندہ کروائی۔

(صحيح البخاري، حديث: 2938)

آپ کے ان بابرکت خطوط کی بدولت دعوتِ اسلام بلادِ عرب سے باہر متعدد غیر عرب (عجمی) اقوام وملل تک پہنچی۔

ان نبوی خطوط اور ان کے مندرجات سے ممالک کے مابین روابط کے اصولوں سے آگاہی بھی ہوتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت آفاقی ہے۔ یوں آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں اسلامی حکومت کے دوسری حکومتوں کے ساتھ روابط کے سلسلے کا آغاز ہو گیا تھا۔

قبطیوں کے فرماں روا مقوقس، بحرین کے حاکم منذر بن ساوی، حبشہ کے والی نجاشی، کسریٰ اور قیصر روم کے نام رسول اللہ ﷺ نے خود خطوط لکھوائے تھے۔ ان میں سے بعض خطوط اصل حالت میں دستیاب ہو چکے ہیں جو چمڑے پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان اصل خطوط کی تحقیق کے بعد مذکورہ بالا اصول وضوابط کی نشاندہی ہوتی ہے۔ (السيرة النبوية للندوی، ص: 292، والوثائق السياسية للعهد النبوی والخلافة الراشدة، ص: 11، ورسائل النبی ﷺ إلى الملوك والأمراء، ص: 18، 30، 44، 55، 62)

رسول اللہ ﷺ کے یہ خطوط اور ان سے اخذ ہونے والے اصولوں اور تعلیمات کے حوالے سے بعض عالمی عجائب گھروں اور تاریخی اہمیت کی حامل لائبریریوں میں مستشرقین نے جو بعض تحقیقات کی ہیں، ان کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس حوالے سے آئندہ تحقیق کرنے والوں کو آگے بڑھنے میں آسانی رہے۔

ہم نے اس سے قبل جس قدر نبوی خطوط کا تذکرہ کیا ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سے خطوط ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ نے بعض امراء اور بادشاہوں کے نام ارسال فرمائے۔ ممکن ہے کہ ان کی اہمیت، ہمارے ذکر کردہ خطوط سے قدرے کم ہو۔ ان کے علاوہ نبی ﷺ نے بعض قبائل کے نام بھی خطوط لکھے، ان سب کے حوالے سے گفتگو کرنا اور کچھ تحریر کرنا خاصا محنت طلب کام ہے۔

نبیٔ مکرم ﷺ کے ان خطوط پر واضح علمی انداز میں بعض شاندار تحقیقات منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ (مرويات الوثائق المكتوبة من النبی ﷺ جمعاً و دراسةً، یہ کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین مدینہ منورہ کے شعبہ تاریخ میں ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا گیا ایک اہم علمی مقالہ ہے۔)

بلاشبہ سیرت نبوی کے واقعات اور احوال وحوادث کا خلفائے راشدین کے عہد خلافت اور ان کے ادوار میں ہونے والی فتوحات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ کے ماہرین اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مختلف علاقوں میں، اسلام کی نشر واشاعت، اس کے بعد سے آج تک وہاں اسلام کی موجودگی اور رسول اکرم ﷺ کی اتباع کے جذبے کا تصور اور وجود، اس بات کی دلیل ہے کہ ان خطوط نے بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔

فتح خیبر ربیع الاول 7 ہجری

خیبر (حجاز سے شمال کی جانب ایک وسیع وعریض زرعی علاقہ ہے۔ یہاں آج کل خیبر کے نام سے ایک نیا شہر آباد ہے۔

دور نبوی میں یہاں یہود کے سات قلعے تھے: معجم البلدان: 409/2، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ خیبر میں یہود کے آٹھ بڑے قلعے تھے: حصن ناعم، حصن صعب بن معاذ، حصن زبير، حصن أبي، حصن نزار، حصن قموص، حصن وطيح، حصن سلالم (الرحيق المختوم (اردو)، ص: 598)) کے جن یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کینہ و عداوت کے پیش نظر قریش اور دیگر قبائل کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی تھی، وہ خود بھی مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں بعض قبائل کے ساتھ رابطے کیے۔ وہ بنو غطفان کے ساتھ باقاعدہ ایک معاہدہ طے کر چکے تھے، نیز وہ خیبر، وادیٔ قریٰ، تیماء اور گردونواح کے یہودیوں کو ساتھ ملا کر مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 191/3، 273، 330، والمغازي للواقدي: 531، وسبل الهدىٰ والرشاد: 181/4، 461)

صلح حدیبیہ سے واپسی پر مسلمانوں کو یہود کے ان ناپاک ارادوں اور خوف ناک عزائم کی مستند اور باوثوق ذرائع سے اطلاعات موصول ہوئیں۔ نبیٔ کریم ﷺ کی حکمتِ عملی تھی کہ آپ اپنے ذرائع سے دشمن کے ارادوں سے مکمل طور پر باخبر رہتے تھے۔

خیبر کا علاقہ مسلمانوں کے نئے مخالفین کا مرکز بن رہا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں۔

جنگی تیاری کے ساتھ ساتھ خیبر کے یہودی یہ پروپیگنڈہ بھی کر رہے تھے کہ مدینہ منورہ اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے وہ دس ہزار کے قریب جنگجو نوجوانوں کو جمع کر چکے ہیں اور ان کے انتہائی محفوظ قلعے بھی ہیں۔ یوں وہ مدینہ منورہ میں جو یہودی باقی رہ گئے تھے ان کی وساطت سے اور منافقوں کے ذریعے سے بالواسطہ اور بلاواسطہ مسلمانوں کو ڈراتے دھمکاتے اور خوف زدہ کرتے رہتے تھے۔

(المغازي للواقدي: 634، وسبل الهدىٰ والرشاد: 181/5)

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں مسلمان اور قریش مکہ اس امر پر اتفاق کر چکے تھے کہ آیندہ دس سال تک ان میں سے کوئی بھی فریق دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس حوالے سے مسلمان قریش کی طرف سے کسی قسم کی فتنہ انگیزی سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اب موقع تھا کہ یہود کے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے سے پہلے خود مسلمان آگے

بڑھ کر پیش قدمی کرتے ہوئے خیبر میں یہودیوں اور ان کے اتحادیوں کی سرکوبی کریں۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان چودہ سو افراد پر مشتمل ایک فوجی لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ: 107/2)

جب مسلمانوں اور اللہ والوں کا یہ فوجی لشکر مدینہ منورہ سے خیبر روانہ ہوا تو نجد کے بنوغطفان یہودِ خیبر کی حمایت میں مسلمانوں کو روکنے اور ان سے لڑائی کے لیے نکلے۔ مسلمانوں نے ایک جنگی چال چلتے ہوئے مشہور کر دیا کہ مسلمان نجد کی طرف بنوغطفان کے باقی ماندہ لوگوں پر حملہ کرنے کے لیے ان کے علاقوں کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ بنوغطفان نے ان اطلاعات کو درست سمجھا اور وہ یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنے علاقے میں واپس آ گئے۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام:3/330، والمغازي للواقدی: 650/2، والسیرۃ الصحیحۃ للعمری، ص:501)

اور عین اسی وقت رسول اللہ ﷺ شام کی جانب سے خیبر جا نکلے۔ (سبل الھدیٰ والرشاد: 184/5)

یہ آپ ﷺ کی ایک جنگی چال تھی، اس لیے آپ نے ایک ایسی جگہ پر پڑاؤ ڈالا جو خیبر اور دیارِ غطفان کے درمیان تھی تاکہ یہ احتمال بھی ہو کہ آپ کا بنوغطفان پر حملہ کرنے کا پروگرام ہے اور یہ بھی محسوس ہو کہ آپ حجاز کے شمال میں آباد یہودیوں پر حملہ کرنے کے لیے میدانِ کارزار کا رخ کرنے والے ہیں یا خیبر کے یہودیوں کے اتحادیوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یوں مسلمانوں کے اس لشکر نے رات کے وقت اچانک خیبر کے قریب پہنچ کر پوزیشن سنبھال لی لیکن دشمن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام:3/330، والمغازي للواقدی: 643)

صبح ہونے پر یہودی اپنے قلعوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے کے لیے باہر آئے تو اچانک مسلمانوں کا لشکر سامنے تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر اپنے قلعوں کی طرف پلٹ گئے۔ اور دہشت کے مارے ایک دوسرے سے ذکر کرتے کہ محمد (ﷺ) تو لشکر لے کر ہمارے سروں پر آ پہنچے، اب کیا ہوگا! اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: «خَرِبَتْ خَيْبَرُ إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ»

”خیبر تباہ ہو گیا۔ ہم جب کسی قوم کے میدان میں جا اترتے ہیں تو ڈرائے ہوئے لوگوں کی صبح بہت

بری ہوتی ہے۔‘‘(صحيح البخاري، حديث: 4197، 4200)

خیبر ایک وسیع وعریض علاقہ ہے۔ وہاں یہودیوں کے چھوٹے بڑے بہت سے قلعے تھے۔ مسلمانوں نے لشکر کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ان تمام قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ ان کے درمیان تیراندازی ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان زخمی اور شہید بھی ہوئے۔

(السيرة النبوية لابن هشام:3/334، والمغازي للواقدي: 2/643، وسبل الهدىٰ والرشاد: 5/186)

مسلمانوں نے جن قلعوں کا محاصرہ کیا تھا، رسول اللہ ﷺ ان کی صورت حال سے بخوبی آگاہ تھے۔

ایک قلعے کا نام ’’حصن النطاۃ‘‘ تھا۔ یہود کی طرف سے اس کی حفاظت کے لیے بہت تھوڑی نفری متعین تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ اس قلعے میں اسلحہ اور دیگر بہت سا ساز و سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔ اس میں ایک منجنیق اور ایک دبابہ (توپ کی ایک قسم) بھی ہے۔ اگر مسلمان اس قلعے کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ آلات اور سامانِ حرب باقی قلعوں کو فتح کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا، اس لیے مسلمانوں نے اپنی تمام تر توجہ اور کوشش اس قلعے کو فتح کرنے کی طرف مبذول رکھی اور بالآخر اللہ کے فضل سے وہ اسے فتح کرنے میں کامیاب رہے۔

مسلمانوں نے جو قلعے فتح کیے، ان میں حصن ناعم اور حصن صعب بھی تھے۔ وہاں سے خاصی مقدار میں غذائی مواد اور اسلحہ ان کے ہاتھ لگا جو دشمن کے مقابلے میں کام آیا۔ اس قلعے سے حاصل ہونے والا اسلحہ اور سامانِ حرب باقی قلعوں پر حملہ کرنے اور انھیں فتح کرنے میں استعمال ہوا۔(المغازي للواقدي: 2/647)

البتہ ایک قلعہ جس کا نام ’’حصن القموص‘‘ تھا، اسے فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو خاصی تگ و دو کرنا پڑی۔ یہی وہ قلعہ ہے جس کو فتح کرنے کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے دی تھی۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن فرمایا تھا:

«لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ»

’’کل میں یہ پرچم ایک ایسے شخص کو دوں گا، جس کے ہاتھوں پر اللہ خیبر فتح کرائے گا، وہ اللہ تعالیٰ اور

اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔''

چنانچہ صحابہ کرام ساری رات یہی قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ کل پرچم کس کو دیا جائے گا؟ صبح ہوئی تو تمام صحابہ کرام آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ پرچم اسے دیا جائے، تب رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ بتایا گیا کہ ان کی آنکھیں دکھتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انھیں بلاؤ۔ ان کو لایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب مبارک لگایا اور دعا فرمائی، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ مکمل طور پر ایسے شفا یاب ہوگئے گویا انھیں کچھ بھی تکلیف نہ تھی۔ آپ ﷺ نے پرچم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو تھماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تیار ہو کر ابھی روانہ ہو جاؤ اور سیدھے ان کے میدان میں جا اترو۔ سب سے پہلے انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اور اللہ تعالیٰ کے جو حقوق اسلام میں ان پر عائد ہوتے ہیں، وہ انھیں بتلانا۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ تمھاری بدولت ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمھارے حق میں (انتہائی قیمتی سامان) سرخ اونٹوں سے کہیں بہتر ہے۔''

(صحيح البخاري، حديث:3701، وصحيح مسلم، حديث: 2406)

رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ اس کے بعد خیبر کے باقی قلعے بھی ایک ایک کر کے فتح ہوتے چلے گئے۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے یہودی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصالحت کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان کو جان کی امان دے دی جائے تو وہ خیبر سے نقل مکانی کر کے کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ (فتح الباري: 57/16)

مذکورہ بالا شرطوں پر صلح ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے یہودیوں کے ساتھ طے کیا کہ وہ فی الحال یہیں اقامت رکھیں اور کھجور کے باغات اور دیگر زرعی اراضی کو کاشت کرتے رہیں۔ ساری فصل کا نصف حصہ مسلمانوں کا اور نصف حصہ یہودیوں کا ہوگا، البتہ مسلمان جب چاہیں انھیں یہاں سے نکل جانے کا حکم دے سکتے ہیں۔

(السيرة النبوية لابن هشام:3/337، المغازي للواقدی: 690/2، وفتح الباري: 57/16)

غزوۂ خیبر میں بیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔ 93 یہودی جنگ میں کام آئے۔ اہل خیبر (یہودیوں) کا محاصرہ اور ان کے ساتھ لڑائی تقریباً دس بارہ دن جاری رہی۔

خیبر کے یہودی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصالحت کر چکے تھے، اس کے باوجود ایک بدفطرت یہودی عورت نے رسول اللہ ﷺ کو زہر دے کر شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بکری کا بھنا ہوا زہر ملا گوشت بطور ہدیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ (فتح الباري: 261/12، والسيرة النبوية لابن هشام:337/3، والمغازي للواقدي: 677/2، وسبل الهدىٰ والرشاد: 208/5)

روایات کے مطابق اس واقعہ کے چند سال بعد جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو اس کا ایک سبب یہی زہر تھا۔ ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ جن دنوں مرض الموت میں تھے تو ام بشر بنت براء بن معرور رضی اللہ عنہا آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ام بشر! میں نے خیبر میں تمھارے بھائی (بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ) کے ہمراہ جو زہر آلود گوشت کھایا تھا، اس کے اثر کی وجہ سے مجھے اپنے حلق کی رگیں کٹتی محسوس ہو رہی ہیں۔''

اسی لیے اہل اسلام یہ رائے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جہاں مقامِ نبوت سے سرفراز فرمایا، وہاں آپ کو شہادت کی موت بھی عطا فرمائی۔ (السيرة النبوية لابن هشام:338/3)

فتح خیبر کے بعد مسلمانوں نے کچھ مزید پروگرام ترتیب دیے۔ رسول اللہ ﷺ اور باقی مجاہدین نے ''وادی القریٰ'' کا رخ کیا۔ مسلمان وہاں پہنچے تو یہود نے تیروں سے ان کا استقبال کیا۔ ان کی تیراندازی کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کا ایک خادم مارا گیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کا نام ''مدعم'' تھا۔ بنو ضباب کے ایک آدمی نے یہ غلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ ارسال کیا تھا۔ جنگ کے دوران یہ غلام رسول اللہ ﷺ کا پالان درست کر رہا تھا کہ دشمن کی طرف سے ایک تیر اس کو آ لگا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ صحابہ کرام نے یہ دیکھ کر خوشی سے کہا: اسے مبارک ہو، اسے شہادت نصیب ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلکہ ایسا ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! خیبر کے دن مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس نے جو چادر چرا لی تھی، وہ اس پر آگ کا شعلہ بن کر بھڑک رہی ہے۔'' (صحيح البخاري، حديث: 4234، 6707)

مسلمانوں کی وادی القریٰ والوں سے جنگ ہوئی اور اللہ کے فضل سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ رسول

اللہ ﷺ نے خیبر والوں کے ساتھ جو معاملہ طے کیا تھا، وہی ان کے ساتھ بھی طے کر لیا کہ وہ لوگ فی الحال یہیں آباد رہیں، زراعت کریں اور اس کا نصف حصہ خود رکھیں اور نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کرتے رہیں۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 338/3، والمغازي للواقدی: 709/2، وسبل الهدیٰ والرشاد: 229/5)

خیبر اور وادی القریٰ میں پیش آنے والے واقعات وغزوات کی اطلاعات جب حجاز کے شمال میں واقع دیگر علاقوں تک پہنچیں تو فدک، تیماء اور اَیلہ وغیرہ کے لوگوں نے نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ مصالحت کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 353/3، والمغازي للواقدی: 706/2، وسبل الهدیٰ والرشاد: 214/5، اَیلَہ: یہ خلیج عقبہ کے ساحل پر فلسطین کی ایک بندرگاہ ہے۔ اسے آج کل ''اَیلات'' کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان: 292/1)۔ فدک: یہ مدینہ منورہ کے قریب خیبر سے دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اسے آج کل ''الحویط'' کہا جاتا ہے۔ یہ صوبہ ''حائل'' میں واقع ہے۔ (معجم استعجم للبکری: 10/3، 15)

عمرۃ القضاء

اسے ''**عمرۃ الصلح**'' بھی کہا جاتا ہے۔ (امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں ''عمرۃ القضا'' کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔)

قریش مکہ کے ساتھ ہونے والی صلح حدیبیہ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ اس سال عمرہ کیے بغیر واپس تشریف لے جائیں اور آیندہ سال آ کر عمرہ ادا کریں۔ ہم آپ کی خاطر مکہ مکرمہ خالی کر دیں گے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو تین دن تک مکہ مکرمہ میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ آپ بڑے جنگی آلات اور سامان حرب ساتھ نہیں لائیں گے، البتہ ایک عام سوار والا ہتھیار، یعنی صرف تلواریں رکھیں گے اور وہ بھی نیاموں میں اور ان کی نمائش نہیں کریں گے۔

اس سے قبل غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر مدینہ منورہ سے روانہ ہوتے وقت رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب کی بنا پر صحابۂ کرام سے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ اس خواب کا تذکرہ قرآن کریم کی ان آیات میں ہوا ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾

''بلاشبہ یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ اگر اللہ نے چاہا تو تم حالتِ امن میں اپنے سر منڈاتے اور بال کتر واتے ہوئے مسجدِ حرام میں ضرور بالضرور داخل ہوگے، تم (کسی سے) نہ ڈرتے ہوگے، پس اللہ وہ بات جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے تو اس نے اس سے پہلے ایک فتح جلد ہی عطا کر دی۔'' (الفتح 27:48)

یعنی یہ سب کچھ اللہ کے علم اور مشیت میں تھا۔ اس نے عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ جانے سے پہلے پہلے تمھیں فتح خیبر سے نوازا دیا۔

صلح حدیبیہ کو ایک سال پورا ہونے پر شعبان 7 ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جو لوگ حدیبیہ کے موقع پر آپ کے ساتھ تھے، وہ سب لوگ عمرے کی تیاری کریں ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہے۔ اس دوران جو لوگ وفات پا گئے یا شہید ہو چکے تھے، ان کو چھوڑ کر باقی سب لوگ عمرے کے لیے روانہ ہوئے بلکہ ان کے علاوہ کچھ مزید لوگ بھی تیار ہو گئے۔ اس طرح ان کی تعداد دو ہزار ہو گئی۔ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے۔

صلح میں طے شدہ شق کے مطابق آپ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے معمولی ہتھیار، یعنی صرف تلواریں ساتھ لیں۔ آپ نے اور صحابہ کرام نے قربانی کے جانور ہمراہ لیے اور ذوالحلیفہ پہنچ کر احرام باندھا۔

قریش کی طرف سے کسی بدعہدی کے اندیشے کے پیش نظر آپ نے بطور احتیاط دو سو گھڑ سواروں کو بھی ساتھ لیا لیکن آپ نے کسی بھی قسم کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا جس سے یہ شک گزرے کہ آپ لڑائی کے ارادے سے روانہ ہوئے ہیں۔ آپ کا سفر مکمل طور پر پُرامن، پُرسکون اور صلح و آشتی کا مظہر تھا۔ ہر آدمی احرام میں ملبوس، تلبیہ اور تکبیر کے ترانے الاپ رہا تھا۔ (السيرة النبوية لابن هشام:3/370)

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں گھڑ سواروں کو اپنے آگے ''مرالظہران'' کی طرف روانہ کر دیا۔ قریش نے جب ان لوگوں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ اللہ کے رسول ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے مرالظہران پہنچ کر اپنے باقی ہتھیار تنعیم کے قریب ایک وادی میں رکھ دیے۔ (تنعیم مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ایک معروف وادی ہے۔ یہاں پر مشہور مسجد ''مسجد عائشہ'' ہے۔ مکہ مکرمہ کے لوگ یہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کے لیے جاتے ہیں۔ (معجم الأماكن الواردة في السيرة، ص: 65))

معاہدے کے مطابق قریش نے مسلمانوں کے لیے مکہ خالی کر دیا اور خود مسلمانوں کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے لیے بیت اللہ کے اردگرد پہاڑوں (شمال کی طرف جبل قعیقعان) پر جا بیٹھے۔ مسلمان بڑے ہی ادب و احترام کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ان کے انداز سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ وہ آپ ﷺ کا کس قدر ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی مہار تھامے (اپنے گلے

میں تلوار حمائل کیے ہوئے) آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ انتہائی وقار کے ساتھ اور جوش و جذبے کے انداز میں درج ذیل اشعار پڑھتے جاتے تھے:

خَلُّوا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيلِهِ خَلُّوا فَكُلُّ الْخَيْرِ فِي رَسُولِهِ
يَا رَبِّ إِنِّي مُؤْمِنٌ بِقِيلِهِ أَعْرِفُ حَقَّ اللهِ فِي قَبُولِهِ
نَحْنُ قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَأْوِيلِهِ كَمَا قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَنْزِيلِهِ
ضَرْباً يُزِيلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيلِهِ وَيُذْهِلُ الْخَلِيلَ عَنْ خَلِيلِهِ

''ارے کافروں کے بیٹو! رسول اللہ ﷺ کا راستہ چھوڑ دو۔ ان کا راستہ چھوڑ دو کہ ساری بھلائی اللہ کے رسول میں ہے۔ اے میرے پروردگار! میں ان کی ہر ہر بات پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور اسے قبول کرنے میں اللہ کے حق کو جانتا ہوں۔ آج ہم آپ ﷺ کے حکم کے مطابق تمھیں ماریں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہم نے تمھیں ضرب لگائی تھی۔ ایسی کاری ضرب لگائیں گے کہ سر تن سے جدا ہو جائیں گے اور دوست دوست کو بھول جائے گا۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 371/3)

قریش میں یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ مدینہ منورہ کی آب و ہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی اور وہ حد درجہ کمزور ہو چکے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ایسا انداز اختیار کیا کہ وہ جان لیں کہ میں خود اور میرے اصحاب صحت مند، تندرست اور خوب طاقتور ہیں، لہٰذا ان پر رعب اور ہیبت طاری ہو جائے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ قریش مکہ دارالندوہ کے پاس جمع ہو گئے تا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابۂ کرام کو عمرہ کرتے ہوئے بچشم خود ملاحظہ کرتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب مسجد حرام میں پہنچے تو آپ نے اپنی احرام والی اوپر کی چادر کو دائیں کندھے کے نیچے سے گزار کر دایاں کندھا ننگا کر لیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: اللہ کی رحمت ہو ہر اس آدمی پر جو آج دشمن کے سامنے اپنی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرے۔

پھر آپ نے حجر اسود کا استلام کیا، یعنی اسے بوسہ دیا، پھر آگے بڑھ کر ہلکی رفتار سے دوڑتے ہوئے طواف کا آغاز کیا۔ رکن یمانی کے پاس پہنچ کر اس کا استلام کیا (اسے صرف ہاتھ لگایا، بوسہ نہیں دیا۔) اس سے آگے

جب آپ بیت اللہ کی اوٹ میں کفار کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تو عام انداز اور رفتار سے چلتے ہوئے حجر اسود تک گئے اور اسے بوسہ دیا۔ آپ نے طواف کے پہلے تین چکر اسی انداز سے مکمل کیے۔ (طوافِ قدوم میں دایاں کندھا ننگا رکھنے کو ''اضطباع'' اور ہلکی رفتار سے دوڑنے کو ''رمل'' کہا جاتا ہے۔ رمل صرف پہلے تین چکروں میں کیا جاتا ہے۔ بعد کے چار چکروں میں اس کی ضرورت نہیں۔) لہٰذا باقی چار چکر عام رفتار سے چلتے ہوئے مکمل کیے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمل ایک وقتی ضرورت اور مصلحت کے تحت کیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جب حجۃ الوداع کیا تب بھی آپ نے اس کا التزام کیا تھا، لہٰذا یہ سنت اب بھی جاری ہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام:3/371)

عمرہ ادا کر لینے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ آپ مکہ مکرمہ میں تین دن گزار چکے تو حویطب بن عبدالعزیٰ بعض سردارانِ مکہ کے ہمراہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: حدیبیہ میں ہونے والے معاہدے کے مطابق آپ کو مکہ میں تین دن رہنے کا حق دیا گیا تھا۔ آج تین دن پورے ہو چکے ہیں، لہٰذا آپ وعدہ وفا کرتے ہوئے مکہ مکرمہ سے تشریف لے جائیں۔

آپ نے فرمایا: ''اس میں کوئی حرج تو نہیں کہ میں شادی کے امور یہیں نبٹا لوں اور ولیمہ بھی یہیں کر لوں تاکہ آپ لوگ بھی دعوتِ ولیمہ میں شریک ہو جائیں۔'' وہ لوگ کہنے لگے: ہمیں آپ کے کھانے اور دعوت کی ضرورت نہیں۔ آپ بس واپس تشریف لے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے غلام ابورافع رضی اللہ عنہ کو مکہ میں چھوڑا تاکہ وہ بعد میں سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر ''سرف'' میں آ جائیں، چنانچہ وہاں پر سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد آپ عازمِ مدینہ منورہ ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے لگے تو آپ کے چچا محترم سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی بھی آپ کو چچا چچا پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے آ گئی۔ وہ ایک یتیم بچی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اسے لے کر سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اسے سنبھالو، یہ تمھارے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے۔ اسے ساتھ لے جانا۔

بعدازاں سیدنا جعفر بن ابی طالب اور سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما نے بھی پوری کوشش کے ساتھ یہ مقدمہ دائر کیا کہ اس بچی کی تربیت و پرورش ان کا حق ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ یہ بچی اسی کے سپرد کی جائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تو معاملہ فیصلے کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔ تینوں افراد میں سے ہر ایک اس بچی کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کے جذبے سے اس کی تربیت اور پرورش و پرداخت کا خواہش مند تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں کر دیا کیونکہ اس بچی کی خالہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ نیز آپ نے فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا:

«اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ» ''خالہ ماں کی مانند ہوتی ہے۔''(صحيح البخاري، حديث: 4251)

آپ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے کہ خالہ کی شفقت و محبت، ماں کی شفقت و محبت کی مانند ہی ہوتی ہے، لہٰذا یہ چھوٹی بچی دوسروں کی نسبت اپنی خالہ کے ہاں زیادہ راحت سے اور پرامن رہے گی۔

غزوۂ مؤتہ (جمادی الاولیٰ 8 ہجری)

فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے متعدد بادشاہوں اور بہت سے حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط سرزمین شام میں بُصریٰ کے حاکم حارث بن ابی شمر غسانی کے نام بھی تھا جو شاہِ روم ہرقل کی طرف سے وہاں کا حاکم تھا۔ آپ نے یہ خط سیدنا حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کیا تاکہ وہ اسے حاکم بصریٰ تک پہنچائیں لیکن ہوا یہ کہ شام کے ایک حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے رسول اللہ ﷺ کے سفیر سیدنا حارث رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا اور جب اسے پتہ چلا کہ اس کے پاس نبی ﷺ کا خط ہے تو اس ظالم نے انھیں انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا۔ جبکہ اس وقت بھی یہ قانون رائج تھا کہ کسی کے سفیر کو قتل نہیں کیا جا سکتا اور سفیر کو قتل کرنا اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ (المغازي للواقدي: 576,575/2، والطبقات الكبرىٰ: 128/2)

نبی کریم ﷺ کو جب ان کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ شدید غضب ناک ہوئے اور تین ہزار افراد پر مشتمل ایک دستہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے تیار فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس دستے کا امیر اپنے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو ان کے بعد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اس دستے کے امیر ہوں گے۔

(صحيح البخاري، حديث: 4261، والسيرة النبوية لابن هشام:373/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 367)

اور اگر عبداللہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان باہمی مشاورت سے جسے چاہیں اپنا امیر منتخب کر لیں۔

(المغازي للواقدي: 756/2، والطبقات الكبرىٰ: 128/2)

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ وہ بھی اس لشکر میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کو شام کے نواح کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں پہنچ کر یہ

عرب عیسائی قبائل کو ان کے جرم کا مزہ چکھائیں اور انھیں ایسا مرعوب کریں کہ ان میں سے کسی کو آئندہ ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو۔ نیز یہ ثابت کر دیں کہ مسلمان کمزور قوم نہیں ہیں۔ یوں مشن کی تکمیل کے بعد یہ لوگ مدینے لوٹ آئیں۔

لشکر کی مدینے سے روانگی سے قبل رسول اللہ ﷺ نے جا کر ان لوگوں سے ملاقات کی۔ انھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور انھیں لڑائی کے سلسلے میں دین اسلام کی ہدایات اور اصولوں سے آگاہ فرمایا اور لشکر کی سربراہی کا جھنڈا سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھما کر انھیں الوداع کرتے ہوئے روانہ کیا۔

(السيرة النبوية لابن هشام:3/373، والمغازي للواقدی: 2/756، والطبقات الكبرىٰ: 16/128)

یہ قدوسی لشکر اللہ کا نام لے کر شام کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ پہلا اسلامی لشکر تھا جو اس دور کی سپر پاور روم کے مقابلے کے لیے انھی کے علاقے کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

رومی اور غسانی حکمرانوں کو جب اسلامی لشکر کی روانگی کا پتہ چلا تو انھوں نے بھی ان کے مقابلے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر ترتیب دیا جس میں لخم، بہراء، جذام اور بلیّ قبائل کے وہ عرب لوگ شامل تھے جو عیسائی ہو چکے تھے۔ دشمن کا لشکر ایک لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ وہ لشکر موجودہ اُردن کے علاقے بلقاء میں آ کر خیمہ زن ہوا۔

مسلمانوں کو اس قدر بڑے لشکر کی خبر ملی تو انھوں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے تاکہ آپ مزید مجاہدین کی صورت میں کمک بھیج دیں۔ (السيرة النبوية لابن هشام:3/375، والمغازي للواقدی: 2/760) لیکن وقت انتہائی محدود اور دشمن از حد قریب آ چکا تھا۔ وہ مسلمانوں کو تیاری کی مہلت دینے کو تیار نہ تھا۔ ان حالات میں مسلمان شیر جوان ایک دوسرے کو حوصلہ دلاتے اور ایک دوسرے کی ہمت بڑھانے لگے اور بالآخر مؤتہ کے مقام پر اس قدوسی لشکر کا شیطانی لشکر سے مقابلہ شروع ہوا۔

مسلمانوں نے شیر دل بہادر جوانوں کی طرح ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ لشکر کی سربراہی و سرکردگی کا پرچم تھامے ہوئے تھے۔ دشمن سے لڑتے لڑتے انھوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اور وصیت کے مطابق ان کے بعد پرچم سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے تھام لیا۔ انھوں نے بھی بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان

کی شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اور وصیت کے مطابق سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا تھام لیا۔ وہ بھی لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش فرما کر خلعتِ شہادت زیب تن کر کے اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔(صحيح البخاري، حديث: 4262)

ان کے بعد ایک انصاری نے جھنڈا اٹھا لیا اور لوگوں کو ایک جگہ جمع کر کے پرچم سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔(السيرة النبوية لابن هشام:379/3)

وہ ایک ماہر جنگجو تھے اور انھیں دشمن سے لڑائی کرنے اور جنگ لڑنے کا طویل تجربہ تھا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور اپنی جنگی مہارت کی روشنی میں ادھر ادھر منتشر مسلمانوں کو یک جا کر کے جنگ میں ان کی قیادت کی اور انتہائی مضبوط حکمت عملی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو جنگ کے احوال سے باخبر کرتے ہوئے فرمایا: ''زید، جعفر اور ابن رواحہ کی شہادت کے بعد جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ) نے سنبھال لیا۔ اور مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح و کامرانی سے ہمکنار کر دیا۔''(صحيح البخاري، المغازی، حديث: 4262)

ان کی حکمت عملی کے نتیجے میں مسلمانوں کا لشکر مزید کسی جانی نقصان سے محفوظ رہا۔ اگرچہ مسلمانوں کے مقابلے میں دشمن کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی، اس کے باوجود مسلمانوں میں سے صرف پندرہ آدمی شہید ہوئے۔
(السيرة النبوية لابن هشام، حديث: 388/3، والمغازي للواقدی: 769/2)

اس قدر بڑے لشکر کے مقابلے میں قلیل ترین افراد کا میدان میں ڈٹ جانا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد کا ایک مظہر تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان شہداء کی مدح سرائی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

«مَا يَسُرُّنِي. أَوْ قَالَ. مَا يَسُرُّهُمْ أَنَّهُمْ عِنْدَنَا»

''میرے لیے یا ان کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں کہ وہ ہمارے پاس زندہ ہوتے (کیونکہ شہادت کے بعد وہ جنت میں عیش کر رہے ہیں۔)''(صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث:3063)

اس کے بعد یہ اسلامی لشکر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ الملقب بہ سیف اللہ کی قیادت میں مدینہ منورہ واپس

آ گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا یہ پہلا جہادی معرکہ تھا جس میں انھوں نے شرکت کر کے بہادری کے جوہر دکھائے۔

اس لشکر کی مدینہ منورہ میں آمد سے پہلے ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کو لشکر کے ساتھ پیش آمدہ احوال سے مطلع کر دیا تھا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مدینہ والوں تک لشکر کے تفصیلی احوال واخبار آنے سے پہلے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سیدنا زید، سیدنا جعفر اور سیدنا ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دے دی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے لشکر کی قیادت کا پرچم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے سنبھالا۔ وہ شہید ہو گئے تو ان کے بعد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جھنڈا ہاتھ میں لے کر لشکر کی قیادت کی۔ ان کی شہادت کے بعد سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھال لیا اور وہ بھی مرتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ یہ بات بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس کے بعد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے جھنڈا تھام لیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھوں مسلمانوں کو دشمن پر فتح اور غلبہ عطا فرمایا۔ (صحيح البخاري، المغازی، حديث: 4262)

غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کے قدرے جانی نقصان کے باوجود یہ مسلمانوں کی فتح ہی تھی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فتح سے موسوم فرمایا۔ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگوں کی شہادت پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ازحد دل گرفتہ ہوئے۔ آپ نے ان شہداء کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اخْلُفْ جَعْفَرًا فِي أَهْلِهِ بِأَفْضَلِ مَا خَلَفْتَ عَبْدًا مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ»

''یا اللہ تو جس طرح اپنے نیک بندوں میں سے کسی کا نائب و قائم مقام ہو جاتا ہے، اس سے بھی بہتر طور پر جعفر کے گھر والوں میں اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔'' (المغازي لابن أبي شيبة، ص:370)

چنانچہ ان کی بیوہ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شادی کر لی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی جو اولاد سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ سے تھی، ان کی تربیت و پرداخت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کرتے رہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد دونوں کی اولاد

کی تربیت کی ذمہ داری سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نبھاتے اور ادا کرتے رہے۔(الإصابة لابن حجر: 231/3)

مؤتہ سے لشکر کی واپسی پر اہل مدینہ نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ اس دوران میں بعض لوگوں نے آنے والے ان مجاہدین سے یہ بھی کہہ دیا: میدان جنگ سے فرار ہو کر آنے والو! تم تو اللہ کی راہ میں اس کی رضا جوئی کے لیے جنگ کرنے گئے تھے، پھر تم نے راہِ فرار اختیار کیوں کی؟'' ان کی یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ فرار ہونے والے نہیں بلکہ اللہ نے چاہا تو یہ مکمل تیاری کر کے دوبارہ دشمن پر حملہ کرنے والے ہیں۔''(السيرة النبوية لابن هشام، حديث: 382/3، والمغازي للواقدی: 765/2)

چنانچہ یہ لشکر بعد میں مناسب حال تیاری کر کے دوبارہ اس علاقے میں پہنچا اور یہ معرکہ فتوحاتِ شام کے سلسلے میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان جیسے بعض دیگر صحابہ کے ہاتھوں یرموک میں پیش آیا۔ معرکۂ یرموک اور اس سے متصل غزوات میں روم کی طاقت کا پول کھل گیا اور دمشق و بیت المقدس وغیرہ کے علاقے سلطنت اسلامیہ کے زیر نگیں آ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ میں شہید ہونے والے قائدین حضرات کی شہادت کی خبر دی۔ بعد میں بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید سالارِ مؤتہ سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہما کو دیکھتے تو آپ پر رقت طاری ہو جاتی اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اسی طرح سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کو دیکھ کر بھی آپ کی ایسی ہی کیفیت ہو جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور بیان فرمایا کہ یہ لوگ شہید ہیں اور اہل جنت میں سے ہیں۔ اس غزوے میں لڑائی کے دوران میں سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کٹ جانے والے بازوؤں کے بدلے میں دو پَر عطا کر دیے ہیں۔ وہ جنت میں اہل جنت کے ہاں ذوالجناحین، یعنی دو پروں والے کے لقب سے معروف ہیں۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 375,374، والطبقات الكبرىٰ: 41/4)

فتح مکہ (20 رمضان 8 ہجری)

صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ دیگر عرب قبائل میں سے جو قبیلہ محمد ﷺ کے ساتھ شامل ہونا چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے اور جو قبیلہ قریش کے ساتھ ملنا چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے۔ اس طرح بنوخزاعہ نبیٔ کریم ﷺ کے اور بنوبکر قریش کے اتحادی بن گئے۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص:375,374، والطبقات لابن سعد: 41/4)

بنوبکر اور بنوخزاعہ کے مابین کچھ عرصے سے سلسلۂ عداوت چلا آ رہا تھا۔ جس میں بنوبکر نے بنوخزاعہ کے ہاتھوں خاصا نقصان اٹھایا تھا۔ اب وہ صلح کے اس معاہدے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنوخزاعہ کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اپنی وہ خفت مٹانا چاہتے تھے جو دورِ جاہلیت میں انھیں بنوخزاعہ کے ہاتھوں پے در پے شکست کی صورت میں اٹھانی پڑی تھی، چنانچہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا اور صلح کی دفعات کی مخالفت کرتے ہوئے قریش نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

قریش کے اس اقدام کو صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ بنوخزاعہ کا ایک فرد جس کا نام عمرو بن سالم خزاعی تھا، وہ اپنی مظلومیت کے اظہار اور رسول اللہ ﷺ کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مدینہ آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آہ و فریاد کی اور آپ سے گزارش کی کہ آپ قریش کے ساتھ ہونے والی صلح کی روشنی میں بنوبکر کے خلاف ہماری مدد کریں۔ بالخصوص یہ امر بھی پیش نگاہ رہے کہ قریش نے بھی بنوبکر کا مکمل ساتھ دیا ہے اور اس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ کی ہوئی صلح کی صاف صاف خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ عمرو بن سالم کی آہ و پکار ایک منظوم قصیدے کی صورت میں تھی، اس میں سے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں:

يَا رَبِّ إِنِّي نَاشِدٌ مُّحَمَّدَا حِلْفَ أَبِينَا وَأَبِيهِ الْأَتْلَدَا
فَانْصُرْ هَدَاكَ اللّٰهُ نَصْرًا أَعْتَدَا وَادْعُ عِبَادَاللّٰهِ يَأْتُوا مَدَدَا

''اے پروردگار! میں محمد ﷺ کو ان کے اور اپنے آباء واجداد کے قدیم عہد کی دہائی دیتا ہوں (یہ اس عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنوخزاعہ اور بنو ہاشم کے درمیان سردار عبدالمطلب کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ الرحیق المختوم (اردو)، ص:638) اللہ آپ کو ہدایت پر قائم رکھے، آپ ہماری بھرپور مدد کریں نیز لوگوں کو پکاریں تاکہ وہ ہماری مدد کے لیے نکلیں۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 394/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 527/3، وسبل الهدى والرشاد: 308/5، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 320)

اس کی دہائی سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمرو بن سالم! تمھاری مدد کی جائے گی۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 395/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 527/3)

اس کے بعد بنوخزاعہ کا ایک اور وفد بھی نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر فریاد کناں ہوا اور آپ سے مدد طلب کی۔ آپ نے ان سے بھی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا۔ ادھر قریش کو اپنی بدعہدی کا فوراً احساس ہوا۔ اس بنا پر وہ شدید قسم کے خطرات محسوس کرنے لگے، چنانچہ ان کا نمایندہ ابوسفیان بن حرب اپنے کیے پر پشیمانی اور ندامت کے اظہار کے ساتھ تجدید صلح کی خاطر مدینہ آیا۔

وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر آیا۔ وہ نبی ﷺ کا سسر تھا۔ جب وہ اپنی بیٹی ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں داخل ہو کر نبی ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگا تو سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے کہا: بیٹی! کیا بات ہے؟ یہ بستر میرے شایانِ شان نہیں یا میں اس بستر پر بیٹھنے کے قابل نہیں؟ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بڑی جرأت سے اپنے والد سے مخاطب ہو کر کہا: ''بات دراصل یہ ہے کہ یہ بستر اللہ کے رسول ﷺ کا ہے اور آپ پلید اور مشرک آدمی ہیں، اس لیے میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ آپ جیسا پلید مشرک، اللہ کے رسول ﷺ کے پاکیزہ بستر پر بیٹھے۔'' بیٹی کی یہ کھری کھری بات سن کر ابوسفیان نے صرف اتنا کہا: اللہ کی قسم! میرے ہاں سے چلے آنے کے بعد تجھے شر نے آن لیا ہے۔ اس کے بعد ابوسفیان نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کے معاملے میں بات کی مگر آپ نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 397/4)

اس کے بعد وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں گیا تا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ان سے سفارش کرائے تو انھوں نے بھی ٹکا سا جواب دیتے ہوئے فرمایا: میں یہ کام نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد وہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچا تو انھوں نے بھی صاف صاف کہہ دیا: ''کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمھارے حق میں سفارش کروں؟ اللہ کی قسم! اگر میں چیونٹی کو بھی تم سے لڑتے دیکھوں تو میں اس کے ساتھ مل کر تمھارے خلاف جہاد کروں۔''

اس کے بعد وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچا۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بھی ان کے پاس ہی تشریف فرما تھیں اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما جو ابھی بچے ہی تھے، وہ بھی ان کے سامنے ہی موجود تھے۔ ابوسفیان کی بات سن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کا مصمم عزم کر لیا ہو، ہم ان سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتے،'' پھر اس نے اپنا روئے سخن سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف موڑتے ہوئے کہا: اے بنت محمد! کیا آپ ایسا کر سکتی ہیں کہ آپ اپنے اس بیٹے سے کہیں کہ یہ لوگوں کے عام مجمع کے اندر جا کر مجھے پناہ دینے کا اعلان کر کے ہمیشہ کے لیے عرب کا سردار بن جائے؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میرا بیٹا ابھی اس درجے تک نہیں پہنچا کہ وہ عام لوگوں میں جا کر پناہ دینے کا اعلان کر سکے۔ ویسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

اس قدر کوشش اور جدوجہد میں ناکام اور مایوس ہونے کے بعد اس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شدید گھبراہٹ اور ناامیدی کی حالت میں کہا کہ آپ ہی کوئی حل نکالیں کہ اب کیا ہونا چاہیے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تم بنو کنانہ کے سردار ہو۔ خود مجمع میں کھڑے ہو کر پناہ کا اعلانِ عام کر دو۔ اور اس کے بعد اپنے وطن لوٹ جاؤ۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: اے علی! تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا میرا اعلان کر دینا مفید اور کارآمد ہوگا؟

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اسے تمھارے حق میں کارآمد نہیں سمجھتا مگر اس کے سوا کوئی دوسری صورت بھی سمجھ میں نہیں آتی، چنانچہ اس کے بعد ابوسفیان نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر عام اعلان کیا کہ لوگو! میں لوگوں کے درمیان امان کا اعلان کرتا ہوں۔ اس نے مکہ مکرمہ پہنچ کر پیش آمدہ سارے احوال قریش کے گوش گزار کیے تو انھوں نے اس سے کہا: علی نے تو تیرے ساتھ محض مذاق کیا ہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 396/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 531/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 326)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو غزوے کی تیاری کا حکم صادر فرمایا۔ آپ کی پوری پوری کوشش رہی کہ قریش کو آپ کی تیاری کا پتہ نہ چل سکے۔ اسی سلسلے میں آپ نے اپنا ایک جاسوسی دستہ مکہ کے علاوہ کسی دوسری جانب روانہ کیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ شاید ادھر ہی کسی جگہ جانے کا پروگرام ہے، البتہ آپ نے اپنے بعض انتہائی قریبی رفقاء کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ آپ مکہ مکرمہ میں قریش کے خلاف لشکر کشی کرنے والے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو بھی تاکید فرمائی تھی کہ وہ اس پروگرام کو عام لوگوں سے پوشیدہ ہی رکھیں۔ ساتھ ہی آپ نے دعا بھی فرمائی کہ یااللہ! جاسوسوں کی خبروں کو قریش تک پہنچنے سے روک لے تاکہ ہم اچانک جا کر ان کو دبوچ لیں۔

رسول اللہ ﷺ نے پانچ ہزار انصار و مہاجرین کے ہمراہ ماہ رمضان میں مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کا سفر شروع کیا۔ راستے میں مزینہ، سُلَیم، غفار، جہینہ، تمیم اور بنواسد کے قبائل بھی ساتھ شامل ہوگئے۔ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچتے پہنچتے آپ کے لشکر کی تعداد دس ہزار جنگجو افراد تک جا پہنچی۔

(فتح الباري، والسيرة النبوية لابن هشام: 400/4، والطبقات الكبرىٰ: 13/2)

چلتے چلتے رسول اللہ ﷺ نے ''مرّ الظهران'' میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ کی طرف رواں دواں تھے تو راستے میں سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی آپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 402/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 543/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 329)

بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ وہ اس سے بہت عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، البتہ انھوں نے اپنے قبولِ اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا اور اپنے اسلام کو عام لوگوں سے مخفی رکھا ہوا تھا۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس محبت اور لگاؤ کا اظہار کیا تھا، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دنوں اسلام قبول کر چکے تھے۔

(الاستيعاب لابن عبدالبر: 95/3، وفتح الباري، والإصابة: 2/2، وسير أعلام النبلاء: 78/2)

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی شدید خواہش اور پوری کوشش تھی کہ ان کی قوم قریش دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے (سفید) خچر پر سوار ہو کر باہر نکلے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی آدمی مل جائے تو اس کے

ذریعے سے مکہ میں قریش کے پاس اطلاع بھجوا دیں تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے پہلے آپ کی خدمت میں آ کر امان طلب کر لیں یا اسلام قبول کر لیں۔

رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے قریش پر ان ساری خبروں اور حالات کی رسائی روک دی تھی۔

آپ ﷺ نے رات کے وقت مسلمانوں کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ جگہوں پر آگ روشن کریں تاکہ اہل مکہ مسلمانوں کی کثرتِ تعداد سے مرعوب ہو جائیں اور مقابلہ نہ کر سکیں، چنانچہ بیک وقت دس ہزار آگ کے الاؤ روشن کیے گئے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 403/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 547/4، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 321، وسبل الهدىٰ والرشاد: 325,324/5)

ادھر قریش مسلمانوں کی طرف سے حملے کے خوف اور اندیشے سے دوچار تھے۔ انھوں نے مکہ سے باہر اس قدر زیادہ آگ کے الاؤ روشن دیکھے تو گھبرا گئے۔ ابوسفیان جو قریش کے سردار اور اہم فرد تھے۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مکے سے باہر آئے۔ حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء بھی اس کے ہمراہ تھے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو پہچان کر کہا: اب قریش کی خیر نہیں۔ ابوسفیان نے گھبرا کر کہا کہ اب کیا ہونا چاہیے؟ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میرے ساتھ خچر پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ساتھ ہی انھوں نے ابوسفیان کو پناہ دے دی۔ وہ اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور اپنے پناہ دینے کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کی دی ہوئی پناہ کو منظور فرمایا۔ اس طرح مسلمانوں نے ابوسفیان کو کچھ نہ کہا، ورنہ انھیں قتل کر دیا جاتا۔ صبح ہوئی تو سیدنا عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان کو ساتھ لے کر نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے تو اس نے کلمہ شہادت کا اقرار کر کے اسلام قبول کر لیا۔

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ ابوسفیان اعزاز پسند آدمی ہے۔ اسے کسی اعزاز سے نواز دیا جائے تاکہ اسے اپنی قوم میں نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل ہو جائے۔ آپ ایسا کریں کہ مسلمانوں میں اعلان کر دیں کہ جو آدمی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے امان ہوگی اور کچھ نہیں کہا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان کر دیا: جو آدمی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے ہماری

طرف سے امان ہے۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 403/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 548/3، وسبل الهدىٰ والرشاد: 330/5)

نبیٔ کریم ﷺ کی پوری کوشش رہی کہ آپ امن کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں۔ لڑائی کی صورت پیدا ہو نہ خوں ریزی کی نوبت آئے، چنانچہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے آپ نے اسلامی لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ چاروں جہات سے اپنی قوت اور شان وشوکت کا اظہار کرتے ہوئے اور لوگوں کی جانوں کے درپے ہوئے بغیر مکہ میں داخل ہوں اور اہل مکہ پیش آمدہ صورت حال کو دل سے تسلیم کر لیں اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہیں۔

نیز اس عظیم موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عام اعلان فرمایا: ''جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے امان ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو کوئی اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لے، اسے بھی امان ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو کوئی مسجد حرام میں چلا جائے، اسے بھی امان ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 403/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 549/3، وسبل الهدىٰ والرشاد: 330/5، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 344)

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہر اس آدمی کے لیے امان اور پناہ کا راستہ کھول دیا جو امن و امان کا خواہش مند تھا۔ یوں اللہ کے رسول ﷺ بغیر خون خرابے کے سلامتی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ حجون میں آپ کا جھنڈا (مسجد الفتح کے پاس) لہرا دیا گیا۔

البتہ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستے کی کچھ قریشی جنگجو نوجوانوں کے ساتھ جھڑپ ہو گئی اور یہ بھی جلد ہی اختتام کو جا پہنچی۔ ان مشرکوں نے بھاگ کر اپنے گھروں میں جا کر اور بعض نے فرار ہو کر مکہ سے باہر جا کر اپنی جانیں بچائیں۔

رسول اللہ ﷺ اللہ کے حضور حد درجہ انکساری اور تواضع کے ساتھ سر جھکائے ہوئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت سورۃ الفتح کی تلاوت آپ کی زبان مبارک پر جاری تھی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 405/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 555/3، وسبل الهدىٰ والرشاد: 342/5)

رسول اللہ ﷺ اپنے گرد و پیش موجود انصار و مہاجرین کے جلو میں مسجد حرام میں تشریف لے گئے۔ کعبہ مشرفہ کی طرف بڑھ کر بیت اللہ کے گرد سات چکر لگائے اور فرمایا:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ وَ هَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

''اکیلے اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) کی مدد کی اور اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست سے دوچار کر دیا۔''

نیز فرمایا: بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ ہر خون اور اعزاز و کمال میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے۔'' پھر فرمایا: ''اے قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے کہ میں تمھارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟''

انھوں نے کہا: ہمیں آپ سے اچھے سلوک کی توقع ہے۔ آپ ہمارے مہربان بھائی ہیں اور شریف النفس بھائی کے بیٹے ہیں۔

ان کی یہ بات سن کر آپ ﷺ نے ایک مشہور تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: «اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ» ''جاؤ، تم سب آزاد ہو۔'' میں تمھیں تمھارا ہر قصور معاف کرتا ہوں۔ آج کسی سے بھی اس کے کسی بھی قصور کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔'' پھر آپ ﷺ نے کعبہ کے کلید بردار (عثمان بن طلحہ حجبی) کو بلوا کر کعبہ کی چابی اس سے لی، پھر آپ کے لیے کعبہ مشرفہ کھول دیا گیا۔ (فتح الباري، والسيرة النبوية لابن هشام: 412,411/4، والبداية والنهاية لابن كثير: 570/3، وسبل الهدى والرشاد: 364/5، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 323)

کعبہ کے اندر تصویریں تھیں۔ آپ کے حکم سے یہ مٹا دی گئیں۔ لوگوں نے صحن حرم میں سال کے دنوں کے برابر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آیت کریمہ پڑھتے جاتے تھے:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔'' (بنی إسرآء یل 81:17)

اور تمام بتوں کو اوندھے منہ گراتے جاتے تھے، پھر آپ کے حکم سے ان سب کو پاش پاش کر دیا گیا۔ (فتح الباري،

والمغازي لابن أبي شيبة، ص:333-335 و341) اس طرح رسول اکرم ﷺ نے بیت اللہ میں موجود ہر بت کو توڑ دیا اور ہر تصویر کو مٹا دیا۔

ابن ابی شیبہ نے بسند صحیح بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ آپ اسے بیت اللہ کے کونوں (حجر اسود اور رکن یمانی) سے لمس کرتے ہوئے استلام کرتے رہے۔ لوگوں کے رش کی وجہ سے مسجد حرام کے صحن میں اونٹنی کے بٹھانے کی جگہ نہ مل سکی تو لوگوں نے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر آپ کو نیچے اتار لیا اور اونٹنی کو باہر لے جا کر کھلی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ آپ نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد و ثنا کی جس کا وہ حق دار ہے، پھر فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے دورِ جاہلیت کی نخوت و تکبر اور اپنے آباء و اجداد پر فخر و غرور کو دور کر دیا ہے۔ بنیادی طور پر لوگوں کے دو طبقے ہیں: ① نیک اور متقی، یہ لوگ اللہ کے ہاں محترم، مکرم اور معزز ہیں۔ ② کافر اور بدبخت، یہ لوگ اللہ کے ہاں ذلیل و رسوا ہیں۔ لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔ دیہاتیوں نے کہا: ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے: تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو وہ تمھارے اعمال (کی جزا) میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

(الحجرات 49:13,14)

اس کے ساتھ ہی میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمھارے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

اس کے بعد آپ ﷺ مسجد حرام کے ایک کونے میں تشریف لے گئے۔ آبِ زمزم سے بھرا ہوا ایک ڈول آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس سے اپنا رخِ انور دھولیا۔ آپ کے چہرۂ انور سے گرنے والے پانی کا ایک بھی قطرہ نیچے نہیں گرنے دیا گیا بلکہ صحابۂ کرام دیوانہ وار اسے حاصل کرنے لگے۔ اگر وہ پانی کسی کے ہاتھ لگا تو زہے قسمت ورنہ وہ دوسرے کے گیلے ہاتھ کو تھام کر اپنے چہرے پر مل لیتا۔ مشرکین یہ تمام مناظر ملاحظہ کر رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نے آج تک کوئی ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کی اس قدر عزت کی جاتی ہو۔ اور ہم نے آپ کی قوم (اہل مکہ) سے بڑھ کر کوئی احمق قوم نہیں دیکھی۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ انھوں نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز کے ساتھ اذان کہی۔ تمام مسلمانوں نے چادریں کَس لیں اور پانی کے ڈول ہاتھوں میں تھام کر زمزم کی طرف لپکے۔ وہ ڈول بھر بھر کر لاتے اور بیت اللہ کو اندر اور باہر سے اچھی طرح غسل دینے لگے۔ انھوں نے کعبہ کے اندر، باہر اور دیواروں پر مشرکوں کا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔ انھوں نے اسے خوب دھو دھو کر صاف کر دیا۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص:341)

اس روایت میں فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے تمام اعمال و افعال اور خطبے کی ایک ایک بات کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والے مردوں اور عورتوں سے الگ الگ بیعت لی اور عورتوں سے بعض ایسے امور کی بیعت بھی لی جو انھی کے ساتھ خاص تھے۔

(سبل الهدىٰ والرشاد: 372/5)

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر آوازۂ حق بلند کرتے ہوئے اعلان کیا:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اللّٰهُ أَكْبَرُ، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰه، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

بعض نومسلم قریشی لوگوں نے جب بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہتے ہوئے سنا تو انھیں یہ بات اچھی نہ لگی، البتہ بعد

میں جب وہ اسلام پر پختہ ہوگئے اور ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہوگیا تو وہ اپنی ان باتوں پر پشیمان ہوئے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 413/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 575/4، وسبل الهدىٰ والرشاد: 372/5)

اس طرح مکہ کی سرزمین شرک کی آلودگی سے مکمل طور پر پاک ہوگئی اور وہاں پر اسلام مخالف قوتیں دم توڑ گئیں۔ مکہ مکرمہ مسلم آبادی کا ایک شہر ہی نہیں بلکہ اس کا اہم ترین حصہ بن گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا نظام سنبھالا اور سیدنا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو وہاں کا امیر (گورنر) تعینات فرمایا۔

(الطبقات الكبرىٰ: 446/5، والإصابة: 452/2، وتاريخ الطبرى: 162/3)

نیز رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا۔ خود آپ نے مکہ مکرمہ میں انیس دن قیام فرمایا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4299)

بعدازاں آپ نے بنوثقیف اور بنوہوازن کے قبائل کا رخ کیا۔ یہ دونوں قبائل فتح مکہ کے بعد اہل اسلام سے جنگ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے، جبکہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے خلاف عربوں کے جذبات میں بہت زیادہ نرمی اور لچک آچکی تھی۔ قریش کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے اور اسلام کے خلاف سب سے بڑی قوت کے خاتمے کے بعد لوگ فوج در فوج اور جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوگیا۔

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾

''(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (النصر 110:1-3)

غزوۂ حنین و طائف (شوال 8 ہجری)

فتح مکہ کے بعد عرب کے اکثر قبائل نے اپنی شکست تسلیم کر لی، تاہم بنوہوازن اور بنوثقیف اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ ان میں بنوثقیف پیش پیش تھے۔ انھوں نے بنوغطفان وغیرہ کو ساتھ ملا کر

مسلمانوں سے ٹکر لینے کا پروگرام بنایا۔ یہ لوگ اپنی اولادوں اور چھوٹے بچوں تک کو اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے آئے تاکہ ان کا خیال ذہن میں لا کر وہ میدان جنگ میں ڈٹے رہیں۔

(فتح الباري، والسيرة النبوية لابن هشام: 438/3)

جب رسول اللہ ﷺ تک دشمن کی جنگی تیاریوں کی مصدقہ اطلاعات پہنچیں تو آپ 12 ہزار افراد پر مشتمل ایک عظیم لشکر لے کر دشمن کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں سے دس ہزار تو وہ لوگ تھے جو مدینہ منورہ اور اردگرد کے علاقوں سے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ آئے تھے اور دو ہزار کے قریب وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے اور انھیں ''طلقاء'' کا لقب دیا گیا تھا اور ان کی جان بخشی کر دی گئی تھی۔ (فتح الباري: 172/16)

تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کا یہ ایک بہت بڑا لشکر تھا۔ بعض مسلمان اپنے لشکر کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر اتراتے ہوئے کہنے لگے: آج ہم تھوڑے ہونے کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے یعلیٰ بن امیہ سے کچھ ہتھیار اس شرط پر عاریتاً لیے کہ یہ واپس کر دیے جائیں گے۔ اگر کوئی نقصان ہوا تو ہم اس کی تلافی کرنے کے پابند ہوں گے۔ یعلیٰ ان لوگوں میں سے تھا جن کی تالیف قلب کی گئی تھی۔ جنگ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شکریے کے ساتھ اس کے ہتھیار واپس کر دیے۔ (السيرة النبوية لمهدی رزق اللّٰه، ص: 873)

ہوازن نے حنین میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ مالک بن عوف ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا: تم اپنی عورتوں اور تمام اموال سمیت میدان جنگ میں آؤ تاکہ ان کی حفاظت اور دفاع کے خیال سے تم لوگ میدان میں ڈٹے رہو۔ اور کسی نقصان کی صورت میں بھاگ نہ سکو۔ بنو جشم کا درید بن صمّہ بھی ہوازن کے ساتھ تھا۔ وہ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب یہ سوائے مشورہ دینے کے کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک دانا اور جنگی امور کا ماہر تھا۔ اس نے بنوہوازن کے قائد مالک بن عوف کی جنگی حکمت عملی سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: تمھارا عورتوں اور اپنے اموال کو میدانِ جنگ میں لے آنا مصلحت کے خلاف ہے۔ یہاں تو تمھیں شمشیر زن اور نیزہ باز لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر جنگ میں تمھیں شکست ہوگئی تو اپنے اہل وعیال اور اموال کے نقصان کی رسوائی بھی تمھارے حصے میں آئے گی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 438/3، وسبل الهدىٰ والرشاد: 460/5)

مسلمانوں کا لشکر بڑی جرأت سے حنین کی وادی میں جا پہنچا۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ دشمن پوری وادی میں پھیل کر کمین گاہوں میں موجود ہے۔ یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ مسلمانوں کا لشکر مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس میں انصار اور مہاجرین جیسے راسخ اور پختہ مسلمانوں کے ساتھ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو چند ہی دن پہلے فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ مسلمان ان خفیہ کمین گاہوں سے یکسر بے خبر تھے۔ وہ جونہی وادی میں داخل ہوئے، ہوازن نے ان پر چاروں طرف سے یلغار کر دی۔

لشکر اسلام کے اگلے دستے بالخصوص وہ لوگ جو بنو تمیم اور اہل مکہ کے ''طلقاء'' میں سے تھے، وہ دشمن کے اچانک حملے کی تاب نہ لا کر منتشر ہو گئے اور مسلمانوں کا لشکر بکھر گیا، البتہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہمراہ کچھ مہاجرین اور انصار میدان میں ڈٹے رہے۔ جو لوگ آپ کے اردگرد موجود رہے ان میں آپ کے چچا سیدنا عباس، سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ موقع پا کر لشکر کی داہنی جانب میں چلے گئے۔ آپ نے اپنی داہنی جانب رخ کر کے زور سے پکارا: ''اے انصار کی جماعت!'' انصار نے آپ کی آواز سنی تو سب نے بیک وقت لبیک کہا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! مطمئن رہیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، پھر آپ ﷺ نے بائیں طرف رخ کر کے آواز دی: ''اے انصار کی جماعت!'' انھوں نے آپ کی پکار سنی تو سب نے بیک آواز لبیک کہا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! اطمینان رکھیں، ہم آپ کے پاس ہی ہیں۔

اس وقت آپ ﷺ اپنے سفید خچر پر سوار تھے۔ اب آپ نیچے اتر آئے اور زور زور سے فرمایا: «أَنَا عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ» ''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔'' (فتح الباري: 172/16)

''لوگو! ادھر میری طرف آ جاؤ، میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں محمد بن عبداللہ ہوں۔''

آپ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی آواز خاصی بلند تھی۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ انصار کو یوں پکارو: «يَا أَصْحَابَ السَّمُرَةِ» ''بیری کے درخت کے نیچے بیعت (رضوان) کرنے والو! ادھر آ جاؤ۔''

اللہ کے رسول ﷺ ساتھ ساتھ یہ رجز پڑھتے جا رہے تھے:

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

''میں اللہ کا نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا (پوتا) ہوں۔'' (فتح الباري: 143/16، والسيرة النبوية لابن هشام: 444/3، وسبل الهدىٰ والرشاد: 471/5، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 378)

مہاجرین اور انصار نے جب یہ پکار سنی تو وہ سب ''لبیک، لبیک'' کہتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جمع ہو کر دشمن پر حملے کرنے لگے۔ اہل اسلام اور ہوازن کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ یہ صورت حال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے شدت جذبات سے فرمایا: «اَلْآنَ حَمِيَ الْوَطِيسُ» ''اب جنگ خوب بھڑک اٹھی ہے۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 445/4، والسيرة النبوية لمهدى رزق الله، ص: 58، وصحيح مسلم، حديث: 1775)

اس کے بعد سے یہ جملہ ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو گیا جبکہ یہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جاری ہوا ہے۔ (الروض الأنف: 138/4)

مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کفار کے خلاف جواں مردی کے جوہر دکھائے۔ رسول اللہ ﷺ نے مٹی کی ایک مٹھی لے کر دشمن کی طرف اچھالتے ہوئے فرمایا: «شَاهَتِ الْوُجُوهُ» ''ان دشمنوں کے چہرے بگڑ جائیں۔'' (صحيح مسلم، حديث: 1775، والسيرة النبوية لمهدى رزق الله، ص: 589)

بالآخر دشمن پسپا ہونے لگا اور کچھ ہی دیر بعد دشمن کی صفوں میں شکست کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اہل اسلام اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے بے شمار قیدیوں اور بے تحاشا مالِ غنیمت سے بہرہ مند ہوئے۔

(فتح الباري: 172/16)

دشمن کے ستر سے زائد افراد جنگ میں کام آئے اور متعدد مسلمانوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 449/4)

مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر دشمن نے شکست کھا کر ادھر ادھر بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں ان سے مزید جنگ کرنے، ان کو قتل کرنے اور ان کی بچی کھچی قوت کو کچلنے کے لیے مختلف دستے روانہ کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دستوں کو فتح و کامرانی سے نوازا اور بہت سا مالِ غنیمت اور بہت زیادہ قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اموالِ غنیمت اور قیدی جعرانہ کے مقام پر ایک جگہ اکٹھے کرنے کا حکم دیا۔ (فتح الباري 162/16، والسيرة النبوية لابن هشام: 488/4 جعرانہ مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب، طائف روڈ پر السیل السریع کے قریب

ہے۔ معجم المعالم الجغرافية فی السيرة النبوية للبلادی، ص: 83)

ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے طائف کا رخ کیا۔ یہاں بنوثقیف نے ہوازن کے باقی ماندہ لوگوں کو اکٹھا کیا ہوا تھا اور یہ لوگ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

طائف کی آبادی کے اردگرد حفاظتی فصیلیں بنائی گئی تھیں۔ اسی لیے اسے ''طائف'' کہا جاتا تھا۔

(معجم البلدان: 9/4، والطائف و دور قبيلة ثقيف العربية، ص: 16)

یہ ایک مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اسے فتح کرنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنا پڑی۔ آپ نے بیس سے زائد راتوں تک اس کا محاصرہ کیے رکھا۔ (سبل الهدىٰ والرشاد: 565/5، والسيرة الصحيحة للدكتور العمری: 507/2، والسيرة النبوية لمهدی رزق اللّٰه، ص: 596)

آپ نے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی مشاورت سے وہاں ایک منجنیق نصب فرمائی۔ اس کے ذریعے سے قلعے پر گولے برسائے گئے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 483/4، وسبل الهدىٰ والرشاد: 560/5)

مشرکین نے قلعے کی دیواروں کے اوپر سے مسلمانوں پر تیروں وغیرہ کی بوچھاڑ کر دی جس کے نتیجے میں متعدد صحابہ کرام شہید ہو گئے۔ مسلمانوں نے لکڑی اور چمڑے سے ایک توپ تیار کی تاکہ اس کے ذریعے قلعے کی دیواروں پر گولہ باری کر کے اسے توڑا جا سکے۔ وہ اس کے اندر داخل ہو کر قلعے کی دیواروں کے قریب پہنچ چکے تھے کہ مشرکین نے لوہے کے ٹکڑے سخت گرم کر کے اس توپ کے اوپر پھینکنے شروع کر دیے۔ ان سے چمڑا جل گیا اور لکڑی بھی شدید متاثر ہوئی۔ جو مجاہدین اس توپ کے اندر تھے، یہ صورت حال دیکھ کر جان بچاتے ہوئے اس سے باہر نکل آئے۔ دشمن جو قلعے کی دیواروں کے اوپر چڑھے ہوئے تھے، انھوں نے ان پر تیر برسائے جس سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 483/4، وسبل الهدىٰ والرشاد: 561/5)

طائف میں سے بعض غلام اپنے مالکوں کو چھوڑ کر مسلمانوں سے آ ملے اور کلمہ شہادت کا اقرار کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ یہ لوگ اب غلام نہیں بلکہ آج سے آزاد ہیں۔

(فتح الباري: 161/16، والسيرة النبوية لابن هشام: 485/4، وسبل الهدىٰ والرشاد: 562/5)

طائف کا محاصرہ طول پکڑ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ طائف فتح نہیں ہو رہا، اس لیے آپ نے

وہاں سے واپسی اور کوچ کے ارادے کا اظہار فرمایا۔ آپ طائف کی فتح سے مایوس نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ ﷺ کو کامل یقین تھا کہ اہلِ طائف اسلام قبول کر کے ازخود ہمارے پاس آ جائیں گے۔ آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اهْدِ ثَقِيفًا»

''یا اللہ! ثقیف کے لوگوں کو نورِ ہدایت سے سرفراز فرما۔'' (السيرة النبوية لمهدى رزق الله، ص: 596)

اس کے بعد رسول اللہ نے مکہ کی راہ لی۔ راستے میں جعرانہ کے مقام پر جہاں ہوازن اور دیگر قبائل سے حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت جمع تھے، آپ نے وہاں قیام کیا۔ آپ اس انتظار میں رہے کہ ہوازن کے لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کر چکے ہیں، وہ اس سے تائب ہو کر آ جائیں تو انھیں معاف کر دیا جائے اور ان کے مال و اسباب انھیں لوٹا دیے جائیں۔

جب کئی دن گزر جانے کے باوجود ان میں سے کوئی نہ آیا تو آپ نے قیدی اور مالِ غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد ہوازن کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور ان سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے حق میں جو کچھ سرزد ہوا تھا، اس کی معذرت کرتے ہوئے معافی کے طلبگار ہوئے۔ ساتھ ہی انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عاجزانہ درخواست کی کہ آپ ان کے اموال اور اولاد انھیں واپس کر دیں۔

ان میں ایک آدمی شاعر تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک عاجزانہ اور انتہائی دردمندانہ قصیدہ پڑھا، اس قصیدے کا پہلا شعر یہ تھا:

اُمْنُنْ عَلَيْنَا رَسُولَ اللّٰهِ فِي كَرَمٍ فَإِنَّكَ الْمَرْءُ نَرْجُوهُ وَنَدَّخِرُ

''اللہ کے رسول! اپنے فضل و کرم کے سبب ہم پر مہربانی کریں کیونکہ آپ ہی وہ ذی وقار ہستی ہیں جن سے حسن سلوک کی ہم آس اور امید رکھتے ہیں۔'' (سبل الهدىٰ والرشاد: 571/5)

آپ نے ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے فرمایا: ''تم یا تو اپنے اموال واپس لے لو یا اپنی اولاد یں اور عورتیں واپس لے جاؤ، ان دو میں سے تمھیں ایک کا اختیار ہے۔''

انھوں نے کہا: ہمیں ہماری اولادیں اور عورتیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''میرے ساتھ جو لوگ ہیں، تم انھیں دیکھ ہی رہے ہو۔ صاف اور سچ سچ کہنا مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو کئی دن تمھارا انتظار کرتا رہا۔'' اور واقعی رسول اللہ ﷺ نے طائف سے واپس آ کر دس دن سے بھی زیادہ دنوں تک ان کا انتظار کیا تھا۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ انھیں دو میں سے صرف ایک چیز واپس کریں گے تو انھوں نے کہا: ہمارے جو لوگ (عورتیں اور اولادیں) قیدی بنا لیے گئے ہیں، وہ واپس کر دیے جائیں۔ بعدازاں رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے سامنے کھڑے ہو کر خطاب فرمایا، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: ''اے میرے صحابہ! دیکھو یہ تمھارے بھائی بند ہیں۔ یہ لوگ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہو کر توبہ کر کے آ گئے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے قیدی ان کو واپس کر دوں، لہٰذا تم میں سے جس کسی کے حصے میں کوئی قیدی آیا ہے، وہ دل کی خوشی سے اسے واپس اور آزاد کر دے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم میں سے جو آدمی اپنے حصے کے قیدی واپس نہیں کرنا چاہتا، وہ بھی بہر حال اسے واپس کر دے۔ میں ان کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ ہمیں سب سے پہلے جو مالِ فے حاصل ہوگا، ہم اس میں سے اسے دیں گے۔''

آپ ﷺ کی گفتگو سن کر تمام صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم آپ کی خاطر سب کچھ دل کی خوشی سے واپس کرنے کو حاضر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے تمام مسلمان اپنے اپنے حصے کے قیدیوں سے خوشی خوشی دست بردار ہو گئے۔ نبیِ کریم ﷺ نے ہوازن کے وفد سے فرمایا کہ جا کر اپنے سردار مالک بن عوف کو میرا پیغام پہنچا دو کہ اگر وہ مسلمان ہو کر میرے پاس چلا آئے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس کے اہل و عیال اور اموال اسے لوٹا دیے جائیں گے اور ہم اسے مزید سو اونٹ دیں گے۔ جب یہ پیغام اس تک پہنچا تو وہ چپکے سے طائف سے نکل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔

طائف اور اس کے گرد و نواح کے جو قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ان کا نگران مقرر فرما دیا، پھر انھوں نے بنوثقیف کے مشرک گروہوں پر اس قدر تابڑ توڑ حملے کیے کہ ان کی زندگی

اجیرن کر دی۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 491/4، والسیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 683/3)

رسول اللہ ﷺ نے جب مال غنیمت تقسیم کرنا شروع کیا تو آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والے قبائل اور وہ نومسلم جن کی دلجوئی کر کے انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنا مقصود تھا یا وہ کفار جن کی دلجوئی سے ان کے اسلام لانے کی امید تھی، انھیں خوب خوب نوازا اور انصار کو کچھ بھی نہ دیا۔

اس سے بعض انصاریوں کو شکایت ہوئی، چنانچہ آپ نے صرف انصار کو الگ بلا کر ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے انصار کی جماعت! کیا تم راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے تمھیں ہدایت سے سرفراز کیا؟ کیا تم ایک دوسرے سے جدا جدا اور الگ نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں میرے ذریعے سے یکجا اور متفق و متحد کر دیا؟ کیا تم تہی دست نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمھیں غنی اور مالدار کر دیا؟'' آپ نے جو بات بھی کی، اس کے جواب میں انھوں نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا احسان اور فضل و کرم ہے۔ آپ نے پھر فرمایا: خاموش کیوں ہو؟ تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟''

وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ یقیناً اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بڑا احسان اور فضل و کرم ہے، پھر آپ نے خود ہی فرمایا: ''اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم سچ ہی کہو گے اور تمھاری بات سچ ہی مانی جائے گی کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلایا گیا تھا۔ ہم (انصار) نے آپ کی تصدیق کی، آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا، ہم (انصار) نے آپ کی مدد کی، آپ کو آپ کے شہر (مکہ مکرمہ) سے نکال دیا گیا تھا، ہم نے (مدینہ میں) آپ کو ٹھکانا دیا۔ آپ محتاج و فقیر تھے۔ ہم نے آپ کی غمخواری اور غمگساری کی۔

اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں دنیا کی اس عارضی اور فانی دولت کی خاطر مجھ سے ناراض ہو گئے ہو جس کے ذریعے سے میں نے نومسلم لوگوں کو اسلام کے قریب کیا تا کہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ اور تمھیں اسلام کی پختگی کی وجہ سے وہ مال نہیں دیا۔

اے انصار کی جماعت! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ دوسرے لوگ دنیا کا مال اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم اللہ کے رسول کو ساتھ لے کر اپنے گھروں اور وطن کو واپس جاؤ۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر عام لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر چلیں تو میں انصار کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی راہ پر چلوں گا۔ انصار میرے لیے اس کپڑے کی مانند ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے اور باقی لوگ میرے لیے اس کپڑے کی مانند ہیں جو انسان نے اپنے اوپر اوڑھا ہوا ہوتا ہے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 3800، 4330، 4331، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 387)

رسول اللہ ﷺ کا یہ خطاب اور گفتگو سن کر انصار شرمندگی کے احساس سے اس قدر دھاڑیں مار مار کر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہوگئیں۔ ان کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ انھوں نے رو رو کر عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم دل و جان سے اس پر راضی اور خوش ہیں کہ ہمارے نصیب میں اللہ کے رسول آئے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کے رسول وہاں سے اٹھ آئے اور باقی لوگ بھی اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ (الكامل لابن الأثير: 272/4)

اموالِ غنیمت کی تقسیم سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جعرانہ ہی سے احرام باندھا اور عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں کچھ دن قیام کیا اور (24 ذوالقعدہ 8 ہجری کو) مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ چند ماہ ہی گزرے تھے کہ طائف اور وہاں کے باشندوں میں دین اسلام پھیل گیا، پھر طائف والوں کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان لوگوں نے قبل ازیں آپ کے ساتھ جو بے رحمانہ سلوک کیا تھا، آپ نے دل کی خوشی سے انھیں سب معاف کر دیا۔ وہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے، سارا شہر مسلمان ہوگیا۔ وہ لوگ بت پرستی سے دست بردار ہوگئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے بھی انتہائی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں معافی دے دی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 538، 541، والسيرة الصحيحة للدكتور العمري: 512/2، والسيرة النبوية لمهدي رزق الله، ص: 659)

طائف والوں کے قبول اسلام کے بعد سارا حجاز نبوی حکومت کے زیر نگیں ہوگیا اور رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ والی اور حکمرانوں نے ان علاقوں کا انتظام سنبھال لیا۔ قرآن کریم کی بعض آیات مبارکہ میں غزوۂ حنین کا

تذکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾

''یقیناً اللہ نے بہت سے مقامات پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جب تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔'' (التوبة 25:9)

غزوۂ تبوک (رجب 9 ہجری)

غزوۂ مؤتہ جو مسلمانوں، رومیوں اور ان کے اتحادی عرب عیسائیوں کے درمیان 8 ہجری میں بپا ہوا۔ یہ اہل اسلام اور رومیوں کے مابین پہلا معرکہ تھا۔ چونکہ اس غزوے میں صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ کے ذہن سے یہ غم نکلتا ہی نہیں تھا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب وجوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔'' (التوبة 123:9)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اور حکم کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے رومیوں کے ساتھ جنگ کا پختہ ارادہ کیا۔ بنیادی طور پر یہ غزوہ (تبوک) رومیوں کے خلاف تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ یہ لشکر بلادِ روم کے نواح میں جانے والا ہے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4418)

آپ اس خبر کو پوشیدہ رکھنا بھی چاہتے تو نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ منافقینِ مدینہ میں سے کچھ لوگ رومیوں کے جاسوس ہیں۔ یہ ان تک اطلاع پہنچا دیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے بھرپور تیاری کا حکم دیا کیونکہ سفر بہت لمبا تھا۔ گرمی انتہا کی تھی۔ علاقے میں قحط سالی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کے پاس مالی وسائل بھی ناکافی تھے۔ مدینہ منورہ میں کھجور اور انگور کی فصل تیار تھی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 398)

لوگ سارا سال ان فصلوں کے تیار ہونے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر تبوک کے لیے سفر کرنا مسلمانوں کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین نے نبیٔ کریم ﷺ کے ہمراہ نہ جانے کے لیے مختلف حیلے بہانوں سے جھوٹ کا سہارا لیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''اور ان میں سے کوئی آپ سے کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں۔ سن لو! وہ فتنے ہی میں تو پڑ چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم کافروں کو ضرور گھیرنے والی ہے۔'' (التوبة 49:9)

منافقین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تبوک کی طرف نہ جانے اور شدید گرمی میں سفر کرنے سے ایک دوسرے کو روکنے لگے۔ اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے (اوروں سے) کہا کہ گرمی میں کوچ نہ کرو۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: جہنم کی آگ (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھتے۔ پس انھیں چاہیے کہ وہ بہت تھوڑا ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔'' (التوبة 82,81:9)

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے لشکر کے انتظامات کے لیے خاصے سرمائے کی ضرورت تھی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے ان اخراجات کی طرف صحابۂ کرام کی توجہ مبذول کرائی۔ اصحاب ثروت اور مالدار صحابہ نے اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے صحابہ پیش پیش تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے تو بہت زیادہ تعاون پیش کیا۔ انھوں نے تین سو اونٹ اور ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

ڈھیر کر دیے۔ ان کے اس ایثار کو دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس عظیم عمل کے بعد عثمان جو بھی عمل کرے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان ہی کے متعلق مزید ارشاد فرمایا: «مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَلَهُ الْجَنَّةُ»

''جس شخص نے جیش عسرت کی ضروریات کو پورا کیا، وہ جنت کا مستحق ہے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 2778)

نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ ارْضَ عَنْ عُثْمَانَ فَإِنِّي عَنْهُ رَاضٍ»

''یا اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 518/3)

مسلمانوں میں سے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جہاد (غزوۂ تبوک) کے لیے جانے کو تیار تھے مگر وہ ناداری اور سفر کے لیے سواری نہ ہونے کی بنا پر جہاد کے لیے جانے سے قاصر تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ ہمارے لیے سواری کا انتظام کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ﴾

''میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں۔'' (التوبة 92:9)

چنانچہ وہ لوگ رنجیدہ و غمگین ہو کر اس حال میں گھروں کو واپس گئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

(تفسير ابن كثير: 902/1)

بدوی دیہاتی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگوں نے نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر عذر پیش کیے تاکہ انھیں بھی پیچھے رہ جانے اور غزوے میں نہ جانے کی رخصت دے دی جائے۔ ادھر بعض صحابۂ کرام ایسے بھی تھے جو فی الواقع رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ غزوے میں جانے کے لیے تیار تھے مگر غفلت اور سستی کی وجہ سے نہ جا سکے۔ انھوں نے غزوے سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح صحیح بات بیان کر دی۔ وہ لوگ اپنی بات میں سچے تھے۔ چند دنوں کی آزمائش اور امتحان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا معاف کر دی اور ان کے بارے میں یہ آیات کریمہ نازل ہوئیں:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۙ ﴾

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور ان تین افراد پر بھی (مہربانی فرمائی) جنھیں (حکمِ الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا، حتی کہ جب زمین فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں (بھی) ان پر تنگ ہوگئیں اور انھوں نے سمجھا کہ اللہ (کے غضب) سے خود اس کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (التوبة 9:117,118)

اسلامی معاشرے کے تمام طبقات خواہ کوئی امیر تھا یا غریب، پختہ ایمان والا تھا یا اس کی ایمانی حالت قدرے کمزور تھی، یہ غزوہ درحقیقت سب کے لیے امتحان اور بہت بڑی آزمائش تھا۔ نیز اس غزوے کے نتیجے میں منافقین اور بچے کھچے یہودیوں کی اسلام دشمنی بھی طشت از بام ہوگئی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا موقف اور اپنی اپنی سوچ تھی۔

غزوۂ تبوک رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور جنگی مہمات میں سب سے آخری غزوہ اور آخری جنگی مہم تھی۔ آپ کی عمر مبارک ساٹھ سال سے متجاوز ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے بنفس نفیس اس لشکر کی قیادت فرمائی کیونکہ یہ غزوہ رومی علاقوں میں آیندہ ہونے والی جنگوں اور اطرافِ عالم میں اسلام کے فروغ اور ترقی کا پیش خیمہ تھا۔

اس غزوے میں شرکت کے لیے تیس ہزار جنگجو مسلمان تیار ہوئے۔ ان میں سے دس ہزار افراد گھوڑ سوار تھے۔ (فتح الباري: 16/242، والسيرة النبوية لابن هشام: 520) اللہ کے رسول ﷺ نے اس عظیم لشکر کی قیادت

کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے تبوک کا رخ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تیار ہونے والے لشکروں میں مجاہدین کی تعداد کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا لشکر تھا۔ تبوک کی طرف جاتے ہوئے اہل اسلام کا گزر مدائن صالح، یعنی سیدنا صالح علیہ السلام کے علاقے سے ہوا۔ (سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ جب سیدنا صالح علیہ السلام کی بستی ''حجر'' کے پاس سے گزرے تو آپ نے اعلان فرمایا: ''جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، یعنی صالح علیہ السلام کے مخالفین اور نافرمان، تم ان کے گھروں میں داخل نہ ہونا مبادا کہ جو عذاب ان پر آیا تھا، تم پر نہ آ جائے، تم یہاں سے اللہ کے خوف اور ڈر سے روتے ہوئے گزرو، پھر آپ نے اپنے سر پر چادر ڈال لی اور بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے وادی پار کر گئے۔'' (صحيح البخاري، حديث: 4420,4419))

آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بھی فرمایا: ''تیزی سے چلتے ہوئے اس علاقے سے گزر جائیں اور ان ہلاک کیے گئے لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہوں اور اگر داخل ہونا پڑے تو روتے ہوئے یا رونے والی شکل بنا کر داخل ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سفر جاری رکھا تا آنکہ آپ تبوک جا پہنچے۔ آپ نے وہاں دس راتوں سے زیادہ قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ نے مختلف علاقوں کی طرف چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ فرمائے اور قریب قریب کے علاقوں اور رومیوں کے احوال سے باخبر رہنے کے لیے آپ جاسوس بھی بھیجتے رہے۔ گردونواح کے قبائل کے رؤسا اور بستیوں کے حکمران بھی آپ سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔

ایک جنگی مہم کے دوران میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ''دومۃ الجندل'' کے حکمران ''اکیدر بن عبدالملک'' کو گرفتار کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ اس نے اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے ذمی کے طور پر جزیہ دینے کا عہد کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے رہا کر دیا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 526/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 30/4)

اسی طرح ''اَیلہ'' کے حکمران یحنہ (یوحنا) بن رؤبہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بطور ذمی جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ نیز ''اذرح'' اور ''الجرباء'' کے حکمران بھی آپ کی خدمت اقدس میں ازخود آ گئے۔ آپ نے انھیں امان دی، ان کے ساتھ ان کے ذمی ہونے کا معاہدہ طے ہوا اور آپ نے انھیں ایک تحریر بھی لکھ دی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 526,525/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 29/4)

حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومیوں اور علاقے کے مقامی حکمرانوں کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی مدینے سے روانگی اور پھر تبوک میں پہنچ جانے کا علم ہو چکا تھا۔ آپ نے تبوک پہنچ کر اپنی قوت اور شان وشوکت کا جو مظاہرہ کیا انھیں اس کا بھی بخوبی علم ہو گیا تھا۔ (امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رومی بادشاہ ہرقل کے ایک قاصد نے تبوک میں آ کر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی تھی۔ اس نے آپ کو ہرقل کا پیغام بھی پہنچایا تھا۔ یہ واقعہ بڑا تعجب انگیز ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ السيرة النبوية لابن كثير: 4/27-29، ومسند أحمد: 3/442، تفصیل کے لیے دیکھیے: روم کے حاکم ہرقل کے نام نامۂ نبوی)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی اور رومیوں نے اپنی قوت، طاقت اور شان وشوکت کے باوصف مسلمانوں سے مقابلے کی ہمت نہ کی۔

غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے ایک صحابی سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے نام غسانی بادشاہ کا خط بھی اسی چیز کا مظہر ہے۔ اس نے مدینہ منورہ میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انھیں اپنے ہاں ملک شام میں آ جانے کی پیشکش کی تھی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4418)

رومی حکومت کے زیر اثر غسانی بادشاہ کو اس غزوے میں شریک ہونے یا شریک نہ ہونے والے ایک ایک فرد کے متعلق مفصل معلومات تھیں تو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ سے تبوک کی طرف سفر کرنے کی خبر ان سے کیونکر پوشیدہ رہ سکتی تھی؟ وہ یقیناً ان حالات سے باخبر تھے، پھر خاص طور پر جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس غزوے کا عام اعلان بھی کر دیا تھا اور سلطنت روم کے جاسوس موقع پا کر مدینہ منورہ کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روم کا بادشاہ دلی طور پر رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا سچا رسول تسلیم کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ جلد یا بہ دیر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لشکر اس پر غالب آ کر رہیں گے۔

اسی خوف اور اندیشے کے پیش نظر اس نے اسلامی لشکر سے ٹکرانے کی ہمت نہ کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک ہرقل کے پاس پہنچا تھا اور اس نے قریش کے تجارتی قافلے کے ارکان سے آپ کے متعلق معلومات لی تھیں تو اس نے قسم کھا کر کہا تھا: ''جو کچھ تم نے مجھے بتلایا ہے اگر یہ سب درست ہے تو وہ (نبی) عنقریب میری اس سلطنت کا مالک ہوگا۔'' (صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 7)

چنانچہ بعدازاں اسی ہرقل نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ اہلِ اسلام اس کے تخت اور حکومت کے مالک بن گئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: روم کے حاکم ہرقل کے نام، نامۂ نبوی، وتاريخ الطبري: 38/4، فتوح الشام للأزدي، ص: 236)

رسول اللہ ﷺ جزیرۂ عرب کی آخری حد تک مسلمانوں کی قوت اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے اور دشمن پر اپنی دھاک بٹھانے کے بعد مدینہ منورہ کی طرف واپس ہوئے۔ راستے میں بعض منافقین نے آپ کو ایذا پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔ ان میں سے چودہ آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کی سازش کی۔ آپ ﷺ ایک انتہائی تنگ پہاڑی درے سے گزرنے لگے تو عام اعلان کر دیا کہ اللہ کے رسول ﷺ اس درے سے گزر رہے ہیں آپ کے گزرنے تک کوئی آدمی اس درے میں نہ آئے۔ یہ درہ اس قدر تنگ اور دشوار گزار تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی سوار بمشکل گزر سکتا تھا۔ اس وقت حفاظت کے پیش نظر سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس دوران میں اونٹوں پر سوار چند آدمیوں کا ایک گروہ موقع پا کر آپ کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ وہ اپنے چہروں کو کپڑوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ انھوں نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے بالکل قریب آ کر جمگھٹا کر دیا۔ ان کو بھگانے اور دور رکھنے کے لیے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ ان کے اونٹوں کے چہروں پر تیزی سے لاٹھی برسانے لگے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب نہ آ سکیں۔ ساتھ ہی وہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو زور زور سے پکار کر کہنے لگے کہ جلدی کرو، تیز چلو، سخت خطرہ ہے۔

درے کے مشکل اور دشوار گزار راستے سے نکل کر رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! انھوں نے اپنے چہروں کو ڈھانپا ہوا تھا، اس لیے میں ان کو نہیں پہچان سکا، البتہ ان کے اونٹوں کو میں نے پہچان لیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جانتے ہو ان کا پروگرام کیا تھا؟''

عمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، میں تو کچھ نہیں جانتا۔ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کا پروگرام تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اونٹ کو ڈرا دھمکا کر تیز بھگائیں تاکہ وہ اونٹ سے نیچے گر جائیں۔''

(مسند أحمد: 391,390/5، وسبل الهدىٰ والرشاد: 669/5)

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف آتے ہوئے مدینہ کے قریب پہنچ کر فرمایا:

«هٰذِهِ طَابَةُ، وَهٰذَا أُحُدٌ جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ»

''یہ (مدینہ) طابہ ہے اور یہ جبل احد ہے جو ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''

(صحيح البخاري، حديث: 4422، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 397)

مدینہ منورہ میں جب رسول اللہ ﷺ کی آمد کی خبر پہنچی تو عورتوں اور بچوں نے مدینہ منورہ سے باہر آ کر مسلمانوں کا استقبال کیا۔ بچے فرطِ محبت ومسرت سے یہ ترانے اور نغمے الاپنے لگے:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا، مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

''ثنیۃ الوداع کی طرف سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔ جب تک پکارنے والا اللہ کو پکارے، ہم پر اللہ کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔'' (فتح الباري: 259/16، والسيرة النبوية لمهدي رزق الله، ص: 631)

یہ غزوہ ان تمام اسلامی طبقات کی تربیت کا بھی ایک ذریعہ تھا جنھوں نے اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ یہ غزوہ اس لحاظ سے پوری امت کے لیے دور رس نتائج کا حامل تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے رومیوں کے خلاف عملاً جہاد کر کے امت کو توجہ دلائی کہ وہ ان اطراف میں جہادی یلغار کر کے ان علاقوں کو فتح کریں، نیز اس غزوے کے بعد مدینہ منورہ پہنچ جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ مسلسل اہم ترین معاملات میں مصروف رہے۔ مدینہ پہنچتے ہی منافقوں کی تعمیر کردہ مسجد ''مسجد ضرار'' کا اہم واقعہ پیش آیا اور جو لوگ اس غزوے میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرتیں پیش کرتے رہے۔ ان میں منافقین بھی شامل تھے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر جھوٹے بہانے پیش کیے اور بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کا پول کھول کر انھیں رسوا کر دیا۔

غزوے میں پیچھے رہ جانے والوں میں سے بعض مخلص مسلمان بھی تھے جو محض اپنی غفلت اور کاہلی کی وجہ سے غزوے میں نہیں جا سکے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر جھوٹ کا سہارا لینے کی بجائے اپنی تقصیر اور کوتاہی کا اعتراف کیا۔ یہ تین آدمی تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور نام سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (ان کے دو باقی ساتھیوں کے نام ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہما ہیں۔) رسول اللہ ﷺ نے ان کی باتیں سن کر کچھ عرصے تک کے لیے ان کا سوشل بائیکاٹ کرتے ہوئے ان سے بات چیت ترک کر

دی اور تمام مسلمانوں کو بھی حکم فرمایا کہ ان کا فیصلہ ہونے تک کوئی بھی مسلمان ان کے ساتھ بات نہ کرے۔

آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرتے ہوئے سورۃ التوبہ کی آیات 118,117 نازل فرمائیں۔ قیامت تک قرآن مجید میں ان آیات کی تلاوت ہوتی رہے گی۔ (فتح الباري: 242/16، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 398)

سورۂ توبہ آیت 38 تا 52 میں غزوۂ تبوک کی تفصیل اور منافقین کے کردار کو بڑے جامع انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں اس غزوے (تبوک) کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

''(اے نبی!) آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (برابر ہے۔) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ انھیں نہیں بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ بلاشبہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے (اوروں سے) کہا کہ گرمی میں کوچ نہ کرو۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: جہنم کی آگ (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھتے۔ پس انھیں چاہیے کہ وہ بہت تھوڑا ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔ (اے نبی!) پھر اگر اللہ آپ کو ان (منافقین) میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ آپ سے (جہاد پر) نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیے: تم اب میرے ساتھ کبھی بھی (جہاد پر) نہیں نکلو گے اور نہ کبھی میرے ساتھ مل کر دشمن سے لڑو گے، یقیناً تم پہلی بار (پیچھے) بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے تھے تو (اب بھی) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور (اے نبی!) ان میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ حالت فسق میں مرے۔ اور (اے نبی!) ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں۔ اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالت کفر میں نکلیں۔ اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس

کے رسول کے ساتھ (مل کر) جہاد کرو تو ان کے دولت مند آپ سے اجازت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہیں۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے، لہٰذا وہ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول (ﷺ) نے اور جو لوگ آپ کے ساتھ ایمان لائے، انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور بھلائیاں بھی انھی لوگوں کے لیے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم کامیابی ہے۔ اور دیہاتیوں میں سے بہانے باز آئے تا کہ انھیں اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ رہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا، ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں جلد ہی دردناک عذاب آ پکڑے گا۔ ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ اسے خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہوں۔ نیکی کرنے والوں پر (گرفت کی) کوئی راہ نہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (اے نبی!) نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جو آپ کے پاس آئیں تا کہ آپ انھیں (سفر جہاد کے لیے) سواری دیں (اور) آپ نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اس حال میں لوٹ گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی تھیں اس غم سے کہ ان کے پاس کچھ نہیں جسے وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں۔ (اے نبی!) (گرفت کی) راہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو آپ سے رخصت مانگتے ہیں، حالانکہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ پیچھے (گھروں میں) رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، چنانچہ وہ نہیں جانتے۔ وہ (منافق) تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے: تم عذر پیش نہ کرو، ہم ہرگز تمھارا یقین نہیں کریں گے، بلاشبہ اللہ نے تمھارے حالات سے ہمیں آگاہ کر دیا ہے اور اللہ جلد تمھارے عمل دیکھ لے گا اور اس کا رسول بھی، پھر تم چھپی اور کھلی (باتیں) جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں بتا دے گا جو تم عمل کرتے رہے۔ عنقریب وہ تمھارے

لیے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے تا کہ تم ان سے درگزر کرو، چنانچہ تم ان سے درگزر (ہی) کرو۔ بلاشبہ وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، ان (کاموں) کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔ وہ تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ ان (لوگوں) سے راضی نہیں ہوتا جو نافرمان ہیں۔'' (التوبۃ 9:80-9)

جو اہل ایمان اس غزوے میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رضا کا سرٹیفیکیٹ دیتے ہوئے فرمایا:

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور ان تین افراد پر بھی (مہربانی فرمائی) جنھیں (حکمِ الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا، حتی کہ جب زمین فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں (بھی) ان پر تنگ ہوگئیں اور انھوں نے سمجھا کہ اللہ (کے غضب) سے خود اس کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تا کہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ اہل مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کے لائق نہیں تھا کہ وہ (جہاد میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ (جائز تھا) کہ اپنی جانوں کو نبی کی جان سے زیادہ عزیز رکھیں، یہ اس لیے کہ بلاشبہ یہ وہ (لوگ) ہیں کہ انھیں اللہ کی راہ میں جو بھی پیاس اور تھکاوٹ اور بھوک (کی تکلیف) پہنچتی ہے اور وہ جو بھی ایسی جگہ روندتے ہیں جو کافروں کو سخت ناگوار ہو اور وہ دشمن سے جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور وہ جو بھی چھوٹا اور بڑا خرچ کرتے ہیں اور وہ جو بھی وادی طے کرتے ہیں وہ (سب) ان کے لیے لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ انھیں ان کاموں کی بہترین جزا دے جو وہ کرتے ہیں۔ اور مومنوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب ہی (جہاد کے لیے)

نکل کھڑے ہوں تو ہر فرقے میں سے ایک گروہ دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلا؟ تا کہ وہ جب اپنے قبیلے میں واپس جائیں تو انھیں خبردار کریں تا کہ وہ (پیچھے والے بھی اللہ سے) ڈریں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب وجوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔'' (التوبة 9:117-123)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں حج کی ادائیگی (9 ہجری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان 8 ہجری میں مکہ مکرمہ فتح کیا۔ اس سال آپ نے حج کیا نہ کسی کو امیر حج کی حیثیت سے تعینات کیا۔ (ان دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سیدنا عتاب بن اسید اموی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کے امیر (گورنر) تھے۔ اس سال لوگوں نے ان کی سربراہی میں حج ادا کیا۔ (تهذيب التهذيب: 89/7)) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کی طرف سے آنے والے وفود کے استقبال، غزوات (غزوۂ تبوک وغیرہ) اور سرایا میں مصروف رہے۔ جب 9 ہجری میں حج کی فرضیت کا حکم نازل ہوا اور حج کے دن آئے تو بھی آپ حج کے لیے تشریف نہ لے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین عرب نے بھی حج کے لیے آنا تھا اور وہ اپنے خود ساختہ مروجہ سابقہ طریقے کے مطابق حج کرتے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے آپ نے حج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ مشرکین برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ میں اس وقت حج کروں گا جب یہ طریقہ ختم ہو جائے گا۔ (السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 536/2)

سن 9 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ ان کے روانہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بلا کر سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات ان کے حوالے کرتے ہوئے انھیں بھی مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ حج کے موقع پر آپ کی جانب سے یہ اعلان کر دیں۔ ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ خون اور مال کے عہد و پیمان کے سلسلے میں عرب کا یہی دستور تھا کہ آدمی یا تو خود ایسا اعلان کرے یا اپنے خاندان کے کسی قریب ترین فرد سے یہ اعلان کرائے۔ خاندان سے باہر کے کسی آدمی کا کیا ہوا ایسا اعلان تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

ان آیات میں مشرکین کے لیے یہ اعلان اور پیغام تھا کہ آج کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہیں آسکیں

گے۔ اہل حرم کے ساتھ آپ نے جو عہد و پیمان کیا ہوا تھا، آج سے وہ بھی کالعدم ہے۔ عرب کے دستور کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بات کا اہتمام کیا کہ آپ کی طرف سے آپ کے اہل بیت کا کوئی فرد ہی یہ اعلان کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے اہل بیت ہی سے کوئی آدمی یہ اعلان کرے۔

(صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4655، ومسند أحمد: 212/3)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''قصواء'' نامی اونٹنی پر سوار ہو کر ذوالحلیفہ کے مقام پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں آتے دیکھا تو بصد احترام دریافت کیا کہ آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں یا مأمور کی حیثیت سے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی نہایت ادب سے بتلایا کہ میں امیر نہیں بلکہ مأمور کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 69/4 وجامع الترمذي، حديث:3091)

اس کے بعد سلسلۂ سفر جاری ہوا اور یہ حضرات مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیر حج تھے۔ حج کا خطبہ بھی انھوں نے ارشاد فرمایا اور نمازوں کی امامت کا فریضہ بھی وہی ادا فرماتے رہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سورۂ توبہ کی درج ذیل آیات لوگوں کے مجمع میں پڑھ کر سنائیں:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ ..... اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

''(اے مسلمانو!) جن مشرکین سے تم نے عہد کر رکھا تھا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان سے (اعلان) براءت ہے تو (اے مشرکو!) تم زمین میں چار ماہ چل پھر لو اور جان لو کہ بے شک تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے تمام لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ بلاشبہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہیں، لہٰذا (اے مشرکو!) اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے (حق سے) منہ موڑے رکھا تو جان لو کہ یقیناً تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (اے نبی!) آپ ان کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں۔ لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا ہے، پھر انھوں نے تمھارے حق میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان سے (مقررہ) مدت تک ان کا عہد پورا کرو، بے

شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے، پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انھیں پکڑ لو اور ان کا محاصرہ کر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (اے نبی!) اگر مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دیں یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے۔ بھلا مشرکوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیونکر ہو سکتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا تھا، پھر (جب تک) وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں تو تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔ بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ کس طرح (مشرکوں سے عہد رہ سکتا ہے؟) جبکہ ان کا یہ حال ہے کہ اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو وہ تمھارے معاملے میں رشتے داری کا لحاظ کریں گے نہ کسی عہد کا۔ وہ اپنے مونہوں (زبانوں) سے تمھیں خوش کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ انھوں نے اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت میں بیچا، پھر (لوگوں کو) اس کے راستے سے روکا، بے شک برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ کسی مومن کے معاملے میں رشتے داری کا لحاظ کرتے ہیں نہ کسی عہد کا اور وہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں تو وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں۔ اور ہم (اپنی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے (ان) سرداروں سے جنگ کرو، بے شک ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں تاکہ وہ باز آئیں۔ کیا تم ان لوگوں سے نہیں لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسول کو (مکہ سے) نکالنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی پہلے پہل تم سے لڑائی شروع کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک)

بخشے گا۔ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا؟ جبکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ ان کی خوب خبر رکھتا ہے۔ مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جبکہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ انھی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو صرف وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکاۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا، لہٰذا امید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس شخص کے (اعمال کے) مانند قرار دے رکھا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے رحمت اور رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ بے شک اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے باپ اور تمھارے بھائی ایمان پر کفر کو پسند کریں تو تم (ہرگز) انھیں دوست نہ بناؤ۔ اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (اے نبی!) کہہ دیں: اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ قبیلہ اور جو مال تم نے کمائے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو (یہ سب) تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یقیناً اللہ نے بہت سے مقامات پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جب تمھاری کثرت

نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے، پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا توجہ فرمائے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو! بلاشبہ مشرک تو ہیں ہی پلید، لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو اگر اللہ چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' (التوبة 9:1-28)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے لوگوں کے مجمع میں ان آیات کی تلاوت کر کے عام اعلان کر رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر بعض صحابۂ کرام یہی پیغام دور والے لوگوں تک پہنچانے میں مصروف تھے جن تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی آواز براہِ راست نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ لوگوں کو باور کرا رہے تھے کہ آئندہ کوئی بھی مشرک حج نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح کوئی بھی آدمی برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے پہلے جس حج میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے روانہ فرمایا تھا، اس حج کے موقع پر یوم النحر، یعنی دس ذوالحجہ کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں، یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کر سکے گا نہ کوئی آدمی برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف کرے گا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4363)

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے اور آپ کے قائم مقام تھے جن پر لوگوں کو کامل اعتماد اور بھروسا تھا، بالخصوص وہ لوگ جن کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عہد و پیمان تھے وہ انھیں قریب سے جانتے تھے، اس لیے عربوں نے ان کی باتوں کو اہمیت دی کیونکہ ان کا دستور تھا کہ کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنا ہوتا یا معاہدہ ختم کرنا ہوتا تو اس قبیلے کا سردار یا اس کے خاندان میں سب سے قریبی آدمی اس کا اعلان کرتا۔ (السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 2/539)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ اہم ذمے داری سونپے جانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کا یہ اعلان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف سے ہے۔ ایک دفعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ 9 ہجری میں حج کے موقع پر آپ کو کس بات کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ انھوں نے فرمایا: مجھے چار باتوں کا اعلان کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

① جنت میں صرف وہ لوگ جائیں گے جو ایمان دار ہوں گے۔

② آیندہ کوئی آدمی برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔

③ آج کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کافر مسجد حرام میں اکٹھے نہیں ہوں گے، یعنی وہ بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکیں گے۔

④ جن لوگوں کا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ ہے وہ اپنی مقررہ مدت تک جاری رہے گا۔ اور جن لوگوں کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے، انھیں آیندہ چار ماہ تک کی مہلت دی جاتی ہے۔

(زاد المعاد: 655، وجامع الترمذي، حديث:3091، ومسند أحمد:79/1)

بعض لوگ اس واقعے سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مابین افضلیت کا پہلو کشید کرنے کی سعی نامشکور کرتے ہیں، حالانکہ اس واقعے میں ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فضیلت کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں۔ ہر دو حضرات کو اللہ کی طرف سے فضیلت اور بلند مقام حاصل ہے اور دونوں ہی کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ ذمے داری سونپی تھی۔ جو ذمے داری انھیں سونپی گئی دونوں نے اسے بجا طور پر ادا کیا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ایک دوسرے کا ادب اور احترام بجا لاتے تھے۔ بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہر ایک کی ذمے داری کو ادا کرنے میں پورا پورا ساتھ دیا۔ ان ذمے داریوں کی ادائیگی میں باقی صحابۂ کرام بھی ان کے ساتھ برابر شریک رہے۔ ان کا تعلق مناسک حج کی ادائیگی سے تھا یا سورۂ توبہ کی آیات عام لوگوں تک پہنچانے سے، ہر ایک نے ان امور کی انجام دہی میں حتی الامکان بھرپور حصہ لیا۔ ان سب کا ایک ہی ہدف تھا کہ حج کے موقع پر اور اس کے بعد کلمۂ توحید ''لا الہ الا اللہ'' سربلند رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو بیت اللہ کا حج کرنے اور برہنہ حالت میں طواف کرنے سے روکنے کے جس اعلان کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ڈیوٹی لگائی تھی، ہم آج بھی اس کے اسی طرح پابند ہیں۔ حج کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابۂ کرام کی زبانی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلانِ براءت سن کر مشرکین مکہ مکرمہ سے

دوسرے علاقوں کی طرف فرار ہوگئے تھے، اس لیے بعد کے ادوار میں مسلمانوں کو اس اعلان کے دہرانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کیونکہ مکہ مکرمہ میں شرک اور مشرکین کا یکسر خاتمہ ہو چکا تھا۔

9 ہجری والا یہ حج مشرکین کے لیے سخت قسم کی تنبیہ اور آئندہ سال کے حج (حجۃ الوداع 10 ہجری) کی تمہید تھا۔

مقدس ترین شہر (مکہ مکرمہ) مشرکین کے وجود نا مسعود سے پاک ہو چکا تھا اور پاکیزہ نفس حجاج کرام، موحدین کے حج کے اس عظیم الشان اجتماع میں رسول اللہ ﷺ کے استقبال کے لیے موجود تھے جس میں اللہ کے رسول ﷺ اپنی امت کو الوداع کہنے والے تھے تاکہ اس موقع پر موجود لوگ رسول اکرم ﷺ کے خطبات اور مواعظ سن کر ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس موقع پر حاضر نہیں تھے۔

مختلف قبائل کے وفود کی آمد

(امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کی ''کتاب المغازی'' میں قبائل کے نام لکھ کر دس قبائل کے وفود کی مدینہ منورہ آمد کا تذکرہ کیا ہے، نیز وفود کے حوالے سے متعدد مستقل کتب بھی تصنیف کی گئی ہیں۔)

وفود، وفد کی جمع ہے۔ کسی قوم یا قبیلے کے سرکردہ اور منتخب افراد جو حکمرانوں اور سربراہوں کی ملاقات کے سلسلے میں اپنی قوم کی نمایندگی کریں، ان کے مجموعہ کو ''وفد'' کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت چونکہ آفاقی اور عالمگیر ہے، اس لیے دعوتِ اسلام کے آغاز ہی سے آپ کی کوشش رہی کہ اس سلسلے میں مختلف قبائل کے نمایاں افراد اور وفود سے رابطے میں رہ کر ان تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔

اس کی شدید ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب قریش مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بہت زیادہ رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کر دیں۔ آپ حج کے دنوں میں حج کے لیے آئے ہوئے مختلف قبائل کے ہاں جا کر، ان سے ملاقات کر کے، انھیں اسلام کی دعوت پہنچاتے اور ان سے اس سلسلے میں تعاون طلب فرماتے۔ اکثر مواقع پر آپ کے انتہائی مخلص رفیق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ ہوتے۔ وہ مختلف قبائل اور ان کے انساب کے حوالے سے کافی معلومات رکھتے تھے۔ (السیرۃ النبویۃ للصلابی: 2/387)

ان ملاقاتوں میں آپ کو مختلف ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا، تاہم اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اخبار و اطلاعات پورے عرب میں پھیلتی رہیں۔ ہجرت سے پہلے بھی آپ کی متعدد قبائل سے ملاقاتیں رہیں۔ اس طرح عرب کا ہر قبیلہ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی دعوت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ ہجرت کے بعد بالعموم اور معرکہ بدر کے بعد بالخصوص ہر طرف رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے چرچے تھے۔

صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ عرب قبائل میں سے ہر ایک کو اختیار ہوگا کہ وہ محمد ﷺ اور قریش میں سے جس کے چاہیں اتحادی بن جائیں۔

صلح کی اس شق کی رو سے بنوخزاعہ، نبی ﷺ کے اور بنوبکر، قریش کے اتحادی بن گئے۔ لیکن ہوا یہ کہ قریش کے تعاون اور حمایت سے بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ گویا قریش نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر جو صلح کی تھی، انھوں نے اسے ختم کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مکہ مکرمہ فتح کرنے اور وہاں سے قریش کے قبضے اور کنٹرول کو ختم کرنے کا جواز مل گیا۔

مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ مکرمہ فتح ہو جانے کے بعد عرب کے تمام قبائل پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اب جزیرۂ عرب کی قیادت کی باگ ڈور صرف رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان حالات کے پیش نظر 9 ہجری میں عرب قبائل کے وفود اس کثرت سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ آئے کہ اس سال کا نام ہی ''عام الوفود'' یعنی وفودِ عرب کی آمد کا سال پڑ گیا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 559/3) اگرچہ ان میں سے بعض قبائل اس سے بہت پہلے 5 ہجری میں بھی مدینہ آ چکے تھے لیکن پھر بھی وہ 9 ہجری میں دوبارہ آئے۔ (السيرة النبوية لمحمد أبي شهبة: 542/2)

ہر قبیلہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات میں اپنی اپنی حیثیت اور شرف کا اظہار کرتا تھا۔ وفود میں آنے والے ان کے خطیب اور شعراء اپنا اپنا کلام اور قصیدے پیش کرتے تو رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو ان کے خطبوں اور قصیدوں کے جواب میں خطبے اور قصیدے پیش کرنے کا حکم فرماتے۔

رسول اللہ ﷺ کا مرکزی ہدف محض یہ تھا کہ اللہ کے دین، اس کی دعوت اور عدل و انصاف کا دنیا میں بول بالا ہو۔ آپ کے رویے سے کسی عصبیت یا فخر کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان وفود سے ملاقات کے بہترین نتائج برآمد ہوئے اور آنے والے افراد نے رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور بلند مرتبت کا دل کی گہرائی سے اعتراف کیا۔

آپ ان وفود کا پورا پورا اکرام بجا لاتے۔ تحائف سے نوازتے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ فرماتے۔ صحابۂ کرام کو بھی حکم دیا جاتا کہ وہ بھی انھیں اللہ کے دین اور احکام سے باخبر کرتے رہیں۔ جب کوئی وفد مدینے

سے اپنے علاقے کو واپس جاتا تو آپ صحابۂ کرام میں سے کسی کو ان کے ہمراہ روانہ فرماتے تاکہ وہ ان کے معاملات کی نگرانی اور امور کی اصلاح کرتا رہے۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4365، والتفسير، حديث: 4847) ان کے ہاں جا کر نظامِ زکاۃ جاری کر کے اصحابِ ثروت سے زکاۃ وصدقات وصول کر کے فقراء، غرباء اور مساکین کی دست گیری کرے۔ اس کی حیثیت ان پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے امیر (حاکم) اور معلم کی سی ہوتی۔ آنے والے یہ لوگ آدابِ معاشرت اور کھانے پینے کے امور اور اپنے علاقوں کے مخصوص حالات میں پیش آنے والے مسائل کے بارے میں مختلف سوالات کرتے اور آپ ﷺ حسب موقع اور حسب حال جوابات سے نواز کر ان کی راہنمائی فرماتے۔

ان وفود کی مدینے آمد اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے دوران میں بعض ایسے حالات بھی پیش آئے کہ ان کی مناسبت سے قرآن کریم کی بعض سورتیں اور آیات بھی نازل ہوئیں جیسا کہ بنوتمیم کے وفد کی آمد کے حوالے سے سورۃ الحجرات نازل ہوئی۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4365، والتفسير، حديث: 4847، و تفسير ابن كثير: 1744/2)

ابن ہشام نے وفود کی آمد اور ''سورۃ النصر'' کے نزول کے باہمی ربط کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ سورت ان دنوں نازل ہوئی جب اطراف واکناف سے قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ کی طرف آنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

''(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (النصر 110:1-3)

قبیلۂ دوس کے نمائندے طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی آمد

دوس، یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ ان کا نسب ازد سے ہوتے ہوئے زہران بن کعب کے ساتھ جاملتا ہے۔ آج کل اس قبیلے کو ''زہران'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(الأنساب للسمعانی: 361/5، وجمهرة أنساب العرب، ص: 379)

موجودہ دور میں یہ قبیلہ طائف کے جنوب میں ''الباحۃ'' کے مقام پر آباد ہے۔ یہاں ان کا ایک مشہور قلعہ تھا۔ اپنے دور میں اس قبیلے کی عرب قبائل میں خاص شہرت اور پہچان تھی۔ (الأنساب للمسعانی: 361/5)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے قریش کی سرتوڑ کوشش رہی کہ بیرون شہر سے مکہ مکرمہ آنے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور آپ کی بات سننے سے روکا جائے اور کوئی آدمی آپ کی باتیں نہ سن سکے۔ انھیں یقین تھا کہ جو بھی آدمی ایک دفعہ آپ سے مل کر آپ کی بات سن لے گا، وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

طفیل دوسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ ہی میں تھے کہ وہ ان دنوں مکہ آئے۔ یہ اپنے قبیلے کے نمایاں فرد اور بہترین شاعر تھے۔ قریش کے لوگوں نے جا کر ان سے کہا: طفیل! آپ ہمارے شہر میں تشریف لائے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں ایک آدمی ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہ مذہبی حوالے سے ہم سے الگ نظریات رکھتا ہے۔ اس نے ایک نیا دین پیش کرنا شروع کیا ہے۔ اس نے ہمارے درمیان تفریق ڈال کر ہمارا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ اس کی باتیں جادو اثر ہیں۔ وہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ جس مصیبت سے ہم دوچار ہیں، یہ مصیبت آپ پر اور آپ کی قوم پر بھی نہ جا پڑے۔ بس آپ کسی بھی صورت میں اس کی بات نہ سنیں اور اس سے بات بھی نہ کریں۔

طفیل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اس حد تک خوف زدہ کیا کہ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی بھی بات نہیں سنوں گا اور نہ ان سے کلام ہی کروں گا۔

میں جب مسجد حرام کی طرف جانے کو نکلا تو میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی بات تک سننا نہیں چاہتا تھا۔ میں مسجد حرام میں پہنچا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے قریب کھڑے نماز ادا کر رہے ہیں۔ میں بھی آپ کے قریب جا کر کھڑا

ہوگیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ آپ کا کچھ کلام میں نے سن لیا۔ وہ بہت عمدہ اور اچھا کلام تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں ایک عقل مند اور سمجھدار شاعر ہوں۔ بھلی بری بات میں تمیز کرسکتا ہوں۔ ان کی بات سن لینے میں کیا حرج ہے؟ اگر ان کی بات اچھی ہوئی تو قبول کرلوں گا، غلط ہوئی تو چھوڑ دوں گا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوکر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جب آپ اپنے گھر میں داخل ہوگئے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

میں نے عرض کیا: اے محمد! آپ کی قوم کے لوگوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں۔ اللہ کی قسم! انھوں نے مجھے آپ سے اس قدر ڈرایا اور خوف زدہ کیا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تاکہ آپ کی بات تک نہ سن سکوں۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں نے آپ کا تھوڑا سا کلام سنا ہے جو بہت بھلا لگتا ہے۔ آپ ذرا تفصیل سے مجھے بتلائیں کہ آپ کہتے کیا ہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے مجھے اسلام کی کچھ باتوں سے آگاہ کیا۔ قرآن مجید کی تلاوت مجھے سنائی۔

اللہ کی قسم! میں نے آج تک اس سے بہتر اور عمدہ کلام نہیں سنا تھا۔ میں نے کلمۂ حق کی شہادت دیتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔ میں نے عرض کیا: اللہ کے نبی! میری قوم میں میرا نمایاں مقام ہے۔ میری بات سنی اور مانی جاتی ہے۔ میں واپس جاکر اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دوں گا۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے کوئی خاص علامت عطا کردے تاکہ قوم کو اسلام کی دعوت دینے کے سلسلے میں وہ علامت میری معاون ہو۔ آپ ﷺ نے دعا کی: یااللہ! اسے کوئی علامت عطا فرمادے! چنانچہ میں اپنی قوم کی طرف آتے ہوئے پہاڑی درے پر پہنچا تو میری پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور نمودار ہوا جو چراغ کی مانند روشن تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں گے کہ چونکہ میں نے اپنے آباء واجداد کا دین و مذہب چھوڑ دیا ہے، اس لیے میری شکل بگاڑ دی گئی ہے۔ میں نے دعا کی: یااللہ! اس نور کو میرے چہرے سے کسی دوسری جگہ پر منتقل کردے۔ میری دعا قبول ہوئی اور وہ نور میری لاٹھی میں منتقل ہوگیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ میری لاٹھی کا سرا فضا میں لٹکی ہوئی روشن قندیل کی مانند روشن ہے۔ میں درے سے چلتا ہوا لوگوں کے پاس جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر میرے والد میرے قریب آئے۔ وہ بہت بزرگ ہو چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا: ابا جان! ایک طرف ہٹ جائیں۔ آپ کا مجھ

سے اور میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے کہا: بیٹے! کیوں، کیا بات ہوئی؟

میں نے عرض کیا: میں اسلام قبول کر کے دین محمد ﷺ میں داخل ہو چکا ہوں۔

یہ سن کر انھوں نے کہا: بیٹا! اگر یہ بات ہے تو جو دین تیرا ہے میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں۔

میں نے کہا: آپ اسلام قبول کرتے ہیں تو غسل کر کے پاک صاف لباس پہن کر آئیں تا کہ دین کی جو باتیں میں جانتا ہوں، آپ کو بھی ان سے آگاہ کروں۔

چنانچہ میرے والد نے غسل کیا اور صاف و پاکیزہ لباس زیب تن کر کے میرے پاس آئے۔ تو میں نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد میری بیوی میرے قریب آنے لگی تو میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ مجھ سے دور ہو جا۔ تیرا مجھ سے اور میرا تیرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کہا: کیوں؟ کیا ہوا؟ میں نے بتلایا کہ اسلام نے میرے اور تیرے درمیان تفریق ڈال دی ہے اور میں نے محمد ﷺ کا دین اختیار کر لیا ہے۔ وہ کہنے لگی: جو دین تمھارا ہے، میں بھی اس دین کو قبول کرتی ہوں۔ میں نے کہا: ''ذوالشریٰ'' کے پاس جا کر غسل کرو۔ طفیل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ذوالشری ایک بت کا نام ہے۔ قبیلۂ دوس اس کی پوجا کیا کرتا تھا۔ اس کے قریب پانی کا ایک تالاب تھا جس میں پہاڑ کی بلندی سے پانی آ کر گرتا تھا اور لوگ وہاں نہایا کرتے تھے۔

طفیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میری بیوی نے خوف زدہ ہو کر کہا: آپ کو بچوں کے بارے میں ڈر نہیں لگتا کہ یہ ذوالشریٰ (بت) انھیں نقصان پہنچائے گا۔ میں نے کہا: نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس بات کا ضامن ہوں۔ اس نے جا کر غسل کیا۔ واپس آئی تو میں نے اسے اسلام کی دعوت دی اور اس نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے قبیلے والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ میں نے مکہ مکرمہ جا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اللہ کے نبی! اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں قبیلہ میری بات نہیں مان رہا۔ آپ ان کے خلاف بددعا کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یوں دعا کی: «اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَأْتِ بِهِمْ» ''یا اللہ! دوس قبیلے کو ہدایت قبول کرنے کی توفیق عطا فرما اور انھیں میرے پاس لے آ۔'' نیز فرمایا: تم واپس جا کر ان لوگوں کو نرمی سے اسلام کی دعوت دو۔ میں واپس آ کر لوگوں کو انتہائی نرمی

سے اسلام کی دعوت دیتا رہا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے۔ اور پھر بدر، احد اور خندق کے معرکے ہوئے۔

میں اپنی قوم کے مسلمان ہو جانے والے ستر، اسی خاندانوں کی معیت میں مدینہ منورہ آیا۔ ان دنوں رسول اللہ ﷺ غزوے کے سلسلے میں خیبر گئے ہوئے تھے۔ ہم رسول اللہ ﷺ سے خیبر میں جا ملے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیگر مجاہدین کے ساتھ ہمیں بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 385/1)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ طفیل رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے قبل مکی دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ایک داعی اور مبلغ کی حیثیت سے اپنی قوم کی طرف گئے تو ان کی قوم میں سے چند ہی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ قوم کی اکثریت اسلام قبول کرنے سے انکاری رہی۔ بعد میں وہ ایک دفعہ پھر مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور صورت حال آپ کے گوش گزار کر کے درخواست کی کہ آپ قوم کے خلاف بددعا کریں۔ ان کی درخواست کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے ان کی قوم کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ طفیل رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: میرا قبیلہ ہلاک ہو گیا۔ انھوں نے میری نافرمانی کی اور قبولِ ہدایت سے انکار کیا ہے۔ آپ ان کے خلاف دعا کریں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَأْتِ بِهِمْ» ''یا اللہ! قبیلۂ دوس کو ہدایت سے سرفراز فرما اور انھیں میرے پاس لے آ۔''

(صحيح البخاري، الدعوات، حديث: 6397)

رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول ہوئی۔ یہ قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور ان کے ستر، اسی آدمی طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ منورہ آئے۔

طفیل رضی اللہ عنہ، فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح کے بعد انھیں قبیلۂ دوس کے اطراف ونواح میں موجود بعض بت خانوں کو تہس نہس کرنے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔

(الطبقات لابن سعد: 157/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 385/1)

اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہونے تک آپ کے ساتھ رہے۔

فتنۂ ارتداد کے سد باب اور مرتدین کی سرکوبی کے سلسلے میں ہونے والے متعدد معرکوں میں بھی آپ نے

شرکت کی۔ بالآخر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں 11 ہجری میں معرکۂ یمامہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔(السيرة النبوية لابن هشام: 258/2، والإصابة: 225/2)

وفد عبدالقیس

عبدالقیس، یہ ربیعہ بن نزار کی نسل میں سے ایک قبیلہ ہے۔

(فتح الباري: 207/16، وجمهرة أنساب العرب، ص: 295)

بحرین کے گرد ونواح کا علاقہ ان کا اصل وطن ہے۔ ان میں سے بعض لوگ شہروں میں اور کچھ دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اسلام سے ان کا تعلق بہت قدیم ہے۔ اس قبیلے کا ایک وفد 5 ہجری سے بھی قبل مدینہ منورہ آیا تھا۔ اس وفد کے شرکاء میں ایک شخص اشجّ عبدالقیس تھا۔ اشج اس کا تخلص تھا۔ نام عبداللہ یا منذر بن عوف تھا۔ (الإصابة: 356/2) یہ ان میں سے خاصا دانا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مدح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«إِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ: الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ»

''تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ بردباری اور طبیعت میں ٹھہراؤ۔''

(صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 18)

قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہونے والی جنگی چپقلش کے ابتدائی زمانے ہی میں یہ وفد مدینے آیا تھا جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ''باب وفد عبدالقیس'' کے زیر عنوان ایک حدیث ذکر کی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وفد عبدالقیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''تم کسی رسوائی اور شرمندگی کے بغیر آئے ہو۔ ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔'' دوران گفتگو ان لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہمارے اور آپ کے مابین مضر قبیلے کے مشرکین حائل ہیں، اس لیے ہم آپ کی خدمت میں حرمت والے مہینوں ہی میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ آپ ہمیں مختصر مگر جامع قسم کی ہدایات فرمائیں جن پر عمل کر کے ہم جنت کے حقدار ٹھہریں اور اپنے قبیلے میں جا کر باقی لوگوں کو بھی وہ باتیں بتلائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمھیں چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار کاموں سے روکتا ہوں۔ ① اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو اللہ پر ایمان لانے کا کیا مفہوم ہے؟

اللہ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اعتراف اور دل سے اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں۔ ② باقاعدگی سے نماز ادا کرنا۔ ③ زکاۃ ادا کرنا۔ ④ رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔ نیز میں تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ مالِ غنیمت میں سے خمس (پانچواں حصہ) ادا کیا کرو۔ اور میں تمھیں چار قسم کے برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کرتا ہوں۔ ① کدو کے برتن سے۔ ② لکڑی کو کھود کر اور کھرچ کر بنائے ہوئے برتن سے۔ ③ سبز روغن کردہ مٹکے۔ ④ اور تارکول سے روغن شدہ برتنوں سے۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4368)

اس وفد میں ''جارود بن عمرو'' بھی شریک تھا۔ وہ نصرانی مذہب کا حامل تھا، البتہ اس نے اسلام قبول کرنے میں رغبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: میں اس وقت ایک دین پر کاربند ہوں۔ میں آپ کے دین کو قبول کرنے کی خاطر اپنا دین چھوڑ دوں تو کیا آپ اس بات کے ضامن ہیں کہ میں ہدایت پر ہوں گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، میں اس بات کا ضامن ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت سے سرفراز فرمائے گا اور تم پہلے سے بھی بہتر حالت میں آجاؤ گے۔'' چنانچہ اس نے اور اس کے باقی تمام ساتھیوں نے اسلام قبول کرلیا۔

(الإصابة: 216/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 575/4)

عبدالقیس کے اس وفد نے اسلام قبول کرنے کے بعد بہت اچھا وقت گزارا۔ ان لوگوں کے ذریعے سے اسلام کی کرنیں بحرین کی ''جواثیٰ'' نامی بستی اور اس کے نواح تک پہنچ گئیں۔ اسی حوالے سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کی ''جواثیٰ'' نامی بستی میں عبدالقیس کی مسجد میں ادا کیا گیا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث:4371 یہ مسجد قطیف کے نواح میں واقع صوبہ الاحساء میں آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے اب تک موجود ہے جس کا میں خود مشاہدہ کر چکا ہوں۔)

اس وفد نے واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ سے سواریاں طلب کیں تو آپ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا: آج کل ہمارے حالات کشادہ نہیں ہیں، اس لیے تمھارے لیے سواریاں مہیا کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 575/4) ان لوگوں نے کہا کہ راستے میں ہمیں کچھ ایسے جانور اونٹ وغیرہ مل جاتے ہیں جن کے متعلق کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس کے ہیں؟ کیا ہم ایسے جانوروں کو قبضے میں لے کر، ان پر سوار ہو کر اپنے علاقوں کی طرف جا سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے انھیں ایسے جانوروں کو پکڑ کر قابو کر لینے سے منع کرتے

ہوئے فرمایا: ''ایسے جانور آگ (جہنم) کا ایندھن ہیں۔''

اسی طرح آپ نے ان کو تعلیم دی کہ لوگوں کے اموال ان کے لیے حرام ہیں اور انھیں اپنے قبضے میں لانا جائز نہیں، حالانکہ ان لوگوں کو سواریوں کی اشد ضرورت تھی۔ یہ جانور صحراؤں اور جنگلوں میں آوارہ پائے جاتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ جانور کس کے ہیں اور ان کا مالک کون ہے؟ اس کے باوجود آپ نے ان کو ایسے جانوروں کو پکڑنے سے منع فرمایا۔ (زاد المعاد، ص: 661)

تاریخ میں یہ بھی ہے کہ اس وفد کے آنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ''عنقریب تمھارے پاس ایک ایسا وفد پہنچنے والا ہے جو اہل مشرق کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہے۔'' (السيرة النبوية لابن كثير: 90/1)

آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اٹھ کر ان لوگوں کی طرف گئے۔ یہ تیرہ آدمی تھے۔ آپ نے جا کر انھیں رسول اللہ ﷺ کی اس بات سے آگاہ کر کے خوشخبری دی۔ اس طرح یہ لوگ بہترین دین اور اخلاق و امانت کے حوالے سے شاندار اصول و ہدایات لے کر اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ ان کے اسی حسن اسلام اور حسن اخلاق کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب ان علاقوں میں ارتداد کے فتنے نے سر اٹھایا تو اسی جارود رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر سر عام خطبہ دیا اور مرتد ہونے والوں کو اسلام کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے اپنے متعلق کھلم کھلا اعلان کیا کہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم ہے اور گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں اور بے شک محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے برملا کہا: ''جو آدمی اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 575/4)

وفد ثقیف

بنو ثقیف کا نسب مضر کی طرف سے ہوتے ہوئے ہوازن کی طرف لوٹتا ہے۔

(الأنساب للسمعاني: 134/3، وجمهرة أنساب العرب، ص: 266)

یہ قبیلہ مکہ مکرمہ کے قریب ایک بڑے شہر ''طائف'' میں آباد تھا اور اس قبیلے والوں کا اہل مکہ سے بڑا مضبوط اور گہرا تعلق تھا۔ یہاں کی آب و ہوا خوشگوار اور زمین زرعی حوالے سے بہت زرخیز تھی۔ یہاں کے چھوٹے

چھوٹے زرعی قطعات پیداواری صلاحیت میں بہت مشہور تھے۔ مکہ کے تاجروں نے وہاں زراعت کے علاوہ فام ہاؤس اور تفریح گاہیں بھی بنا رکھیں تھیں۔ یہ ان کا گرمائی علاقہ تھا۔ وہ موسمِ گرما میں موسم کی شدت اور حدت سے بچنے کے لیے گرمی کے دن گزارنے کے لیے ادھر نکل آتے تھے۔

(معجم البلدان: 11/4، ومعجم معالم الحجاز للبلادی: 224/5)

طائف میں ثقیف کے ساتھ ہوازن قبیلہ بھی رہتا تھا لیکن شہری آبادی پر ثقیف ہی کا کنٹرول تھا۔ دوسرے لفظوں میں ثقیف شہری تھے اور ہوازن دیہاتی تھے۔ ثقیف کے لوگ مشرک تھے اور مشہور بت ''لات'' کے پجاری تھے۔ (معجم استعجم: 886/3، ومعجم البلدان: 11/4) اس بت کا تذکرہ درج ذیل قرآنی آیات میں ہوا:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ ﴾

''کیا پھر تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔'' (النجم 20,19:53)

غزوۂ حنین میں بنو ثقیف نے ہوازن اور دیگر قبائل کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جنگ میں مسلمانوں کے کسی قدر نقصان کے بعد بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی اور انھیں فتح سے ہمکنار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ کی درج ذیل آیات میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''یقیناً اللہ نے بہت سے مقامات پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جب تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے، پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں عذاب دیا اور کافروں

کی یہی سزا ہے، پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا توجہ فرمائے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (التوبة 9:25-27)

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد شوال 8 ہجری میں غزوۂ حنین سے فارغ ہونے کے بعد طائف کا رخ کیا اور تقریباً بیس دن تک اس کا محاصرہ کیے رکھا۔ آپ نے محاصرے کے دوران میں منجنیق اور توپ کا بھی استعمال کیا۔ اس کے باوجود طائف کو سر کرنا مسلمانوں کے لیے دشوار رہا۔ طائف کے قلعے کی مضبوط دیواریں مسلمانوں کی فتح کے راستے میں آڑے آتی رہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ اب طائف کو فتح کرنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد آپ نے طائف کو فتح کرنے اور اس پر غلبہ پانے کا خیال ترک کر کے مکہ کی راہ لی۔

حنین اور مکہ کے درمیان ایک مقام ''جعرانہ'' ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے اموالِ غنیمت جمع کر کے رکھے تھے۔ طائف کے بادیہ نشین، ہوازن کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غزوۂ حنین میں ان کے بہت سے لوگوں کو مسلمانوں نے گرفتار کر کے قیدی بنا لیا تھا۔ انھوں نے انتہائی شرمندگی کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ان کے اموال اور قیدی واپس کر دیے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اختیار دیا کہ وہ یا تو اپنے اموال واپس لے لیں یا قیدی چھڑوا لیں۔ انھوں نے اپنے قیدی چھڑوا لینے کو ترجیح دی۔ ان کے جو قیدی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خاندان کے لوگوں کے حصے میں آئے تھے، آپ نے ان سب کو آزاد کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے باقی مسلمانوں نے بھی ہوازن کے قیدیوں کو رہائی دے دی۔ ہوازن کا ایک سرکردہ لیڈر ''مالک بن عوف'' فرار ہو کر ثقیف کے ہاں طائف میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی قوم کے لوگوں کے ذریعے سے اسے پیغام بھیجا کہ اگر وہ توبہ کر کے ہمارے ہاں چلا آئے تو اس کا مال اور اہل وعیال واپس کرنے کے علاوہ ہم اسے مزید ایک سو اونٹ بھی عطا کریں گے۔ اس نے یہ پیغام سنا تو نبیٔ کریم ﷺ کی مدح سرائی کرتے ہوئے خوشی خوشی آ گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے اسے اس کی قوم کے ان لوگوں کا حاکم مقرر کر دیا جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، نیز رسول اللہ ﷺ نے اسے

طائف میں پناہ لینے والے ثقیف کے لوگوں کے ساتھ جنگ کر کے ان پر گھیرا تنگ کرنے کی ذمے داری سونپی۔ فتح مکہ کے بعد مکہ سے فرار ہونے والوں کے لیے طائف ایک محفوظ پناہ گاہ تھی، مالک بن عوف رضی اللہ عنہ نے جا کر ثقیف کے ساتھ جنگ کی اور ان کے لیے تنگی اور شدت کا ماحول پیدا کر دیا۔ وہ سخت مشکل سے دوچار ہوئے۔

اسی دوران میں عروہ بن مسعود ثقفی نے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہ اپنی قوم کے محبوب اور مقبول ترین فرد تھے۔ بعد میں وہ اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے طائف گئے۔

انھوں نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان و اظہار کیا تو ان کی قوم کے لوگوں نے ان پر ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک تیر انھیں جا لگا۔ جب وہ زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے تو ان سے پوچھا گیا: تمھارا اپنے قتل کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انھوں نے کمال اطمینان سے جواب دیا: یہ قتل (موت) میرے لیے شہادت کا اعزاز ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے سے پہلے جن لوگوں کو مکے میں قتل کر دیا گیا تھا، میں بھی ان شاء اللہ انھی جیسا شہید ہوں۔ میری وفات کے بعد مجھے ان کے قریب ہی دفن کرنا۔

صحابہ کرام اور اہل علم کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

«إِنَّ مِثْلَهُ فِي قَوْمِهِ كَمِثْلِ صَاحِبِ يَاسِينَ فِي قَوْمِهِ»

''بلاشبہ اس کی اپنی قوم میں وہی مثال ہے جو سورہ یٰسین میں مذکور آدمی کی اپنی قوم میں ہے۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 538/4، والإصابة: 478/2)

اس واقعے کے چند ہی مہینوں بعد ثقیف کو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ اور مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تو انھوں نے ایک وفد تشکیل دے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس وفد کی آمد کا پتہ چلا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خوشی خوشی ان کے آنے کی خبر دی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 539/4)

ان کی آمد پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے قیام کے لیے مسجد کے ایک کونے میں خیمہ نصب کرایا۔ سیدنا خالد

بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے مابین پیغام رساں تھے۔ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک تحریری معاہدہ طے پایا جسے سیدنا خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کے لیے کھانا بھیجا جاتا تو پہلے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس میں سے کچھ کھانا تناول کرتے، اس کے بعد وہ لوگ کھانا کھاتے۔ آخر کار انھوں نے کلمہ پڑھ کر دین اسلام قبول کر لیا اور معاہدہ بھی تحریر ہو گیا۔ دوران گفتگو ان لوگوں نے ایک مطالبہ یہ رکھا کہ ان کے بت ''لات'' کو تین برس تک کچھ نہ کہا جائے اور اسے اپنی اسی حالت پر برقرار رہنے دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ بات تسلیم نہ کی۔ وہ اس مطالبے میں بتدریج کمی کرتے کرتے یہاں تک آ گئے کہ کم از کم اگلے ایک مہینے تک اسے اسی حالت میں باقی رہنے دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں ذرہ بھر بھی لچک نہ دکھائی اور اسے باقی رکھنے کے لیے کوئی مہلت نہ دی۔ اس مطالبے سے بظاہر ان کا مقصد یہ تھا کہ اس بت کے باقی رہنے کی صورت میں وہ لوگ اپنی قوم کے شریر لوگوں کے شر سے محفوظ رہیں گے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پہلے ان کی ساری قوم مسلمان ہو جائے، پھر اس بت کو منہدم کر دیا جائے۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں ذرہ برابر بھی لچک نہ دکھائی اور سیدنا ابوسفیان بن حرب اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو روانہ فرمایا کہ جا کر اس بت کو تہس نہس کر دیں۔

ثقیف کے اس وفد کے شرکاء نے ایک اور مطالبہ بھی کیا تھا کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد انھیں نماز کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا جائے اور انھیں اپنے ہاتھوں سے بت توڑنے کا مکلّف نہ کیا جائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہاں تک تمھارے ہاتھوں بتوں کے پاش پاش کرنے کا تعلق ہے، ہم تمھیں اس کا مکلّف نہیں ٹھہرائیں گے۔ باقی رہی بات نماز کی تو جس دین میں نماز نہ ہو، اس میں کچھ بھی خیر نہیں۔ (سنن أبي داود، حديث: 3026) آپ کی پُرعزم گفتگو سن کر انھوں نے کہا کہ اے محمد ﷺ! آپ جو کہیں گے، ہم اس پر عمل کریں گے۔ خواہ ہمیں کتنی ہی مشقت اور صعوبت برداشت کرنی پڑے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 540/4)

وہ کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاہدہ تحریر کر دیا۔ سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان پر حاکم اور امیر تعینات فرمایا۔ یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کو

سمجھنے، اس کی تعلیمات سے واقف ہونے اور قرآن سیکھنے کے بارے میں یہ ان سب سے زیادہ حریص اور سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے تھے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے یہ نوجوان اسلام کو سمجھنے اور اس کی تعلیمات سے واقفیت رکھنے اور قرآن کے سیکھنے کے بارے میں ان سب سے زیادہ رغبت رکھتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بقیہ زندگی میں اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پورے عہد خلافت میں وہی ان کے حاکم رہے۔(سیر أعلام النبلاء: 374/2)

قیامِ مدینہ کے دوران میں اس وفد نے قرآن مجید کا کچھ حصہ اور دین کے بہت سے مسائل سیکھ لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا کہ لات کو پاش پاش اور منہدم کرنے کے لیے بعض دوسرے حضرات کو بھیجا جائے گا اور وہ اسے ایک لحظہ کے لیے بھی باقی نہیں رہنے دیں گے، چنانچہ آپ نے اس وفد کی واپسی پر ان کے ہمراہ اپنے آدمیوں کا ایک وفد روانہ فرمایا تاکہ وہ ان لوگوں کی موجودگی میں اور ان کی حمایت وتعاون کے ساتھ بت کو پاش پاش کر دیں۔ جب اس بت کو پاش کیا جا رہا تھا تو ثقیف کی بعض عورتیں اپنے معبود کا یہ حشر دیکھ کر زاروقطار رو رہی تھیں۔(السيرة النبوية لابن هشام: 542/4)

اس کے بعد بنوثقیف میں اور طائف کی شہری آبادی میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اسلام پر ثابت قدم رہے اور ان میں سے کوئی بھی اسلام چھوڑ کر مرتد نہیں ہوا۔(فتوح البلدان للبلاذری، ص: 115)

وفد بنی تمیم

بنوتمیم عدنانی قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے۔ یہ لوگ اپنا انتساب مُرّ بن اُدکی طرف کرتے ہیں۔

یہ قبیلہ عرب قبائل میں سب سے بڑا ہے۔(فتح الباري: 205/16، وجمهرة أنساب العرب، ص: 207)

اس قبیلے کے لوگ بحرین اور نجد کے مشرقی علاقوں اور الاحساء کے گرد ونواح میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 575/4، وصفة جزيرة العرب للهمداني، ص: 281)

9 ہجری میں جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو اس قبیلے کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ اس سے پہلے بھی اس قبیلے کے کچھ لوگ خدمت نبوی میں حاضر ہو چکے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ''**باب وفد بنی تمیم**'' کے زیر عنوان ایک باب قائم کر کے اس میں متعدد احادیث ذکر کی ہیں۔

خدمت نبوی میں آنے والے قبائل کے وفود میں اس قبیلے کا وفد خصوصی شہرت اور اہمیت رکھتا ہے۔ عرب قبائل کی سطح پر اس دور میں جو لوگ نمایاں حیثیت کے حامل تھے، ان میں سے اقرع بن حابس، زبرقان بن بدر، حجاب بن یزید، عطارد بن حاجب اور عیینہ بن حصن جیسے بہت سے لوگ اس وفد میں شریک تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 560/4)

یہ وفد جب مدینہ منورہ پہنچا، اس وقت رسول اللہ ﷺ امہات المومنین میں سے کسی کے حجرے میں آرام فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کی ملاقات کا شوق ان پر اس قدر غالب تھا کہ انھوں نے انتظار کی زحمت برداشت نہ کی اور حجروں کے باہر ہی سے رسول اللہ ﷺ کو پکارتے ہوئے کہنے لگے:

اے محمد! آپ ہمارے ہاں باہر تشریف لے آئیں۔ ہم کسی کی مدح کریں تو وہ آدمی کے لیے باعث زینت و افتخار ہوتی ہے اور اگر ہم کسی کی مذمت کرنے لگیں تو یہ اس آدمی کے حق میں باعث عار ہوتی ہے، لہٰذا آپ جلدی باہر آئیں۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 562/4)

ان لوگوں کی اس قسم کی باتیں رسول اللہ ﷺ کو ازحد ناگوار گزریں۔ ان کے اس نامناسب رویے کی وجہ سے قرآن کریم کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

''بلاشبہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اور اگر بے شک وہ صبر کرتے، حتی کہ آپ (خود ہی) ان کی طرف نکلتے تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحجرات 49:4،5، والسيرة النبوية لابن هشام: 562/4)

جب اللہ کے رسول ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو انھوں نے درخواست کی کہ ان کے خطیب عطارد بن حاجب کو گفتگو کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملنے پر اس نے خطاب کیا اور اپنے خطاب میں اس نے کہا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو ہر قسم کے فضل کا اہل ہے اور اس نے ہم پر بہت احسان کیے ہیں۔ وہی ہر فضیلت کا اہل اور اپنے بندوں پر احسان کرنے والا ہے۔ اس اللہ نے ہمیں لوگوں پر بادشاہ بنایا اور ہمیں بے پناہ دولت و ثروت سے نوازا ہے۔ ہم اس کے عطا کیے ہوئے مال کو اچھے اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس اللہ کا بے پناہ شکر ہے جس نے ہمیں اہل مشرق میں سب سے معزز بنایا۔

اس طرح وہ اپنے قبیلے بنو تمیم کی مدح سرائی کرتا اور فضیلت بیان کرتا رہا تا آنکہ اس نے اپنا خطاب مکمل کر لیا۔ جب وہ اپنے خود ستائی سے بھرپور خطاب سے فارغ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو اس کے جواب میں خطاب کرنے کا حکم دیا، چنانچہ انھوں نے اس کے جواب میں فی البدیہ خطاب فرمایا اور کہا: ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے یہ پوری کائنات پیدا کی ہے اور یہ (ساتوں) آسمان اور زمینیں بھی اسی کی مخلوقات میں سے ہیں۔ ان میں اسی کا حکم جاری اور نافذ ہے۔ اس کا علم اس کی کرسی سے بھی وسیع ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ عیاں اور پوشیدہ ہے وہ سب اس کے علم میں ہے۔''

ان کا پورا خطاب ایمانی جذبات سے بھرپور، صداقت کا آئینہ دار، دعوت الی اللہ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مدح و ثنا پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد بنو تمیم کے شاعر (زبرقان بن بدر) نے کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اپنا ایک قصیدہ پیش کیا جس میں اس نے اپنی قوم کی فضیلت اور خوبیاں ہی خوبیاں بیان کیں۔ گویا وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنا رہا۔ اس کے قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

نَحْنُ الْكِرَامُ فَلَا حَيَّ يُعَادِلُنَا مِنَّا الْمُلُوكُ وَ فِينَا تُنْصَبُ الْبِيَعُ

''ہم اس قدر معزز اور بلند مرتبہ لوگ ہیں کہ کوئی قبیلہ ہماری ہمسری نہیں کر سکتا۔ بادشاہ اور حکمران ہم ہی میں سے چنے جاتے ہیں۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 564/4)

وہ جب اپنا قصیدہ پیش کر چکا تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ اس کے

جواب میں کچھ کہیں تو سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے بھی فی البدیہ اپنا ایک بہترین قصیدہ پیش کیا:

اس قصیدے کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

إِنَّ الذَّوَائِبَ مِنْ فِهْرٍ وَّ إِخْوَتِهِمْ قَدْ بَيَّنُوا سُنَّةً لِّلنَّاسِ تُتَّبَعُ

يَرْضٰى بِهَا كُلُّ مَنْ كَانَتْ سَرِيرَتُهُ تَقْوَى الْإِلٰهِ وَكُلُّ الْخَيْرِ يُصْطَنَعُ

''(رسول اللہ ﷺ کے چودھویں دادا) فہر اور ان کے خاندانوں کے لوگ نہایت عالی مرتبت اور سردار ہیں۔ انھوں نے لوگوں کے لیے ایسی ایسی سنتیں اور طریقے جاری کیے ہیں جن کی لوگ پیروی کرتے ہیں۔ ہر وہ آدمی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور تقویٰ موجود ہے، وہ ان سنتوں اور طریقوں سے راضی اور خوش ہے۔ اور لوگ ہر اچھی بات کا خیر مقدم کیا کرتے ہیں۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 176,175/4)

سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کا قصیدہ ذاتی مفاخر کی بجائے دین اسلام کی اعلیٰ ترین خوبیوں اور رسول اللہ ﷺ کی ذات پر اظہارِ تفاخر پر مشتمل تھا۔ تاریخ میں یہ بات محفوظ ہے کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ اور زبرقان نے ایک دوسرے کے جواب میں متعدد قصیدے کہے۔ جب ان کے قصیدوں کا سلسلہ انتہا کو پہنچا تو اقرع بن حابس بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا: میرے باپ کی قسم، اس شخص، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ ان کا خطیب ہمارے خطیب سے بڑھ کر، ان کا شاعر ہمارے شاعر کی نسبت نہایت عمدہ شاعر اور ان لوگوں کی آوازیں ہماری آوازوں کی نسبت زیادہ شیریں اور رسیلی ہیں۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 567/4)

پھر ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دین کے بارے میں خاصی رہنمائی لی، آپ نے صحابہ سے بھی فرمایا کہ انھیں دینی و اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہیں۔ ان لوگوں نے اپنے قیام کے دوران خود بھی بہت سے امور کے بارے میں سوالات کر کے ان کے جوابات حاصل کیے۔

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ بنو تمیم کے لوگ نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اے بنو تمیم! تم بشارت قبول کرو۔'' یہ سنتے ہی ان لوگوں نے کہا: آپ نے ہمیں بشارت دی ہے، دنیا کا مال بھی تو عنایت فرمائیں۔ ان کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بہت

ناگوار گزری جس کے اثرات آپ کے چہرہ مبارک پر بھی محسوس کیے گئے۔ اس کے بعد کچھ یمنی لوگ آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''بنوتمیم نے تو بشارت قبول نہیں کی، تم بشارت قبول کرو۔'' انھوں نے خوشی خوشی کہا: اللہ کے رسول! ہم آپ کی طرف سے بشارت قبول کرتے ہیں۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4365)

بنوتمیم کا یہ وفد اپنے علاقے کی طرف واپسی کی تیاری کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں انعامات اور تحائف سے نوازا۔ ان کے امیر کی تعیین کے حوالے سے سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی آراء مختلف ہوگئیں۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ بنوتمیم کا وفد آیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ قعقاع بن معبد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کر دیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کیا جائے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے محض میری مخالفت کرتے ہوئے دوسرا نام پیش کیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اختلاف کی کوئی بات نہیں، میں نے تو محض اپنی تجویز پیش کی ہے۔ ان دونوں کی آپس میں تُو تکار سے ان کی آوازیں خاصی بلند ہوگئیں۔ اس حوالے سے قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور تم اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں (بات) کرتے ہو، کہیں تمھارے عمل برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔''

(الحجرات 49:1,2، صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4367، والتفسير لابن كثير: 1743/2)

وفد بنی عامر

بنو عامر بن صعصعہ، یہ قبیلہ مضر کی شاخ قیس عیلان کا ایک ذیلی قبیلہ ہے۔ (جمهرة أنساب العرب: 271/2)

یہ مدینہ منورہ کے قریب نجد کے گرد ونواح میں آباد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ اسلام دینے کے لیے کچھ

صحابۂ کرام کو ان کی طرف بھیجا تو ان کو بئر معونہ کے سانحہ میں شہید کر دیا گیا۔

بنوعامر کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس میں عامر بن طفیل بھی شریک تھا۔ بئر معونہ کے سانحے میں صحابۂ کرام کو شہید کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔ یہ تند مزاج قسم کا اعرابی (بدو) تھا۔

نبیٔ کریم ﷺ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو وہ کہنے لگا: میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''جو کچھ عام مسلمانوں کو ملے گا تم بھی اسی کے حق دار ہو گے۔ جو ذمے داریاں عام مسلمانوں پر عائد ہوں گی وہی تم پر بھی نافذ ہوں گی۔'' کہنے لگا: آپ حکومت و خلافت کا معاملہ اپنے بعد میرے لیے مقرر کر دیں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ چیز نہ تمھیں دی جائے گی نہ تمھاری قوم کو، البتہ گھوڑوں کی لگامیں تمھارا مقدر ہیں۔'' کہنے لگا: نجد کے گھوڑوں کی باگیں تو اب بھی میرے کنٹرول میں ہیں۔ پھر کہنے لگا: شہری آبادی پر آپ حکومت کرتے رہیں اور دیہاتوں کا کنٹرول میرے حوالے کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا بھی نہیں ہوسکتا۔'' جواب میں عامر نے کہا: پھر میں بھی اسلام قبول نہیں کرتا، پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولا: میں سوار اور پیادے لشکر لے کر آپ پر چڑھائی کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے مقابلے میں اللہ تعالیٰ میری حفاظت فرمائے گا۔'' پھر آپ نے یوں دعا کی: ''یااللہ! عامر بن طفیل کے مقابلے میں تو مجھے کفایت فرما، میری حفاظت اور دفاع فرما۔'' چنانچہ اس کے بعد اس کی گردن پر ایک بہت بڑا پھوڑا ابھر آیا۔ درد کی شدت کے مارے میں وہ زور زور سے چیختا تھا۔ وہ بنوسلول کی ایک عورت کے گھر میں بیمار پڑا رہا، پھر اس نے اس گھر میں مرنا گوارا نہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چل پڑا اور کہتا جا رہا تھا: میری گردن پر اونٹ کے پھوڑے جیسا پھوڑا نکل آیا ہے۔ کیا میں بنوسلول کی عورت کے گھر میں مر جاؤں؟ وہاں سے نکلا اور راستے میں جا کر کہیں مر گیا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 569/4، والتفسیر لابن کثیر: 1008/1)

اس وفد میں اربد بن قیس نام کا ایک آدمی بھی تھا۔ یہ دونوں نبی ﷺ کو شدید نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عامر تو اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اَربد بن قیس جو اللہ تعالیٰ کا بے ادب اور بہت زیادہ گستاخ تھا۔ اس نے واپس جا کر کہا: محمد (ﷺ) نے ہمیں جس ہستی کی عبادت کی دعوت دی ہے، اگر وہ میرے سامنے ہو تو میں اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دوں۔ اس گفتگو کے دو دن بعد اس پر آسمانی بجلی گری جس نے اسے جلا کر بھسم کر دیا۔

بعض مفسرین کا بیان ہے کہ درج ذیل قرآنی آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی تھی:

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝ ﴾

''اور (بادل کی) گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتی ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے (تسبیح پڑھتے ہیں)۔ اور وہی کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر انھیں جن پر چاہے گراتا ہے، جبکہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ شدید قوت والا ہے۔''

(الرعد 13:13، والتفسير لابن كثير: 1008/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 568/4)

وفد بنی حنیفہ

اس قبیلے کا انتساب بنوبکر بن وائل کی طرف ہے۔ (جمهرة أنساب العرب، ص: 309)

یہ قبیلہ یمامہ کی ایک وادی میں آباد تھا۔ یہ وادی اسی قبیلے اور اس کی شاخوں کی نسبت سے مشہور تھی۔ یہ زرعی علاقہ تھا جہاں گندم اور کھجور کی فصل بہت زیادہ ہوتی تھی اور یہ اجناس مکہ مکرمہ کی منڈیوں تک پہنچا کرتی تھیں۔ (معجم اليمامة، لعبدالله بن محمد بن خميس)

اہل یمامہ اور قریش کے مابین تجارتی روابط بھی تھے۔ فتح مکہ سے کچھ عرصہ قبل اس قبیلے کا ایک شہزادہ ثمامہ بن اثال مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوگیا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ایک گھوڑ سوار جنگی دستہ نجد کی طرف روانہ کیا۔ وہ بنوحنیفہ کے ایک نوجوان ثمامہ بن اثال کو گرفتار کر لایا۔ آپ ﷺ کے حکم سے اسے مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ نبیٔ کریم ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو پوچھا: ''ثمامہ! سناؤ کیسے ہو؟'' اس نے کہا: اے محمد! میرے پاس خیر ہے، البتہ یاد رکھیں اگر آپ نے مجھے قتل کروا دیا تو میری قوم آپ سے انتقام لے کر رہے گی اور اگر آپ میرے ساتھ احسان کرتے ہوئے رہا کر دیں تو میں بھی احسان فراموش نہیں ہوں، احسان کی قدر کرنے والا ہوں۔ اگر آپ کو مال چاہیے تو مانگیں آپ کو حسب خواہش دے دیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ سخت اور ترش باتیں سن کر اسے کچھ نہ کہا۔ دوسرا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے

پھر پوچھا: ''ثمامہ! بتاؤ تمھارا کیا خیال ہے؟'' اس نے دوسرے دن بھی وہی جواب دیا جو پہلے دن دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات برداشت کی اور اسے کچھ نہ کہا۔ تیسرا دن ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس روز بھی اس سے وہی بات پوچھی اس نے پھر وہی جواب دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ بھی اس کی بات کو حوصلے سے سنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''ثمامہ کو آزاد کر دو۔''

آزاد ہونے کے بعد وہ مسجد نبوی کے قریب کھجوروں کے ایک باغ میں گیا۔ وہاں غسل کر کے واپس مسجد نبوی میں آ گیا اور کلمۂ شہادت پڑھا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں اور میں دل کی گہرائی سے اعتراف کرتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

ساتھ ہی اس نے کہا: اے محمد ﷺ! مجھے روئے زمین کے سب لوگوں سے زیادہ نفرت آپ کے چہرے سے تھی۔ اب آپ کا چہرہ میری نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ دینوں میں مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ کے لائے ہوئے دین سے تھی۔ اب آپ کا دین مجھے تمام ادیان میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ شہروں میں سے مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ کے شہر سے تھی۔ اب آپ کا شہر میری نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ میں عمرہ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ آپ کے لوگوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اسے بشارت دیتے ہوئے عمرہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

وہ جب مکہ مکرمہ آئے تو کسی کہنے والے نے اس سے کہا: تم صابی (بے دین و بے مذہب) ہو گئے ہو؟ انھوں نے کہا: میں بے دین نہیں بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہوا ہوں۔ اللہ کی قسم! جب تک نبی ﷺ اجازت نہیں دیں گے تب تک تمھاری طرف یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4372)

امام بخاری رحمہ اللہ نے ''بَابُ وَفْدِ بَنِي حَنِيفَةَ وَحَدِيثِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ'' میں اولاً ان کے قبول اسلام کا اور اس کے بعد بنو حنیفہ کے وفد کی آمد کا تذکرہ کیا ہے کہ ثمامہ رضی اللہ عنہ نے کیسے رسول اللہ ﷺ کی

صداقت، رحمت وشفقت اور حسن معاملہ کو ملاحظہ کیا اور وہ بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

«وَاللهِ مَا كَانَ عَلَى الْأَرْضِ وَجْهٌ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ وَّجْهِكَ، فَقَدْ أَصْبَحَ وَجْهُكَ أَحَبَّ الْوُجُوهِ إِلَيَّ»

''اللہ کی قسم! مجھے روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی اور چہرہ برا معلوم نہ ہوتا تھا۔ اب آپ کا چہرہ مبارک میری نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔''(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4372)

قبول اسلام کے بعد وہ عمرہ کرنے کے سلسلے میں جب مکہ مکرمہ گئے اور قریش کو ان کے مسلمان ہونے کی خبر ملی تو انھوں نے انھیں پکڑ کر ایذائیں دیں اور بالآخر انھیں چھوڑ دیا۔ انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں ان کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں یمامہ سے ان کی منڈیوں میں غلے کی آمد متاثر نہ ہو جائے۔ اور عملی طور پر ایسا ہی ہوا کہ وہ جب اپنے وطن واپس پہنچے تو انھوں نے وہاں کے تاجروں کو غلہ مکہ مکرمہ لے جانے سے سختی سے منع کر دیا۔ بلکہ انھوں نے حکم دیا کہ ہمارے علاقے کی کوئی بھی چیز مکہ میں نہ جائے۔ اس صورت حال سے مکہ کے لوگ بہت زیادہ پریشان ہوئے، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے نام خطوط لکھ کر صلہ رحمی کا واسطہ دیا کہ مہربانی فرما کر ثمامہ سے کہیں کہ وہ اپنے تجارتی اموال کی مکے آمد کی پابندی ختم کر دے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ثمامہ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا کہ وہ قریش کو یمامہ سے اشیائے خورونوش خریدنے کی اجازت دے دے۔ اس کے بعد اہل یمامہ اور قریش کے مابین غلے کی تجارت کا سلسلہ بحال ہوا۔(السيرة النبوية لابن هشام: 639/4)

یہ تو مسلمانوں کی طرف سے اہل مکہ کے ساتھ اقتصادی بائیکاٹ کا ایک معمولی اقدام تھا۔ ثمامہ رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے ان کی قوم اور وطن پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور دعوت اسلام تیزی سے پھیلنے لگی۔

9 ہجری میں وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان میں سے ایک وفد قبیلہ بنو حنیفہ کا بھی تھا۔ اس میں ان کے منتخب اور سرکردہ لوگ شامل تھے۔ مسیلمہ کذاب بھی ان میں شامل تھا۔ اس وقت تک اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور نہ وہ مسلمانوں کی تکفیر ہی کرتا تھا۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4374,4373)

رسول اللہ ﷺ نے اس وفد کو رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرایا۔ یہ گھر رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

نبیٔ کریم ﷺ ان لوگوں سے ملاقات کے لیے گئے تو اس وقت کھجور کی ایک چھڑی آپ کے دست مبارک میں تھی۔ سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ آپ کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر آپ کی مسیلمہ کذاب سے گفتگو بھی ہوئی تھی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4378)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مسیلمہ کذاب اپنی قوم کے بہت بڑے وفد کے ہمراہ مدینہ منورہ آیا۔ یہاں آ کر اس نے کچھ اس قسم کی باتیں کیں کہ اگر محمد ﷺ اپنے بعد خلافت میرے نام کر دیں تو میں ان کی پیروی میں آ جاتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اس وفد سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی۔ مسیلمہ اپنے لوگوں کے ساتھ مجمع میں بیٹھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''اگر تم مجھ سے یہ چھڑی بھی مانگو تو میں یہ بھی تمھیں نہیں دوں گا۔ اللہ نے تیرے متعلق جو فیصلہ کر دیا ہے تو اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اگر تو نے اسلام سے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ تجھے ناکام و نامراد کر دے گا، مجھے تیرے متعلق جو خواب دکھایا گیا ہے تو وہی ہے۔ یہ میرے ساتھی ثابت بن قیس میری طرف سے تیری باتوں کا جواب دیں گے۔'' یہ بات کہہ کر رسول اللہ ﷺ واپس آ گئے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے خواب کے بارے میں دریافت کیا تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں سویا ہوا تھا کہ مجھے زمین کے خزانے عطا کیے گئے۔ اور میری ہتھیلی میں سونے کے دو کنگن لا کر رکھ دیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی کہ ان پر پھونک ماریں۔ میں نے ان پر پھونک ماری تو وہ دونوں نابود ہو گئے۔ میں نے خواب میں دیکھے جانے والے کنگنوں کی تعبیر یہ کی کہ میرے بعد دو جھوٹے نبوت کا دعویٰ کریں گے، ایک صنعاء کا اسود عنسی اور دوسرا یمامہ کا مسیلمہ۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4373,4374)

اس کذاب (مسیلمہ) کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا موقف بہت مضبوط اور رد بہت جاندار تھا۔ مدینہ

منورہ سے واپسی کے بعد جب مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسلام اور اہل اسلام کی مخالفت میں بنوحنیفہ نے عصبیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کی عصبیت کا یہ حال تھا کہ ان میں سے ایک آدمی نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ واقعی کذاب ہے لیکن ربیعہ قبیلے کا کذاب ہمیں مضر قبیلے کے سچے نبی، یعنی محمد ﷺ کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے۔ (التاريخ للطبری: 514/3) (یاد رہے کہ مضر رسول اللہ ﷺ کا اٹھارواں دادا ہے)

مسیلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے نام ایک خط بھی لکھا۔ اس کی عبارت درج ذیل تھی:

«مِنْ مُسَيْلَمَةَ رَسُولِ اللهِ إِلٰى مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللهِ، سَلَامٌ عَلَيْكَ، فَإِنِّي قَدْ أُشْرِكْتُ فِي الْأَمْرِ مَعَكَ وَإِنَّ لَنَا نِصْفُ الْأَرْضِ وَلِقُرَيْشٍ نِصْفُ الْأَرْضِ وَلٰكِنَّ قُرَيْشاً قَوْمٌ يَّعْتَدُونَ»

''اللہ کے رسول مسیلمہ کی طرف سے اللہ کے رسول محمد ﷺ کی خدمت میں۔ آپ پر سلام ہو، مجھے نبوت کے معاملے میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے۔ آدھی زمین (حکومت) ہماری اور آدھی قریش کی ہوگی۔ لیکن قریش ایسے لوگ ہیں جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں۔'' (تاريخ الطبري: 248/3)

اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے نام یہ خط بھیجا:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ إِلٰى مُسَيْلَمَةَ الْكَذَّابِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ»

''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ ان لوگوں پر سلام ہو جو راہِ ہدایت کی پیروی کریں۔ اما بعد، یہ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا مالک بناتا ہے۔ اور بہتر انجام ان لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔''

مسیلمہ کذاب کی نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ یہ خط کتابت 10 ہجری میں ہوئی تھی۔(تاريخ الطبری: 248/3)

مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کی شان وشوکت میں اضافہ ہوتا گیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب خلافت اور مسلمانوں کی قیادت کی ذمے داری سنبھالی تو آپ نے سب سے پہلے مرتدین کی سرکوبی کی۔آپ نے مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں مجاہدین کے تین لشکر روانہ فرمائے۔بنوتمیم وغیرہ قبائل بھی ابتدا میں مسیلمہ کے ہم نوا ہوگئے تھے۔ان کی وجہ سے اس کی قوت میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا، چنانچہ یمامہ کے مقام پر مسلمانوں کی ان مرتدین کے ساتھ مشہور جنگ ہوئی۔جس میں تین سو سے زائد صحابہ کرام جامِ شہادت نوش فرما گئے۔شہید ہونے والوں میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی سیدنا زید بن خطاب، سیدنا ابودجانہ رضی اللہ عنہما اور انصاریوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔

(الفتوح الإسلاميه عبرالعصور، ص: 103، وتاريخ الطبری: 252/3)

یمن سے وفود کی آمد

یمن ایک وسیع وعریض علاقے کا نام ہے۔دورِ نبوت میں یہاں بہت سے قبائل آباد تھے۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے اوائل میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے ہی یمن کے قبائل اور افراد کی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ایک ہی قبیلے یا شہر سے متعدد وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ کے ساتھ ان کے روابط کی تفصیل کو یہاں بیان کرنا کافی مشکل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابۂ کرام کو امیر بنا کر یمن کی طرف بھیجا تو اس کے بعد سے یمن سے وفود کی مدینہ منورہ آمد کے سلسلے میں خاصی تیزی آئی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 592/4، والسيرة النبوية فی ضوء المصادر الأصلية، ص: 676)

ان میں سے بعض اہم وفود درج ذیل ہیں:

اشعریوں کا وفد

یہ قبیلہ اشعر بن زید بن کہلان بن سبا کی طرف منسوب ہے اور ان کا اصل وطن یمن ہے۔(جمهرة أنساب

العرب، ص: 397) اس قبیلے کا وہ وفد جس میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اس کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:

«جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً، وَأَضْعَفُ قُلُوباً، وَالْإِيمَانُ يَمَانٍ وَّالْفِقْهُ يَمَانٍ وَّالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ»

''اہل یمن آئے ہیں، یہ لوگ رقیق القلب اور کمزور دل ہیں۔ بہترین ایمان یمن والوں کا اور بہترین فقہ بھی انھی کی ہے۔ اور ان کی حکمت و دانائی بھی کمال درجے کی ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ كَأَنَّهُمُ السَّحَابُ هُمْ خِيَارُ مَنْ فِي الْأَرْضِ»

''تمھارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں۔ یہ لوگ بادل جیسے، یعنی دوسروں کے حق میں مفید ہیں۔ یہ روئے زمین کے لوگوں میں سب سے اچھے لوگ ہیں۔'' (زاد المعاد، ص: 667)

یہ لوگ ایمان وصداقت کے جذبات سے معمور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کو بغیر کسی تردد کے قبول کرنے والے تھے۔ اشعریوں اور بنوتمیم کے وفد بیک وقت مدینے پہنچے تھے۔

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ بنوتمیم کا ایک وفد نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بنوتمیم! تم بشارت قبول کرلو۔'' وہ کہنے لگے: آپ نے ہمیں بشارت دی ہے تو مال بھی دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یہ جواب اس قدر ناگوار گزرا کہ ناگواری کے اثرات آپ کے چہرۂ انور پر نمایاں ہوگئے، پھر کچھ ہی دیر بعد یمن والوں کا وفد پہنچ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنوتمیم کے لوگوں نے تو بشارت قبول نہیں کی، تم ہی اس بشارت کو قبول کرلو۔'' ان لوگوں نے فوراً کہا: اللہ کے رسول! ہمیں آپ کی بشارت قبول ہے۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4386)

تفصیلی روایات میں بیان ہے کہ اس وفد نے اپنے قیامِ مدینہ کے دوران میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے بارے میں بہت کچھ سیکھا اور بہت سے سوالات کے جوابات بھی حاصل کیے۔ ان کا ایک سوال ابتدائے آفرینش

کے حوالے سے تھا کہ اس کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی؟ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كَانَ اللهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْئٌ غَيْرُهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْئٍ وَّخَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ»

''اول اللہ کی ذات تھی، اس کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کرنا تھا، اسے لوح محفوظ میں لکھا اور آسمانوں اور زمین کو اسی نے پیدا کیا۔''

(صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث: 3191)

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وفد کے نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں آنے سے بہت پہلے اسلام کی کرنیں اس قبیلے میں پہنچ چکی تھیں۔ بلکہ اس قبیلے کے بعض لوگ ہجرت حبشہ میں اور بعدازاں غزوۂ خیبر میں بھی شریک تھے۔

قبیلۂ مراد کے نمائندے فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ کی آمد

خاندان سبا کی شاخ ''کہلان'' کے قبیلہ مذحج کا ایک ذیلی قبیلہ ''مراد'' کہلاتا ہے۔ یہ لوگ یمن میں سکونت پذیر تھے اور قبیلۂ ہمدان ان کا پڑوسی تھا۔ یہ لوگ اپنے علاقے میں کندہ کے حکمرانوں کے زیر اثر سمجھے جاتے تھے۔ (جمهرة أنساب العرب، ص: 406,407، والسيرة النبوية لابن هشام: 581/4)

اس قبیلے کا ایک نمائندہ فروہ بن مسیک 9 ہجری میں مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ ان کے قبیلے کی ہمدان کے ساتھ جو لڑائیاں ہوئیں اور ان کے قبیلے کو جن نقصانات اور حوادث کا سامنا کرنا پڑا، اس نے ان کا تذکرہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا إِنَّ ذٰلِكَ لَمْ يَزِدْ قَوْمَكَ فِي الْإِسْلَامِ إِلَّا خَيْراً»

''یہ صورت حال تمھاری قوم کے لیے اسلام کے حوالے سے خیر و برکت ہی کا سبب بنے گی۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 583/4) پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کو یمن کے متعدد قبائل کا عامل (حاکم) مقرر فرمایا۔

وفد ہمدان

ہمدان بھی ایک یمنی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب بھی کہلان بن سبا تک پہنچتا ہے۔(جمهرة أنساب العرب، ص: 392)
یمن میں ان کی رہائش السکون اور حاشد کے گردونواح میں قبیلۂ اشعر کے پڑوس میں تھی۔
(صفة جزيرة العرب، ص:101، 105، و معجم البلدان: 229/3)

اس قبیلے کے کچھ لوگوں نے بیعت عقبہ اولیٰ سے بھی پہلے مکہ مکرمہ جا کر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کی دعوتِ اسلام سنی۔ یہ وہ دور تھا جب رسول اللہ ﷺ ہجرت مدینہ سے قبل مختلف قبائل سے ملاقات کر کے اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرتے تھے کہ کوئی قبیلہ آپ کو اپنے ساتھ اپنے علاقے میں لے جائے اور آپ وہاں آزادی سے اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچا سکیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں اسلام کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور ان کو اسلام میں رسوخ حاصل ہوا۔

اس قبیلے کا وفد 9 ہجری میں مدینہ منورہ میں ان دنوں آیا جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے تھے۔(الطبقات الكبرىٰ:341/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 588/4)

یہ وفد اپنے قبیلے کے سرکردہ افراد پر مشتمل تھا۔ وہ خاص قسم کے بیش قیمت لباس زیب تن کیے ہوئے، انتہائی دیدہ زیب چادریں اوڑھے ہوئے اور عدن کے تیار شدہ انتہائی خوبصورت عمامے زیب سر کیے ہوئے تھے۔

وہ ''مہرہ'' قبیلے کے اعلیٰ نسل کے اور ''ارحب'' علاقے کے انتہائی خوبصورت اور قیمتی اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اونٹوں کی پشتوں پر یمن کی اعلیٰ ترین اور نایاب قسم کی لکڑی سے تیار کردہ زیب نظر پالان رکھے ہوئے تھے۔(السيرة النبوية لابن هشام: 598,597/4) وہ مختلف قسم کے رجز اور اشعار پڑھ رہے تھے، ان اشعار میں وہ اپنے قومی مفاخر اور مدینہ میں آمد اور قبولِ اسلام پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے ظاہری جمال و آرائش اور ترانوں سے مدینے میں عجب سماں بندھا ہوا تھا۔ اہل مدینہ بڑے تعجب اور حیرت سے یہ مناظر دیکھ دیکھ کر فرحت محسوس کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر آپ کی عظمت و اکرام کا خوب اعتراف کیا۔ اس وفد کے ایک رہنما مالک بن نمط نے کھڑے ہو کر گفتگو کی۔ (ایسی گفتگو اور خطاب کو آج کل کے ماحول میں سپاس نامہ کہا جاتا ہے۔)

اللہ کے رسول! آج آپ کی خدمت عالیہ میں قبیلۂ ہمدان کے ہر شہر اور دیہات سے سرکردہ اور نمایاں لوگ حاضر ہیں۔ ہم تیز رفتار اور عمدہ ترین اونٹوں پر سوار ہو کر دین اسلام کو اپنا کر آئے ہیں۔ اللہ کا دین قبول کرنے کے حوالے سے ہمیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پروا نہیں۔ ہمارا تعلق یمن کے خارف اور یام شاکر نامی قبائل کے شہروں سے ہے۔ یہ بہترین اونٹ اور عمدہ ترین گھوڑے پالنے والے لوگ ہیں۔ اس قدر شان وشوکت اور جاہ وجلال کے حامل لوگوں نے اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہہ کر دین اسلام کو گلے سے لگا لیا اور معبودانِ باطلہ اور بتوں کے استھانوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ جب تک بادلوں کی گرج چمک باقی ہے اور پہاڑوں پر ہرن کلیلیں لگاتے (دوڑتے پھدکتے) ہیں، تب تک ان سے کیا ہوا عہد توڑا نہ جائے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 598/4)

اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک تحریر لکھ دی کہ جب تک یہ لوگ دین پر ثابت قدم رہیں تب تک تمام پہاڑی اور میدانی علاقوں پر ان کا حق ہے۔ یہ علاقے ان سے نہیں لیے جائیں گے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 598/4)

وفد کندہ

یہ یمن کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ ان کا نسب بھی ''کہلان بن سبا'' تک پہنچتا ہے۔

(الأنساب للسمعاني: 485/10، وجمهرة أنساب العرب، ص: 425)

ان کا اصل وطن یمن میں ''سکاسک'' اور ''السکون'' نامی شہروں کا گرد ونواح ہے۔ یہ قبیلہ یمن کے علاوہ بلاد عرب کے دور دراز کے علاقوں تک آباد اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کے اقتدار اور حکومت و بادشاہی کا سلسلہ سرزمین شام تک پھیلا ہوا تھا۔ بعض نصوص میں صراحت ہے کہ مدینہ منورہ میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہونے سے بھی پہلے اسلام کی روشنی ان تک پہنچ چکی تھی۔ مدینہ منورہ میں آنے والے اس قبیلے کے وفد میں اشعث بن قیس کندی بھی تھا جس کا تعلق یمن کے اصل قبیلے ''کندہ'' سے تھا۔ یہ وفد اسّی افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ انتہائی سنجیدگی اور باوقار انداز سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں مسجد میں حاضر ہوئے۔

انھوں نے اپنے بالوں کو سنوارا، خوب اچھی طرح کنگھی کی، آنکھوں میں سرمہ ڈالا، شاندار قسم کے بیش قیمت

لباس اور چادریں زیب تن کیں۔ انھوں نے جو جبے پہنے ہوئے تھے، ان کے گلوں اور بازوؤں پر ریشم سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔ یہ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم لوگ اسلام قبول نہیں کر چکے ہو؟'' انھوں نے کمال ادب سے جواب دیا کہ ہم دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''پھر تمھاری گردنوں میں ریشم کا کیا کام؟'' یعنی ریشم کا استعمال اللہ نے مردوں کے لیے حرام ٹھہرایا ہے۔ یہ سنتے ہی ان لوگوں نے اپنے لباس سے ریشم والا حصہ اتار کر پھینک دیا۔(السيرة النبوية لابن هشام: 585/5)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک انتہائی افسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ اشعث بن قیس کندی اسلام سے برگشتہ ہو کر مرتد ہو گیا، تاہم اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق دی اور یہ توبہ کر کے اسلام میں واپس آ گیا اور پھر زندگی بھر دامنِ اسلام سے وابستہ رہا۔ اس نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ام فروہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ عہد صدیقی اور دور فاروقی میں ہونے والی فتوحات میں اس کا وافر حصہ اور نمایاں کردار رہا۔

(الإصابة: 51/1، والطبقات لابن سعد: 22/6، وسير أعلام النبلاء: 37/2)

وفدِ اَزد و جرش

ازد سے مراد ''ازد شنوءۃ'' کا قبیلہ ہے۔ اس کا نسب بھی ''کہلان بن سبا'' تک پہنچتا ہے۔

(الأنساب للسمعاني: 198/1)

سرزمینِ یمن میں جُرش کے گرد و نواح کے علاقے ان کا وطن تھے۔(معجم البلدان: 11/2)

صُرد بن عبداللہ ازدی اپنی قوم کے ایک وفد کے ہمراہ 9 ہجری میں مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ سب لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔(السيرة النبوية لابن هشام: 587/4) آپ نے ان لوگوں کو اپنے علاقوں میں مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا حکم ملنے کے بعد صرد بن عبداللہ ازدی رضی اللہ عنہ اپنے علاقے میں جا کر ''جُرش'' میں اترے۔ ان دنوں مختلف قبائل اس شہر میں آباد تھے۔ ان لوگوں نے جب سنا کہ مسلمان ان پر حملہ آور ہونے والے ہیں تو سب قبائل شہر میں جمع ہو گئے۔ بنو خثعم بھی ان کے ساتھ جا ملے۔ یہ لوگ اپنے قلعے کے اندر پناہ گزیں ہو گئے۔ مسلمانوں نے جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا جو ایک مہینے تک جاری رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک ماہ بعد مسلمان محاصرہ چھوڑ کر ''شکر'' نامی پہاڑ کے قریب چلے گئے۔

جُرش والوں نے سمجھا کہ مسلمان شکست خوردہ اور مایوس ہو کر چلے گئے ہیں، چنانچہ وہ لوگ قلعے سے نکل کر مسلمانوں کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ اب صرد رضی اللہ عنہ نے پلٹ کر ان کا مقابلہ کر کے ان کی خوب خبر لی اور قتل عام کیا۔ جُرش والوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف مدینہ منورہ میں دو آدمی بھیجے ہوئے تھے۔

ایک دن عصر کے بعد وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''شکر مقام کس جگہ واقع ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہمارے علاقے میں ایک پہاڑ ہے۔ جسے ''کشر'' کہتے ہیں اور جُرش والے اسے ''شکر'' کی بجائے ''کشر'' ہی کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا نام کشر نہیں بلکہ شکر ہے۔''

وہ بولے: اللہ کے رسول! اس جگہ کے بارے میں کیا بات ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے قریب اللہ کے اونٹوں، یعنی دشمنانِ اسلام کو نحر (ذبح) کیا جا رہا ہے۔

یہ سن کر وہ دونوں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما کے قریب جا بیٹھے۔ انھوں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ تمھیں تمھاری قوم کے قتل کی خبر سنا رہے ہیں۔ جا کر رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تاکہ آپ کی قوم سے یہ مصیبت ٹل جائے، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تو آپ نے یوں دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ عَنْهُمْ»

''یا اللہ! ان لوگوں کو اس مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرما۔''

یہ دونوں جب اپنے علاقے اور قوم میں پہنچے تو پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ نے جس دن اور جس وقت یہ واقعہ بیان کیا تھا، ٹھیک اسی دن اور عین اسی وقت ان کی قوم کا صرد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ٹکراؤ ہوا اور ان کا قتل عام ہوا تھا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 588,587/4)

اس واقعے کا جرش والوں پر گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے ایک وفد تشکیل دے کر مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا۔ ان لوگوں نے جا کر آپ سے ملاقات کی اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بستی والوں کے لیے کچھ جگہیں مقرر کر دیں کہ اس علاقے پر صرف انھی کا حق ہوگا اور دوسرے

لوگ دخل اندازی نہیں کریں گے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 588/4، والسيرة النبوية فی ضوء المصادر الأصلية، ص: 655)

وفد حارث بن کعب

حارث بن کعب کے بیٹوں کے متعدد قبائل تھے۔ ان کا بھی نسب ''کہلان بن سبا'' تک پہنچتا ہے۔

(جمهرة أنساب العرب، ص: 416)

یہ لوگ نجران کے گرد ونواح میں آباد تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 593/4، ونجران فی عصر النبوة والخلافة الراشدة)

شدت وقوت کے حوالے سے یہ قبائل پورے عرب میں معروف تھے۔ نجران اور اس کے نواح میں بہت سے علاقوں پر ان کا غلبہ اور کنٹرول تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے 10 ہجری کے اوائل میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک دستہ ان قبائل کی طرف روانہ فرمایا۔ انھیں حکم دیا تھا کہ وہاں جا کر تین دن تک ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اور جنگ سے گریز کرنا۔ یہ لوگ اگر اسلام قبول کر لیں تو ان کے ساتھ جنگ نہ کی جائے۔

چنانچہ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کے علاقوں میں پہنچ کر اپنے مبلغین پورے علاقے میں بھیج کر انھیں اسلام کی دعوت دی کہ لوگو! دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یہ اللہ کا سچا دین ہے، چنانچہ ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 595/4)

اس کے بعد سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء ان کے ہاں مقیم رہے، انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا، اللہ کی کتاب کی تعلیم دی اور انھیں اللہ کے دین کی تفاصیل اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں سے آگاہ کرتے رہے۔ ان قبائل کے اسلام قبول کرنے پر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو بہت خوشی ہوئی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 593/4)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جنگ سے محفوظ رکھا، چنانچہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے ایک خط لکھ کر رسول اللہ ﷺ کو صورت حال سے آگاہ کیا اور خوشخبری دی کہ یہ لوگ دائرۂ اسلام میں آ گئے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھ جنگ

نہیں کی نہ ہمارے مدمقابل ہی آئے ہیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی اور اس کے نبی ﷺ کی سنتوں کی تعلیم دے رہا ہوں۔ آپ کی نئی ہدایات آنے تک میں یہیں پر ہوں۔ والسلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اس خط کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے لکھا: ''اب آپ واپس آجائیں اور ان کا ایک وفد بھی ساتھ لے کر آئیں۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 593/4)

اس خط کو پڑھنے کے بعد سیدنا خالد رضی اللہ عنہ مدینے واپس آئے تو ان قبائل کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک وفد بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ یہ لوگ جب مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: ''یہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو ہندوستان کے لوگوں جیسے لگتے ہیں۔''

بتلایا گیا کہ اللہ کے رسول! یہ بنوحارث بن کعب کے لوگ ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوکر آپ کو سلام کیا اور کہا: «نَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللهِ وَأَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ»

''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے برحق رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں۔''

ان کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا:

«وَأَنَا أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ»

''میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایسے لوگ ہو کہ جنھیں ہانکا جائے تو آگے بڑھتے ہیں۔''

اس کے جواب میں وہ خاموش رہے اور انھوں نے کچھ بھی نہ کہا۔ آپ نے اپنی بات دوبارہ دہرائی تب بھی ان میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری مرتبہ بھی یہی بات دہرائی۔ تب بھی ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر آپ نے جب چوتھی مرتبہ اپنی بات دہرائی تو ان میں سے یزید بن عبدالمدان نے کہا: ''اللہ کے رسول! جی ہاں، ہم وہی لوگ ہیں جنھیں ہانکا جائے تو آگے بڑھتے ہیں۔'' اس نے بھی اپنی بات کا چار دفعہ اعادہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ أَنَّ خَالِدًا لَّمْ يَكْتُبْ إِلَيَّ أَنَّكُمْ أَسْلَمْتُمْ وَلَمْ تُقَاتِلُوا لَأَلْقَيْتُ رُؤُوسَكُمْ تَحْتَ أَقْدَامِكُمْ»

''اگر خالد نے خط لکھ کر مجھے اطلاع نہ دی ہوتی کہ تم لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور تم نے مسلمانوں سے جنگ نہیں کی تو میں تمھارے سرگردنوں سے جدا کر کے تمھارے قدموں میں ڈال دیتا۔''

یزید بن عبدالمدان نے عرض کیا: اللہ کی قسم! ہم اس موقع پر نہ آپ کی تعریف کرتے ہیں نہ خالد رضی اللہ عنہ ہی کی مدح کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''تو پھر تم کس کی مدح کرتے ہو؟'' وہ بولے: اللہ کے رسول! ہم اس اللہ کی حمد کرتے ہیں جس نے آپ کی بدولت ہمیں ہدایت کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''واقعی تمھاری بات درست ہے۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں تم لوگ اپنے دشمن پر کس طرح غلبہ پاتے تھے؟'' انھوں نے کہا: ہم کسی پر غلبہ نہیں پا سکتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''ایسی بات تو نہیں، تم تو اپنے مخالف اور دشمن پر غالب رہتے تھے۔'' انھوں نے بتلایا کہ لڑائی کے موقع پر ہم سب اکٹھے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے تھے اور ہم کسی پر زیادتی کرنے میں پہل نہیں کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، یہ بات درست ہے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا قیس بن حصین رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر فرمایا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 595/4)

اس کے بعد جب یہ وفد مدینہ منورہ سے اپنے وطن کو لوٹا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ معلم اور دین کی تعلیم دینے والے استاد کی حیثیت سے اور صدقات کی وصولی کی خاطر روانہ فرمایا۔ ان کے ہاتھ ایک خط بھی بھیجا جس میں اطاعت کرنے والوں کے لیے خوشخبری اور اطاعت نہ کرنے والوں کے لیے ڈانٹ اور اموالِ زکاۃ کے نصاب کی تفصیل لکھی گئی تھی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 1015,1014/2، ونجران فی عصر النبوة والخلافة الراشدة، ص: 75)

عرب نصرانیوں کے وفود

جزیرۂ عرب کے شہروں اور دیہاتوں میں نصرانیت عام تھی۔ یہ لوگ اہل کتاب اور صاحب علم تھے۔ جب

ان لوگوں تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت پہنچی تو بہت سے نصرانی انفرادی طور پر اور بہت سے وفود کی صورت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔(العلاقات الإسلامية النصرانية فی العهد النبوی، ص: 93)

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت آفاقی اور عالمگیر ہے اور آپ کی رحمت روئے زمین کے تمام لوگوں کے لیے عام ہے، اس لیے آپ کے روابط بھی ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ تھے۔ ان نصرانیوں کو عام عربوں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ یہ لوگ گزشتہ انبیاء کے بارے میں خاصا علم رکھتے تھے اور ان کی تعلیمات کی روشنی میں یہ لوگ اللہ کے آخری رسول اور خاتم الانبیاء کی آمد کے منتظر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو بہت سے نصرانی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنے والے ان کے متعدد وفود میں سے بعض کا تذکرہ درج ذیل ہے:

وفد الداریین (قبیلۂ دار کے لوگوں کا وفد)

یہ لوگ بنولخم کی ایک ذیلی شاخ ''بنوالدار'' میں سے ہیں۔ یہ فلسطین، شام، بیت اللحم اور رملہ وغیرہ کے علاقوں میں آباد اور پھیلے ہوئے تھے۔(العلاقات الإسلامية النصرانية فی العهد النبوی، ص: 157)

یہ عرب کے ان نصرانیوں میں سے ہیں جن تک دعوتِ اسلام پہنچی۔ نبیٔ کریم ﷺ جب تبوک سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ پہنچے تو ان کے دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد خدمت نبوی میں آیا۔ یہ لوگ نصرانی تھے۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور نبیٔ کریم ﷺ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ تمیم داری رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی نعیم داری رضی اللہ عنہ بھی اس وفد میں شامل تھے۔ سرزمین شام ابھی تک مسلمانوں کے زیرنگین نہیں آئی تھی، تاہم رسول اللہ ﷺ کو یقین کامل تھا کہ مسلمان بہت جلد اسے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کرلیں گے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شام کے علاقے میں ایک قطعہ اراضی سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ کو الاٹ کر دیا تھا۔

سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ کو بھی سرزمین شام کی فتح کا پورا یقین تھا، وہ اس بات کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ سے وہاں کا کچھ علاقہ اپنے لیے مستقل طور پر طلب کیا تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام فتح ہوا تو انھوں نے وہ قطعۂ زمین سیدنا تمیم رضی اللہ عنہ کو عنایت

فرمایا۔(سیر أعلام النبلاء: 442/2)

دجال کے بارے میں سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وہ واقعہ سنا تو آپ نے اعلان کروا کر سب لوگوں کو مسجد میں بلوایا تا کہ وہ ان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ خود ان کی زبانی سن لیں۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ تمیم داری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آنے کے لیے سمندری سفر طے کر کے آئے تھے۔(صحیح مسلم، حدیث: 2942)

وفد تغلب

آلِ عدنان میں ربیعہ بن نزار کی نسل سے بہت سے قبائل وجود میں آئے۔ ان میں سے ایک قبیلہ تغلب بن وائل کی طرف منسوب ہے۔(الأنساب للسمعانی: 62/3، وجمهرة أنساب العرب، ص: 203)

یہ قبائل جزیرۂ عرب کے شمال میں اور ان میں سے بعض قبائل شام اور عراق میں بھی آباد تھے۔ عرب کے نصرانی قبائل میں سے قبیلۂ تغلب خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس قبیلے میں بہت سے اہل علم پائے جاتے تھے جن کا اپنی قوم اور دیگر قبائل میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ان کے رومی سلطنت، نجران اور حبشہ کے حکمرانوں سے بھی مضبوط روابط اور تعلقات تھے۔

10 ہجری میں اس قبیلے کے سولہ افراد پر مشتمل ایک وفد مدینہ منورہ آیا۔(الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 361/1)

ان میں سے کچھ لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور بعض لوگ ابھی تک اپنے سابقہ مذہب نصرانیت پر قائم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو رملہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے مکان پر ٹھہرایا۔ آپ کے مہمانوں کو وہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہ گویا آپ کا مہمان خانہ تھا۔ اپنے قیام کے دوران میں انھوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقاتیں کیں۔ آپ کی گفتگو سنی اور آپ کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا لیکن مسلمانوں نے جب عراق فتح کیا تو یہ لوگ اسلام مخالف ہو گئے اور ان میں سے بعض لوگ فرار ہو کر رومیوں سے جا ملے اور مسلمانوں سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالا۔ اس عہد شکنی کی بنا پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے ساتھ مختلف رویہ اختیار کیا۔(کتاب الخراج لیحییٰ بن آدم، ص: 200، والأموال لقاسم بن سلّام، ص: 36، وفتوح البلدان، ص: 251)

بنو طے کے وفود

قبیلۂ طے ایک قحطانی عربی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب بھی کہلان بن سبا تک پہنچتا ہے۔(جمهرة أنساب العرب، وأنساب العرب للسمعاني: 187/8) یہ لوگ نجد کے شمال میں ''اَجا اور سلمیٰ'' نامی پہاڑوں کے درمیان آباد تھے۔ یہ طے کے پہاڑ کہلاتے تھے۔(صفة جزيرة العرب، ص: 262، ومعجم قبائل العرب: 688/2)

یہ لوگ عراق اور شام کے جنوبی علاقوں اور جزیرۂ عرب کے شمال تک آباد اور پھیلے ہوئے تھے۔ (جمهرة أنساب العرب، ص: 400,399)

اس قبیلے کا ایک وفد 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ آیا۔(الإصابة: 572/1)

ان کے ایک سردار کا نام ''زید الخیل'' تھا۔ یہ قبیلۂ طے کے ایک شخص غوث کی نسل میں سے تھے۔ زید الخیل کے والد کا نام مہلہل بن زید تھا۔ (جمهرة أنساب العرب، ص: 404) وہ ایک عمدہ شاعر اور دورِ جاہلیت کے بہترین شاہ سوار تھے۔ اسی لیے انھیں ''زید الخیل'' کہا جاتا تھا۔ پورے عرب میں ان کی دھوم تھی۔ بہت سخی تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے بعد اس نے اور اس کے تمام رفقاء نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

ابن ہشام نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا: ''میرے سامنے عرب کے جس شخص کی بھی خوبیاں اور فضائل بیان کیے گئے، جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے اسے اس کی مشہور تعریف سے کم ہی پایا، البتہ زید الخیل کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کے متعلق میں نے جو کچھ سنا، اس میں اس سے بڑھ کر خوبیاں موجود ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام زید الخیل سے بدل کر زید الخیر (ایسا زید جو سرتاپا خیر ہی خیر ہے) رکھ دیا۔

نیز آپ نے وادیِ فید اور اس کے قرب و جوار کے قطعاتِ اراضی انھیں الاٹ کر دیے۔ (آج کل وادیِ فید میں ''فید'' نامی قصبہ آباد ہے جو مشہور شہر ''حائل'' کے مشرق میں ہے۔) اس سلسلے میں ایک تحریر بھی ان کے حوالے کی تھی۔

مدینہ منورہ سے نجد کو واپس جاتے ہوئے (فردہ نامی چشمے پر پہنچے تو) انھیں شدت کا بخار ہوا اور وہیں انتقال کر گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ان کی وفات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت

میں ہوئی تھی۔ واللہ أعلم.

(السيرة النبوية لابن هشام: 578,577/4، والطبقات الكبرىٰ: 355,321/1، والإصابة: 572/1)

فروہ بن عمرو جذامی کا وفد

قحطان کے قبائل میں سے کہلان بن سبا کی نسل سے ایک مشہور قبیلہ ''جذام'' بھی ہے۔

یہ لوگ روم کی سرحد کے قریب اردن کے نواح میں واقع ''معان'' شہر اور اس کے قریب تبوک کے غرب میں واقع مدین کے مغربی علاقوں میں آباد تھے۔ ان کی آبادیاں فلسطین تک پھیلی ہوئی تھیں۔

(العلاقات الإسلامية النصرانية فی العهد النبوي، ص: 127)

معان اور گرد ونواح کے علاقوں پر سلطنت روم کی طرف سے فروہ بن عمرو جذامی حکمران تھا۔ مذہباً نصرانی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ اسلام اس تک پہنچی تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نے اپنا ایک وفد مدینہ منورہ روانہ کیا اور اس کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے لیے تحائف بھی بھیجے۔ رومی حکمران کو جب ان کے قبولِ اسلام کا پتہ چلا تو اس نے انھیں گرفتار کر کے قید میں رکھا اور بالآخر قتل (شہید) کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ جب اسے قتل کرنے لگے تو انھوں نے قتل ہونے سے قبل موقع پا کر کچھ اشعار لکھ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف بھجوائے۔ ان میں اس نے رسول اللہ ﷺ کے نام سلام بھی بھیجا۔ اس کے اشعار میں سے ایک شعر درج ذیل ہے:

بَلِّغْ سَرَاةَ الْمُسْلِمِينَ بِأَنَّنِي سِلْمٌ لِّرَبِّي أَعْظُمِي وَ مَقَامِي

''اہل اسلام کے سربراہوں اور رہنماؤں کو یہ اطلاع کر دو کہ میں نے اپنی ہڈیاں اور اپنا مقام اپنے رب کے سپرد کر دیا ہے۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 592/4، وزاد المعاد: 646/3، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 281/1، ووفاء الوفاء: 740/2)

وفد غسان

غسان بھی عرب قبائل میں سے ایک مشہور قبیلہ ہے۔ ان کا نسب ''ازد'' تک جا پہنچتا ہے۔ (العلاقات الإسلاميه النصرانية فی العهد النبوی، ص: 155) اس قبیلے کی حکومت اور اثر و رسوخ کا دائرۂ کار دمشق سے حمص

تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنے دور کی عظیم سلطنت روم کے زیر اثر تھے۔ ان کے بادشاہ ''ملوک غساسنہ'' (غسانی بادشاہ) کہلاتے تھے۔ ان کا مذہب ''نصرانیت'' تھا۔ اسلام کے مدمقابل یہ لوگ سلطنت روم کے ہم نوا تھے۔ اس قبیلے میں سے تین آدمی رمضان 10 ہجری میں مدینہ منورہ میں نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلے گئے، البتہ رومیوں کے ظلم وستم اور تشدد کے خوف سے انھوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا واقعہ پوشیدہ رکھا۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد:338/1، وزاد المعاد: 669/3)

ان میں سے دو آدمیوں کا ملک شام فتح ہونے سے پہلے انتقال ہوگیا تھا، البتہ تیسرا آدمی ان کے بعد بھی زندہ رہا۔ یرموک میں جب سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ برسر پیکار تھے، ان دنوں اس نے آ کر آپ سے ملاقات کی اور آپ نے بھی اس کا خوب اکرام کیا۔

(زاد المعاد: 669/3، والسیرة النبویة لابن سیدالناس: 256/2)

وفد عدی بن حاتم الطائی

عدی، یہ دورِ جاہلیت (قبل از اسلام) کے مشہور ترین سخی حاتم طائی کے فرزند اور اپنے قبیلے کے نمایاں اور سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ عرب میں پائے جانے والے نصرانیوں کے ایک فرقے ''رکوسی'' کے عقائد و اعمال کے حامل تھے۔ شام کے نصرانی ''یعقوبی'' فرقے سے اور عراق کے نصرانی ''نسطوری'' فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ (محاضرات فی تاریخ الأدیان، ص: 148، فی الفکر الدینی الجاهلی للفیومی، ص: 68۔ رکوسی، یہ عہد نبوت میں عرب علاقوں میں نصاریٰ اور صابیوں (بے دین لوگوں) کے بین بین ایک فرقہ تھا، یعنی ان کے کچھ عقائد و اعمال نصرانیوں والے تھے اور کچھ صابیوں (بے دین لوگ) والے۔ (المعجم الوسیط، ص: 369)

رسول اللہ ﷺ کے دور میں یہ نصاریٰ کا ایک معروف فرقہ تھا۔ ان کے ملک شام کے عرب نصرانیوں، غسانیوں اور عراق کے بنو منذر کے نصاریٰ کے ساتھ گہرے روابط تھے۔ نیز عدی کا اپنے قبیلے طے پر بھی اچھا اثر ورسوخ تھا۔ یہ اپنے قبیلے کا سردار اور سرکردہ آدمی تھا۔

ابتدائی زمانے ہی سے اسلام کے متعلق خبریں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری اور آپ کی گفتگو سننے کے بارے میں متردد رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا عرب وعجم میں ہر جگہ

چرچا ہونے لگا۔

جب اسے خبر ملی کہ زید الخیل (زید الخیر) اور بعض دیگر سردارانِ طے نبی ﷺ کی خدمت میں جا کر مشرف بہ اسلام ہو آئے ہیں تو اس کا اس پر خاصا منفی اثر ہوا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ جب نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو مجھے یہ خبر اس قدر ناگوار گزری کہ اس سے قبل مجھے کوئی بھی بات اتنی ناگوار نہیں گزری تھی۔ میں اپنا علاقہ چھوڑ کر روم کی سرحد کے قریب عرب کے سب سے آخری سرحدی مقام پر چلا گیا۔ میرا اس طرح اپنا علاقہ چھوڑ کر وہاں چلے جانا، مجھے پہلے امر سے بھی زیادہ اور سخت ناگوار گزرا۔ (المغازي لابن أبي شيبة: 142)

بعد میں جب اس کی بہن سفانہ بنت حاتم قید کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ احسان و مروت کا برتاؤ کیا اور اس سے کچھ ایسی باتیں بھی کہیں تاکہ وہ یہ باتیں عدی تک پہنچا دے، شاید عدی اسلام کی طرف مائل ہو جائے۔

اس کی وضاحت اور تفصیل یوں ہے کہ ماہ ربیع الثانی 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی دستہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قیادت اور سربراہی میں قبیلہ طے کے علاقے میں ''الفُلس'' نامی بت خانے کے انہدام کی غرض سے روانہ کیا۔ اس اسلامی دستے کے ساتھ قبیلے والوں کی جھڑپ ہوئی اور بہت سے لوگ قید ہو گئے۔ قید ہونے والوں میں حاتم طائی کی بیٹی اور عدی کی ہمشیرہ سفانہ بنت حاتم بھی تھی۔ (الطبقات لابن سعد: 164/2)

مسجد نبوی کے دروازے کے قریب ایک جگہ تھی جہاں قیدیوں کو محبوس کیا جاتا تھا۔ سفانہ کو بھی باقی قیدیوں کے ساتھ وہاں قید کر دیا گیا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 385/4) رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا تو یہ اٹھ کر آپ کی طرف آ گئی۔ وہ ایک باہمت اور جرأت مند خاتون تھی۔ کہنے لگی: اللہ کے رسول! میرا والد فوت ہو چکا ہے اور میری سرپرستی کرنے والا فرار ہو کر کہیں دور نکل گیا ہے۔ آپ میرے ساتھ احسان فرمائیں، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے گا۔

آپ ﷺ نے پوچھا: ''تمھاری سرپرستی کرنے والا کون تھا؟'' اس نے بتلایا کہ عدی بن حاتم۔ آپ نے فرمایا: ''وہی جو اللہ اور اس کے رسول کی گرفت کے خوف سے فرار ہونے والا ہے؟''

وہ کہتی ہیں یہ سن کر آپ وہاں سے چلے گئے۔ دوسرے دن اللہ کے رسول میرے پاس سے گزرے تو

گزشتہ روز کی طرح پھر میرا ان سے سامنا اور مکالمہ ہوا۔ تیسرے دن جب اللہ کے رسول وہاں سے گزرے تو میں نے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ آپ کی خاموشی کی وجہ سے میں مایوس ہو چکی تھی۔ آپ کے پیچھے پیچھے ایک آدمی جا رہا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ ہمت کر کے حسب سابق آپ سے اپنی درخواست پیش کر دو۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا: اللہ کے رسول! میرا والد فوت ہو چکا ہے اور میری سرپرستی کرنے والا مجھے بے آسرا چھوڑ کر کہیں فرار ہو گیا ہے۔ آپ مجھ پر احسان فرمائیں۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ حسن سلوک کرے گا۔

آپ نے میری درخواست کو قبول و منظور کرتے ہوئے فرمایا: ٹھیک ہے مگر جب تک تمھیں اپنے قبیلے کا کوئی ایسا بااعتماد آدمی نہ مل جائے جو تمھیں تمھارے وطن پہنچا دے تب تک تم اپنے وطن جانے کی جلدی نہ کرنا۔ جب کوئی ایسا آدمی مل جائے تو مجھے اطلاع دینا۔

میں نے لوگوں سے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا جس نے مجھے نبی ﷺ سے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔

اس کے بعد میں مدینے ہی میں رہی تا آنکہ بلی یا قضاعہ قبیلے کے لوگ مدینے آئے۔ میں اپنے بھائی عدی کے پاس ملک شام جانا چاہتی تھی۔ وہ مسلمانوں کے خوف سے اپنا علاقہ چھوڑ کر ملکِ شام چلا گیا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ میرے قبیلے کے بااعتماد لوگ ہیں۔ میں ان کے ہمراہ چلی جاتی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے میری روانگی کے وقت مجھے بطورِ تحفہ لباس دیا، میرے لیے سواری کا انتظام کر دیا اور معقول مقدار میں سفر خرچ بھی عنایت فرمایا، چنانچہ میں ان لوگوں کے ہمراہ ملک شام پہنچ گئی۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 579/4)

عدی، شام کی طرف فرار ہو گیا تھا۔ اسے وہاں خبر ملی کہ اس کی بہن کو مسلمان قیدی بنا کر لے گئے ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی بہن کو رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ اس کو بہت زیادہ اعزاز و اکرام سے بھی نوازا ہے تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔

عدی رضی اللہ عنہ اپنی بہن کے شام پہنچنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیٹھا تھا کہ میں نے دور سے ایک شتر سوار خاتون کو دیکھا جو ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔

مجھے دور سے محسوس ہوا کہ شاید یہ حاتم کی بیٹی (میری ہمشیرہ) ہو۔ جب وہ قریب آئی تو واقعی وہ میری بہن ہی تھی۔ وہ قریب آتے ہی مجھ پر برس پڑی اور کوسنے لگی: او قطع رحمی کرنے والے! ارے او ظالم! تو اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر جان بچا کر بھاگ گیا اور اپنے باپ کی امانت اور اپنی عزت کی قطعاً پروا نہ کی۔

میں نے اسے خاموش کراتے ہوئے کہا: اے بہن! مجھے برا بھلا نہ کہہ۔ ملامت نہ کر۔ اچھی اور بھلی باتیں منہ سے نکال۔ تم میرے متعلق جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ سب درست ہے۔ میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ کیا، غلط کیا۔ جب اس کا غصہ دور ہوا تو وہ اونٹ سے نیچے اتر آئی اور میرے پاس ہی ٹھہری رہی۔ وہ بہت دانا عورت تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا: اس شخص، یعنی محمد ﷺ کے بارے میں تمھارے کیا خیالات ہیں؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میرا تو مشورہ ہے کہ جس قدر جلدی ہو سکے تم جا کر ان سے ملاقات کرو۔ اگر وہ واقعی اللہ کے نبی ہیں تو ان کی طرف جلدی جانے والے کے لیے یہ حاضری باعث فضیلت ہے۔ اور اگر وہ ایک دنیوی بادشاہ ہے تب بھی تم یمن کے اقتدار اور حکومت کے حوالے سے اس کی طرف سے رسوا نہیں ہو گے۔ باقی تم خود بھی سمجھ دار اور عقل مند ہو۔ اس کی باتیں سن کر میں نے دل میں کہا: اس کی بات تو ٹھیک ہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 4/570)

اس کے بعد عدی بن حاتم رسول اللہ ﷺ کی ملاقات اور زیارت کا قصد لے کر شام سے مدینہ منورہ آئے۔ وہ مدینہ منورہ پہنچے تو لوگوں نے نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ لوگوں کے ان کی طرف توجہ کرنے کی وجہ ان کا فاخرانہ لباس، شاندار سواری اور ان کے رفقاء بھی ہو سکتے ہیں۔ بہر حال اہل مدینہ نے نظریں اٹھا اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ مسجد میں آ کر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کہا۔ آپ نے دریافت فرمایا: ''بھئی تم کون ہو؟'' انھوں نے بتلایا کہ میں عدی بن حاتم ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں ایک عمر رسیدہ کمزور عورت ملی۔ اس نے آپ کو روک لیا اور اپنے کسی کام کے حوالے سے خاصی دیر تک آپ کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ آپ

کا یہ انداز دیکھ کر میں نے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ آدمی دنیا دار بادشاہ نہیں ہوسکتا۔ آپ مجھے ساتھ لیے گھر میں داخل ہوئے۔ آپ نے کھجور کی چھال سے بھرا چمڑے کا ایک گدا اٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا: ''اس پر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے عرض کیا: اس پر آپ تشریف رکھیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں، تم مہمان ہو۔ اس پر تم بیٹھو۔'' میں اس گدے پر بیٹھ گیا اور آپ نیچے زمین پر بیٹھ رہے۔ میں نے ایک بار پھر سوچا کہ بادشاہوں کا انداز ایسا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آپ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''عدی، کیا تم رکوسی فرقے میں سے نہیں ہو؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں..... میں رکوسی تھا۔

آپ نے فرمایا: ''کیا تم اپنی قوم کے لوگوں سے ان کے اموال کا چوتھا حصہ بطور ٹیکس نہیں لیتے تھے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں، ایسے ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''حالانکہ یہ چیز تمھارے دین میں تمھارے لیے حلال نہیں؟'' میں نے عرض کیا: ایسے ہی ہے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ اور آپ ایسی ایسی باتیں جانتے ہیں جن کا عام لوگوں کو علم تک نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''اے عدی! تمھیں ہمارے دین میں داخل ہونے سے شاید یہ بات روکتی ہے کہ میرے پیروکاروں کی اکثریت غریب اور نادار ہے۔ اللہ کی قسم! عنقریب ان کے پاس مال کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ مسلمانوں میں کوئی صدقہ لینے والا نہیں ملے گا۔ شاید یہ بات بھی تمھیں مسلمان ہونے سے روکتی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی اور ان کے مخالفین بہت زیادہ ہیں؟ اللہ کی قسم! یاد رکھو تم عنقریب ایسی خبریں سنو گے کہ ایک اکیلی عورت اونٹ پر سوار ہو کر قادسیہ سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے گی اور اسے راستے میں ڈاکے اور قتل وغیرہ کا قطعاً ڈر نہیں ہوگا۔ شاید تمھارے لیے اسلام میں داخل ہونے سے یہ امر بھی مانع ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ حکومت، سلطنت اور اقتدار مسلمانوں کے مخالفین کے پاس ہے۔ اللہ کی قسم! عنقریب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتوحات کے بعد حکومت، سلطنت اور اقتدار سے سرفراز فرمائے گا اور تم سنو گے کہ مسلمانوں نے سرزمین بابل میں واقع کفار کے سفید محلات (وائٹ ہاؤسز) کو فتح کر لیا ہے۔''

عدی کہتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے یہ حقائق سن کر اسلام میرے دل میں گھر کر گیا

اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں وہ کہا کرتے تھے کہ ان میں سے دو باتیں تو پوری ہو چکی ہیں اور میں بچشم خود ان کا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ ایک بات باقی رہ گئی ہے، اللہ کی قسم! وہ بھی ضرور پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ مسلمان ارضِ بابل میں واقع کفار کے سفید محلات کو زیر نگیں کر چکے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ قادسیہ سے ایک عورت تن تنہا بغیر کسی خوف کے مکمل امن کی حالت میں قادسیہ سے سفر کر کے بیت اللہ کا حج کرنے آئی تھی۔

اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی تیسری پیش گوئی بھی پوری ہوگی کہ مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ صدقے کا مال لینے والا کوئی آدمی نہیں ملے گا۔ (تاريخ الطبري: 150/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 142، والسيرة النبوية لابن هشام: 581/4)

اس ملاقات میں عدی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی تواضع، انکساری، عظمت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا کہ آپ کو نصرانیت اور اس کی اصل تعلیمات سے بخوبی واقفیت حاصل ہے اور آپ اس میں پائی جانے والی تحریف سے بھی آگاہ ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ (عدی) نصرانیوں سے ان کی آمدن کا چوتھا حصہ وصول کرتا ہے، حالانکہ اس کا لینا اس کے لیے حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی گفتگو، معلومات کی صحت اور وسعت سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

ان کی آپ کے ساتھ یہ ملاقات خاصی طویل تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے قیام مدینہ منورہ کے دوران میں رسولِ کریم ﷺ سے متعدد ملاقاتیں ہوئی ہوں۔

انھی واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی گردن میں چاندی سے بنی ہوئی ایک صلیب لٹک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ پڑھی:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

”انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو (بھی)، حالانکہ

انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود (اللہ) کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس شرک سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' (التوبة 31:9)

عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے یہ سن کر عرض کیا کہ وہ (عیسائی) اپنے علماء کی عبادت تو نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ وہ ان کے لیے کسی حلال چیز کو حرام، حرام چیز کو حلال کہہ دیتے ہیں تو یہ ان کی ایسی باتیں بھی مان لیتے ہیں۔ یہی تو ان کی عبادت اور بندگی ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: ''عدی! اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟

کیا اللہ اکبر کہنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا اعتراف تمھیں نقصان پہنچائے گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ کے سوا بھی کوئی الٰہ (معبود) ہے؟''

پھر آپ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور دل کی گہرائی سے حق کی گواہی دی۔ (تفسیر ابن کثیر: 874/1)

اسلام قبول کر لینے کے بعد عدی رضی اللہ عنہ نے اپنے ذہن میں آنے والے سوالات اور اشکالات پیش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا حل اور جوابات بھی حاصل کیے۔

صحیح بخاری میں ہے، سیدنا عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا، اللہ کے رسول! میں کتوں کے ذریعے سے شکار کرتا ہوں۔ میں سدھائے ہوئے کتوں کو شکار پر چھوڑتا ہوں اور وہ شکار کو قابو کر کے میرے پاس لے آتے ہیں؟ میں ان کو چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیتا ہوں، کیا وہ شکار حلال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جب اپنے سدھائے ہوئے کتے کو اللہ کا نام لے کر چھوڑو اور وہ اسے پکڑ کر تمھارے پاس لے آئے تو تم اسے کھا سکتے ہو۔'' میں نے عرض کیا: اگر وہ اسے پکڑ کر مار ڈالیں تب بھی؟ فرمایا: ''خواہ وہ اسے جان سے مار ڈالیں، تب بھی اسے کھانے کی اجازت ہے بشرطیکہ اس کو شکار کرنے اور مارنے میں تمھارے چھوڑے ہوئے کتوں کے ساتھ دوسرے کتے شریک نہ ہوں کیونکہ تم نے صرف ان کتوں پر تکبیر پڑھی تھی جن کو تم نے چھوڑا، دوسرے کتوں پر تم نے تکبیر نہیں پڑھی۔''

میں نے عرض کیا: میں شکار کے جانور پر نوک دار لکڑی پھینکتا ہوں، وہ اسے جا لگے تو اس کے متعلق کیا حکم

ہے؟ فرمایا: ''تم نوک دار لکڑی پھینکو اور وہ شکار کے جسم کو پھاڑ ڈالے تو وہ حلال ہے، تم اسے کھا سکتے ہو اور اگر وہ چوڑائی کے بل جانور کو لگے، یعنی دھار کے بغیر محض چوٹ سے اسے مار ڈالے تو اسے مت کھاؤ کیونکہ وہ ''وقیذ'' یعنی چوٹ زدہ ہے۔'' (صحيح البخاري، الذبائح والصيد، حديث: 5476,5475) (وقیذ، ایسے جانور کو کہتے ہیں جو چوٹ کھا کر مر گیا ہو۔ وہ نہ تو زخمی ہوا ہو نہ اس سے خون خارج ہوا ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ ''تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردار جانور، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مر جانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔'' (المآئدة 3:5))

صحیحین کی دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جب شکار کے لیے کتے کو چھوڑو تو اسے چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو، یعنی تکبیر پڑھ لو۔ وہ اسے پکڑ کر زندہ حالت میں تمھارے پاس لے آئے تو تم اسے ذبح کر لو اور اگر تم اسے بے جان پاؤ اور اس کتے نے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو تب بھی تم اسے کھا سکتے ہو کیونکہ ایسے کتے کا اسے شکار کر لینا ذبح کے حکم میں ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے: ''اگر کتے نے شکار میں سے کچھ کھا لیا تو تم اسے مت کھاؤ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے اس کو تمھارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا ہو۔'' (تفسير ابن كثير: 582/1)

اسی طرح ان کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزے اور طلوعِ فجر کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔

(الإصابة: 468/2)

اس وقت سورۃ البقرۃ کی آیت: 187 میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کے الفاظ نازل نہیں ہوئے تھے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سیاہ اور سفید دھاگے اپنے تکیے کے قریب رکھ لیے اور رات کے آخری حصے میں ان پر نظر رکھی۔ مگر مجھے ان میں امتیاز نہ ہو سکا۔ صبح ہونے پر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اپنا یہ واقعہ آپ کے گوش گزار کیا تو آپ نے فرمایا: ''اس سے یہ حسی دھاگے نہیں بلکہ معنوی دھاگے، یعنی رات کی ظلمت اور دن کی روشنی مراد ہے۔'' اسلام قبول کر لینے کے بعد عدی رضی اللہ عنہ کو دین سے والہانہ محبت ہو گئی

تھی۔ان کا اپنا بیان ہے کہ جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ فوراً نماز ادا کرلوں۔

(صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4509، 4510)

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سیدنا عدی رضی اللہ عنہ زندگی بھر اسلام پر ثابت قدم رہے۔سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی میں انھوں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اپنی قوم سے صدقات و زکاۃ کی وصولی اور مرتدین کے خلاف مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا اور ان تمام مواقع پر اسلام اور اہل اسلام کا خوب دفاع کیا۔

صحیح بخاری میں ''قِصَّةُ وَفْدِ طَيِّئٍ وَّ حَدِيثُ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ'' کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے۔امام صاحب نے اس باب میں سیدنا عدی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک وفد کی صورت میں امیرالمومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔آپ نے تمام افراد کو ایک ایک کر کے بلوایا اور ان کے نام پوچھے۔میں نے عرض کیا: امیرالمومنین! کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے؟ انھوں نے فرمایا: کیوں نہیں۔

آپ تو اس وقت ایمان لائے تھے جبکہ باقی لوگ ابھی کفر پر ڈٹے ہوئے تھے۔آپ اس وقت ادھر آئے تھے جب لوگ اسلام سے اعراض کر کے دور بھاگ رہے تھے۔جب دوسرے لوگوں نے بدعہدی اور بے وفائی کی تھی، آپ نے اس وقت وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔جب لوگ مخالف تھے، آپ نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔

امیرالمومنین کے منہ سے یہ بات سن کر عدی رضی اللہ عنہ نے خوشی سے عرض کیا: آپ کو میرے متعلق اتنا تعارف ہے تو مجھے کسی بھی چیز کی کوئی پروا نہیں۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4394)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ ہی سب سے پہلے صدقات لے کر مدینہ منورہ پہنچے تھے۔آپ نے اپنی قوم کو ارتداد سے روکنے کے سلسلے میں بھی بھرپور کردار ادا کیا تھا۔

(فتح الباري: 328/2)

سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں آپ تمام جنگوں اور فتوحات میں اور پھر عراق وفارس بالخصوص فارس کے دارالحکومت مدائن کی فتح میں بھی شریک تھے۔

ان فتوحات میں کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کی ملکیت میں آئے تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش

گوئی کو خود ملاحظہ کیا جو آپ نے ان کے سامنے کی تھی۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ ان کے ہمنوا رہے اور کوفہ میں اقامت رکھی۔ (فتح الباري: 329/2)

نجران کے عیسائیوں کا وفد

جزیرۂ عرب کے جنوب میں واقع وسیع وعریض علاقہ ''نجران'' کہلاتا ہے۔ (معجم البلدان: 266/5) یہ بہت سے شہروں پر مشتمل ہے اور یہاں متعدد عرب قبائل آباد ہیں۔ اسلام سے قبل یہاں نصرانیت کا دور دورہ تھا۔ ان کے سرزمین شام اور جزیرۂ عرب کے شمال میں، نیز حبشہ کے عرب عیسائیوں کے ساتھ گہرے روابط تھے۔ (المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام: 614/6)

عرب نصرانی علماء اکثر و بیشتر ان کے ہاں آتے جاتے تھے۔ دورِ نبوت میں اور اس سے قبل نجران کا علاقہ نصرانیت کا گڑھ تھا۔ (المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام: 616/6) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے سے پہلے ہی یہ لوگ دعوتِ اسلام سے آگاہ ہو چکے تھے۔ (نجران فی عصر النبوة والخلافة الراشدة، ص: 19) تاریخ میں مختلف طرق سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے اس دور کے مشہور پادری (اُسقف) قس بن ساعدہ ایادی کو سوقِ عکاظ میں خطاب کرتے سنا تھا۔ (المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام: 616/6)

بلادِ عرب کے جنوب میں نجران، نصرانیت کا اصل مرکز شمار ہوتا تھا۔ وہاں ان کی باقاعدہ تنظیم اور مختلف مذہبی ادارے موجود تھے۔ وہاں ان کا ایک عہدے دار ''العاقب'' کہلاتا تھا۔ اہل سیر کے قول کے مطابق اس کی حیثیت ان کے امیر، صاحب الرائے اور انتہائی ذمے دار کی سی ہوتی تھی۔ سب لوگ اس کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ اسی طرح ان کا ایک عہدے دار ''السید'' کہلاتا تھا۔ پوری قوم اپنے معاملات اس تک پہنچا کر اس کی رائے لیا کرتی تھی۔ وہ پوری قوم کے مالیاتی اور اجتماعی امور کا مشیر اور ذمے دار ہوتا تھا۔ ان کا ایک انتہائی ذمے دار اور عہدے دار ''اسقف'' کہلاتا تھا۔ وہ ان کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا، امام اور ان کے دینی اور تعلیمی اداروں کا نگران ہوتا تھا۔

''السید'' اور ''اسقف'' دونوں مل کر اپنی قوم کی قیادت اور سیاسی و مالیاتی امور کی نگرانی کرتے اور انھیں سرانجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ پوری قوم کے باقی معاملات بھی نمٹاتے تھے۔

(المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام: 617/6)

نجران کے نصرانیوں کے ہاں قبائلی حکومت نہیں تھی بلکہ قبائلی عصبیت سے یکسر مختلف انداز میں دینی اور مذہبی بنیادوں پر حکومت قائم تھی جس میں مختلف قبائل کی متعدد اقوام مل کر حکومت کرتی تھیں۔

(المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام: 618/6)

رسول اللہ ﷺ نے نجران کے نصرانیوں کے نام ایک خط بھیجا تھا۔ یہ خط پڑھ کر پادری ڈر کے مارے خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے ہمدان قبیلے کے ایک آدمی شرحبیل بن وداعہ کو مشاورت کے لیے طلب کیا۔ ملک میں جب بھی کوئی اس قسم کا اہم اور مشکل ترین مسئلہ پیش آتا تو عاقب، سید اور اُسقف کو اطلاع دینے سے پہلے اس سے مشاورت کی جاتی تھی۔ پادری نے رسول اللہ ﷺ کا خط اس کے حوالے کیا کہ اسے پڑھو۔ اس کے بعد پادری نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:

ابومریم! اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شرحبیل نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اولاد اسماعیل کی نسل میں نبوت کے متعلق کیا تھا۔ عین ممکن ہے یہ وہی نبی ہو جن کے متعلق ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہوتا تو میں اپنی رائے دیتا لیکن یہ تو نبوت کا معاملہ ہے۔ میں اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں دے سکتا۔ پادری نے اس کو ایک علیحدہ جگہ بٹھا دیا۔ اس کے بعد اس نے قبیلۂ حمیر کی شاخ ذی اصبح کے ایک آدمی کو بلوایا جس کا نام عبداللہ بن شرحبیل تھا۔

اس نے اسے بھی یہ خط پڑھوا کر اس سے رائے طلب کی۔ اس نے بھی شرحبیل بن وداعہ کی سی بات کہی۔

پادری نے اسے بھی ایک الگ جگہ بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ اس کا نام جبار بن فیض تھا۔ یہ حارث بن کعب کے خاندان کی ایک شاخ بنوحماس کا فرد تھا۔ پادری نے اسے بھی یہ خط پڑھنے کو دیا اور اس بارے میں اس کی رائے طلب کی۔ اس نے بھی اپنے سے پہلے دو آدمیوں شرحبیل بن وداعہ اور عبداللہ بن شرحبیل کے جوابات جیسا جواب دیا۔ پادری نے اسے بھی ایک جگہ بھیج دیا۔

پادری کو ان تینوں کی طرف سے ایک سا جواب ملا تو اس نے ناقوس بجانے، چراغاں کرنے اور گرجا گھروں میں ٹاٹ اٹھانے کا حکم صادر کیا۔ ان کے ہاں معمول تھا کہ دن کے وقت کوئی اہم اعلان کرنا ہوتا تو ایسے ہی کیا

کرتے تھے۔ اور اگر رات کو اعلان کرنا ہوتا تو ناقوس بجایا جاتا اور گرجا گھروں میں خوب چراغاں کر دیا جاتا۔

جب اعلان کی اطلاع دی گئی تو پوری وادی کے طول وعرض سے لوگ جمع ہو گئے۔ وادی اس قدر طویل تھی کہ تیز گھوڑ سوار آدمی پورے دن میں بمشکل ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچتا تھا۔ یہ وادی چھوٹی بڑی تہتر آبادیوں اور ایک لاکھ بیس ہزار جنگجو افراد پر مشتمل تھی۔ سب لوگ آ گئے تو پادری نے ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا۔ اور اس بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ بالآخر اہل رائے کے مشورے سے طے پایا کہ شرحبیل بن وداعہ ہمدانی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا جائے۔ (تفسیر ابن کثیر:1/371,370)

طویل مشاورت کے بعد طے پایا کہ ساٹھ آدمیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ ان میں سے چوبیس آدمی ان کے چوٹی کے رہنما اور ان میں سے پھر تین آدمی ایسے تھے جنھیں ہر قسم کی گفتگو اور معاملہ طے کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

ان میں سے ایک کے منصب کا نام ''العاقب'' تھا۔ اور خود اس کا اپنا نام ''عبدالمسیح'' تھا۔ یہ ان کا رئیس، امیر اور صاحب الرائے تھا اور اسے ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ دوسرے کے منصب کا نام ''السید'' اور اس کا نام ''ایہم'' تھا۔ یہ ان کے اجتماعی امور کا نگران اور ذمے دار تھا۔

تیسرے کے منصب کا نام ''اسقف'' تھا۔ اور اس کا اپنا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔ یہ بنو بکر بن وائل قبیلے کا فرد تھا۔ یہ ان کا پادری، امام اور ان کے دینی وتعلیمی ادارے کا منتظم تھا۔ ابوحارثہ، ان کا مذہبی رہنما بھی تھا۔ ان کی مذہبی کتب پڑھا ہوا اور ان سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے علمی مرتبے اور مذہب میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہونے کی وجہ سے روم کے نصرانی حکمران اس کی بہت تکریم کرتے، مال و دولت سے نوازتے اور اس کی ہر قسم کی خدمت بجالاتے تھے۔

انھوں نے اسے متعدد گرجا گھر تعمیر کر کے دیے تھے اور یہ ان کی نگرانی کرتا تھا۔ اس وفد کے ارکان مدینہ منورہ آ کر اپنے سفر والے لباس تبدیل کر کے نئے صاف ستھرے، اجلے اور اعلیٰ ترین لمبے لمبے جبے زیب تن کر کے اور طلائی انگوٹھیاں انگلیوں میں ڈال کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ انھوں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے ان کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ انھوں نے سارا دن آپ سے گفتگو کی کوشش جاری رکھی مگر آپ

نے انھیں کچھ بھی اہمیت نہ دی۔

سیدنا عثمان بن عفان اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما تاجر آدمی تھے۔ وہ اسلام سے پہلے بھی تجارت کے سلسلے میں نجران جاتے رہتے تھے۔ ان کی ان نجرانیوں سے جان پہچان تھی۔ نجرانیوں نے ان دونوں کی تلاش شروع کر دی تو انھیں یہ انصار و مہاجرین کی ایک مشترکہ محفل میں مل گئے۔ انھوں نے ان سے کہا: اے عثمان اور عبدالرحمان! آپ کے نبی نے ہمارے نام خط لکھا۔ ہم نے ان کی بات مان لی اور ان سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ ہم نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انھیں سلام کہا تو انھوں نے ہمارے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ ہم نے سارا دن ان سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کی مگر انھوں نے ہمارے ساتھ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیا خیال ہے؟ کیا ہم ان سے ملاقات کیے بغیر ہی لوٹ جائیں۔ محفل میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے۔ ان دونوں نے ان سے کہا: ابوالحسن! ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میرا مشورہ ہے کہ یہ لوگ اپنے فاخرانہ لباس اور طلائی انگوٹھیاں اتار کر اپنے سفر والا (سادہ لباس) پہن کر آپ کی خدمت میں جائیں تو بات بن جائے گی، چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے۔ انھوں نے جا کر سلام قبول کیا تو آپ نے سلام کا جواب دیا۔ دوران ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پادری سے فرمایا: ''ابوحارث! اسلام قبول کر لو اور مسلمان ہو جاؤ۔'' وہ بولا کہ میں تو مسلمان ہوں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا: ''ابوحارث اسلام قبول کر لو اور مسلمان ہو جاؤ۔'' اس نے پھر کہا: میں تو آپ سے بھی پہلے اسلام قبول کر چکا اور مسلمان ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم (عیسیٰ علیہ السلام کو) اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہو، خنزیر کا گوشت کھاتے ہو (حالانکہ وہ حرام ہے) اور تم شراب نوشی کرتے ہو (یہ بھی حرام ہے) یہ سب کام اسلام کے منافی ہیں۔'' (المغازي لابن أبي شيبة، وفتح الباري: 259/16، وتاريخ المدينة لعمر بن شبة: 583/1)

ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طویل گفت وشنید ہوئی۔ دوران گفتگو ان کے ایک رئیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ تو ہمارے نبی کی توہین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں سے ایک اور آدمی نے تیکھے انداز میں کہا: آپ ذرا بتلائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا جواب دینے میں جلدی نہیں کرتے تھے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے

جواب نہ آجاتا آپ خاموش رہتے تھے، چنانچہ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ ﴾

''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، پھر آپ کے پاس علم آ جانے کے بعد جو کوئی عیسیٰ کے متعلق آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو بلا لیں اور خود بھی (حاضر ہوں) پھر گڑگڑا کر اللہ سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

(آل عمران 3:59-61، وزاد المعاد لابن قیم: 3/621-633)

رسول اللہ ﷺ پر جب یہ آیات، یعنی آیات مباہلہ نازل ہوئیں تو آپ نے انھیں مباہلہ کرنے کے لیے دوسرے دن آنے کی دعوت دی۔ وہ سب نصرانیوں کے علماء تھے۔ وہ آپس میں مشاورت کے لیے اکٹھے ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا: اللہ کی قسم! اگر وہ واقعی نبی ہیں اور ہم نے ان سے مباہلہ کیا تو ہم کبھی فلاح نہیں پاسکیں گے اور نہ ہماری اولادیں ہی ہمارے بعد محفوظ رہ سکیں گی، نیز روئے زمین سے ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ (تاریخ المدینة لابن شبة: 2/584، وتفسیر ابن کثیر: 1/371)

ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صاف اور کھری کھری باتیں سن کر فیصلہ کیا کہ آپ کے ساتھ مباہلہ نہ کیا جائے اور آپ ان کے متعلق جو بھی حکم صادر فرمائیں، وہ اسے تسلیم کر لیں، چنانچہ ان کے سربراہ شرحبیل بن وداعہ ہمدانی نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص (محمد ﷺ) کوئی بھی بے جا بات نہیں کرتا۔ (زاد المعاد لابن قیم: 3/643)

دوسرے دن صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء، سیدنا حسن، سیدنا حسین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ آپ نے آ کر ان نجرانیوں کو مباہلے کے لیے بلایا تو وہ ڈر کر مسجد میں ادھر ادھر

چھپنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ نبی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں آپ ان کے لیے بددعا نہ کر دیں۔

ان کے سربراہ شرحبیل نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: آپ کے ساتھ مباہلہ کرنے کی بجائے ایک بہترین تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: وہ یہ کہ آپ آج شام تک اور اس کے بعد ساری رات صبح ہونے تک سوچ بچار کر کے ہمارے متعلق جو بھی فیصلہ کر دیں، ہمیں وہ منظور ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات کہنے میں شاید کوئی دوسرا آدمی تمھیں ورغلا رہا ہے؟'' اس نے کہا: نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں فیصلہ کرنے میں مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہوں۔ آپ چاہیں تو میرے دوسرے دونوں ساتھیوں سے بھی اس بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔

آپ نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ ہمارے پورے علاقے اور ساری وادی میں کوئی بھی شخص شرحبیل کی رائے اور فیصلے کو رد نہیں کرتا، چنانچہ اس کے بعد نبی ﷺ ان کے ساتھ مباہلہ کیے بغیر واپس آ گئے۔ اس کے بعد وہ دوسرے دن نبی ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ نے ان کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل صلح نامہ لکھوا دیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ عہد نامہ ہے جو اللہ کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران کے لیے لکھا۔

''اہل نجران کے سیاہ وسفید، سونے، چاندی، پھلوں اور غلاموں، یعنی ہر چیز پر اللہ کے رسول کا حکم نافذ ہوگا پھر آپ ﷺ نے ان پر احسان کرتے ہوئے یہ سب کچھ انھیں اس شرط پر دیا کہ وہ سالانہ دو ہزار جوڑے اور دو ہزار اوقیہ چاندی ادا کریں گے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہوگا کہ ہر صفر کے مہینے میں ایک ہزار جوڑا اور ہزار اوقیہ چاندی دینا ہوگی اور ہر رجب کے مہینے میں بھی اسی مقدار میں جوڑے اور چاندی ادا کرنا ہوگی۔ ٹیکس میں کمی و بیشی اسی حساب سے ہوگی۔ اگر وہ اس کے بدلے زرہیں، گھوڑے، اونٹ یا دیگر ساز وسامان دیں گے تو وہ اسی حساب سے لیا جائے گا۔

◎ اہل نجران کے ذمے ہوگا کہ وہ بیس یا اس سے کم دنوں تک میرے نمایندوں کے تمام اخراجات اور رہائش کا انتظام کریں گے۔

◎ کسی نمایندے کو ایک ماہ سے زیادہ نہیں روکا جائے گا۔

◎ اگر یمن میں کوئی سازش یا ہنگامی صورت حال ہوئی تو اہل نجران تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ عاریتاً دینے کے پابند ہوں گے۔ اگر ان عاریتاً لی گئی اشیاء میں سے کوئی چیز ضائع ہوگئی تو میرے نمایندے اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ صرف نجران والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور محمد ﷺ کی ذمہ داری ہوگی۔ ان کے مال و جان، دین، زمین، حاضر، غائب، خاندان اور متعلقہ لوگ سبھی امن و امان کے حق دار ہوں گے، بشرطیکہ وہ اس عہد کی پاسداری کریں۔

◎ ان کے حقوق اور دین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے ہٹایا جائے گا نہ کسی راہب کو رہبانیت سے منع کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی یہودی کو اس کے معبد خانے کی نگرانی سے بھی معزول نہیں کیا جائے گا۔ اور ان کے پاس تھوڑی یا زیادہ جتنی دولت ہوگی اس کے بارے میں ان سے باز پرس نہیں ہوگی۔

◎ ان پر بداعتمادی ہوگی نہ جاہلیت کے کسی خون کا ان سے مطالبہ ہوگا، نیز انھیں ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے گا نہ مزید کوئی ٹیکس لیا جائے گا۔

◎ جس نے ان میں سے اپنے حق کا مطالبہ کیا، اسے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق ملے گا۔ نہ اس پر ظلم کیا جائے گا نہ اسے ظلم کرنے دیا جائے گا، البتہ جس نے اس سے پہلے سود کھایا ہو تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

◎ کوئی شخص ظلم و زیادتی کرے گا تو اس کے بدلے میں کسی دوسرے کو نہیں پکڑا جائے گا۔

◎ اس عہد نامے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی پناہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری اس وقت تک ہوگی جب تک اہل نجران مسلمانوں کے خیر خواہ رہیں گے اور اپنی ذمہ داریوں کو ایمانداری سے پورا کرتے رہیں گے۔

◎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی نیا حکم آ گیا تو یہ عہد نامہ منسوخ تصور ہوگا۔

اسی واقعے کے ضمن میں سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ

تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

”بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، پھر آپ کے پاس علم آ جانے کے بعد جو کوئی عیسیٰ کے متعلق آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو بلا لیں اور خود بھی (حاضر ہوں) پھر گڑگڑا کر اللہ سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ بے شک یہی بیان سچا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔“ (آل عمران 3:59-64)

ان آیات میں ہر زمانے اور ہر علاقے کے تمام نصرانیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مناقشے اور مباہلے کی عام دعوت ہے۔ ﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ ﴾

”(یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔“ (آل عمران 3:60)

حقیقت یہ ہے کہ دورِ رسالت کے نصرانیوں کی طرح دورِ حاضر کے بھی اکثر عیسائی اس بات کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول اور نبی ہیں۔ مگر وہ ہٹ دھرمی کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ اور نجرانی نصرانیوں کے مابین معاہدہ طے پا گیا تو انھوں نے عرض کیا: آپ کسی دیانت دار اور امین آدمی کو ہمارے ساتھ روانہ کر دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمھارے ساتھ ایک ایسے دیانت دار آدمی کو بھیجوں گا جو واقعی بہت دیانت دار اور امین ہوگا۔''

یہ سن کر سب لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں یہ اعزاز کسے نصیب ہوتا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوعبیدہ بن جراح! تم اٹھو۔'' پھر آپ نے ان کو ان کے ہمراہ روانہ فرمایا۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 408، وصحيح البخاري، المغازي، حديث: 4380-4382)

وفد نے نجران واپس جا کر قوم کے سامنے اپنا دفاع کیا اور بتلایا کہ ہم محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر آئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی بددعا کے اندیشے سے انھوں نے جزیہ ادا کرنا منظور کر لیا ہے، نیز انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اعتراف کیا کہ وہ واقعی اللہ کے رسول ہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے اسلام قبول نہ کیا، البتہ ان میں سے صرف دو آدمیوں نے مدینہ منورہ واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ان میں سے ایک کا نام بشر بن معاویہ ہے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہے تا آنکہ بعد میں مقام شہادت سے سرفراز ہوئے۔ (زاد المعاد: 637/3، والبداية والنهاية: 55/5) اور دوسرے آدمی ان کے اسقف، امام، مذہبی رہنما اور ان کے دینی و مذہبی ادارے کے منتظم ابو حارثہ بن علقمہ کے بھائی کرز بن علقمہ تھے۔ (زاد المعاد: 80/3)

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو نجران روانہ فرمایا تو ان کا وہاں جانا بابرکت ثابت ہوا۔ وہ نصرانیوں کے سامنے اہل اسلام کی طرف سے ایک شاندار نمونہ اور اسلام کے بہترین داعی ثابت ہوئے۔ مالیاتی امور کے حوالے سے انھوں نے اپنی ذمے داری کو خوب سمجھا اور اچھے طریقے سے نبھایا۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 409)

نجران میں ان کے اور علمائے نصاریٰ کے مابین قرآن کے حوالے سے گفت وشنید ہوتی رہتی تھی۔ اسی طرح ان کے علاوہ بھی جن صحابۂ کرام کو رسول اللہ ﷺ نے نجران بھیجا، ان کے ساتھ بھی ان کی نوک جھوک رہتی تھی۔ اسی سلسلے میں سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے نجران بھیجا تو نجران کے نصرانی علماء نے مجھ سے کہا: تم قرآن میں یوں پڑھتے ہو:

﴿ يَٰٓأُخۡتَ هَٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمۡرَأَ سَوۡءٖ وَمَا كَانَتۡ أُمُّكِ بَغِيّٗا ﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی۔'' (مریم 28:19)

یعنی قرآن کے مطابق سیدہ مریم، سیدنا ہارون علیہ السلام کی بہن تھیں۔ جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان طویل عرصے کا وقفہ ہے۔ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے ان کے اس سوال کا جواب کچھ بھی سجھائی نہ دیا۔ میں نے واپس آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''تم انھیں یہ جواب دیتے کہ وہ لوگ اپنے بچوں کو سابقہ انبیاء اور صالحین کے ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے۔'' (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 409، وصحيح مسلم، حديث: 2135) یعنی سیدہ مریم علیہا السلام کو ہارون نبی کی بہن نہیں کہا گیا بلکہ ان کے بھائی کا نام بھی ''ہارون'' تھا۔

10 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی نجران بھیجا تھا تاکہ وہ نجران کے نصرانیوں سے جزیہ اور وہاں کے مسلمانوں سے صدقات وصول کریں۔ وہ حج کے دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے تھے۔ (زاد المعاد: 637/3، والسيرة النبوية: 60/4)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک مسلمانوں کے اہل نجران کے ساتھ تمام معاملات درست رہے اور ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہونے والا معاہدہ بحال رہا، البتہ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بعض علاقوں میں فتنۂ ارتداد نے سر اٹھایا۔ نجران میں بھی بعض نومسلم اس فتنے کا شکار ہوئے۔ عین ممکن ہے کہ اس فتنے میں نصرانی یا دیگر غیر مسلموں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ شرکت کی ہو، البتہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے دوران میں اہل اسلام اور نجران کے نصرانیوں کے درمیان کوئی قابل ذکر الجھاؤ پیدا نہیں ہوا۔

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور اسلامی مملکت کی حدود پھیلنے لگیں تو بلادِ عرب میں سے بہت سے قبائل بالعموم اور فتوحات میں شریک ہونے والے قبائل بالخصوص مفتوحہ علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ ان دنوں نجران کے نصرانی، مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی مملکت سے یکسر الگ تھے اور ان فتوحات میں ان کا کچھ بھی کردار نہیں تھا۔ وہ بھی ان نئے علاقوں کی طرف نقل مکانی کے خواہش مند تھے مگر اسلام قبول نہ کرنے اور جنگوں اور فتوحات میں عدم شرکت کی وجہ سے وہ اس خواہش کو پورا

نہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود نجران میں ان کی تعداد میں معقول اضافہ ہو رہا تھا اور وہ کسی بھی وقت مسلمانوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے با سند بیان کیا ہے کہ اہل نجران کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خدشہ رہتا تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ ہمارے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے، لہٰذا آپ ہمیں یہاں سے کسی دوسری طرف جلا وطن کر دیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکھ کر دیا تھا کہ انھیں یہاں سے جلا وطن نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جب خود ہی یہ تجویز پیش کی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے انھیں یہاں سے نقل مکانی کی اجازت دے دی۔ وہ لوگ یہ تجویز پیش کرنے اور اس کے منظور ہو جانے کے بعد اپنے فیصلے پر نادم ہوئے۔

انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر درخواست کی کہ ہم اپنی تجویز واپس لیتے ہیں۔ ہمیں یہیں ٹھہرنے دیا جائے مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور فیصلہ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے تو ان لوگوں نے ان سے بھی سفارش کرانا چاہی کہ فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔ انھوں نے بھی سفارش سے انکار کرتے ہوئے کہا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ بالکل درست ہے۔

سیدنا سالم کہتے ہیں کہ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے کسی فیصلے پر اعتراض کرنا ہوتا تو اہل نجران کے متعلق ان کے فیصلے پر اعتراض کرتے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 408)

جیسا کہ نصوص سے واضح ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اہل نجران سے ان کی بے آباد اراضی اور انگور کے سارے باغات خرید لیے تھے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 407)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ وہ سودی لین دین نہیں کریں گے۔ مگر وہ معاہدے کے باوجود اس سے باز نہ آئے اور سودی لین دین کرتے رہے۔ انھیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس پر مؤاخذے کا اندیشہ تھا۔ انھوں نے امیر المومنین کی طرف سے مؤاخذہ کیے جانے سے پہلے خود ہی جا کر یہاں سے کسی دوسری جگہ نقل مکانی کی اجازت طلب کر لی۔ اس طرح انھوں

نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ ایک تو سرکاری مؤاخذے سے بچ گئے اور دوسرا یہ کہ اس بہانے انھیں نئے اسلامی مفتوحہ علاقوں میں جا کر آباد ہونے کی راہ اور اجازت مل گئی۔ اسلامی حکومت کی طرف سے انھیں ان کی فصلوں اور انگور کے باغات کے عوض معقول ہی نہیں بلکہ بھاری معاوضے ادا کیے گئے۔

یہ سارے امور طے ہو جانے کے بعد انھیں اس پر پشیمانی بھی ہوئی اور انھوں نے امیر المومنین سے اس نئے معاہدے کو کالعدم کرنے کی درخواست بھی کی لیکن امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمھاری ہی درخواست پر یہ سب کچھ طے پایا ہے، لہٰذا اب اس میں ترمیم نہیں کی جاسکتی۔

بالآخر انھیں نجران سے عراق کی طرف نقل مکانی کرنی ہی پڑی، البتہ امیر المومنین نے وہاں کے مسلم حکمران کو لکھا کہ ان نجرانیوں کی وہاں پر آبادکاری میں ان کی بھرپور مدد کریں اور انھیں رہائش اور زراعت کے لیے اراضی مہیا کی جائے۔

آپ نے لکھا کہ امیر المومنین کی طرف سے تحریر کیا جاتا ہے کہ نجران سے آنے والوں کو اللہ کی طرف سے مکمل امان حاصل ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ان کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جو بھی معاہدے کیے، تمام مسلمان ان کو پورا کریں اور کوئی بھی مسلمان ان کو کسی بھی قسم کی ایذا نہ پہنچائے۔

شام اور عراق کے حکمرانوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق زمین کی پیمائش کر دیں۔ یہ جب تک وہاں کاشت کاری کرتے رہیں، یہ ان کی نجران والی زمینوں کے بدلے میں انھی کی ہوگی۔ ان سے اس زمین کی قیمت نہ لی جائے نہ ان کی زمینوں اور مکانات پر قبضہ کرنے کی کسی مسلمان کو اجازت ہے۔ یہ ہمارے ملک میں ذمی ہیں۔ کسی بھی طرف سے اور کسی بھی حوالے سے ان پر زیادتی ہو تو اردگرد کے تمام مسلمان ان کی مدد اور مکمل حمایت کریں گے۔

ان کے وہاں آباد ہونے کے بعد اگلے چوبیس مہینوں تک ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اس حکم نامے پر بطور گواہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور معیقیب بن ابی فاطمہ کے دستخط کیے گئے۔ عراق میں کوفہ کے قریب ان کا ایک الگ اور نیا محلّہ آباد ہوا۔ اس کا نام ''نجرانیہ'' تھا۔ (الطبقات لابن سعد: 358/1)

بتوں کی شامت

پورے بلادِ عرب میں جگہ جگہ بت پھیلے ہوئے تھے، حتیٰ کہ مکہ مکرمہ میں کعبہ مشرفہ کے اردگرد مسجد حرام میں بھی تین سو ساٹھ بت رکھ دیے گئے تھے اور مشرکین ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض بتوں، مثلاً: لات، منات وغیرہ کا قرآن کریم میں نام بہ نام تذکرہ آیا ہے۔

عرب قبائل اپنے ان بتوں پر فخر کرتے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں مشرکین کو اس عمل سے روکا گیا اور یہ بیان ہوا کہ گزشتہ زمانوں میں بھی اللہ کے انبیاء اپنی قوموں کو اس سے روکتے اور بت پرستی کی تردید کرتے رہے، جیسا کہ اللہ کے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اے میرے رب! بے شک انھوں (بتوں) نے بہت سے لوگ گمراہ کیے ہیں، پھر جو میری اتباع کرے تو یقیناً وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو بلاشبہ تو غفور (اور) رحیم ہے۔'' (إبراهيم 36:14)

رسول اللہ ﷺ کا بھی بنیادی مشن یہی تھا کہ لوگوں کے دلوں میں پائے جانے والے غلط عقیدے اور شرک کو نکال پھینکا جائے۔ آپ کی پوری کوشش رہی کہ بت پرستی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ان بتوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ مکہ فتح ہوتے ہی آپ نے سرِ عام لوگوں کی موجودگی میں کعبہ مشرفہ کے اردگرد موجود بتوں کو فوری طور پر تہس نہس اور نیست و نابود کر دیا۔ جب آپ بتوں کو پاش پاش کر رہے تھے، اس وقت آپ قرآن کریم کی اس آیتِ مبارکہ کا بار بار ورد کر رہے تھے:

﴿ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ ﴾

''اور کہیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔'' (بنی إسرآء یل 81:17)

آپ ﷺ کا ہدف تھا کہ جہاں تک آپ کا ہاتھ پہنچے، وہاں تک جتنے بھی بت موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک کا بھی وجود باقی نہ رہے، چنانچہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد آپ نے اطراف میں ہر سمت اپنے فوجی دستے روانہ فرمائے تاکہ جہاں جہاں بت اور بت خانے موجود ہیں، ان کا یکسر خاتمہ کر دیں۔

اس کے نتیجے میں سارے عرب پر آپ کی ہیبت چھا گئی اور آپ کو مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ اس طرح آپ نے جہاں بتوں کا خاتمہ کیا، اس کے ساتھ ساتھ ان کی عبادت کرنے والوں کو یہ بھی سمجھایا کہ یہ سب عاجز اور بے اختیار ہیں۔ یہ تو اپنے آپ کو بھی نہ بچا سکے، دوسروں کے کیا کام آئیں گے؟

آپ نے بتوں کے انہدام اور خاتمے کے سلسلے میں جو دستے روانہ فرمائے، ان میں سے بعض کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

''عزیٰ'' کا انہدام

مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں جہاں قبیلۂ ہذیل آباد تھا، اس علاقے میں ''عزیٰ'' نام کا ایک بت تھا۔ (الأصنام للكلبي، ص: 16، والمفصل: 235/7)

مشرکین اللہ تعالیٰ کی بجائے اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں اس کا ذکر آیا ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ ﴾

''کیا پھر تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔'' (النجم 20,19:53)

مشرکین عرب اس کی پوجا کرتے، مشکلات میں اسے پکارتے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ (صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4860,4859، والتفسير لابن كثير: 1780/2)

یہی وجہ ہے کہ غزوۂ احد میں لڑائی ختم ہونے کے بعد ابوسفیان نے اپنی فتح اور مسلمانوں کے نقصان پر اِتراتے ہوئے تکبر سے کہا: لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ ہمارا تو ایک عزیٰ بت ہے، تمھارا کوئی عزّیٰ

نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کہو «اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ» ''ہمارا اللہ مولیٰ ہے، تمھارا کوئی مولیٰ نہیں۔''(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 238)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک دستہ بھیج کر اس کو ملیامیٹ کرا دیا۔(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 145/2)

سواع بت کا انہدام

یہ مکہ مکرمہ کے مشرق میں واقع وادی نخلہ میں قدیم زمانے کا ایک بت تھا۔(المفصل: 257/6)

اسے قبیلۂ ہذیل کا بت بھی کہا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی ایک آیتِ مبارکہ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ﴾

''اور انھوں نے کہا: تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور ہرگز تم نہ چھوڑنا وَدّ کو اور نہ سُواع کو اور نہ یَغُوث اور یَعُوق اور نَسر کو۔''(نوح 23:71)

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک فوجی دستے کے ہمراہ ادھر بھیجتے ہوئے حکم فرمایا کہ جا کر اس کو تہس نہس کر دو۔ اس بت خانے کا مجاور کہنے لگا: یہ بت اپنا دفاع خود کرے گا اور عمرو بن عاص کسی بھی صورت اسے منہدم نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اللہ کے فضل سے اسے پاش پاش کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ وہ بت نہ اپنے آپ کو بچا سکا نہ اسے توڑنے والوں کا کچھ بگاڑ سکا تو وہ اپنے معبود کی لاچاری اور بے بسی دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ یوں یہ بت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گیا۔ الحمد للہ۔(تفسير ابن كثير: 1923/2)

منات کی تباہی

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان وادی قدید میں المشلل کے نواح میں منات نامی ایک بت تھا۔

(تفسير ابن كثير: 1781/2، والمفصل: 246/6، وصحيح البخاري، حديث: 4861)

عرب لوگ بالعموم اور یثرب کے اوس اور خزرج کے مشرکین بالخصوص اس بت کی پوجا کرتے اور اس کا

تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔(صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4861)

سورۃ النجم کی درج ذیل آیت میں اس کا ذکر آیا ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ ﴾

''کیا پھر تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔''(النجم 53:19,20)

مکہ فتح ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد بن زید اشہلی انصاری رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ دے کر روانہ فرمایا کہ جا کر اس بت اور بت خانے کا نام و نشان مٹا ڈالو۔ اس بت کے مجاوروں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت اپنا دفاع خود کرے گا، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ مسلمانوں نے اسے پاش پاش کر کے معدوم کر دیا۔ اس طرح اس بت کا وجود اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت و ہیبت کا تأثر ختم ہو گیا۔(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 146/2، وشرح المواهب اللدنيه: 348/2)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بنو طے کے بت خانے ''الفلس'' کا انہدام

نبیٔ کریم ﷺ نے ایک دستہ ماہ ربیع الاول 9 ہجری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ انھوں نے جا کر ''طے'' قبیلے پر حملہ کیا اور بت کو پاش پاش کر کے اس کا بے بہا خزانہ مالِ غنیمت کے طور پر لائے، نیز ان کے کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کر لائے۔ قیدیوں میں حاتم طائی کی دختر ''سفانہ'' بھی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے اسے رہا کر دیا تھا۔ بعد میں وہی اپنے بھائی عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجنے اور اس کے قبولِ اسلام کا ذریعہ بنی۔ اس واقعہ کی تفصیل قبل ازیں بیان ہو چکی ہے۔(زاد المعاد: 517/3، والتاريخ للطبري: 148/3، وصحيح البخاري، المغازي، حديث: 4340، والطبقات لابن سعد: 164/2)

سیدنا طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قبیلۂ دوس کے بت ''ذوالکفین'' کا انہدام

غزوۂ حنین کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حممہ کے قبائل کے ''ذوالکفین'' نامی بت کو گرانے اور اسے نیست و نابود کرنے کے لیے سیدنا طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ انھوں نے جا کر اسے پاش پاش کر کے آگ لگا کر راکھ بنا دیا۔ رسول اللہ ﷺ طائف میں کفار کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ یہ لوگ اللہ کے

فضل سے اپنی اس مہم میں کامیاب ہو کر آپ ﷺ سے طائف میں آن ملے۔

(الطبقات لابن سعد: 157/2، المغازي للواقدی: 922/3، والسیرة النبویة للصلابی: 666/2)

ذوالخلصہ کی تباہی

یمن میں آباد خثعم قبیلے کی ایک شاخ ''بجیلہ'' کہلاتی تھی۔ وہ لوگ ''ذوالخلصہ'' نامی بت کے پجاری تھے۔ (فتح الباري: 190/16) وہ اس کے اس قدر عقیدت مند اور شیدائی تھے کہ بعض لوگ اس کے استھان کو کعبہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَلَا تُرِيحُنِي مِنْ ذِي الْخَلَصَةِ» ''کیا تم مجھے ذوالخلصہ سے راحت نہیں پہنچاؤ گے؟'' جریر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیوں نہیں۔ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ گھوڑے پر جم کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس کمزوری کا رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک ان کے سینے پر رکھتے ہوئے یہ دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا»

''یا اللہ! اسے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کی قدرت عطا فرما اور اسے لوگوں کے لیے ہدایت کا راہبر اور ہدایت یافتہ بنا دے۔''

آپ کی یہ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی اور وہ اس کے بعد کبھی بھی گھوڑے سے نہ گرے، چنانچہ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ احمس قبیلے کے ایک سو پچاس گھوڑ سواروں کا قافلہ لے کر اس مہم کے لیے روانہ ہوئے اور ''ذوالخلصہ'' پہنچ کر اسے ملیامیٹ کر دیا۔

اور ایک قاصد کو مدینے بھیجا تا کہ وہ جا کر رسول اللہ ﷺ کو یہ خوشخبری سنائے۔

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''کیا تم مجھے ذوالخلصہ کے حوالے سے خوش کر سکتے ہو؟'' میں نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! کیوں نہیں۔''

چنانچہ میں احمس قبیلے کے ایک سو پچاس گھوڑ سوار آدمیوں پر مشتمل دستہ لے کر روانہ ہوا۔ یہ سب لوگ تجربہ کار گھوڑ سوار تھے جبکہ میں گھوڑے پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی اس کمزوری کا آپ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک قدرے زور سے میرے سینے پر رکھا اور مجھے آپ ﷺ کے ہاتھ کا اثر اپنے سینے

کے اندر تک محسوس ہوا۔ آپ نے میرے حق میں یوں دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا»

''یااللہ! اسے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کی قدرت عطا فرما اور اسے دوسروں کے لیے ہادی (راہِ ہدایت کا رہبر) اور مہدی (ہدایت یافتہ) بنا۔''

ان کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے اس کے بعد میں کبھی گھوڑے سے نہیں گرا۔ فرماتے ہیں کہ یمن میں خثعم اور بجیلہ کا ایک بت خانہ تھا۔ انھوں نے اس کا نام ذوالخلصہ رکھا ہوا تھا۔

اس میں ایک استھان بھی تھا۔ وہ اسے ''کعبہ'' کہتے تھے۔ جریر رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر اسے پاش پاش کر کے آگ لگا دی۔ ان کا بیان ہے کہ جب وہ یمن پہنچے تو وہاں ایک آدمی تیر کے پانسوں کے ذریعے سے لوگوں کو قسمت بتلاتا تھا۔ اس آدمی کو بتلایا گیا کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کا ایک فرستادہ آیا ہوا ہے۔ اسے موقع ملا تو وہ تمھاری گردن اڑا دے گا۔

وہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھا اپنے اس مشرکانہ کام میں مصروف تھا کہ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ اس کے پاس پہنچ گئے اور فرمایا: ان تیروں کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کر لو ورنہ میں تمھیں قتل کر ڈالوں گا، چنانچہ اس نے فوراً تیروں کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کا اقرار کر لیا۔ بعدازاں سیدنا جریر رضی اللہ عنہ نے قبیلۂ احمس کے ایک آدمی ابوارطاۃ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ مدینے جا کر رسول اللہ ﷺ کو یہ خوشخبری سنائے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچ کر آپ ﷺ کو خبر دیتے ہوئے کہا:

اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر اور حق دے کر مبعوث کیا ہے، میں وہاں سے جب روانہ ہوا تو بت کی حالت یہ تھی کہ وہ جل کر خارش زدہ اونٹ کی طرح ہو چکا تھا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ازراہِ مسرت بنواحمس کے ان جوانوں کے لیے پانچ مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔

(صحيح البخاري، حديث: 4357)

حجۃ الوداع

حج، اسلام کا پانچواں اہم اور بنیادی رکن ہے۔ قرآن کریم کی ایک مستقل سورت اسی نام سے موسوم ہے۔ قرآن کریم کی تقریباً بارہ آیات میں حج اور شعائر حج کا ذکر آیا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ حج کی فرضیت بلکہ ہجرت سے پہلے بھی قریش کے خود ساختہ طریقے کے برعکس عین سنت ابراہیمی کے مطابق حج کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ایک ہی حج کیا جو 10 ہجری میں ہوا۔ اسی کو ''حجۃ الوداع'' کہا جاتا ہے۔ (محدثین نے اس حوالے سے مستقل عنوانات قائم کیے ہیں: صحيح البخاري، قبل الحديث: 4395، تاریخ اسلام میں اس حج کو حجۃ الاسلام اور حجۃ التمام بھی کہا جاتا ہے۔)

اس سے قبل 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی و قیادت میں فریضہ حج ادا کر چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ حرمت اور امن والے شہر مکہ مکرمہ میں اپنی آنکھوں سے شرک کے مظاہر کو نہ دیکھیں، اس لیے آپ نے ایک سال کے لیے حج کی ادائیگی کو مؤخر کر دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آپ نے 9 ہجری میں حج کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ذریعے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ آج کے بعد مشرکین کا مسجد حرام میں داخلہ بند ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اے ایمان والو! بلاشبہ مشرک تو ہیں ہی پلید، لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو اگر اللہ چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' (التوبة 28:9)

حجۃ الوداع درحقیقت نبی ﷺ کی طرف سے حج اور مناسک حج کی ادائیگی کے حوالے سے امت کی عملی تربیت بھی تھی۔ اسی سلسلے میں آپ ﷺ نے حج کے دوران میں فرمایا تھا:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّي لَا أَدْرِي لَعَلِّي لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هٰذِهِ»

''لوگو! تم مجھ سے حج کے طریقے اچھی طرح سمجھ لو اور سیکھ لو، شاید میں اس حج کے بعد (دوبارہ) حج نہ کر سکوں۔'' (صحيح مسلم، الحج، حديث: 1297)

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہی امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں ''باب حجۃ الوداع'' کے زیر عنوان ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے 10 ہجری میں ماہ ذوالحجہ سے قبل اعلان کرا دیا تھا کہ آپ امسال حج کے لیے تشریف لے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر رسول اللہ ﷺ کی معیت اور اقتدا میں حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد مدینہ منورہ میں جمع ہوگئی۔ (فتح الباري: 229/16)

رسول اللہ ﷺ حج کی ادائیگی کے لیے پچیس ذوالقعدہ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کا سفر آٹھ دنوں میں طے ہوا۔ سفر کے دوران صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ سے حج اور دین کے مسائل پوچھتے اور سیکھتے گئے۔ راستے میں بھی اطراف و اکناف سے صحابۂ کرام کے قافلے اس عظیم قافلے میں شامل ہوتے گئے۔ مدینہ منورہ سے آپ کے ساتھ آنے والے آپ کے اہل بیت، ازواج مطہرات اور دیگر اہل مدینہ ان کے علاوہ تھے۔

نبیٔ کریم ﷺ تلبیہ پکارتے تو صحابۂ کرام بھی آپ کے ساتھ وجد و سرور کے ساتھ تلبیہ پکارتے اور کھلم کھلا اعلان کرتے جاتے کہ وہ صرف ایک اللہ کے عبادت گزار، اس کی توحید کا اعتقاد رکھنے والے اور اس کا اقرار کرنے والے ہیں:

«لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ»

’’حاضر ہوں، یااللہ! میں حاضر ہوں۔ بار بار حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں پھر حاضر ہوں۔ یقیناً سب تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لیے ہیں اور ساری بادشاہت بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔‘‘

(صحيح البخاري، الحج، حديث: 1549)

یہ تلبیہ جسے امت مسلمہ اپنے آغاز سے دورِ حاضر تک سیکھتی اور اپنے سے بعد والوں کو سکھاتی اور بڑے اہتمام سے اس کا ورد کرتی آ رہی ہے، یہ شرک اور اہل شرک سے براءت و لاتعلقی کا واضح اعلان ہے۔ اس میں کھلم کھلا اعتراف ہے کہ یہ پوری کائنات اور ساری نعمتیں اسی اللہ وحدہ لاشریک کی طرف سے ہیں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے چار ذوالحجہ کی رات مکہ مکرمہ کے قریب (وادیٔ ذی طویٰ میں) بسر کی اور پانچ ذوالحجہ کی صبح چاشت کے وقت آپ مسجد حرام میں پہنچے۔ اس وقت آپ یہ کلمات دہراتے جاتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ»

’’یا اللہ! تو سراپا سلامتی ہے، سلامتی تیری ہی طرف سے آتی ہے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھنا۔‘‘ (نبیٔ کریم ﷺ سے یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں، تاہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اس موقع پر یہ الفاظ ثابت ہیں: السنن الكبرىٰ للبيهقي: 72/5)

آپ ﷺ کی نظر مبارک بیت اللہ پر پڑی تو آپ نے یوں دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيفًا وَّتَعْظِيمًا وَّتَكْرِيمًا وَّمَهَابَةً»

’’یا اللہ! اپنے اس گھر کے شرف و عزت، عظمت، تکریم اور ہیبت میں اضافہ فرما۔‘‘

(ضعيف الجامع للألباني، حديث: 4456، والسلسلة الضعيفة، حديث: 4215)

آپ ﷺ کعبہ کے قریب تشریف لے گئے اور اونٹنی پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا۔ لوگ چاروں اطراف سے آپ کو دیکھتے اور آپ کی اقتدا کرتے ہوئے سارے اعمال آپ ہی کی طرح بجا لاتے رہے۔ جس بات کی وضاحت محسوس کرتے وہ آپ سے دریافت کر لیتے۔ صحابۂ کرام دور دراز سے آ آ کر آپ کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھے، وہ بڑی توجہ سے آپ کے اعمال و افعال کو دیکھتے اور آپ کے فرمودات کو سماعت فرما رہے تھے۔

آپ کے ہاتھ میں چھڑی (کھونڈی) تھی۔ آپ نے اس کے ساتھ حجر اسود کا استلام کیا۔ طواف کے ابتدائی

تین چکروں میں ''رمل'' کیا، یعنی قدرے تیزی سے چلے۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے درج ذیل آیت کی تلاوت کی:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾

''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے۔'' (البقرة 125:2)

طواف کے بعد آپ ﷺ نے مقام ابراہیم کے قریب طواف کی دو رکعتیں ادا فرمائیں۔ مقام ابراہیم آپ کے سامنے تھا۔ آپ نے پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ الکافرون اور دوسری رکعت میں سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی۔ اس کے بعد آپ نے دوبارہ حجر اسود کا استلام کیا، یعنی اسے بوسہ دیا، پھر آپ صفا پر تشریف لے گئے اور یہ آیت تلاوت کی:

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' (البقرة 158:2)

صفا کے اوپر پہنچ کر آپ ﷺ نے قبلہ رو ہو کر تین دفعہ اللہ اکبر کہا، پھر یہ کلمات ادا فرمائے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

''اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ حکومت اسی کی ہے اور وہی تمام تعریفوں کا

حقدار ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کے تمام لشکروں کو اس اکیلے نے مات دی۔''

اس کے بعد آپ مروہ کی طرف تشریف لے گئے اور اس طرح سعی مکمل کی۔ اس دوران میں آپ خود اس بات کو یاد کرتے اور صحابہ کرام کو بھی یاد دلاتے رہے کہ اللہ ہی نے آپ کی نصرت فرمائی اور اللہ ہی نے ان مشرکوں کو شکست سے دوچار کیا جنھوں نے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو ایذاؤں سے دوچار کیا تھا۔ اب اسی اللہ نے شرک کا خاتمہ کر کے توحید کا علم بلند کر دیا ہے۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا کہ وہ عنقریب مسلمانوں کی مدد کر کے انھیں عزت اور غلبہ عطا فرمائے گا، اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں چار دن گزارے۔ اس دوران میں آپ کا قیام وادی ابطح میں رہا۔ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ بھی مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور اپنی اہلیہ محترمہ دختر رسول سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے آ ملے (جو مدینہ طیبہ سے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آئی تھیں)۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4354,4353، والسيرة النبوية لابن كثير: 334/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 602/4)

8 ذوالحجہ بروز جمعرات چاشت کے وقت نبیٔ کریم ﷺ نے حجاج کرام کے ہمراہ منیٰ کا رخ کیا۔ وہاں آپ نے لوگوں کو ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی جمع اور قصر کر کے پڑھائیں۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ مؤذن تھے۔

صحابۂ کرام نبیٔ کریم ﷺ کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے تبرک حاصل کرتے تھے۔ یوم عرفہ، 9 ذوالحجہ کو نبی ﷺ نے فجر کی نماز منیٰ میں پڑھائی اور سورج طلوع ہو جانے کے بعد عرفات روانہ ہو گئے۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ آپ کے لیے عرفات سے متصل وادیِ نمرہ میں خیمہ لگایا جائے۔

قریش نے دین ابراہیمی میں جو تبدیلیاں کر ڈالی تھیں ان میں سے ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وہ حج کے موقع پر باقی تمام مناسک ادا کرتے مگر عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ ان کے ذہن میں شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ اہل حرم ہیں اور عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے، اس لیے انھیں عرفات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ بھی قریشی تھے، تاہم آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عرفات میں بھی حاضری دی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''پھر جہاں سے سب لوگ لوٹیں وہیں سے تم بھی لوٹو اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (البقرة 199:2)

رسول اللہ ﷺ کے لیے وادیِ نمرہ میں خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اور یوم عرفہ (9 ذوالحجہ) کا دن 6 مارچ 632ء کو تھا۔ (أزمنة التاريخ الإسلامي، ص: 28)

ان دنوں موسم سرما کا اختتام اور موسم گرما کی ابتدا ہو رہی ہوتی ہے۔ مکہ مکرمہ کی آب و ہوا تو موسم سرما میں بھی شدید گرم ہوتی ہے۔ گرما کا اندازہ آپ خود کر لیں کہ گرمی کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ گرمی سے بچاؤ اور سائے کے حصول کی خاطر آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اس سے ایک مقصود یہ بھی تھا کہ آپ کو آسانی سے پتہ چل جائے کہ آپ کس جگہ تشریف فرما ہیں تاکہ جو آدمی آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہو وہ آسانی سے آپ تک پہنچ سکے۔ نیز اس سے عرفات کی حدود کا تعین ہو جائے کیونکہ وادی نمرہ عرفات سے باہر اور الگ ہے۔ آپ ﷺ اپنے خیمے میں یاد الٰہی میں مصروف رہے۔ اس طرح آپ نے اپنے فرمائے ہوئے اس ارشاد پر بھی عمل کیا:

«خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ، وَخَيْرُ مَا قُلْتُ أَنَا وَالنَّبِيُّونَ مِنْ قَبْلِي لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

''سب سے بہترین دعا عرفہ کے دن، یعنی 9 ذوالحجہ کی دعا ہے۔ اور سب سے بہتر کلمات وہ ہیں جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں تمام حکومت و بادشاہی اسی کی ہے اور تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔'' (جامع الترمذي، حديث: 3585)

سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے (حج کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت کریمہ پڑھتے سنا:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾

''اللہ نے گواہی دی ہے کہ بے شک اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف کے ساتھ قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ انتہائی غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (آل عمران 18:3)

روایات میں بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے دن جو دعائیں کیں، ان میں ایک دعا یہ بھی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرٰى مَكَانِي وَ تَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي وَلَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ أَمْرِي، وَأَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهِ، أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِينِ وَاَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ، مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ، وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهُ، وَذَلَّ لَكَ جَسَدُهُ، وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهُ، اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْنِي بِدُعَائِكَ شَقِيًّا، وَكُنْ بِي رَؤُوفًا رَّحِيمًا، يَا خَيْرَ الْمَسْؤُولِينَ وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِينَ»

''یا اللہ! تو میری ہر بات سن رہا اور میری جگہ سے بھی واقف ہے۔ تو میرے باطن اور ظاہر کو جانتا ہے، میری کوئی بھی بات تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ میں از حد درماندہ اور تہی دست ہوں، تیری مدد کا محتاج اور تیری گرفت سے پناہ کا طالب ہوں، میں تجھ سے ڈرتا ہوں، اپنی تقصیر کا اعتراف کرتا ہوں، میں تجھ سے اس طرح دعائیں کرتا اور مانگتا ہوں، جیسے کوئی تنگ دست آدمی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اس سے سوال کرتا اور مانگتا ہے۔ میں تیری طرف انتہائی عاجز آدمی کی طرح لپک کر آیا ہوں اور میں تجھ سے اس آدمی کی طرح دعائیں کرتا ہوں، جیسے کوئی ڈرا ہوا اور خوف زدہ آدمی کسی سے التجا کرتا ہے۔

جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہ رہی ہے اور اس کے جسم پر تیرے خوف سے لرزہ طاری ہے اور اس کی ناک تیرے سامنے خاک آلود ہو چکی ہے، اے میرے پروردگار! میں تجھے پکار رہا ہوں، مجھے محروم نہ کرنا تو مجھ پر مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا۔ اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر اور سب دینے والوں سے اچھے!''

(تفسير ابن كثير: 358/1، والمعجم الكبير للطبراني: 378,377/9)

روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب آپ اونٹنی پر سوار تھے۔

رسول اللہ ﷺ جب وادیٔ نمرہ میں خیمے میں تشریف فرما تھے، وہاں آپ فارغ نہیں بیٹھے بلکہ سارا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعاؤں میں مصروف رہے۔ سورج ڈھل جانے کے بعد آپ قصواء اونٹنی پر سوار ہو کر وادیٔ عرفہ کے درمیان تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ لوگوں کو خاموش کرایا جائے تاکہ وہ آپ کا خطبہ توجہ سے سنیں اور اسے یاد رکھ سکیں۔ جب آپ نے خطبہ شروع کیا تو کچھ صحابۂ کرام تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پورے مجمع میں پھیل گئے تاکہ آپ جو کچھ ارشاد فرمائیں وہ آپ کی بات سن کر آگے لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ (تاريخ الطبري: 169/3)

آپ نے اس روز جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا مختلف روایات میں اس کے تھوڑے تھوڑے اجزاء بیان ہوئے ہیں۔ راویوں کے لیے پورا خطبہ من وعن یاد رکھنا ممکن نہ رہا۔ انھوں نے آپ کے خطبے اور بیانات کے معانی یاد رکھے اور مختلف مواقع پر سنے ہوئے مواعظ حسب ضرورت بیان کر دیے۔ اس خطبے میں آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، ان میں سے کچھ مواعظ اور بیانات درج ذیل ہیں:

''لوگو! میری باتیں توجہ سے سنو۔ ممکن ہے کہ اس سال کے بعد میری تمھارے ساتھ اس مقام پر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔''

''لوگو! تمھارے خون، یعنی جانیں اور مال قیامت تک ایک دوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں، جیسے اس مہینے (ذوالحجہ) میں آج کے دن (9 ذوالحجہ) کی حرمت ہے۔''

''تم عنقریب اپنے رب کے پاس جانے والے ہو وہ تم سے زندگی میں کیے ہوئے اعمال کے بارے میں دریافت کرے گا، (ان کا حساب لے گا۔) میں تمھیں ہر بات کھول کھول کر واضح کر رہا ہوں۔ یاد

رکھو! تم میں سے جس کسی کے پاس کوئی امانت ہے اسے چاہیے کہ وہ اسے اس آدمی کو واپس لوٹا دے جس نے اس کو امین (دیانت دار) سمجھ کر اس کے پاس امانت رکھی تھی۔''

''سود کا لین دین بالکل ختم کیا جاچکا ہے، البتہ جس نے کسی کو سود پر مال دیا تھا اسے اصل زر لینے کا حق حاصل ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

''اللہ تعالیٰ نے اٹل فیصلہ کر دیا ہے کہ سودی لین دین بالکل ختم ہے۔''

''میرے چچا عباس بن عبدالمطلب نے لوگوں سے جو سود لینا تھا، میں اس سارے کی معافی کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ کسی سے بھی سود نہیں لیں گے۔ اسی طرح قبل از اسلام جو قتل ہوئے، آج سے وہ تمام خون اور قتل معاف کرتا ہوں۔ ان میں سے کسی بھی قتل کا کسی سے بھی بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ میرے خاندان میں ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا بیٹا جو بنولیث کے قبیلے میں دودھ پی رہا تھا اور بنو ہذیل کی عورتوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا، میں سب سے پہلے اس کا قتل معاف کرتا ہوں۔''

''امابعد.....شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ سرزمین عرب میں اب اس کی عبادت کی جائے، البتہ وہ اس کے علاوہ باقی گناہوں کے بارے میں پرامید ہے کہ وہ تم سے دوسرے گناہ کرواتا رہے گا۔''

''تم اپنے جن اعمال کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہو وہ انھی پر راضی ہے۔ تم دین کے معاملے میں اس سے بچ کر رہو۔''

''لوگو! سال کے مہینوں کو اپنی مرضی سے آگے پیچھے کرنا مزید ایک کافرانہ حرکت ہے۔ جس سے یہ کافر لوگ مزید گمراہ کیے جاتے ہیں۔ ایک سال کسی مہینے کو حلال اور دوسرے سال اسی مہینے کو حرام (حرمت والا) قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ اللہ کے حرام کردہ، یعنی حرمت والے مہینوں کی تعداد کو پورا بھی کر دیتے ہیں اور اللہ کے حرام کیے ہوئے کو اپنے لیے حلال بھی کر لیتے ہیں۔ اب زمانہ گھوم گھام کر اپنی اسی اصل حالت پر آ گیا ہے جو حالت اس دن تھی جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔''

''اللہ کے ہاں سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ تین مہینے مسلسل ہیں اور چوتھا مضر قبیلے والا مہینہ رجب ہے جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے۔'' (مضر قبیلے کے

لوگ رجب کی حرمت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، اس لیے اس مہینے کو ان کی طرف منسوب کیا گیا۔)

''لوگو! تمھاری بیویوں کے ذمے تمھارے اور تمھارے ذمے ان کے بہت سے حقوق ہیں۔ ان پر فرض ہے کہ وہ تمھارے بستر پر کسی بھی ایسے آدمی کو نہ آنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے، نیز ان پر لازم ہے کہ وہ کھلم کھلا کسی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اللہ کی طرف سے تمھیں اجازت ہے کہ تم ان کے بستروں سے الگ رہو اور انھیں سزا دو لیکن سخت سزا نہ دو۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی بے حیائی سے باز آجائیں تو معروف انداز کے مطابق ان کا کھانا پینا اور لباس مہیا کرنا تمھاری ذمے داری ہے۔ میں تمھیں بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ تمھارے ماتحت اور تمھاری خدمت گار ہیں۔ وہ اپنے بارے میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ تم انھیں اللہ کی امانت، یعنی اس کے دین کے تحت اپنے پاس لائے ہو۔ اور تم نے اللہ کے کلمات، یعنی اس کے مقرر کردہ اصول و ضابطے کے تحت ان کی عصمت کو اپنے لیے حلال کیا ہے، لہٰذا لوگو! میری بات کو اچھی طرح سمجھو۔ میں اللہ کا دین تم تک پہنچا رہا ہوں۔''

''میں تمھارے درمیان ایسی واضح اور مضبوط چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم مضبوطی سے انھیں تھامے رہے تو کبھی بھی راہِ راست سے نہیں بھٹکو گے: ایک اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔''

''لوگو! میری باتیں توجہ سے سنو اور سمجھو۔ تم اس حقیقت کو جانتے ہو کہ ہر مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اور تمام اہل اسلام آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے اس کے مسلمان بھائی کی کوئی چیز حلال نہیں الا یہ کہ وہ اپنی کوئی چیز اپنی مرضی سے کسی کو دے دے۔''

''تم کسی بھی حوالے سے اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ میں تمھیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے اللہ کا دین تم لوگوں تک پہنچا دیا ہے؟'' راویٔ حدیث کا بیان ہے کہ مجھ سے ذکر کیا گیا کہ اس کے جواب میں صحابۂ کرام نے کہا: اللہ گواہ ہے کہ آپ نے اللہ کا دین ہم تک مکمل طور پر پہنچا دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یا اللہ! تو اس بات پر گواہ رہ۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 605/4، والسيرة النبوية لابن كثير: 342)

دوران خطبہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے، یعنی ہر ایک کے لیے وراثت میں اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے، لہٰذا اب کسی بھی وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں۔''

''شرعی اور قانونی طور پر بچہ اس کا سمجھا جائے جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا ہے اور زنا کرنے والا محروم رہے گا، یا اس کو پتھر مار کر سنگسار کر دیا جائے گا۔ جو کوئی جانتے بوجھتے خود کو حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کرے، یا جو غلام اپنے حقیقی مالک کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا مالک قرار دے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا کوئی فرض قبول کرے گا نہ نفل۔''

(السيرة النبوية لابن هشام: 605/4)

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، یعنی ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو۔'' (صحيح البخاري، حديث:4403)

ابن ہشام نے آپ کے خطبے کے جو الفاظ روایت کیے ہیں بعض روایات میں مروی الفاظ اگرچہ ان سے کچھ مختلف ہیں، تاہم ان کا بھی مفہوم یہی ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ باتیں دس ذوالحجہ کے دن یا بعض دوسرے مواقع پر ارشاد فرمائی گئی ہوں، مثلاً: صحیح بخاری میں سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''زمانہ گھوم گھام کر اپنی اسی اصل حالت پر آ گیا ہے جو حالت اس کی اس دن تھی جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ اللہ کے ہاں سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ تین لگاتار اور مسلسل ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا مہینہ رجب ہے۔ جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے اور مضر قبیلے کے لوگ اس کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔''

پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''لوگو! آج کون سا دن ہے؟'' ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ ہم نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی نیا نام تجویز کرنے والے ہیں، پھر آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا: ''کیا یہ یوم النحر (دس ذوالحجہ) نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: جی ہاں، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون سا مہینہ ہے؟'' ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے

ہیں۔اس پر آپ خاموش رہے، ہم نے سمجھا شاید آپ اس مہینے کا کوئی نیا نام رکھیں گے، پھر آپ نے خود فرمایا: ''کیا یہ ماہ ذوالحجہ نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: جی ہاں، پھر آپ نے دریافت فرمایا: ''یہ کون سا شہر ہے؟'' ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

آپ ﷺ پھر خاموش رہے۔ ہم نے سمجھا شاید آپ اس کا کوئی نیا نام رکھیں گے۔ پھر آپ نے خود ہی فرمایا: ''کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے خون، یعنی تمھاری جانیں، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں، جیسے تمھارا یہ دن تمھارے اس شہر میں تمھارے اس مہینے میں حرمت والا ہے۔تم عنقریب اپنے رب سے جا کر ملو گے، وہ تم سے زندگی میں کیے ہوئے تمھارے اعمال کا حساب لے گا۔خبردار! تم میرے بعد گمراہ (کافر) نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔خبردار! ذرا بتلاؤ تو سہی کیا میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا؟ خبردار! تم میں سے جو لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں وہ میری یہ باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں۔ کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ براہ راست سننے والوں کی نسبت وہ لوگ ان باتوں کو بہتر طور پر سمجھ جاتے ہیں جن تک یہ پہنچائی جاتی ہیں۔''

محمد بن سیرین رحمہ اللہ اس حدیث کو روایت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: محمد ﷺ نے سچ فرمایا ہے، پھر آپ ﷺ نے دو دفعہ فرمایا: ''کیا میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا ہے؟'' (صحيح البخاري، حديث: 4406)

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ خطبہ قیامت تک آنے والی پوری انسانیت کے لیے اور ہر زمانے کے لیے بہترین دستور العمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے جو کچھ بیان فرمایا، یہ ان میں سے اہم ترین خطبہ ہے۔ اس میں اللہ کی توحید، انسانوں کے بدنی، روحانی اور مادی حقوق، عورتوں کے حقوق، ان کے شرف کا تعین، دوسروں پر ظلم و تعدی کی حرمت، امانت کی ادائیگی کی ترغیب اور اس کی اہمیت کا بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان ہے۔ نیز اس خطبے میں آپ نے سود کی لعنت کا خاتمہ کر کے اسے جڑ سے اکھاڑ کر ایک جدید عالمی اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی جو عدل و اعتدال کے راہنما اصولوں پر مبنی ہے۔

آپ نے ماضی میں اور دورِ جاہلیت میں سرزد ہو جانے والے واقعات وحوادث کو بھلا دینے پر زور دیا، نیز انسانی جانوں کے احترام اور وقار کا احساس دلایا۔ شیطان انسانوں کو ورغلا کر انسانی معاشرے میں جو فساد کا بیج بوتا اور دہشت گردی اور قتل وخوں ریزی کے ذریعے سے فتنے پھیلاتا ہے، آپ نے انسانیت کو اس سے محتاط رہنے پر زور دیا۔ نیز آپ نے واضح فرمایا کہ انسان ہونے کے ناتے سے تمام انسان آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ ان سب کی ابتدا ایک ہی ہستی سے ہوئی ہے۔

مزید آپ نے امت کو ایک بنیادی شرعی مرجع قرآن وسنت کے تمسک اور اس کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی کہ صحیح دنیاوی نظام اور شریعت ہی انسان کی فلاح کے ضامن ہیں اور انسانی معاشروں کو انھی اصولوں اور ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے جو ضابطے ان کے خالق نے مرتب فرمائے ہیں تاکہ انسانی معاشرہ امن کا گہوارہ بن کر اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے اور باہمی تعاون حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح بنیادوں پر استوار ہو سکے۔ اس خطبے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے خطبے کے بعد لوگوں کو بھی اس بات پر گواہ بنایا اور ان سے اس بات کی گواہی لی کہ واقعی آپ اللہ کی امانت لوگوں تک مکمل طور پر پہنچا کر اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے صحابۂ کرام سے گواہی کے الفاظ سن کر اپنی انگشت مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ فَاشْهَدْ» ''یا اللہ! یہ لوگ میری ادائے امانت کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس بات پر تو بھی گواہ رہ۔'' یہ عمل کر کے آپ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اللہ تو بندوں کی ہر بات سے مکمل طور پر باخبر ہے۔

نیز آپ نے بڑی تاکید سے واضح فرمایا کہ سارا میدانِ عرفہ اور پوری وادیٔ مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے۔ ان میں جہاں بھی وقوف کر لیا جائے، وہ درست ہوگا۔ اسی طرح آپ نے منیٰ میں جب قربانی کی تو آپ نے اس بات کی بھی صراحت فرمائی کہ میں نے تو یہاں قربانی کی ہے اور یاد رکھو! پورے منیٰ میں جہاں کہیں بھی قربانی کر لی جائے وہ درست ہے، یعنی سارا منیٰ ہی قربان گاہ ہے۔ (مسند أحمد: 72/1، وتاريخ الطبری: 170/4)

میدانِ عرفات میں جب آپ خطبہ دینے سے فارغ ہوئے تو آپ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردار جانور، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کرلو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج وہ لوگ ناامید ہو گئے جنھوں نے تمھارے دین کا انکار کیا، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کرلیا، پھر جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے جبکہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (المائدۃ 5:3)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو زارو قطار رونے لگے۔ نبی ﷺ نے دریافت فرمایا: ''عمر! کیوں روتے ہو؟'' عرض کیا: اللہ کے رسول! اب تک ہمارے لیے دین میں اضافہ ہوتا رہا۔ اب جبکہ یہ مکمل ہو چکا ہے تو کوئی بھی چیز جب اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو اس میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ گویا اب دین میں آہستہ آہستہ کمی آتی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، تمھاری بات درست ہے۔''

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے جانے کی اطلاع تھی۔

(السیرۃ الحلبیۃ: 325/3، والسیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 579/1)

نیز جس اعلیٰ خدمت کے لیے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا، اس کے پورا ہو جانے کے بعد آپ کو دنیا سے جانا ہی تھا۔ مزید اس آیت کے نزول سے یہ عیاں ہو گیا کہ دین کی تکمیل و تبلیغ اور امت کی خیر خواہی کی جو گواہی

لوگوں نے دی تھی، اللہ نے بھی اسے سن لیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کی طرف سے اپنے فریضے کی تکمیل اور احکام رسالت کی ادائیگی کے ساتھ ہی اللہ کا دین مکمل اور اس کی نعمت تمام ہو چکی، لہٰذا اب آپ امت کو الوداع کہنے والے ہیں۔ اور آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آچکا ہے۔ اس موقع پر صحابۂ کرام کی وہ بات بھی سچ ثابت ہوتی ہے کہ ابھی نبی ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور ہم حجۃ الوداع کی باتیں کیا کرتے تھے، اس وقت ہمیں علم نہیں تھا کہ حجۃ الوداع کا مفہوم کیا ہے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4402)

اس کا تو ہمیں آپ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد پتہ چلا کہ حجۃ الوداع سے کیا مراد ہے؟

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خطبے کے علاوہ بھی منیٰ میں، مکہ مکرمہ میں، یوم النحر کو اور مختلف مناسبتوں سے خطبے ارشاد فرمائے۔ اہل علم اور محدثین نے آپ کے ان خطبات کے مختلف اجزاء اپنی اپنی کتابوں میں ذکر فرمائے ہیں۔ (فتح الباري: 233/16)

ان میں سے آپ کا ایک خطبہ وہ بھی ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد بڑی تفصیل اور وضاحت سے مسیح دجال کا ذکر کیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہر نبی نے اپنی امت کو دجال کے فتنے سے آگاہ اور متنبہ کیا ہے، حتی کہ نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء نے بھی اپنی امتوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ اس کا ظہور تم ہی میں ہوگا جس کا حال تم پر پوشیدہ نہیں رہے گا، لہٰذا یہ بات تم پر پوشیدہ نہ رہے کہ تمھارا رب اس ہیئت اور صورت پر نہیں ہے جو تم پر مخفی رہے۔ بلاشبہ تمھارا رب یک چشم نہیں جبکہ دجال اپنی داہنی آنکھ سے کانا ہے۔ گویا اس کی آنکھ پچکے ہوئے انگور کی مانند ہوگی۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4402)

9 ذوالحجہ کو عرفہ کے دن خطبے کے بعد سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اذان اور بعد ازاں اقامت کہی اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو نماز ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس کے بعد سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اقامت کہی اور رسول اللہ ﷺ نے عصر کی دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوئے۔ جبل رحمت کے قریب نیچے وادی میں جو پتھر پڑے تھے۔ وہاں جا کر آپ نے اپنی اونٹنی کو کھڑا کر دیا اور قبلہ رُو ہو کر دعاؤں اور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات میں مصروف ہو گئے۔ (السيرة الحلبيه: 324/3)

غروب آفتاب کے وقت آپ نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سواری پر اپنے پیچھے سوار کر لیا اور عرفات سے روانہ ہوئے۔ (صحيح البخاري، الحج، حديث: 1669)

آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو دہراتے جاتے تھے:

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾

''پھر جہاں سے سب لوگ لوٹیں وہیں سے تم بھی لوٹو اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (البقرة 2:199)

عرفات سے مزدلفہ کو جاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے تھے:

«أَيُّهَا النَّاسُ، السَّكِينَةَ السَّكِينَةَ» ''لوگو! سکون سے چلو، اطمینان سے چلو۔''

(صحيح البخاري، الحج، حديث: 1671)

عرفات سے مزدلفہ جاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارے راستے میں تلبیہ پکارتے گئے۔ جب آپ مزدلفہ میں پہنچے تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع اور قصر کر کے پڑھائیں۔ اس کے بعد آپ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فجر طلوع ہونے پر آپ نے فجر کی نماز عام معمول سے ہٹ کر انتہائی اول وقت میں ادا کی اور پھر آپ مشعر الحرام کے قریب گئے اور خوب روشنی پھیلنے تک اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے۔ اس وقت سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ سواری پر سوار تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر خوب دعائیں کیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ میں نے ان سب کی مغفرت کر دی ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے پروردگار! تو اس بات پر قادر ہے کہ ظالم کو معاف کر دے اور مظلوم کو اپنی رحمت کے خزانوں میں سے بہتر بدلہ عطا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو اس بات کا کوئی جواب نہ دیا، البتہ جب نماز فجر کے بعد آپ نے دوبارہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ وہ ان کی سب خطائیں معاف کر دے گا، اس پر ابلیس کو بہت دکھ ہوا اور وہ اپنے لیے ہلاکت و تباہی کی دعائیں کرتے

ہوئے اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔(السيرة النبوية لأبي شهبة، ص: 576)

آپ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ وہ جمروں کو رمی کرنے کی خاطر آپ کے لیے سات چھوٹی چھوٹی کنکریاں تلاش کر کے لائے۔ حجاج کرام آج تک اس سنت پر عمل کرتے ہیں، البتہ بعض لوگ اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کی بنا پر ان کنکریوں پر قیاس کرتے ہوئے بڑے بڑے پتھر رمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (ایسا کرنا درست نہیں۔) طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے آپ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ منیٰ پہنچ کر آپ نے جمرۃ العقبہ کی رمی کی۔ اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ آپ نے ہر کنکری پھینکتے وقت اللہ اکبر کہا۔
(السيرة النبوية لابن كثير:4/373)

آپ نے دس ذوالحجہ کے دن منیٰ میں لوگوں سے پھر خطاب کیا۔ اس وقت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے تھے اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما گرمی سے بچاؤ کے لیے آپ پر سایہ کیے ہوئے تھے۔

اس خطبے میں آپ نے زنا کی حرمت کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ تمھارے لیے ایک دوسرے کے اموال اور عزتیں بھی حرام ہیں، نیز آپ نے یوم النحر (دس ذوالحجہ) کو باقی تمام روئے زمین کے مقابلے میں مکہ مکرمہ کی حرمت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! ذرا بتلاؤ تو سہی، آج کون سا دن ہے؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آج کا دن حرمت والا ہے، پھر آپ نے پوچھا: ''یہ کون سا شہر ہے؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ انتہائی حرمت اور عظمت والا شہر ہے۔

آپ نے دریافت فرمایا: ''یہ مہینہ کون سا ہے؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ مہینہ بھی ازحد حرمت والا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تمھارے خون، یعنی جانیں، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی، اس شہر میں اور اس مہینے میں حرمت ہے۔''

آپ نے اس بات کو کئی مرتبہ دہرایا، پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر فرمایا: ''یا اللہ! کیا میں نے ان لوگوں تک تیرا دین اور امانت پہنچا دی؟ لوگو! تم میں سے جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ تمام باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو آج یہاں موجود نہیں ہیں۔''

''لوگو! تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔'' نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

''مجھ سے حج کے اعمال ومناسک اچھی طرح سیکھ لو، ہوسکتا ہے کہ میں آیندہ سال حج نہ کرسکوں۔'' یہ خطبہ دیتے وقت آپ جمرات کے درمیان کھڑے تھے اور کچھ لوگ بیٹھ کر اور کچھ کھڑے ہوکر آپ کا خطبہ مبارکہ سماعت کر رہے تھے۔(صحیح السیرۃ النبویۃ لصالح العلی، ص: 327)

ایک خطبے میں آپ نے یہ بھی فرمایا: ''لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو، پنجگانہ نمازیں اہتمام سے ادا کرتے رہو اور جب تمھیں کوئی حکم دیا جائے تو اسے خوشی خوشی بجالایا کرو، ان اعمال کی بدولت تم اپنے رب کی جنت میں پہنچ جاؤ گے۔''(السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 392/4)

آپ کے خطبوں میں ایک یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں۔ اسی طرح کسی گورے کو کالے پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے، سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔''

(السیرۃ النبویۃ للصلابی: 780/2)

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ان خطبات کے ضمن میں کچھ راویوں کی غلطی سے بعض مسائل تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن راجح امر یہ ہے کہ یہ تکرار راویوں کی غلطی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض مسائل اور امور کی اہمیت کے پیش نظر بہت سے مواقع پر یہ مسائل بار بار ذکر فرمائے ہیں۔

(السیرۃ النبویۃ للصلابی: 776/2)

اس کے بعد آپ ﷺ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک بھی تریسٹھ برس تھی، پھر آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور باقی اونٹ انھوں نے نحر کیے۔ اس طرح آپ نے کل ایک سو اونٹ نحر کیے۔

آپ کے اس عمل سے قربانی کی فضیلت اور اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قربانی کرنے کے شوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آپ اگر اس سے کم تعداد میں اونٹ نحر کرتے تب بھی کافی تھا لیکن آپ نے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی خاطر زیادہ قربانیاں کیں۔ اس عمل کو اسراف (فضول خرچی) نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقرب کا ذریعہ اور عمل ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ متعدد پہلوؤں سے انتہائی قربت ومحبت والا تعلق تھا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے چند اونٹوں کو نحر کرنے کے بعد باقی اونٹوں کو نحر کرنے کی ذمے داری ان کو سونپی۔ آپ ﷺ نے اس کام میں نیابت کے لیے انھی کا انتخاب کیا۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تکریم اور عزت افزائی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے جتنے اونٹ قربان کیے، ہر اونٹ کے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر سارا گوشت جمع کر کے پکایا گیا۔ آپ نے اس میں سے حسب خواہش گوشت تناول فرمایا اور شوربا نوش بھی فرمایا۔ آپ نے باقی سارا گوشت اور چمڑے مستحقین میں تقسیم کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ قصاب کو اس میں سے گوشت بطور اجرت نہ دیا جائے۔ (صحيح البخاري، الحج، حديث: 1716)

پھر آپ نے اپنا سر منڈوایا۔ آپ کے سر کے بال سیدنا معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مونڈے۔ انھوں نے آپ کے سر کے داہنی جانب سے بالوں کو کاٹنا شروع کیا۔ اس کے بعد بائیں جانب کے بال کاٹے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آدھے بال سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کے شوہر سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دے دیے، پھر باقی آدھے بال دوبارہ انھیں دے کر فرمایا کہ انھیں (بطور تبرک) لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے بالوں، آپ کے پسینے اور خوشبو سے تبرک لیا کرتے تھے۔ سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ایک ایک، دو دو اور تین تین کر کے وہ سارے بال صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم کر دیے۔

(صحيح مسلم، الحج، حديث: 1305، وصحيح البخاري، حديث: 171)

آپ نے اس موقع پر دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُحَلِّقِينَ» ''یا اللہ! حلق کرانے والوں، یعنی سر کے بال منڈوانے والوں کی مغفرت فرما۔'' صحابہ نے درخواست کی کہ تقصیر، یعنی بال چھوٹے کرانے والوں کے حق میں بھی دعا فرمائیں۔ آپ نے تین مرتبہ حلق کرانے والوں کے حق میں مغفرت کی دعا کی۔ صحابہ کرام ہر دفعہ تقصیر کرانے والوں کے حق میں دعا کی درخواست کرتے رہے۔ آخر چوتھی مرتبہ آپ نے تقصیر کرانے والوں کے حق میں بھی مغفرت کی دعا کی۔

اس کے بعد ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خوشبو لگائی۔ وہ یہ خوشبو مدینے سے ساتھ لے کر

آئی تھیں۔(السيرة النبوية لابن كثير:3/378، وصحيح البخاري، حديث: 4410, 4411)

صحابۂ کرام آپ کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر پیش آمدہ اشکالات بیان کر کے ان کا حل دریافت فرماتے رہے۔کسی نے سر پہلے منڈوالیا اور کسی نے قربانی پہلے کر لی تھی۔آپ ﷺ نے ہر ایک سے فرمایا:

«اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ» ''کوئی حرج نہیں۔اب باقی کام سرانجام دو۔''

(صحيح البخاري، كتاب الحج، السيرة النبوية لابن كثير: 4/393)

اس کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ جا کر طواف افاضہ کیا۔آپ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے حوض سے پانی نوش فرمایا، پھر زمزم کی طرف جا کر وہاں سے زمزم نوش فرمایا۔آپ کا جی چاہتا تھا کہ بنوعبدالمطلب کے ساتھ مل کر چاہ زمزم سے پانی کھینچ کر لوگوں کو پلائیں، پھر آپ کو خیال آیا کہ ایسا کیا تو لوگ بھی اس سعادت کو حاصل کرنے کی خاطر جمگھٹا کر کے بنوعبدالمطلب پر غالب آجائیں گے۔

اس لیے آپ نے فرمایا:''اے بنوعبدالمطلب! تم زمزم نکال نکال کر لوگوں کو پلاتے رہو۔اگر مجھے لوگوں کے تم پر غالب آجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بھی تمھارے ساتھ مل کر زمزم نکال کر لوگوں کو پلاتا۔''

(السيرة النبوية لابن كثير: 4/381)

اس کے بعد آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے واپس منیٰ تشریف لے گئے اور ایام تشریق کی راتیں وہیں بسر کیں۔ ان دنوں میں آپ ہر روز زوال کے بعد جمرۃ العقبہ، جمرۃ الوسطی اور جمرۃ الصغریٰ کی رمی کرتے رہے۔ ہر جمرے پر سات سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے۔آپ نے صحابہ کرام کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ایام تشریق میں مکہ جا کر بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہیں۔

(12,11 اور 13 ذوالحجہ کے دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔)

آپ ظہر اور عصر کی، اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا فرماتے، لوگوں کو مناسک حج کی تعلیم دیتے اور ان کو سوالات کے جوابات سے مستفید فرماتے رہے۔آپ صحابہ کو بار بار باور کراتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ اب آپ ان کو چھوڑ جانے والے ہیں۔

مہاجرین، انصار اور دیگر قبائل کے آئے ہوئے حجاج کرام پورے منیٰ میں پھیلے ہوئے تھے۔اور آپ لوگوں سے فرماتے تھے:

«مِنیٰ مَنَاخُ مَنْ سَبَقَ» ''جو آدمی منیٰ میں دوسروں سے پہلے آ کر جہاں ٹھہر جائے، وہ جگہ اسی کی ہے۔''

حج کے دوران میں آپ جانوروں کے چرواہوں، کمزوروں اور عورتوں کو ان کی مجبوری کے پیش نظر دوسروں کی نسبت زیادہ رعایت اور شرعی رخصت دیتے تھے۔

بیان ہے کہ آپ نے ایام تشریق کے دوسرے دن، یعنی بارہ ذوالحجہ کو بھی صحابۂ کرام سے خطاب فرمایا۔ اس دن کو ''یوم الرؤوس'' کہا جاتا ہے۔ (اس کے معنی ہیں: ''سریوں کا دن'' حجاج کرام اس دن جانوروں کی سریاں بنا سنوار کر اور پکا کر کھاتے تھے، اس لیے اس دن کا یہ نام رکھ دیا گیا۔ عوام الناس میں اب تک یہی نام ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 405/3))

بارہ ذوالحجہ کے خطبے میں کچھ امور تو وہ تھے جو آپ قبل ازیں یوم عرفہ (9 ذوالحجہ) کو اور یوم النحر (دس ذوالحجہ) کے خطبوں میں بیان فرما چکے تھے۔ اس دن کے خطبے میں آپ نے یہ بھی فرمایا:

«أَلَا لَا تَظْلِمُوا، أَلَا لَا تَظْلِمُوا، أَلَا لَا تَظْلِمُوا، لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِّنْهُ»

''خبردار! کسی پر ظلم نہ کرنا، خبردار! کسی پر ظلم نہ کرنا، خبردار! کسی پر ظلم نہ کرنا۔ کسی بھی مسلمان کے لیے دوسرے کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔'' (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 401/4)

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی حج کے موقع پر سورۃ النصر بھی آپ پر نازل ہوئی، اس لیے اس حج کو ''حجۃ الوداع'' کہا جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 403/4، صحیح البخاري، التفسیر، حدیث: 4970)

اعمال حج سے فراغت کے بعد آپ نے منیٰ سے روانہ ہو کر مکہ کی ایک وادی ''ابطح'' میں نزول فرمایا۔ اس وادی کو خیف بنی کنانہ یا وادیٔ محصب بھی کہا جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 410/4، وصحیح السیرۃ، ص: 549)

مکہ سے واپسی پر یہاں سے روانگی میں آپ کے لیے زیادہ آسانی اور سہولت تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے نبیٔ کریم ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ اللہ کے رسول! کل آپ کس مقام پر قیام فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے؟'' پھر فرمایا: ''ہم ان شاء اللہ کل خیف بنی کنانہ، یعنی وادیٔ محصب میں قیام کریں گے جہاں قریش نے کفر کے کام پر قسمیں کھائی تھیں۔''

(السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: 407/4، وصحیح البخاري، الحج، حدیث: 1590,1589)

اس سے اگلے دن نبیٔ کریم ﷺ نے فجر کی نماز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ کعبہ کے قریب ادا فرمائی اور نماز میں سورۃ الطّور مکمل تلاوت کی۔ اس کے بعد آپ نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان والی جگہ ''ملتزم'' میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کیں۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 411/4)

آپ نے لوگوں کو طواف وداع کے حوالے سے ہدایت فرمائی:

«لَا يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»

''کوئی بھی آدمی ہرگز روانہ نہ ہو، یہاں تک کہ اس کی آخری حاضری، بیت اللہ کا طواف (طوافِ وداع) ہو۔'' (صحيح مسلم، الحج، حديث: 1327)

پورے سفر کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب اور امہات المومنین کی ضرورتوں کا مکمل دھیان رکھا۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واپسی کی رات کو عمرہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے ان کے بھائی سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو بلوا کر ان سے فرمایا:

''تم اپنی ہمشیرہ کے ساتھ حدودِ حرم سے باہر تنعیم جاؤ تاکہ یہ وہاں سے عمرے کا احرام باندھ لے۔ اور انھیں عمرہ کروا لاؤ۔ میں یہیں پر تمھارا انتظار کروں گا۔'' ام المومنین رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ہم گئے۔ میں نے احرام باندھا، پھر بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کے درمیان سعی کی اور ہم رات ہی کو واپس آ گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ اسی مقام پر تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم عمرہ کر آئی ہو؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تب آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو وہاں سے روانہ ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

(صحيح البخاري، الحج، حديث: 1772، السيرة النبوية لابن كثير: 410/4)

رسول اللہ ﷺ مکہ کے نشیبی حصے میں سے گزر کر مکہ سے باہر آئے اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ہجرت کے بعد یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ آپ کی مکہ مکرمہ کی یہ آخری زیارت تھی۔ اس کے بعد دنیا سے رحلت فرما جانے تک آپ دوبارہ مکہ مکرمہ میں تشریف نہ لا سکے۔

حجۃ الوداع کے دوران مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے حالات سے مکمل آگاہ رہے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو قبل از ہجرت کے دور سے رسول اللہ ﷺ کے قریبی ساتھی تھے۔ اور عشرہ مبشرہ میں

سے ہیں، حج کے دوران میں بیمار پڑ گئے تو رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام حجاج کرام کے امور و معاملات میں مشغول ومصروف تھے، اس کے وجود آپ ان کی تیمارداری کے لیے تشریف لے گئے۔

صحیح بخاری میں سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر میں اس قدر بیمار ہوا کہ موت کے قریب جا پہنچا۔ نبی کریم ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میری بیماری کی شدت آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اللہ کے فضل سے میں خاصا مال دار ہوں۔ میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ تو کیا میں اپنے مال میں سے دو تہائی حصہ اللہ کی راہ میں دے دوں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' میں نے عرض کیا: کیا میں اپنا آدھا مال اللہ کی راہ میں دے دوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔''

میں نے عرض کیا: آیا ایک تہائی دے سکتا ہوں؟ فرمایا: ''ہاں۔ یہ بھی بہت ہے۔ سعد! تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں مفلس و کنگال چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جتنا بھی خرچ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا اجر دے گا، یہاں تک کہ تم جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے تمھیں اس کا بھی اجر ملے گا۔''

میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں اپنے ساتھیوں کے (مدینہ لوٹ جانے کے) بعد پیچھے (یہیں مکہ میں) چھوڑ دیا جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم نہ جا سکے تب بھی اگر تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے کوئی عمل کرو گے تو تم درجے اور بلندی میں اور بڑھ جاؤ گے۔''

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں مزید زندگی دے گا اور تمھاری بدولت بہت سے لوگوں (مسلمانوں) کو فائدہ ہوگا اور بہت سے لوگوں (کافروں) کو ضرر پہنچے گا، پھر آپ نے دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ أَمْضِ لِأَصْحَابِي هِجْرَتَهُمْ وَلَا تَرُدَّهُمْ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ»

''یا اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو پورا فرما اور انھیں ان کی ایڑیوں کے بل نہ لوٹا۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4409)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے صحابہ سے کس قدر انس اور لگاؤ تھا کہ آپ ان کے حالات

سے مکمل طور پر باخبر رہتے تھے۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے اس واقعے میں رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ بھی ہے کہ آپ کی پیش گوئی کے مطابق سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے بعد طویل زندگی پائی۔ معرکۂ قادسیہ اور فتح مدائن میں مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کی اور آپ اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے ایران کے دارالحکومت میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ شدت جذبات کی بنا پر آپ بلند آواز سے کلمۂ شہادت بھی پڑھتے جاتے تھے:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

اسی طرح آپ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی:

«وَ لَعَلَّكَ تُخَلَّفُ حَتّٰى يَنْتَفِعَ بِكَ أَقْوَامٌ وَّ يُضَرَّ بِكَ آخَرُونَ»

''امید ہے کہ تمھاری بدولت بہت سے لوگوں (مسلمانوں) کو فائدہ اور بہت سے لوگوں (کافروں) کو ضرر پہنچے گا۔''

حجۃ الوداع کے بعض اہم نکات

- یہ واحد حج ہے جو امت نے اللہ کے رسول ﷺ کی معیت میں ادا کیا۔ آپ کو براہِ راست حج کرتے دیکھا اور آپ سے حج کے احکام سیکھے۔
- نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ صحابۂ کرام کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ انھوں نے آپ کو جو جو عمل کرتے دیکھا، ان کی اکثریت نے اسے وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا۔
- تمام امہات المومنین آپ کے ہمراہ تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ الگ الگ معاملات اور واقعات پیش آئے۔ اس سے آپ کی ازواج کی کثرت کی حکمت بھی عیاں ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی صحابیات شریک سفر تھیں۔ ان سب کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کے پیش نظر بہت سے سوالات کے جوابات کی صورت میں متعدد احکامِ شریعت کی وضاحت ہوئی۔

◎ صحابۂ کرام حج کے احکام و مناسک رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سیکھ رہے تھے۔ آپ نے بھی فرمایا تھا: «خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ» ''تم مجھ سے مناسک حج اچھی طرح سیکھ لو'' نبی ﷺ نے حج کے دوران میں عرفات میں اور دیگر متعدد مواقع پر خطبے ارشاد فرمائے، اس حوالے سے بہت سی روایات ہیں۔ یہ تمام روایات و بیانات مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان روایات میں کوئی تعارض ہے نہ تکرار۔ بسا اوقات سامعین مختلف ہوتے کہ ان میں سے بعض کسی موقع پر موجود ہوتے اور کسی دوسرے موقع پر وہ موجود نہ ہوتے یا بعض مسائل کی اہمیت، تکرارِ بیان کا تقاضا کرتی تھی۔ اس تکرار میں یہ حکمت بھی کارفرما تھی کہ یہ مسائل لوگوں کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ ہو جائیں۔ نیز حج کے اس اجتماع میں مختلف علاقوں کے متعدد قبائل شریک تھے۔ انھوں نے آپ کے خطبات، مواعظ، بیانات اور وصیتوں کو سنا، وہ یہ تعلیمات لے کر اپنے اپنے علاقوں میں گئے اور وہاں جا کر باقی لوگوں تک ان کو پہنچایا۔

◎ خطبے کے آخر میں آپ نے لوگوں سے اس بات کی شہادت بھی لی کہ کیا میں نے اللہ کا دین اور اس کے احکام تم لوگوں تک پہنچا دیے ہیں؟ لوگوں نے واضح طور پر اقرار کیا کہ واقعی آپ نے اللہ کا دین اور احکام ہم تک پہنچا دیے ہیں۔ ان کی یہ گواہی سن کر آپ کو دلی مسرت ہوئی کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ سے اس بارے میں ضرور سوال کرے گا۔

◎ آپ نے لوگوں کو بھی حکم فرمایا کہ تم نے یہاں جو کچھ سنا ہے یہ سب ان لوگوں تک پہنچا دینا جو یہاں نہیں ہیں۔

◎ آپ ﷺ نے اپنے متعدد خطبات میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو بھی خوب خوب واضح کیا اور بیان فرمایا کہ آپ کو اللہ کی طرف سے ایسا دین، شریعت اور احکام دے کر مبعوث کیا گیا ہے جن میں پوری انسانیت کی بھلائی ہے۔ آپ نے اپنے بیانات میں حقوق العباد کی اہمیت اور ہر ایک کے لیے دوسروں کی جان، مال اور عزتوں کی حرمت کا بھی بلیغ انداز سے ذکر کیا۔ اور بار بار اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے پر زیادتی نہ کرے، نیز آپ نے عورتوں کے حقوق بھی واضح کیے اور فرمایا کہ انھیں کسی بھی حوالے سے کمزور یا کمتر نہ سمجھا جائے۔ آپ نے واضح فرمایا کہ امت مسلمہ کا اب دورِ جاہلیت سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں اور جاہلیت کے تمام نظام باطل اور کالعدم ہیں۔ اقتصادی نظام کی اصلاح کے حوالے سے آپ نے سود کی حرمت اور معاشرتی

نظام کی اصلاح کے لیے زنا کی حرمت کو واضح طور پر بیان کیا۔ آپ نے واضح فرمایا کہ سب لوگ آپس میں برابر ہیں۔ کسی کو دوسرے پر کسی بھی لحاظ سے فضیلت یا برتری حاصل نہیں۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لوگوں کی جانیں، اموال اور عزتیں ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں۔

◎ آپ نے خطبے میں یہ بھی واضح فرمایا کہ مسلمانوں کا اپنا ایک الگ نظام ہے جس کی بنیاد قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ پر ہے۔ امت اگر ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھے تو راہِ راست سے کبھی نہیں بھٹکے گی اور قیامت تک بھلائی ان کا مقدر ہوگی، لہٰذا قرآن وسنت کا علم حاصل کرنا اور آنے والی نسلوں تک اسے پہنچانا افرادِ امت کی اجتماعی اور انفرادی ذمے داری ہے۔

◎ آپ نے حاضرینِ اجتماع کو تبلیغِ دین کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ اس اجتماع میں حاضر ہیں وہ یہ تمام مسائل سن کر ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ بسا اوقات جس آدمی تک بات پہنچائی جائے وہ براہِ راست سننے والے کی نسبت اس بات کو زیادہ سمجھنے اور یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔

◎ تبلیغ دین کے فریضے کو خود آپ نے بھی پوری ذمے داری سے ادا کیا اور لوگوں کی تربیت، تعلیم اور افتاء و رہنمائی کے سلسلے میں آپ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، نیز اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کے حوالے سے یہ آیت نازل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

”تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردار جانور، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مرجانے

والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج وہ لوگ ناامید ہو گئے جنھوں نے تمھارے دین کا انکار کیا، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا، پھر جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے جبکہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (المائدۃ 3:5)

◎ اسی حج کے موقع پر سورۃ النصر کے نزول کی صورت میں خوشخبری ملی اور اس کے ساتھ ہی صحابۂ کرام غمگین بھی ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اب اللہ کے رسول ﷺ کا دنیا سے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ یہ امت اور نبی ایک دوسرے کو داغِ مفارقت دینے والے ہیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے امت سے اس بات کی گواہی لی کہ آپ اللہ کی امانت (دین) کو امت تک پہنچا کر اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

◎ سارے مناسک حج، بالخصوص تلبیہ اور باقی تمام دعاؤں میں اللہ رب العزت کی توحید، اس کی تعظیم، شرک سے بیزاری اور اس کے احکام کی بجا آوری کا اعلان اور اظہار ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾

''اور تم حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تمھیں (راستے میں) روک دیا جائے تو قربانی کے لیے جو میسر ہو (وہ قربان کر دو) اور اپنے سر نہ منڈاؤ حتی کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ پہنچ جائے، پھر اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ سر منڈوا لے) تو فدیے میں روزے رکھے

یا صدقہ دے یا قربانی کرے، پھر جب تمھیں امن مل جائے (اور تم حج سے پہلے مکے پہنچ جاؤ) تو تم میں سے جس نے حج (کے احرام) تک عمرے کا فائدہ اٹھایا وہ (احرام کھول کر) جو میسر ہو قربانی کرے، پھر جو شخص (قربانی) نہ پائے تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات اس وقت جب تم گھر لوٹ آؤ، یہ پورے دس (روزے) ہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔''

(البقرة 196:2)

◎ رسول اللہ ﷺ نے حج کے دوران میں دوسروں کے ساتھ نرمی برتنے اور پرسکون رہنے کا رویہ اپنایا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا، بالخصوص آپ نے خواتین کی کمزوری اور چرواہوں کی ضرورت و مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے احکام میں لچک پیدا کر کے ان کے لیے نرمی اور سہولت مہیا کی۔

◎ حج کے بہت سے مسائل کا قرآن کریم کی سورۃ الحج اور دیگر سورتوں میں مذکور آیات سے گہرا ربط ہے، مثلاً:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾

''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔'' (البقرة 125:2)

نیز ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر

کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' (البقرۃ 158:2)

◎ اللہ کی طرف سے لوگوں سے یہ بات بھی مطلوب ہے کہ وہ حج کے دوران میں شہوانی حرکات، گناہ کے کاموں اور لڑائی جھگڑے سے گریز کریں۔ اس سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ ﴾

''حج کے مہینے معلوم و مقرر ہیں، پھر جو شخص ان (مہینوں) میں حج کو لازم کرلے تو حج کے دوران میں وہ جنسی باتیں نہ کرے، اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور کسی سے جھگڑا نہ کرے اور جو نیک کام تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے اور (حج کے لیے) زادِ راہ لے لو، بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقل مندو! تم مجھ سے ڈرو۔'' (البقرۃ 197:2)

ان کے ساتھ ساتھ ایک آیت مبارکہ میں استطاعت والوں پر حج کی فرضیت کا بیان یوں آیا ہے:

﴿ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

''اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہوجائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے، اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ ساری دنیا سے بڑا بے پروا ہے۔'' (آل عمران 97:3)

اس آیت میں واضح طور پر بیان ہے کہ حج صرف صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ اور جو آدمی صاحب استطاعت نہ ہو، اس پر حج کرنا فرض نہیں۔

◎ ایام حج کا یہ بھی امتیاز ہے کہ ہر دن کا ایک الگ نام اور اس کی خاص وجہ تسمیہ ہے، مثلاً:

8 ذوالحجہ کے دن کو ''یوم الترویہ'' کہا جاتا ہے۔ ترویہ کے معنی ہیں: سیراب کرنا اور خوب پانی پلانا۔ اس دن حجاج کرام حج کے لیے منیٰ کو جانے سے پہلے اونٹوں کو سیراب کر کے خوب پانی پلاتے تھے تاکہ وہ آئندہ دنوں

میں مناسب مقدار میں پانی نہ ملنے کی صورت میں اسی پانی پر گزارکرسکیں۔ آج کل اگرچہ حجاج کرام حج کے لیے اونٹوں پر سفر نہیں کرتے تاہم اب بھی اس دن کو اسی نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔

9 ذوالحجہ کو حجاج کرام حج کی ادائیگی کے لیے میدان عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس دن کو ''یوم عرفہ'' کہا جاتا ہے۔ 10 ذوالحجہ کو چونکہ قربانیاں کی جاتی ہیں، اس لیے اس دن کو ''یوم النحر'' کہا جاتا ہے۔ قربانی سے بعد والے تین دن 12,11 اور 13 ذوالحجہ کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں انھی دنوں کا ذکر آیا ہے:

﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾

''اور گنتی کے چند دنوں میں تم اللہ کو یاد کرو، پھر جس نے دو دنوں (منٰی سے مکے کی طرف واپسی) میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے (ایک دن کی) تاخیر کی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ تقویٰ اختیار کرے اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک تمھیں اسی کے حضور اکٹھا کیا جائے گا۔'' (البقرۃ 203:2)

◎ حجۃ الوداع میں امت نے اپنے نبی ﷺ سے جو کچھ سیکھا اس میں یہ تعلیم بھی شامل تھی کہ مسلمان تمام اہل بیت کے ساتھ محبت کریں اور ان سب کی فضیلت اور سبقت کا اعتقاد رکھیں، بالخصوص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مرتبے اور مقام کو پہچانیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین سیدنا علی رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹوں اور باقی تمام اہل بیت کے ساتھ خصوصی عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ جس نبیٔ رحمت ﷺ نے ہمیں ان سے محبت رکھنے کی ترغیب دلائی ہے، اسی نبی نے ہمیں توحید کی تعلیم دی اور اس کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت سے محبت کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ ان کے بارے میں غلو کرتے ہوئے انھیں دائرۂ بشریت ہی سے خارج سمجھا جائے یا انھیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا دیا جائے۔

بعض لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں غلو کرتے ہوئے یہاں تک جا پہنچے کہ انھیں اِلٰہ قرار دے دیا۔ وہ ان کی پوجا کرتے اور مصیبت کے وقت اللہ کو چھوڑ کر ان کو یاد کرتے اور پکارتے ہیں، حالانکہ موت کے بعد وہ تو

اس بات کے محتاج ہیں کہ ان کے حق میں بلندیٔ درجات کی دعائیں کی جائیں نہ کہ ان کو پکارا جائے۔ اللہ کی قسم! اللہ کے رسول ﷺ اور اہل بیت ایسی باتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے بارے میں ایسا غلو کرنا ان سے محبت نہیں بلکہ شرک اکبر ہے۔ ایسا کرنے سے شیطان خوش ہوتا ہے، نیز ایسا کرنے والا شخص اہل بیت کا قرب حاصل کرنے کی بجائے ان سے دور ہو جاتا ہے۔ اس قدر غلو نہ تو نبیٔ کریم ﷺ کے بارے میں جائز ہے نہ اہل بیت کے بارے میں۔ عیسائیوں پر اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضی کا سبب بھی یہی تھا کہ انھوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے بارے میں حد سے تجاوز اور غلو کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آخرت میں ہمارا حشر اہل توحید اور اہل بیت کے ساتھ فرمائے۔ آمین!

نبیٔ کریم ﷺ کا اپنی امت کو اہل بیت کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرنا دراصل اپنے رب سے ملاقات کی تمہید تھا۔ آپ اس حج کے بعد صرف تین ماہ ہی زندہ رہے اور آپ کی یہ بات پوری ہوئی کہ

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ فَلَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هٰذَا»

''لوگو! تم مجھ سے حج کے مسائل اچھی طرح سیکھ لو شاید اس سال کے بعد میری تمھارے ساتھ (اس جگہ) ملاقات نہ ہو سکے۔'' (صحيح البخاري، فضائل الصحابه، حديث: 3654)

واقعہ غدیر خم

حجۃ الوداع کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف واپس آ رہے تھے تو اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا۔ سب مسلمان جانتے ہیں کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد، آپ کے داماد، سب لوگوں کی نسبت آپ کو زیادہ محبوب اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق بھی تھا۔ وہ آپ کی دختر سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے شوہر نامدار، آپ کے نواسوں سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے والد، نوجوانوں میں سب سے پہلے کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے، عشرہ مبشرہ میں سے ایک اور آپ کے خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفہ ہیں۔

ہجرت کے دسویں سال رسول اللہ ﷺ نے سرکاری خدمات کے حوالے سے ایک مختصر سا وفد یمن کی طرف

روانہ فرمایا تا کہ یہ لوگ وہاں جا کر حکومتی معاملات کی نگرانی کریں اور لوگوں سے صدقات وصول کر کے لائیں۔ اس وفد کی قیادت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ آپ انتہائی نیکوکار اور ازحد دیانت دار تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یمن سے واپس آئے تو حج کے دن تھے۔ یہ لوگ سیدھے مکہ مکرمہ چلے گئے اور 9 ذوالحجہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

یمن کے سفر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے کسی آدمی کی ان کے ساتھ کسی بات پر اَن بن ہوگئی۔ مدینہ منورہ کی طرف آتے ہوئے ''غدیر خم'' کے مقام پر یا اس سے کچھ پہلے اس آدمی نے اس بات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حوالے سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کیا۔

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ''غدیر خم'' کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: ''اما بعد، لوگو! میں ایک انسان ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ کا فرستادہ (ملک الموت) میرے پاس آئے اور میں اپنے رب کے حکم پر لبیک کہہ دوں۔ میں تم میں دو اہم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان میں سے ایک اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے جس میں تمھارے لیے ہدایت اور نور (روشنی) ہے۔ تم اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو۔'' آپ نے اللہ کی کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کو تھامنے کی ترغیب دلائی۔

پھر آپ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اہل بیت کا بھی ذکر کیا اور تین دفعہ فرمایا: ''لوگو! میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دہانی کراتا ہوں۔'' (صحيح مسلم، فضائل الصحابة، حديث: 2408)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''جس کا میں دوست ہوں، یہ (علی رضی اللہ عنہ) بھی اس کا دوست ہے۔ یا اللہ جو آدمی اس سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو آدمی اس سے بغض و عداوت رکھے تو بھی اس سے عداوت رکھ۔''

(السنن الكبرىٰ للنسائي: 8092، صحيح السيرة، ص: 551، والسيرة النبوية لابن كثير: 425/4)

یمن کے سفر میں نجران کی طرف جانے والے وفد کے بعض ارکان کی طرف سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اسی طرح ایذا کا سامنا کرنا پڑا جس طرح غزوۂ حنین میں بعض کم فہم لوگوں کی باتوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشانی ہوئی۔

پوری امت مسلمہ جس میں سلف صالحین سرفہرست ہیں، کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دوستی، محبت اور ان کا ہر حوالے سے دفاع کرنے پر اجماع و اتفاق ہے۔

ان میں سے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا وہ طبقہ سرفہرست ہے جنھوں نے غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات سماعت کیے اور انھیں پتہ چلا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کس قدر محبت ہے۔ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر ان سے محبت کرنے لگے۔ وہ واقعی اس قدر محبت کیے جانے کے اہل ہیں۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت وغیرہ کے حوالے سے کچھ سنا ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت و ہدایت پر ضرور عمل کرتے۔ یہ کوئی ایسی معمولی اور غیر اہم بات نہ تھی کہ وہ اس سے بے پروائی اور بیزاری اختیار کرتے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی اور اس قدر عظیم اجتماع کو اس کا پتہ نہ چلتا۔ تابعین عظام نے بھی صحابۂ کرام سے ایسی کوئی بات نقل نہیں کی، حالانکہ متاخرین امت میں سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تابعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہتر سمجھتے ہیں جنھوں نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کیا اور وہ اسی واقعے کے وقت حاضر تھے۔

ایسا ہونا ناممکن ہے کہ امت محمدیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کسی ایسی غلط بات کا ارتکاب کرتے جس کا الزام یہ جعلی محبان علی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر دھرتے ہیں۔ یہ لوگ ان کے بارے میں اس حد تک غلو اور حد سے تجاوز کرتے ہیں کہ ان کو الٰہ قرار دیتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات کہی ہو اور صحابۂ کرام نے اسے ترک کر دیا ہو۔

ادھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جو سب سے بڑھ کر بہادر تھے، انھوں نے بھی کبھی اپنے بارے میں اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ صحابۂ کرام پر طعن و تشنیع کرنے والے یہ لوگ نہ تو علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر بہادر ہیں اور نہ صحابۂ کرام سے بڑھ کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں۔ یا اللہ! آخرت میں ہمارا حشر سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے ساتھ فرما! آمین!

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے لشکر کی روانگی

سرزمین شام پر رومی سلطنت کا کنٹرول تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے 6 ھ میں روم کے حکمران ہرقل کے نام ایک مکتوب لکھا تھا جس کی تاریخِ اسلام میں خاصی شہرت ہے۔

اردن کے نواح میں سرزمین شام سے جنوب کی سمت 8 ھ میں مؤتہ کے مقام پر ایک غزوہ بپا ہوا تھا جس میں سیدنا عبداللہ بن رواحہ، سیدنا جعفر بن ابی طالب اور رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام لشکر صحابہ کے قائد سیدنا زید بن حارثہ اور بہت سے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جامِ شہادت نوش فرما گئے تھے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد رومی سلطنت کی سرحدوں اور ان کے زیر اثر علاقے میں اردن کے قریب غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی قیادت خود اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے تھے، البتہ عملاً لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

روم کے بادشاہ نے اپنی افواج اور حکمرانوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں نکلنے سے روک دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان اس کے زیر اثر علاقوں شام وغیرہ میں اللہ کے دین، اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ دلی طور پر معترف تھا کہ نبی ﷺ اور آپ کی دعوت حق و صداقت پر مبنی ہے، یہی چیز اسے مسلمانوں کے مدمقابل آنے سے روک رہی تھی۔

تبوک میں قیام کے دنوں میں نبی ﷺ نے وہاں کے گرد و نواح کے حکام اور بادشاہوں کے ساتھ کئی معاہدے کیے۔ اور اس طرح آپ نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی قوت اور حکومت کا دائرۂ کار تبوک سے بہت آگے تک جانے والا ہے۔

تبوک سے واپس آنے کے بعد آپ حجۃ الوداع اور دیگر بہت سے اہم معاملات میں مصروف رہے۔ 11 ہجری

کے اوائل میں حج اور باقی امور سے فرصت پانے کے بعد ماہ صفر کے آخر میں آپ نے صحابۂ کرام کو روم پر چڑھائی کے لیے تیار کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو غزوۂ موتہ میں لشکر کے قائد اور اسی غزوے کے شہید تھے، آپ نے ان کے لخت جگر سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو روم کی طرف جانے والے لشکر کی قیادت سونپ دی۔ وہ نوجوان تھے اور ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ آپ نے ان کو بلا کر فرمایا:

''تم اس علاقے میں پہنچو جہاں تمھارے والد کو شہید کیا گیا تھا اور جا کر اس علاقے کو گھوڑوں سے روند ڈالو۔ میں تمھیں اس لشکر کی کمان سونپتا ہوں۔ جاسوسوں کے ذریعے سے ان لوگوں تک اطلاعات پہنچنے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جاؤ۔ اللہ تمھیں کامیابیوں سے نوازے اور وہاں زیادہ دن قیام نہ کرنا۔ تم اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو بھی لے جانا جو وہاں کے راستوں سے بخوبی واقف ہوں۔ تم اپنے جاسوسوں اور حالات کا جائزہ لینے والوں کو پہلے روانہ کردو۔'' (الطبقات لابن سعد: 190/2)

اس لشکر کا ہدف سرزمین فلسطین میں واقعہ بلقاء کا علاقہ تھا تاکہ ان لوگوں پر اپنی قوت وسطوت کی دھاک بٹھائی جائے۔ اور ممکن حد تک کم از کم وقت میں اس مہم کو سرانجام دے کر یہ لوگ واپس لوٹ آئیں۔

نبی ﷺ نے تقریباً تین ہزار جنگجو افراد پر مشتمل لشکر ترتیب دیا۔ (المغازي للواقدي: 1120/3)

اس لشکر میں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما جیسے کبار صحابہ بھی شامل تھے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 376)

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما ایک نوجوان صحابی تھے جبکہ دوسری طرف شرکائے لشکر عمر میں ان کے والد سے بھی بڑے تھے۔ وہ ان (اسامہ رضی اللہ عنہ) کی ولادت سے بھی پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ وہ لوگ اسامہ رضی اللہ عنہ کی نسبت فہم وفراست میں برتر اور قیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ ان پر سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت و سربراہی بعض حضرات کو ناگوار گزری۔ ان کی یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: ''اگر تمھیں اس کی قیادت وسربراہی پر اعتراض ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، تم لوگوں نے اس سے قبل (غزوۂ مؤتہ میں) اس کے والد کی سربراہی پر بھی اعتراض کیا تھا، اللہ کی قسم! وہ لشکر کا سربراہ بنائے جانے کا اہل تھا اور مجھے سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بھی مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

(صحيح البخاري، حديث: 4468، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 376)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے جھنڈا سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کو تھمایا اور ضروری ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: ''تم جا کر مدینہ منورہ کے شمال میں وادیٔ جرف میں ٹھہر کر انتظار کرو۔ جب تمھیں کہا جائے تو تم اپنی مہم پر روانہ ہو جانا۔'' لشکر کو روانہ کرنے سے پہلے ہی اللہ کے رسول ﷺ پر بیماری کا شدید حملہ ہوا اور آپ بیمار پڑ گئے اور بالآخر دارالفنا سے دارالبقا کو روانہ ہو گئے۔ آپ کی وفات کے بعد تمام شرکائے لشکر آپ کے جنازے میں شریک ہوئے اور جرف میں رک کر رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے پروگرام کے مطابق اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر روانہ ہو جائے۔ (الطبقات لابن سعد: 191/2)

لشکر کی روانگی اور اس مہم کو سرانجام دینا اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا اسلام کے لیے بہت بابرکت ثابت ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد روم کے سرحدی علاقوں میں جن فتنوں نے سر اٹھایا تھا، اس لشکر کی وجہ سے دشمن مرعوب ہو گئے، مدینہ منورہ پر چڑھائی تو کجا انھیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے سرزمین شام میں اسلام کی نشر و اشاعت کے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، آپ کی وفات سے یہ سلسلہ رکنے کی بجائے مزید بڑھتا گیا۔

اسامہ رضی اللہ عنہ کا یہ لشکر ان کے والد (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) اور دیگر شہداء کے خون کا بدلہ بھی لے رہا تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد اس لشکر اور اس کی قیادت کو حسب سابق بحال رکھنا، اس امر کا واضح اعلان تھا کہ آپ کسی بھی قسم کی عصبیت کا شکار نہیں ہوئے اور امت کی مصلحت کے پیش نظر آپ رسول اللہ ﷺ کے منہج اور طریق کار ہی پر کاربند ہیں۔

اس طرح آپ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قیادت کا تعلق حسب و نسب یا عمر میں بڑے ہونے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ قیادت کا حق اس آدمی کو حاصل ہے جو اپنے ہم عصروں پر افضلیت اور فوقیت رکھتا ہو۔ لشکر اسامہ کو حسب سابق بحال رکھنے میں اس بات کا بھی اظہار تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور اس سے پہلے ان کے والد سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت زیادہ محبت تھی۔

حکومتِ اسلامیہ کا قیام

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے پہلے ہی دن سے یہ عیاں ہو چکا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبودیت کے نظام کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ آپ ایک ایسا مثالی معاشرہ اور حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں وہاں کے رہنے والے افراد ایک دوسرے کے بارے میں رحم دلی کے جذبات رکھتے ہوں اور وہاں اللہ کے بندوں پر اللہ کی شریعت نافذ ہو۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اللہ کی شریعت مکمل طور پر رحمت وشفقت اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔

مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلامی کے آغاز ہی سے رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو خوشخبریاں دیا کرتے تھے کہ وقت آنے پر دین اسلام چار دانگِ عالم میں پھیل کر شرک و کفر اور اس کے تمام باطل نظاموں کا خاتمہ کر دے گا۔

مکہ مکرمہ کے جس ماحول میں اسلام کا آغاز ہوا، وہاں بدحالی کا دور دورہ تھا۔ اس ماحول میں کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ ہر طرف ظلم و زیادتی کا راج تھا۔ وہ کسی شریعت کے پابند تھے نہ کسی نظام کے۔ وہاں انصاف تھا نہ کوئی دین و شریعت۔ زنا، بدکاری، شراب نوشی، سودی لین دین، بچیوں کو زندہ درگور کرنا، قتل و غارت گری، عورت ذات کو انتہائی گھٹیا اور حقیر سمجھنا اور اس قسم کے دیگر جرائم و خبائث ان میں عام تھے۔

اسلام ایک عادلانہ نظام اور توحید کا علم بردار تھا۔ مکہ اور اردگرد کے صنم پرست اپنی جہالت کی بنا پر دعوت اسلام کو روکنا چاہتے تھے۔

یہ بات معروف اور معلوم ہے کہ اسلام کے تفصیلی احکام متفرق اوقات میں نازل ہوتے رہے، البتہ حقوق اللہ، حقوق العباد، رحمت وشفقت، عدل و انصاف، انسانوں میں مساوات اور ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک جیسی بے مثال خوبیاں اور اوصاف و کمالات شروع ہی سے نمایاں رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں داخلی

اور بیرونی سیاست کی اصلاح، حقوق کے تحفظ اور عدل کی ضامن ہے۔ یہ تمام اصول کسی ترقی پذیر معاشرے کے لیے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب محسوس کیا کہ آپ کے لیے مکہ مکرمہ اور وہاں کے ماحول کو اسلامی معاشرے اور مسلمان ملک میں تبدیل کرنا بہت مشکل ہے تو آپ مکہ سے باہر گردونواح کے قبائل اور علاقوں میں کسی مناسب جگہ اور افراد و قبائل کی تلاش کرنے لگے جو اس عظیم مقصد کے لیے آپ کے ساتھ تعاون کریں۔ تاکہ دین اسلام قبول کرنے والے مسلمان ایک اسلامی معاشرے اور ماحول میں آزادانہ زندگی بسر کرسکیں۔ وہ ایک ایسی نمایاں امت ثابت ہوں جن کا اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت کے ساتھ ایسا مضبوط ربط اور تعلق ہو کہ وہ سعادت و کمال کے حصول کے سلسلے میں انسانیت کی قیادت کرسکیں اور روئے زمین پر آباد جو لوگ پُرسکون زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں، ان کی راہنمائی کا فریضہ ادا کرسکیں۔

حج کے دنوں میں عکاظ اور ذوالمجنہ جیسی بڑی بڑی تجارتی منڈیوں میں جب پورے عرب کے قبائل اور نمایاں افراد کسی ایک جگہ اکٹھے ہوتے تو رسول اللہ ﷺ لوگوں سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں کر کے ایسے معاونین کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے جو اس عظیم مشن میں آپ کا ساتھ دیں تاکہ آپ ایسا مثالی معاشرہ قائم کریں جس میں عربوں اور عجمیوں کے مابین تفریق نہ کی جاتی ہو۔ اس معاشرے کے افراد عدل و ایمان کے اسلحے سے لیس ہو کر دشمن کے مقابلے میں اپنا اور اپنے دین کا تحفظ کرتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک حج کے موقع پر آپ کی ملاقات مدینہ منورہ سے آئے ہوئے لوگوں سے ہوئی۔ انھوں نے آپ کی دعوت سنی اور فوراً ایمان لے آئے۔ وہ اپنے شہر کو دین اسلام اور مثالی اسلامی معاشرے کا مرکز بنانے کے لیے تیار ہوگئے۔ انھوں نے دین کے لیے جانی اور مالی قربانیاں دینے کا عہد کیا۔

عالم اسلام کے ممتاز سکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الوثائق السیاسیة للعهد النبوی والخلافة الراشدة'' میں رقم طراز ہیں کہ عہد نبوی میں قبل از ہجرت بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ ہی میں اسلامی سیاسی حکومت کی بنیاد رکھ کر اس کے کچھ ابتدائی اصولوں اور دستور کا خاکہ تیار کر لیا گیا تھا، البتہ اس کی عملی تطبیق کا تدریجی عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا جس سے بالآخر ایک باقاعدہ مملکت کا قیام عمل میں آ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی حکومت کے قیام، نظام، ذمے داریوں اور ذمے داروں کے حوالے سے متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم کتاب ''الدلالات الشرعية على ما كان في عهد رسول الله ﷺ من الحرف والصنايع والعمالات الشرعية'' ہے جسے امام ابوالحسن علی بن محمد خزاعی نے تحریر کیا ہے۔

علامہ عبدالحی الکتانی نے ''التراتيب الإدارية'' کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔ اس حوالے سے عون شریف قاسم نے بھی 'نشأة الدولة الإسلامية'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

علامہ کتانی اپنی کتاب التراتيب الإدارية میں رقم طراز ہیں کہ نبی ﷺ منصب نبوت پر فائز تھے۔ آپ ایک ایسی حکومت وسلطنت بنانے کی کوشش کرتے رہے جو دین اور دنیا کا حسین امتزاج ہو۔

نبی ﷺ نے حکومت کی ترتیب، اداروں کی تنظیم اور امت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے ایسا مثالی نظام ترتیب دیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں فقہاء اور مصنفین ومؤلفین نے حکومت وسلطنت کے سلسلے میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مسلمانوں نے بعد کے مختلف زمانوں میں سیاسی، مالی، اقتصادی، عسکری اور اجتماعی معاملات میں انھی اصولوں کو مدنظر رکھا اور اسلامی نظام ترتیب دیا۔

نبیٔ کریم ﷺ کے مقرر کردہ نظاموں اور اصولوں کا واقعاتِ تاریخ عالم کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ آپ نے ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جس سیاسی نظام کی بنیاد رکھی، وہ بعد کے ادوار میں قائم ہونے والی اسلامی حکومتوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔

مکی دور میں اصحاب رسول پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے اور آپ مسلمانوں کی اس بے بسی کے عالم میں انھیں خوش خبریاں سناتے تھے کہ بہت جلد وہ دن آنے والے ہیں کہ ظلم کا نام ونشان مٹ جائے گا اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ اس وقت تک کی معلوم روئے زمین پر عدل کا دور دورہ ہوگا۔

ایک دفعہ سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں کفار اور دشمنانِ دین کی طرف سے ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا اظہار کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ ان ظالموں کے خلاف بددعا فرما دیں تو آپ نے فرمایا:

«وَاللهِ لَيُتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلٰى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللهَ أَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهِ»

''اللہ کی قسم! یہ دین مکمل ہوگا اس حد تک کہ ایک شتر سوار صنعاء سے حضرموت تک اکیلا سفر کرے گا تو اسے اپنی جان کے متعلق اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا یا اسے اپنی بکریوں پر بھیڑیوں کے حملے کا خوف ہوگا۔''

(صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3612)

اسلام کے غلبے اور روئے زمین پر مسلمانوں کی حکومت کے قیام کی صورت میں مکمل امن و امان کے حوالے سے اللہ اور اس کے رسول کا یہ وعدہ اپنے اندر اس پیش گوئی کو سموئے ہوئے تھا کہ اللہ نے چاہا تو عنقریب حکومت و اقتدار کی ایسی صورت سامنے آنے والی ہے جو دنیوی مروجہ سیاست کے ساتھ ساتھ دین کی بھی حامل ہوگی۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین مضبوط کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (النور 55:24)

ایک اور آیت میں بھی اللہ نے اہل ایمان کو حکومت و اقتدار دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ ﴾

''اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا اور انھیں پیشوا

بنائیں اور انھیں (ملک مصر کے) وارث بنائیں۔'' (القصص 5:28)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔'' (الأنبياء 105:21)

رسول اللہ ﷺ کو مکمل اطمینان اور پورا یقین تھا کہ آپ جس اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد رکھ رہے ہیں، وہ بہت جلد، مروجہ نظاموں، مثلاً: فارس (ایران) میں کسراؤں اور روم میں قیصروں کے نظامہائے حکومت پر غالب آ کر رہے گا۔

سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی ایک جماعت آلِ کسریٰ کے خزانے کو جو سفید عمارت میں ہے، ضرور فتح کر لے گی۔'' (صحيح مسلم:7331، ومسند أحمد: 89/5)

اسی طرح 5 ہجری میں غزوۂ احزاب سے کچھ دن پہلے جب خندق کھودی جا رہی تھی تو کھدائی کے دوران میں بعض صحابہ کے سامنے سخت چٹان آڑے آ گئی۔ ان کے لیے اسے توڑنا اور کاٹنا مشکل ہو گیا، چنانچہ اسے توڑنے کی غرض سے اللہ کے رسول ﷺ اٹھ کر گئے۔ آپ نے اس پر ایک ضرب لگائی تو اس میں سے چنگاریاں نکلیں، آپ نے خوشی کے مارے زور سے اللہ اکبر کہا۔ آپ نے دوسری ضرب لگائی تو پھر اس میں سے چنگاریاں نکلیں۔ آپ نے دوبارہ اللہ اکبر کہا اور ساتھ ہی صحابۂ کرام نے بھی پرعزم ہو کر اللہ اکبر پکارا۔

پھر آپ نے چٹان پر تیسری ضرب لگائی تو پہلے کی طرح اس سے چنگاریاں نکلیں۔ آپ نے اور صحابۂ کرام نے مل کر اللہ اکبر کہا۔ آپ نے چٹان پر پہلی ضرب لگانے کے بعد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے سرزمین شام کی چابیاں دے دی گئیں۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت ان چنگاریوں میں وہاں کے سرخ محلات کو دیکھ رہا ہوں۔''

آپ نے دوسری ضرب لگانے کے بعد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے فارس (ایران) کی چابیاں عنایت کر دی گئیں۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت مدائن کے سفید محلات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں،'' پھر آپ نے تیسری ضرب کے بعد فرمایا: ''اللہ اکبر! یمن کی چابیاں مجھے عطا کر دی گئی ہیں۔ میں اس وقت اور اس جگہ صنعاء کے

دروازے دیکھ رہا ہوں۔‘‘(مسند أحمد:303/4، والسيرة النبوية الصحيحة: 423/2)

نبی ﷺ صحابہ کرام کو مسلسل خوشخبری اور تسلی دیا کرتے تھے کہ اسلام اور اس کی حکومت زمین کے آخری کونوں تک پھیل جائے گی۔ اور مسلمان ان تمام علاقوں کو فتح کر کے اسلامی قلمرو میں شامل کر لیں گے تا کہ انسانیت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کی طرف موڑ لائیں۔ دوسرے نظاموں اور حکومتوں پر غالب آنے والا یہ اسلامی و سیاسی نظام ایسا تھا جس کی بنیادیں دینی تعلیمات پر استوار تھیں اور تمام مسلمان عوام وخواص اس سے بخوبی واقف تھے۔

امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں معرکۂ قادسیہ سے قبل جب سیدنا ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کی رستم سے ملاقات ہوئی تو دورانِ گفتگو سیدنا ربعی رضی اللہ عنہ نے اپنے اہداف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو، بندوں کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعتوں کی طرف اور لوگوں کے خود ساختہ نظاموں سے اللہ کے دین اسلام کے عادلانہ نظام کی طرف نکال لے جائیں۔‘‘(تاريخ الطبري: 106/4)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز ہی سے عدل و مساوات کے لازوال اصولوں پر قائم انسانی نظام اور معاشرے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی حکومت کا قیام تدریجاً عمل میں آیا۔ اس کی ابتدا محض دعوت اور نبوت تھی۔ ہجرت کے بعد اس میں مزید پختگی آئی اور فتح مکہ کے بعد یہ حکومت پھلنے پھولنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے جزیرۂ عرب کے اکثر حصوں پر چھا گئی۔

اس کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کے عظیم منصب کے شانہ بشانہ حکومت اسلامیہ کی قیادت کا اعلیٰ منصب بھی آپ کو حاصل ہوگیا۔ آپ نے صحابۂ کرام کی ایسی شاندار تربیت فرمائی کہ وہ آپ کے بعد پوری دنیا کی قیادت اور توحید و عدل کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

آپ نے امورِ مملکت کو متعدد اداروں، عہدوں اور ذمے داریوں میں اس خوبصورت انداز سے مرتب فرمایا کہ حکومت خوب مستحکم ہوگئی اور سارے معاملات بہترین انداز پر رواں دواں ہوئے۔ پوری مملکت میں عوامی، اقتصادی اور اجتماعی معاملات، امن کی صورت حال اور داخلی و خارجی امورِ بہترین انداز پر استوار ہوگئے۔

(مبادئ التخطيط والإدارة في السيرة النبوية، ص: 14)

رسول اللہ ﷺ کا قائم کردہ یہ نظام اس دین اسلام ہی کا ایک جز تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر رحم کھاتے ہوئے ان کی طرف نازل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں پر رحمت کرنے کے لیے ہی بھیجا ہے۔'' (الأنبیاء 107:21)

آپ کے قائم کردہ نظام میں دین اور دنیا کو اس خوبی کے ساتھ سمو دیا گیا تھا جس سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم دانشور بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

ایک یورپی دانشور ''مائیکل ہارٹ'' اپنی عالمی شہرت یافتہ کتاب ''تاریخ انسانی کی 100 بااثر شخصیات'' میں رقمطراز ہے کہ محمد ﷺ کا جاری کردہ نظام دینی اور دنیوی تعلیمات کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کی پوری دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ اسی خاصیت نے محمد ﷺ کو پوری انسانیت میں امتیاز دے کر سب سے منفرد شخصیت بنا دیا ہے۔ (تاریخ انسانی کی 100 بااثر شخصیات، ص:21)

باقاعدہ مملکت اور صوبوں کی تشکیل

بلادِ عرب بالعموم اور نجد و حجاز کے علاقے بالخصوص سیاسی و ادارتی نظام سے بالکل نابلد تھے۔ یہاں کے لوگ سرداری اور قبائلی نظام کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ وہاں سیاست اور مملکت کا کوئی تصور نہ تھا۔ سرداروں اور وڈیروں کی پسند اور ناپسند ہی وہاں کی سیاست اور نظام کا محور تھا۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ میں کسی قیادت اور ذمے داری کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ شہر آباد ہونے کے باوجود وہاں کسی تنظیم یا ادارے کا کوئی وجود نہ تھا۔ آخر کار جب ان علاقوں پر رسول اللہ ﷺ کو کنٹرول حاصل ہوا تو یہاں کی معاشرت میں قابل ذکر تبدیلی آئی۔ لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے اور ان امور کو باقاعدہ طور پر منظّم کرنے کا تذکرہ قرآن کریم میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝﴾

’’بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کردو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمھیں بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹادو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہت بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔‘‘(النساء 59,58:4)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ﴾

’’بلاشبہ یقیناً ہم نے اپنے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں سخت لڑائی (کا سامان) اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ اسے جان لے جو بن دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ بڑی قوت والا، نہایت غالب ہے۔‘‘(الحدید 25:57)

اس نئی قائم ہونے والی اسلامی و دینی سلطنت کے حاکم اعلیٰ اور رئیس اعظم اللہ کے رسول ﷺ تھے۔ آپ حکومت کو چلانے کے لیے اہل کاروں اور عہدے داروں کا تقرر فرماتے تھے۔ آپ نے اپنی حکومت کو عمدہ خطوط پر چلانے اور مختلف اداروں کو منظّم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس سلسلے کی ابتدا بیعت عقبہ ثانیہ سے ہوئی۔ آپ نے بیعت کرنے والے لوگوں کو ایک تنظیم کی شکل دے کر فرمایا کہ وہ اپنے اپنے قبیلے کے نقباء، یعنی نمائندوں کے نام پیش کریں۔ وہی اپنے قبیلے کے باقی افراد کی طرف سے مسئول اور ذمے دار ہوں گے۔ حکومت کی طرف سے جاری ہونے والی ہدایات اور احکام ان تک پہنچائے جائیں گے، پھر وہ ان ہدایات کو دیگر لوگوں تک پہنچا کر ان کا نفاذ کریں گے۔

یہ بیعت جس طرح مردوں سے لی گئی تھی اسی طرح عورتوں سے بھی لی گئی۔ اس کا بھی ایک خاص مقصود تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں آئیں (اور) وہ آپ سے (ان امور پر) بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد قتل کریں گی اور نہ بہتان لگائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیں اور نہ نیک کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔'' (الممتحنة 12:60)

مسلمانوں کا اجتماع چھوٹا ہو یا بڑا، رسول اللہ ﷺ نے ہر موقع پر انھیں اجتماعیت و مسئولیت کی ذمے داری سے آگاہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ نَفَرٍ يَكُونُونَ بِأَرْضٍ فَلَاةٍ إِلَّا أَمَّرُوا عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ»

''کہیں بھی تین مسلمان آدمی موجود ہوں تو ان کے لیے اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا امیر مقرر کیے بغیر رہنا حلال نہیں۔'' (مسند أحمد: 177/2)

یعنی انھیں چاہیے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا امیر مقرر کر کے اس کی زیر امارت وقت گزاریں۔ نبی کریم ﷺ بذاتِ خود حکومت کے عسکری اور عوامی امور کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ آپ بڑے اور چھوٹے دستے ترتیب دے کر دشمن کے علاقوں میں کارروائی کے لیے روانہ کرتے، ان میں سے باصلاحیت آدمی کو قیادت کی ذمے داری سونپتے بلکہ آپ احتیاطی پہلو کو بھی مدنظر رکھتے تاکہ قیادت کے حوالے سے پریشانی کی صورت میں خلا پیدا نہ ہو۔

غزوۂ موتہ کے موقع پر آپ نے لشکر کی قیادت کی ذمے داری سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور ساتھ ہی

فرمایا: ''اگر یہ شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ جعفر بن ابی طالب کو اور ان کی شہادت کی صورت میں عبداللہ بن رواحہ کو امیر مقرر کر لیا جائے۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان اپنے میں سے جسے چاہیں اپنا امیر مقرر کر لیں۔'' (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 367، والسياسة الشرعية، ص: 16)

مسلمانوں کا منظّم رہنا، اپنا امیر اور قائد منتخب کرنا اور معروف کاموں میں قیادت کی طرف سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات پر عمل کرنا، یہ وہ اہم امور ہیں جن کی پابندی کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے امت کو تاکید کی ہے۔

مدینہ منورہ، اسلامی مملکت کا دارالحکومت بن چکا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ وہاں کے حکمرانِ اعلیٰ تھے۔ آپ خود وہاں کے تمام معاملات اور اداروں کی نگرانی فرماتے اور جب کبھی کسی کام کے سلسلے میں آپ کو بیرونِ مدینہ جانے کی ضرورت پیش آتی، آپ صحابۂ کرام میں سے کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے جاتے۔ مدینہ منورہ سے غیر حاضری کے دنوں میں آپ نے جن لوگوں کو اپنا نائب مقرر فرمایا، ان میں سب سے مشہور نام سیدنا عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (الإصابة لابن حجر: 525/2)

کتب تاریخ و سیرت میں بیان ہے کہ ان کو غزوۂ بدر، غزوۂ حمراء الاسد اور دیگر غزوات کے مواقع پر تقریباً تیرہ مرتبہ مدینہ منورہ میں نائب مقرر کیا گیا۔ (الإصابة: 523/2)

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض غزوات میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔ (تاريخ الخلفاء للسيوطي: 148/1)

نیز غزوۂ تبوک کے لیے روانگی کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑ کر روانہ ہوئے، ان پر یہ امر بہت گراں گزرا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

«أَمَا تَرْضٰى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُّوسٰى، إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي»

''کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تمھیں میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو سیدنا ہارون علیہ السلام کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے تھی؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4416، ومسند أحمد: 182/1)

الغرض رسول اللہ ﷺ مختصر یا طویل عرصے کے لیے جب بھی مدینے سے باہر تشریف لے جاتے تو آپ کسی نہ کسی کو اپنا نائب مقرر کر جاتے تاکہ وہ آپ کی موجودگی میں شہر کے حالات پر نظر رکھے اور امامت وغیرہ کی خدمات سرانجام دیتا رہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبوی سلطنت میں رسول اللہ ﷺ انتظامی اداروں پر بھی خصوصی نظر رکھتے تھے، پھر آپ کی حیات مبارکہ میں جب حکومت اسلامیہ وسعت پذیر ہوئی اور مدینہ منورہ کی حدود بھی دور دور تک پھیل گئیں تو آپ ﷺ اپنے قاضیوں اور گورنروں کو مختلف علاقوں اور صوبوں میں تعینات کر کے روانہ کرنے لگے۔ بسا اوقات آپ بعض قبائل کی طرف بھی اپنے نمائندوں کو روانہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ جن لوگوں کو عامل، حاکم، قاضی یا اپنا نمایندہ مقرر فرماتے، اس کے تعین کے وقت اس کی صلاحیتوں کو بھی مدنظر رکھتے کیونکہ عموماً ہر علاقے، ملک اور قبیلے کے اصول وضوابط دوسروں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔

عدل ومساوات

عدل و انصاف ہر انسانی معاشرے کا بالعموم اور اسلامی معاشرت کا بالخصوص اہم ترین عنصر ہے۔ یہ وصف مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی معاملات کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ مستحکم کرتا ہے، خاص طور پر جب کسی کو دوسروں کے معاملات سونپ دیے جائیں تو اس کے لیے اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

”بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو (امداد) دینے کا حکم دیتا ہے اور وہ بے حیائی، برے کام اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں وعظ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔“ (النحل 90:16)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝﴾

”بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کردو اور جب تم لوگوں کے

درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمھیں بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔'' (النساء 58:4)

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾

''لہٰذا آپ اسی (دین) کی طرف (سب کو) بلائیں اور ثابت قدم رہیں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہہ دیجیے: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب اور تمھارا رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ (روز قیامت) ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''
(الشوریٰ 15:42)

نیز اللہ تعالیٰ نے بڑی شد و مد کے ساتھ ظلم سے ڈرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۭ۬ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝﴾

''اور (اے نبی!) آپ ہرگز مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ اپنے سر اٹھائے (محشر کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف بھی نہ پھر سکے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔ اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آلے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مدت تک مہلت دے دے ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور

ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟'' (إبراهيم 14:42-44)

اسلام کی اہم ترین ہدایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ حتی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔''

(المآئدة 5:8)

عدل و انصاف کا تعلق صرف فیصلے کرنے ہی سے نہیں بلکہ اس کا مسلمان کی پوری زندگی کے ساتھ تعلق ہے، مثلاً: کسی ادارے کے مسئول اور ذمے دار افسر کو چاہیے کہ وہ اپنے ماتحتوں اور اس کام سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرے۔ اسی طرح اسلام ہر انسان سے اس کی گھریلو زندگی اور ماحول میں بھی انصاف کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص ملک یا ادارے میں صاحب اختیار ہو اور اس کا عوام و خواص ہر طبقے کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہو تو اس کے لیے عدل کی کتنی اہمیت ہوگی؟

غزوۂ حنین میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر مقام رسالت کے آداب سے ناواقف ایک آدمی نے جب اس بات کا اظہار کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غنیمتوں کی تقسیم میں عدل کے تقاضے پورے نہیں کیے تو یہ بات آپ پر بہت گراں گزری کیونکہ آپ کی نظر میں یہ آپ پر بہت بڑی تہمت تھی۔ آپ تو پوری کائنات میں سب سے بڑھ کر عدل کرنے والے، سب سے بڑھ کر نیکوکار اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کرنے والے سب لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے حوالے سے بہترین نمونہ ہیں۔ آپ تو کسی طرف سے کسی پر ظلم ہوتا برداشت نہیں کرتے تھے کجا یہ کہ آپ خود کسی پر ظلم کرتے، اس لیے اس شخص کی یہ ناروا بات کو سن کر آپ طیش میں آگئے۔

آپ پوری زندگی امت کو کسی پر ظلم کرنے سے روکتے رہے۔ اسی سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ، أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ»

''ظلم سے بچو! کیونکہ ظلم قیامت کے دن بے شمار اندھیروں کا سبب ہے۔ اور تم بخیلی سے بھی بچ کر رہو۔ اسی بخیلی نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی نے انھیں دوسروں کے خون بہانے اور ان کی عزتیں پامال کرنے پر اکسایا تھا۔'' (صحيح البخاري، البر والصلة، حديث: 2578)

نیز آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کمزور یا قوی کا فرق کیے بغیر ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ حدود کے نفاذ میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَأَيْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»

''تم سے پہلی امتوں کو اس بات نے ہلاک کیا کہ ان میں جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے، (اس پر حد جاری نہیں کرتے تھے) اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے تھے، اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔'' (صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، حديث: 3475)

رسول اللہ ﷺ بذات خود لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔

آپ عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے اور پوری کوشش کرتے تھے کہ فریقین میں سے کوئی دوسرے کی حق تلفی کرے نہ زیادتی کا ارتکاب کرے۔ آپ نے ایک دفعہ اپنے گھر کے دروازے کے قریب دو آدمیوں کو جھگڑا کرتے سنا۔ آپ نے ان کے پاس جا کر فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّهُ يَأْتِينِي الْخَصْمُ فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ، فَأَحْسِبُ أَنَّهُ صَدَقَ فَأَقْضِيَ لَهُ بِذٰلِكَ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ مُسْلِمٍ فَإِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ فَلْيَأْخُذْهَا أَوْ لِيَتْرُكْهَا»

''بلاشبہ میں ایک بشر ہوں۔ بسا اوقات ایک مدعی میرے پاس آتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے کی نسبت زیادہ ہوشیار اور چالاک ہو اور میں اسی کو سچا سمجھ کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ یاد رکھو میں جس کے حق میں اس کے مسلمان بھائی کی چیز کا (غلطی سے) فیصلہ کر دوں (تو یہ اس کے لیے حلال نہیں) بلکہ یہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔''

(صحيح البخاري، المظالم، حديث: 2458)

اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے اور کوئی مسلمان ہو یا غیر مسلم آپ ہر حقدار کو اس کا حق دیتے۔ اس طرح آپ نے فیصلہ کرنے والوں اور فیصلہ کرانے والوں کے لیے اصول وضوابط مقرر فرمائے، نیز آپ نے دعوے میں جھوٹ اور جھوٹی قسم کے ذریعے دوسروں کا حق لینے پر سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِينٍ وَّهُوَ فِيهَا فَاجِرٌ لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ، لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ»

''جس نے جھوٹا ہونے کے باوجود، کسی مسلمان کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی تو قیامت کے دن اس کی اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات ہوگی کہ وہ اس پر سخت ناراض ہوگا۔''

(صحيح البخاري، الخصومات، حديث: 2416)

اسی حوالے سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

’’بے شک جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی قیمت کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں، ان لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔‘‘(آل عمران3:77)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کا تذکرہ شرک کے ساتھ کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۝﴾

’’یہی (حکم) ہے اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں اس کے لیے بہت بہتر ہے اور تمھارے لیے چوپائے حلال کیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جا چکے ہیں، لہٰذا تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو۔‘‘(الحج 22:30)

فریقین کے درمیان مساوات کرنے کے سلسلے میں آپ کی واضح ہدایات تھیں کہ فیصلہ کرنے والا اپنی مرضی اور ذاتی خواہش کو مدنظر رکھ کر فیصلہ نہ دے بلکہ اس کا فیصلہ واضح شرعی نصوص اور نظام کے تحت ہونا چاہیے۔ عدل کے حوالے سے نبیٔ کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کتنا واضح ہے:

«اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ»

’’اختلاف کی صورت میں ثبوت پیش کرنا مدعی کی ذمے داری ہے اور مدعا علیہ اگر انکاری ہو تو قسم کھا کر بری ہو جائے۔‘‘(صحيح البخاري، الشهادات، قبل الحديث: 2637، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 252/10)

نیز آپ نے جھوٹے دعووں کے سدباب کے طور پر فرمایا:

«لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَّأَمْوَالَهُمْ»

’’اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کی جانوں اور مالوں پر (دھڑا دھڑ) دعوے کرنے لگیں گے۔‘‘(صحيح مسلم، حديث: 1711)

نیز اللہ تعالیٰ نے فیصلے میں گواہی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَإِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾

''پھر جب وہ اپنی عدت (ختم ہونے) کو پہنچیں تو تم انھیں اچھے طریقے سے (اپنے پاس بحیثیت بیوی) روک لو، یا انھیں اچھے طریقے سے جدا کر دو اور تم اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو اور اللہ کے لیے گواہی قائم کرو۔ اس (حکم) کی اسے نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔'' (الطلاق 2:65)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے گواہی ادا کرنے کو اسباب عدل میں شمار کیا ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ لوگ خواہشات کی پیروی کیے بغیر نظامِ عدل قائم کریں، یہاں تک اگر انسان کو اپنے انتہائی قریبی رشتے دار یا اپنی ذات کے خلاف بھی فیصلہ کرنا پڑے تو عدل کا دامن نہ چھوٹے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف ہو یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت اللہ زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہٰذا تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔'' (النساء 135:4)

ایک حدیث قدسی میں ہے:

«يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوا»

''میرے بندو! میں نے ظلم کرنے کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے اور میں نے اسے تم پر بھی حرام کیا ہے،

لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔'' (صحيح مسلم، حديث: 2577 ومسند أحمد: 160/5)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرۂ کار عدل و انصاف کو بھی محیط ہے کہ فیصلے صاف شفاف ہوں اور انصاف کرنے والے لوگ ذاتی خواہشات یا جاہلانہ تعصب کی بجائے انصاف کے اصولوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھ کر فیصلے کریں۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝﴾

''(ہم نے کہا:) اے داود! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی، بلاشبہ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے، اس لیے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔'' (ص 26:38)

اللہ کے رسول ﷺ نے ظالم قاضیوں (ججوں) کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

«اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ، قَاضِيَانِ فِي النَّارِ وَقَاضٍ فِي الْجَنَّةِ، رَجُلٌ قَضٰى بِغَيْرِ الْحَقِّ فَعَلِمَ ذَاكَ فَذَاكَ فِي النَّارِ، وَقَاضٍ لَا يَعْلَمُ فَأَهْلَكَ حُقُوقَ النَّاسِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَقَاضٍ قَضٰى بِالْحَقِّ فَذٰلِكَ فِي الْجَنَّةِ»

''قاضی (فیصلہ کرنے والے) تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ دو قسم کے قاضی جہنم میں اور ایک قسم کے قاضی جنت میں جائیں گے۔ جو آدمی جانتے بوجھتے ناحق (غلط) فیصلہ کرے، وہ جہنم میں جائے گا۔ جو آدمی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کے باوجود وہ فیصلے کرتا اور لوگوں پر ظلم کرتا ہے، وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ اور جو قاضی حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کرے وہ جنت میں جائے گا۔''

(جامع الترمذي، الأحكام، حديث: 1322، و سنن أبي داود، القضاء، حديث: 3573)

اسلام نے رشوت کو بھی اسی لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس سے ایک فریق پر ظلم اور اس کی حق تلفی ہوتی ہے،

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَعَنَ اللهُ الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي»

''اللہ کی لعنت ہے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر۔''

(مسند أحمد: 164/2، جامع الترمذي، الأحكام، حديث:1337)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ہر دور کے ہر معاشرے اور طبقے میں فیصلے کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان ہو یا غیر مسلم ہر ایک کو اس کا حق مل جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''وہ بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں، پھر اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ پھیر لیں اور اگر آپ ان سے منہ پھیر لیں گے تو بھی وہ آپ کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر آپ ان کے درمیان کوئی فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

(المائدة 42:5)

جو شہر اور علاقے مدینہ منورہ سے دور دراز واقع تھے، رسول اللہ ﷺ نے وہاں عدل کا نظام جاری کرنے کے حوالے سے قاضیوں کا تعین فرمایا۔ آپ نے بہت سے مواقع پر لوگوں کے مابین ہونے والے تنازعات کے فیصلے کرنے کے سلسلے میں بعض صحابۂ کرام کو بھیجا۔ آپ کے متعین کردہ قاضیوں میں ایک معتبر نام سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ان کو آپ نے یمن کے علاقے میں قاضی کی حیثیت سے تعینات کیا تھا۔ وہ وہاں سے حجۃ الوداع کے دوران میں واپس آئے اور مکہ مکرمہ جا کر رسول اللہ ﷺ سے ملے۔

فیصلہ کرنے کے ضابطوں اور اصولوں کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مابین مفصل گفتگو ہوئی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا:

«إِذَا حَضَرَ خَصْمَانِ بَيْنَ يَدَيْكَ فَلَا تَقْضِ لِأَحَدِهِمَا حَتّٰى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخَرِ»

''جب دو فریق آپ کے پاس اپنا مقدمہ لے کر آئیں تو دوسرے فریق کا موقف سنے بغیر کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ دینا۔'' (الأحكام السلطانية للماوردي، ص: 67)

نبیٔ کریم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو عامل (گورنر) بنا کر یمن بھیجا تھا۔ ان کی ذمہ داریوں میں فیصلے کرنا بھی شامل تھا۔

آپ نے جب معاذ رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو ان سے پوچھا: «بِمَ تَحْكُمُ؟» ''لوگ تمھارے پاس فیصلے کرانے آئیں گے تو تم کس طرح فیصلے کرو گے؟'' انھوں نے عرض کیا: «بِكِتَابِ اللهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ» ''میں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلے کروں گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنْ لَّمْ تَجِدْ؟» ''اگر تمھیں کتاب وسنت سے راہنمائی نہ مل سکی تو پھر؟'' انھوں نے عرض کیا: ''پھر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمھیں اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے بھی راہنمائی نہ مل سکی تو؟''

انھوں نے عرض کیا: ''پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات سن کر خوشی سے فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللهِ لِمَا يُرْضِي رَسُولَهُ»

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے نمایندے کو ایسی بات سمجھائی ہے جو اس کے رسول ﷺ کو خوش کرتی ہے۔''

(الأحكام السلطانية للماوردي، ص: 67، وسنن أبي داود، القضاء، حديث: 3592 والحديث ضعيف)

فیصلوں کے حوالے سے امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام خط مشہور عالمی دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ (امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین عن رب العالمین'' کی جلد اول، ص: 86 تا 406 اور جلد دوم ص: 1 تا 165 تک 450 سے زائد صفحات میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس حکم نامے کی شرح کی ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس حکم نامے میں عدل کے جن ضابطوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب نبی ﷺ سے اخذ کردہ تعلیمات ہی کا خلاصہ ہیں، اس عظیم حکم نامے میں مذکور ہے کہ فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا فریضہ اور رسول اللہ ﷺ کی قابل عمل سنت ہے۔

یاد رکھو! جب فریقین آپ کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے حاضر ہوں تو آپ ان میں سے کسی ایک کی بات سے اس قدر متأثر نہ ہوں کہ آپ کا میلان باطل کی طرف ہو جائے۔ فریقین کے موقف سنتے ہوئے آپ کے چہرے اور رویے سے کسی ایک کی طرف میلان نمایاں نہ ہو تا کہ کوئی شریف (سچا) آدمی یہ نہ سمجھے کہ آپ ظلم کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اس طرح کوئی کمزور آدمی آپ کے عدل سے مایوس نہ ہو جائے۔

یاد رکھو! گواہ اور ثبوت پیش کرنا مدعی کی ذمے داری ہے۔ اگر مدعا علیہ اس دعوے سے انکاری ہو تو وہ قسم کھا کر بری الذمہ ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں (فریقین) کے درمیان صلح کرانا جائز (بلکہ بہت اچھا کام) ہے، البتہ صلح کی کوئی شق ایسی نہ ہو کہ جس کی وجہ سے کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دیا جائے۔ اگر تم کوئی فیصلہ صادر کر دینے کے بعد اس پر غور وفکر کرو اور تمھیں دلائل کی روشنی میں محسوس ہو کہ تم نے جو فیصلہ دیا ہے، وہ درست نہیں تو تمھیں اس سے رجوع کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ عقل اور رشد و ہدایت کا تقاضا ہے کہ تم غلطی سے حق کی طرف رجوع کر لو۔ حق وصداقت اصل ہے جسے کوئی بھی نئی چیز (باطل) ختم نہیں کر سکتی۔

غلطی اور جھوٹ پر اصرار کرنے کی نسبت حق وصواب کی طرف رجوع کر لینا بہت بہتر ہے۔ یاد رکھو! جو بات اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں نہ ہو اور اس کے متعلق دل میں کھٹکا آتا ہو تو اس سے بچ کر رہو۔

پیش آمدہ معاملے کے متعلق فیصلہ کرتے وقت اس جیسے دیگر واقعات اور فیصلوں کو بھی مدنظر رکھو۔ اگر کسی دعوے کا گواہ یا ثبوت موقع پر موجود نہ ہو تو فوری فیصلہ کرنے کی بجائے گواہی اور ثبوت آنے تک فیصلے کو مؤخر کر دو۔

فیصلہ کرنے میں حق کا ساتھ دینا بہت بڑی نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بہت زیادہ اجر ہے۔ اور ایسے آدمی کا دنیا میں نام روشن ہوتا ہے۔ والسلام۔ (إعلام الموقعين: 86,85/1)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی معاشرہ کسی نظام، قوانین اور واضح شریعت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ معاشرے میں ہر ایک کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیے اور ہر معاشرے اور ماحول میں حقوق کے تحفظ اور حصول کے لیے ایک ایسا با اختیار ادارہ ضرور ہونا چاہیے جہاں بوقت ضرورت دستک دی جا سکے۔ معاشرے میں ایک ایسی قوتِ نافذہ کی موجودگی بھی ضروری ہے جو مظلوموں کو ان کا حق دلا سکے۔ ایسا منصفانہ اور عادلانہ نظام

لوگوں کے حقوق کا ضامن، پُرسکون زندگی کے لیے معاون، لوگوں کے اموال، عزت و ناموس اور جانوں کے تحفظ کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات وتعلیمات اور نبوی طریق کار کی روشنی میں مدینہ منورہ اور اپنے زیرِاثر علاقوں میں ایسے ہی اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی جس کے ہر شعبے میں عدل کا چرچا تھا۔ یہی جاری کردہ نظام آیندہ تشکیل پانے والی نئی اسلامی حکومتوں کے لیے اور وہاں کے معاشروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ جن ممالک اور معاشروں نے اس کے مطابق عمل کیا، وہ امن وامان اور ایمان کے گہوارے بن گئے اور جنھوں نے اس سے اعراض کیا وہ گمراہی اور تباہی کے عمیق گڑھوں میں جا پڑے۔

علمائے اسلام اور فقہائے شریعت نے اس موضوع کی مناسبت سے اس قدر علمی ذخیرہ مرتب کر دیا ہے جس کا بالاستیعاب تذکرہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ ذخیرہ امت مسلمہ کی علمی، سیاسی، ادارتی، قانونی اور شرعی میراث ہے۔ بہت سے رہنما، اصحابِ اقتدار اور اربابِ حکومت اس شاندار علمی میراث سے غفلت کا شکار ہیں۔ وہ خود بھی ضائع ہوئے اور دوسروں کو بھی ضائع کر ڈالا۔

امن وسلامتی کے احکام

امن و امان ہر انسان کی بنیادی ضرورت اور ہر معاشرے کا اساسی تقاضا ہے۔ بعثت نبوی کے وقت عرب معاشرہ انتشار اور بدامنی کا شکار تھا۔ طاقتور، کمزور کو کھا رہا تھا اور بدامنی کی صورت حال یہ تھی کہ لوگ ذاتی دفاع سے عاجز اور سفر کرنے سے کتراتے تھے۔ امن و امان سے رہنے کے لیے طاقتور ہونا یا کسی طاقتور کا حلیف ہونا ضروری تھا۔ کوئی مستقل نظام، شریعت یا قانون ایسا نہ تھا جو لوگوں کو دوسروں کے ظلم وستم سے بچا سکے۔ قرآن مجید نے امن و امان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اسے انسان کے دین اور معیشت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ ﴾

''وہ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور انھیں خوف سے امن دیا۔'' (قریش 4:106)

نیز فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین مضبوط کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں

گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (النور 55:24)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝﴾

''اور ہم نے ان (اہل سبا) کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، کئی بستیاں باہم متصل (سرِراہ آباد) رکھی تھیں اور ان میں ہم نے چلنے (آنے جانے) کی منزلیں مقرر کردی تھیں، (ہم نے کہا:) تم ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے سفر کرو۔'' (سبا 18:34)

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہوجائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے، اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ ساری دنیا سے بڑا بے پروا ہے۔'' (آل عمرٰن 97:3)

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝﴾

''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا۔'' (إبراهيم 35:14)

ایک مقام پر مکہ مکرمہ کے امن کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝﴾

''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ)

تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے۔'' (البقرة 125:2)

امن ہی کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' (الأنعام 82:6)

اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء کے واقعات بیان کرتے ہوئے قوموں کی زندگی میں امن کی اہمیت یوں اُجاگر فرمائی۔ قوم صالح کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝ ﴾

''کیا تمھیں یہاں کی چیزوں میں پرامن چھوڑ دیا جائے گا۔'' (الشعراء 146:26)

تمام قوموں اور بستیوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ﴾

''کیا پھر بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آ جائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں؟ یا بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ جائے اور وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں؟ کیا پھر وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ اللہ کی تدبیر سے بے خوف تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو خسارہ پانے والے ہوں۔'' (الأعراف 97:7-99)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾

''اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن واطمینان سے (آباد) تھی، اس کا رزق اسے ہر

جگہ سے وافر (میسر) آتا تھا، پھر اس (کے باشندوں) نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے بھوک اور خوف کا لباس چکھا دیا۔'' (النحل 16:112)

رسول اکرم ﷺ نے کئی بار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خوشخبری دی کہ اس دین کے ذریعے سے امن کا بول بالا ہوگا۔ آپ ﷺ نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«فَوَاللهِ لَيُوشِكَنَّ أَنْ تَسْمَعَ بِالْمَرْأَةِ تَخْرُجُ مِنَ الْقَادِسِيَّةِ عَلَى بَعِيرِهَا حَتَّى تَزُورَ هٰذَا الْبَيْتَ لَا تَخَافُ أَحَدًا إِلَّا اللهَ»

''اللہ کی قسم! عنقریب تم سنو گے کہ ایک عورت قادسیہ سے اونٹ پر سوار ہو کر نکلے گی، اس گھر کی زیارت کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا۔''

(تاريخ الطبري: 150/3، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 142، والسيرة النبوية لابن هشام: 581/4)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيُتِمَّنَّ اللهُ هٰذَا الْأَمْرَ حَتَّى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخْشَى إِلَّا اللهَ وَالذِّئْبَ عَلَى غَنَمِهِ»

''اللہ تعالیٰ دین کے اس امر کو ضرور پورا کرے گا حتی کہ ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا یا بکریوں کے بارے میں بھیڑیے کا ڈر ہوگا۔''

(صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3852)

لوگوں میں امن و امان کا قیام اسلام کا بنیادی اور اہم مقصد ہے، اس لیے خوف اور اس کے عوامل و اسباب کے خلاف لڑنا ضروری قرار دیا۔ ریاستی اختیارات کا مقصد، جس کے سربراہ خود رسول اکرم ﷺ تھے، امن قائم کرنا ہی تھا۔

عدلیہ، اس سے متعلقہ اداروں کا قیام اور قوانین بھی عدل و انصاف اور امن قائم کرنے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں تاکہ لوگوں کے مال و جان کی حفاظت ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ

فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝﴾

''اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ لکھ دیا کہ بلاشبہ جو شخص کسی کو قتل کرے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد کرنے والا ہو تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو شخص کسی ایک جان کو (ناحق قتل ہونے سے) بچائے تو گویا اس نے تمام لوگوں کی جان بچائی۔ اور بلاشبہ ہمارے رسول واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے، پھر بے شک اس کے بعد ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں حد سے نکل جانے والے ہیں۔'' (المآئدة 32:5)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝﴾

''اور جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنے وطن سے اپنے لوگوں کو نہ نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو۔'' (البقرة 84:2)

نیز فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝﴾

''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔''

(الفرقان 68:25)

ایک مقام پر اس کی اہمیت یوں بیان فرمائی:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝﴾

''اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو یقیناً

ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے، لہٰذا وہ قتل (قصاص) میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا ہوا ہے۔'' (بنيٓ إسرآء يل 33:17)

اور رسول اکرم ﷺ اپنی گفتگو اور خطبات میں بھی صلح وآشتی اور امن وامان کے ساتھ رہنے اور کسی دوسرے پر زیادتی نہ کرنے کی تاکید فرماتے۔ آپ بیعت اسلام میں بھی امن وامان کا خصوصی طور پر ذکر فرماتے۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے چند لوگوں کے ہمراہ رسول اکرم ﷺ کی بیعت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ لاَّ تُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلاَدَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُونِي فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَأُخِذَ بِهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَطَهُورٌ، وَمَنْ سَتَرَهُ اللهُ فَذٰلِكَ إِلَى اللهِ، إِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ وَإِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُ»

''میں تم سے اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو گے، نہ چوری کے مرتکب ہو گے اور نہ اپنی اولاد کو قتل ہی کرو گے اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کسی کے خلاف بہتان نہیں اٹھاؤ گے، نیز بھلے کاموں میں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔ تم میں سے جس نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور جو کوئی ان میں کوئی غلطی کر گزرے گا اور دنیا میں اسے سزا دے دی گئی تو وہ اس کے گناہ کا کفارہ اور اس کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالا، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو اسے معاف کر دے۔''

(صحيح البخاري، الحدود، حديث: 6801)

آپ ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں فرمایا:

«(أَلَا أَيُّ شَهْرٍ تَعْلَمُونَهُ أَعْظَمُ حُرْمَةً) قَالُوا: أَلَا شَهْرُنَا هٰذَا: قَالَ: أَلَا أَيُّ بَلَدٍ تَعْلَمُونَهُ أَعْظَمُ حُرْمَةً، قَالُوا أَلَا بَلَدُنَا هٰذَا، قَالَ أَلَا أَيُّ يَوْمٍ تَعْلَمُونَهُ

أَعْظَمُ حُرْمَةً، قَالُوا أَلَا يَوْمُنَا هٰذَا، قَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَدْ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ دِمَائَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ، إِلَّا بِحَقِّهَا، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ ثَلَاثًا، كُلُّ ذٰلِكَ يُجِيبُونَهُ أَلَا نَعَمْ، قَالَ وَيْحَكُمْ، أَوْ وَيْلَكُمْ، لَا تَرْجِعُنَّ بَعْدِي كُفَّارًا، يَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ»

''تم کس مہینے کو سب سے زیادہ حرمت والا خیال کرتے ہو؟'' لوگوں نے جواب دیا: ہمارے اسی مہینے کو۔ آپ نے پوچھا: ''تم کس شہر کو سب سے زیادہ حرمت والا خیال کرتے ہو؟'' لوگوں نے جواب دیا: اسی شہر (مکہ) کو۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا: ''تم کس دن کو سب سے زیادہ عزت والا سمجھتے ہو؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اپنے اسی دن (یوم نحر) کو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حق شرع کے سوا تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں تم پر حرام کر دی ہیں جیسا کہ اس دن کی حرمت اس شہر اور اس مہینے میں ہے۔'' پھر آپ نے تین مرتبہ فرمایا: ''کیا میں نے تمھیں اللہ کا پیغام دیا ہے؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ ہاں پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ''تمھاری خرابی ہو! میرے بعد تم کفار جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں اڑانے لگو۔''

(صحيح البخاري، الحدود، حديث: 6785)

انسانی زندگی میں امن کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ مُعَافًى فِي جَسَدِهِ عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا»

''تم میں سے جو شخص امن کے ساتھ اپنے گھر میں صبح کرے، جسمانی طور پر بھی ٹھیک ہو اور اس کے پاس ایک دن کی ضرورت کا سامان بھی ہو تو گویا اسے ساری دنیا دے دی گئی ہے۔''

(جامع الترمذي، الزهد، حديث: 2346)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُرَوِّعَ مُسْلِمًا»

''کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو خوف زدہ کرے۔'' (مسند أحمد: 262/5)

آپ ﷺ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِي وَ آمِنْ رَّوْعَتِي»

''اے اللہ میرے عیب پر پردے ڈال دے اور مجھے خوف سے امن عطا فرما۔'' (مسند أحمد: 25/2)

اسلامی ریاست نے مدینہ طیبہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو امن وسلامتی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ رسول اکرم ﷺ اور مدینہ کے عام باشندوں اور قبائل کے درمیان معاہدے کی یہی بنیاد تھی۔ یہ مشترکہ دفاع، امن وسلامتی کو فروغ دینے اور امن کو برباد کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کا معاہدہ تھا۔ اس میں طے پایا کہ امن وامان کو مدینہ کا باسی خراب کرے یا باہر سے کوئی خطرہ ہو، سب سے سختی سے نبٹا جائے گا۔

(دیکھیے، اسی کتاب میں 'وثیقۃ المدینۃ')

رسول اکرم ﷺ مدینہ طیبہ کے شہریوں اور وہاں پناہ لینے والوں کی امن وسلامتی کی خود نگرانی فرماتے۔ مجرموں، دنگا فساد کرنے والوں، لوگوں کا امن وامان برباد کرنے والوں اور قتل وغارت کرنے والوں پر شرعی حدود کا نفاذ فرماتے، جیسا کہ عرینہ قبائل کے فسادیوں کو عبرت ناک سزا دی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں مستقل ایک عنوان کتاب الحدود کے نام سے قائم کیا اور اس کے تحت متعدد ابواب اور سیکڑوں احادیث ذکر کی ہیں۔ وہ اس میں امیر غریب سب پر حدود کے نفاذ کا حکم، حدود کے حوالے سے سفارش کی ممانعت اور دیگر کئی مسائل زیر بحث لائے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: صحيح البخاري، كتاب الحدود)

اسی حوالے سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مخزومیہ عورت، جس نے چوری کی تھی، نے قریش کو پریشان کر دیا قریش نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے محبوب سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس عورت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بات نہیں کر سکتا اور نہ کسی میں جرأت ہی ہے کہ وہ آپ سے اس قسم کی بات کرے، چنانچہ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ؟ ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ، قَالَ: 'يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا ضَلَّ مَنْ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ الضَّعِيفُ فِيهِمْ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَايْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ

سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ يَدَهَا»

''(اے اسامہ!) کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرنے آئے ہو؟'' پھر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، پھر فرمایا: ''اے لوگو! تم سے پہلے لوگ صرف اس لیے گمراہ ہوئے کہ ان میں جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد (ﷺ) اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتے۔''

(صحيح البخاري، الحدود، حديث: 6788)

قرآن مجید نے بھی چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت، تم ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دیا کرو، یہ اللہ کی طرف سے اس گناہ کی عبرت ناک سزا ہے جو انھوں نے کیا اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (المآئدة 38:5)

امام بخاری نے مذکورہ آیت پر صحیح بخاری میں مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے بنومخزوم قبیلے کی عورت پر حد نافذ کر کے یہ بتا دیا کہ حدود اور قوانین کے نفاذ میں کسی کا شرف وعزت رکاوٹ بن سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش کیونکہ آپ نے اس بارے شرفائے قوم اور اسامہ بن زید کی سفارش کو بڑی سختی سے رد کر دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کئی بار چوری کی حد عملی طور پر نافذ کی۔ (صحيح البخاري، كتاب الحدود)

چوری پر حد کے نفاذ نے لوگوں کے مال ومتاع کی حفاظت میں اہم کردار ادا کیا۔ چوروں پر حدود کے نفاذ کی ایسی دھاک بیٹھی کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں چوری نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس معاشرے نے بھی چوری کی حد کا نفاذ کیا وہاں سے چوری بہت کم ہوگئی اور لوگوں کو اپنے اموال کے بارے میں کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا۔

اسی طرح قتل کا بدلہ قتل مقرر کیا الا یہ کہ مقتول کے ورثاء معاف کر دیں۔ قرآن مجید نے اس سزا کا بڑی

صراحت کے ساتھ ذکر کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا﴾

''اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو یقیناً ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے، لہٰذا وہ قتل (قصاص) میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا ہوا ہے۔'' (بنيّ إسراء يل 33:17)

واضح بات ہے کہ قصاص کے قانون سے لوگ دوسروں کا خون بہانے اور قتل کرنے کا سوچیں گے بھی نہیں۔ کیونکہ جب انھیں علم ہو کہ انھیں بھی بدلے میں قتل کر دیا جائے گا اور ان کے خون کی کوئی قیمت نہیں پڑے گی تو وہ کسی کا خون کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں گے، اس لیے قصاص کو زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

''اور اے عقل والو! تمھارے لیے برابر کا بدلہ لینے ہی میں زندگی ہے تاکہ تم (قتل و غارت سے) بچو۔''

(البقرة 179:2)

اسلام نے محاربہ اور زمین میں فساد پھیلانے کی الگ سے حد مقرر کی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، ان کی سزا تو صرف یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لیے ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ، توبہ کر لیں تو

تم جان لو کہ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' (المآئدة 5:33,34)

حدیث میں ہے کہ قبیلہ عکل کے کچھ بدو لوگ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ بیمار تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں صفہ میں ٹھہرایا۔ لیکن مدینہ طیبہ کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی تو انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! ہمارے لیے کہیں سے دودھ کا بندوست کر دیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَجِدُ لَكُمْ إِلَّا أَنْ تَلْحَقُوا بِإِبِلِ رَسُولِ اللهِ»

''ہمارے لیے یہ انتظام تو مشکل ہے، البتہ تم رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں کے پاس جا کر رہو'' چنانچہ وہ اونٹوں کے پاس آئے اور وہاں ان کا دودھ اور پیشاب پینے لگے۔ پھر صحت مند ہو کر خوب موٹے تازے ہو گئے، آخر کار انھوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ اس دوران میں نبی ﷺ کے پاس ان کی خبر دینے والا آیا تو آپ نے ان کی تلاش میں چند سواروں کو روانہ کیا۔ ابھی دھوپ زیادہ نہیں پھیلی تھی کہ انھیں گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ آپ ﷺ کے حکم سے لوہے کی سلائیاں گرم کی گئیں جنھیں آپ نے ان کی آنکھوں میں پھیر دیا، نیز ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی کاٹ دیے اور انھیں داغ بھی نہ دیا، پھر انھیں گرم پتھریلی زمین پر پھینک دیا گیا۔ وہ پانی مانگتے تھے لیکن انھیں پانی نہیں دیا گیا حتی کہ وہ مر گئے۔

(راوئ حدیث) ابوقلابہ نے کہا: (ان کے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے کیا گیا کہ) انھوں نے چوری کی، چرواہے کو قتل کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف مسلح واردات کی۔

(صحيح البخاري، الحدود، حديث: 6804)

رسول اکرم ﷺ امن و امان کی اہمیت اور بدامنی کی اذیت سے خوب واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ نے اپنے دشمنوں کو بھی امن کی ضمانت دیتے ہوئے اعلان کیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا وہ پرامن رہے گا۔ جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا اس کے لیے بھی امان ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو گیا اسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ (دیکھیے ہماری اسی کتاب کا عنوان ''فتح مکہ'')

نبی ﷺ سمجھتے تھے کہ سکیورٹی کے معاملات لوگوں کی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے فتح

مکہ کے بعد آپ نے پہلے وعظ ہی میں خون بہانے کی حرمت پر زور دیا۔(السيرة النبوية لابن هشام: 415/4)

اسلامی ریاست کے قیام کے وقت ہی سے یہ پالیسی تھی کہ امن سب شہریوں کے لیے ہوگا بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ امن وسلامتی عام کرنا ہی اس ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد تھا۔ آپ نے ایسے قوانین مقرر فرمائے جن سے بیک وقت جرائم کی روک تھام، مجرم کی سزا اور حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے امن وامان کا بھی بول بالا ہو۔

انسانی زندگی میں دین، توحید اور رزق کے بعد سب سے اہم معاملہ امن کا ہے۔ اس آیت میں ان سب چیزوں کو معجزانہ طور پر جمع کر دیا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ ﴾

''لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے رب کی عبادت کریں۔ وہ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور انھیں خوف سے امن دیا۔''(قريش 106: 3، 4)

توحید، رزق اور امن وامان کو بیت اللہ اور مسلمانوں کے قبلے کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جگہ، نظم وضبط اور دین کا ایک ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔

اخلاق وآداب کی تعمیر وترقی

رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت انسانی معاشروں بالخصوص عربی معاشرے کے اخلاق و عادات نہایت بگڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بدسلوکی اور دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اس معاشرے کی عام روش تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: أخلاق النبي ﷺ في القرآن والسنة، دكتور أحمد بن عبد العزيز بن قاسم الحداد) رسول اکرم ﷺ نے مکہ کی داخلی صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے نہایت سنجیدہ کوششیں کیں۔ آپ نے اسلام کی نشر واشاعت کے ساتھ، ادب وآداب، اخلاقیات، باہمی روابط وتعلقات اور ایک دوسرے سے گہرے مراسم رکھنے کا حکم بھی دیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ دینی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر انسان کے اولین حق دار اس کی اولاد، آباء واجداد اور رشتہ دار ہیں۔

قریش نے بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کی مخالفت کی۔ آپ کی دعوت کو روکنے کے لیے آپ اور آپ کے صحابہ سے دشمنی کی۔ انھیں اذیتیں پہنچائیں جس نے آپ کو کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے پر مجبور کیا تاکہ وہاں ایسا مسلم معاشرہ تشکیل دے سکیں جو اخلاق وآداب اور ہم آہنگی کے عظیم وصف سے متصف ہو۔ چنانچہ آپ نے پرامن انسانی اسلامی معاشرے کی بنا اور تعمیر وترقی کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں آپ نے مہاجرین اور انصار کے مؤاخات، بھائی چارے اور محبت والفت پر قائم معاشرہ تشکیل دیا۔ آپ نے مؤاخات کا ایسا نظام ترتیب دیا جس سے صاف ستھرا باہم شیر وشکر معاشرہ وجود میں آ گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''اور ان (انصار) کے لیے ہے جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی ہجرت) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت (طلب اور خواہش) نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الحشر 9:59)

اس بھائی چارے اور ہم آہنگی کا حکم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والی تمام نسلوں کے لیے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اور (فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحشر 10:59)

تزکیۂ نفس اور آداب و اخلاق کی تعلیم آپ کی نبوت کا بنیادی مقصد تھا۔ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾

''جیسے ہم نے تم میں ایک رسول تمھی سے بھیجا ہے، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

(البقرة 151:2)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور یقیناً وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران 164:3)

اسی طرح فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴾

''وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بلاشبہ اس سے پہلے تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔'' (الجمعة 2:62)

نیز ایک مقام پر ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝﴾

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بیشک تو ہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔'' (البقرة 129:2)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف فرامین کے ذریعے سے معاشرے کے افراد اور خاندانوں کے تعلقات کو مستحکم کرنے کی ترغیب دلائی۔ (الأدب النبوي، عظات بالغة وَحِكم بالغة لعبد العزيز الخولي)

ارشادِ نبوی ہے: «اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ» ''اچھا اخلاق ہی نیکی ہے۔'' (مسند أحمد: 250/2)

نیز فرمایا: «إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا»

''تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔''

(صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3559)

اسلام نے ماں باپ اور اولاد کے اچھے تعلقات پر بہت زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک نسل کے دوسری نسل سے تعلقات کا بہتر ہونا کسی بھی معاشرے کے لیے لازم ہے اور اس کے لیے ہم آہنگی اور صلہ رحمی ازحد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کو اپنی اطاعت وفرماں برداری کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ﴾

''اور تمھارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے اچھا سلوک کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے ہاں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تُو ان سے ''اف'' تک نہ کہہ اور انھیں مت جھڑک اور ان سے نرم (لہجے میں ادب واحترام سے) بات کر۔ اور ان کے لیے رحم دلی سے عاجزی کے ساتھ اپنا بازو (پہلو) جھکائے رکھ اور کہہ: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔'' (بنيٓ إسرآء يل 17:24,23)

اسی طرح قرآن مجید نے رشتہ داروں سے حسن سلوک اور صلہ رحمی کا درس دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ ﴾

''اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی سے مال نہ اڑا۔''

(بنيٓ إسراء يل 17:26)

خود رسول اکرم ﷺ اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوصاف کریمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰي خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

''اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (فائز) ہیں۔'' (القلم 68:4)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے لیے آپ کے اخلاق کریمہ کو بطور مثال ذکر کرکے اسے اپنانے کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾

''بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں ہمیشہ سے بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔''

(الأحزاب 21:33)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: «إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ»

''مجھے عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا۔'' (مسند أحمد: 381/2)

نبی ﷺ نہایت متواضع انسان تھے۔ آپ بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ جنازوں میں شامل ہوتے۔ لوگوں کی دعوت قبول کرتے اور اگر کوئی آپ کو دیکھ کر کھڑا ہوتا تو اسے ناپسند فرماتے۔ چھوٹوں، بڑوں سب کے ساتھ عجز وانکساری سے پیش آتے۔ اجنبی آدمی آپ کو صحابہ میں بیٹھے ہوئے پہچان نہ سکتا تھا۔ آپ جود وسخا کے بہتے دریا تھے اور لوگوں کو بھی سخاوت کا حکم فرماتے۔ آپ نہایت فیاض تھے اور فیاضی کا حکم فرماتے۔ آپ نہایت پاک دامن تھے۔ بے نیازی کی زندگی گزاری اور لوگوں کو بھی پاک دامنی اور دوسروں کے مال سے بے نیازی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ دلیر تھے، بردبار تھے اور لوگوں کو بھی بردباری کی تعلیم دی۔ نرم مزاج تھے اور نرمی کرنے کا حکم فرماتے۔ نظافت وصفائی کا عالم یہ تھا کہ پسینہ بھی خوشبودار ہوتا اور امت کو بھی صاف ستھرا رہنے کی ترغیب دی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے وقار، عظمت اور ادب کا ہر آن لحاظ رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید پر سمجھوتہ نہ کرتے۔ اس کا عبد بن کر رہنا آپ کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھتے اور اس پر مکمل اعتماد اور بھروسا کرتے۔ خشیت الٰہی آپ کی غذا اور اللہ کی تقسیم آپ کی رضا تھی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے لیے پرامید رہتے۔ اس کے ذکر سے مانوس اور اس کے شکر وعبادت سے مالوف۔ خلوت ہو یا جلوت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ وخشیت آپ کی متاع عزیز تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾

''(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔'' (الأنفال 8:2,3)

ایک مقام پر فرمایا: ﴿فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾

''بس تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔'' (البقرة 2:152)

نیز فرمایا: ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا﴾

''تمھیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے لیے وقار (عظمت اور بڑائی) کا عقیدہ نہیں رکھتے؟ حالانکہ یقیناً اس نے تمھیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔'' (نوح 71:13,14)

اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے:

﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾

''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''

(یونس 10:61)

نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ادب اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

«اِسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. [قَالَ:] قُلْنَا: يَا نَبِيَّ اللهِ! إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، قَالَ: 'لَيْسَ ذَاكَ وَلٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ: أَنْ

تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى، وَ تَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰى، وَ تَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى يَعْنِي مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ»

''اللہ سے ایسی حیا کرو جیسی اس سے کرنی چاہیے۔'' مخاطبین نے عرض کیا: ہمیں اللہ کی بہت حیا ہے اور ہر قسم کی تعریف اسی کے لیے ہے، اللہ کے نبی! آپ نے فرمایا: ''یہ نہیں (یعنی حیا کا مفہوم صرف اسی قدر محدود نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو) بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تم سر اور سر میں جو اعضاء (کان، آنکھ، زبان) ہیں، ان سب کی نگہداشت کرو، پیٹ اور اس میں جو کچھ بھرا ہے جس پر وہ مشتمل اور حاوی ہے، ان کی نگرانی کرو۔ موت اور قبر کی شکستگی اور بوسیدگی کو یاد رکھو اور جو انسان آخرت کو مقصود بنائے وہ دنیا کی زیب و زینت کو چھوڑ دے، چنانچہ جس شخص نے یہ سب کچھ کیا تو اس نے واقعی حیا کی، یعنی اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا۔'' (جامع الترمذي، صفة القيامة، حديث: 2458)

ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «فَاللهُ أَحَقُّ أَنْ يُسْتَحْيَا مِنْهُ مِنَ النَّاسِ»

''اللہ تعالیٰ لوگوں کی نسبت زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔''

(جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2794)

اللہ تعالیٰ کے ادب کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے، اس سے استغفار کیا جائے اور گناہوں سے فرار اختیار کر کے اس کے حضور پناہ لی جائے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾

''پس تم اللہ کی طرف دوڑو، بلاشبہ میں تمھیں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔'' (الذاريات 50:51)

اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو کہ تمام نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔرُوْنَ ۝ ﴾

''اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے

تو اسی سے تم آہ وزاری کرتے ہو۔'' (النحل 53:16)

ایک مقام پر فرمایا: ﴿فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾

''بس تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔'' (البقرة 152:2)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر جو فضل واحسان اور کرم فرمایا ہے اسے ہر وقت یاد رکھا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی بخشیں گے اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر وثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

(النحل 97:16)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ادب کا مظہر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید کا ادب واحترام کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے (کان لگا کر) سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (الأعراف 204:7)

جن آداب پر اس امت مسلمہ کی تربیت ہوئی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا آپ کی زندگی میں اور وفات کے بعد بھی ادب احترام کیا جائے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور تم اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ خوب سننے

والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں (بات) کرتے ہو، کہیں تمھارے عمل برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔ بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔ بلاشبہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں اور اگر بے شک وہ صبر کرتے، حتی کہ آپ (خود ہی) ان کی طرف نکلتے تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الحجرات 49:1-5)

قرآن مجید نے صحابۂ کرام کو نبی ﷺ کے حکم کی تعمیل و اتباع کا حکم دیا اور آپ کی معصیت و نافرمانی سے منع فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''تم رسول کے بلانے کو اپنے درمیان ایک دوسرے کو بلانے کے مانند نہ بنا لو، یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا چاہیے کہ جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں (دنیا میں) کوئی آزمائش آپڑے یا انھیں (آخرت میں) دردناک عذاب پہنچے۔'' (النور 24:63)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾

''اللہ نے اپنے رسول پر ان بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ

(مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الحشر 7:59)

نیز فرمایا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾

''تو (اے نبی!) آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ آنے پائے اور وہ اسے دل و جان سے مان لیں۔'' (النسآء 65:4)

رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ادب و احترام کی تاکید کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ اگر اللہ کے رسول کسی کو کسی جگہ متعین کریں یا کسی اجتماعی کام میں تم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہو تو اجازت لیے بغیر وہاں سے مت جاؤ۔ اس حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاۗءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

''مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی جمع کرنے والے کام پر ہوتے ہیں تو آپ سے اجازت لیے بغیر (وہاں سے) نہیں جاتے، (اے نبی!) بلاشبہ جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت

دیں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ تم رسول کے بلانے کو اپنے درمیان ایک دوسرے کو بلانے کے مانند نہ بنا لو، یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا چاہیے کہ جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں (دنیا میں) کوئی آزمائش آپڑے یا انھیں (آخرت میں) دردناک عذاب پہنچے۔'' (النور 24:62، 63)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے امت کو حکم دیا کہ وہ اپنے رسول کی اطاعت وفرماں برداری میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾

''بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، کہ وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور انھوں نے اپنی پکی پکی اللہ کی قسمیں کھائیں کہ اگر آپ انھیں حکم دیں گے تو وہ (جہاد پر) ضرور نکلیں گے، کہہ دیجیے: تم قسمیں نہ کھاؤ، (تمھاری) اطاعت معروف ہے، بلاشبہ جو عمل تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ کہہ دیجیے: اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو اس رسول کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے صرف وہ ہے جو تم پر بوجھ ڈالا گیا اور اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت

پاؤ گے اور رسول کے ذمے صرف کھلم کھلا پہنچا دینا ہے۔'' (النور 24:51-54)

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُّزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَيَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَيَأْتِي إِلَى النَّاسِ مَا يُحِبُّ أَنْ يُّؤْتٰى إِلَيْهِ»

''جسے پسند ہو کہ اسے آگ سے دور رکھا جائے اور وہ جنت میں داخل ہو تو اسے چاہیے کہ اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرنے والا ہو۔ اور لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے جیسا سلوک اپنے ساتھ پسند کرتا ہے۔'' (صحيح مسلم، الإمارة، حديث: 1844)

رسول اکرم ﷺ دنیا میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور اسی بات کا حکم فرماتے۔ آپ ایسی اعلیٰ صفات کے مالک تھے جن سے نظافت، کھانے پینے، لباس اور وضع قطع میں دوسروں کے جذبات کے احترام کا درس ملتا ہے۔

آپ نے لوگوں میں محبت اور سلام کو عام کرنے کا پیغام دیا۔ ارشاد نبوی ہے:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَ أَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ' فَسَكَتَ الْقَوْمُ... قَالَ: 'أَحْسَنُكُمْ خُلُقًا»

''کیا تمھیں قیامت کے روز مجلس کے اعتبار سے اپنے سب سے زیادہ قریب اور محبوب ترین آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟'' لوگ خاموش ہو گئے..... آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تم میں سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہے۔'' (مسند أحمد: 186/2)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَاتَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتّٰى تَحَابُّوا أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ، أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ»

''تم جب تک ایمان نہ لاؤ جنت میں نہیں جا سکتے اور جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو ایمان

دار نہیں ہو سکتے۔ کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اگر تم وہ کرلو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ سلام کو آپس میں عام کرو۔'' (صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 54)

رسول اکرم ﷺ بچوں کے پاس سے گزرتے تو بھی سلام کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے اجازت طلب کرنے اور سلام عام کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾

''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتی کہ تم اجازت لے لو اور ان گھر والوں کو سلام کہو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' (النور 27:24)

قرآن نے معاشرے کی اخلاقی تعمیر وترقی کے لیے سلام عام کرنے اور لوگوں کے ساتھ عجز وانکساری سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَي الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔'' (الفرقان 63:25)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾

''اور زمین پر اکڑ کر مت چل، بلاشبہ تُو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔'' (بنيٓ إسرآء يل 37:17)

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ

لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝﴾

''اور تو تکبر وغرور سے اپنے رخسار کو لوگوں سے نہ پھیر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ ہر مغرور، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور تو اپنی چال درمیانی رکھ اور اپنی آواز دھیمی رکھ، بلاشبہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔'' (لقمان 31:18, 19)

نبی ﷺ ہمیشہ نرمی کا حکم دیتے کیونکہ اس سے معاشرے اور خاندان میں باہمی محبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ»

''اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔'' (صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6024)

اسی طرح نبی ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ»

''بلاشبہ نرمی جس چیز میں بھی ہو، اسے خوبصورت بنا دیتی ہے۔'' (صحيح مسلم، البر، حديث: 2594)

رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کے ساتھ نرمی کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ۭ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝﴾

''پھر (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ بدخلق سخت دل ہوتے تو یقیناً وہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، بس آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (آل عمران 3:159)

اس نرمی اور شفقت کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ امت سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کی کوئی تکلیف انھیں گراں گزرتی اور ہر وقت ان کی بھلائی کے لیے فکر مند رہتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''(لوگو!) بلاشبہ یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔'' (التوبة 128:9)

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نرمی کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''اور ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو مال ومتاع دیا ہے اس کی طرف آپ اپنی نظریں ہرگز نہ اٹھائیں اور نہ ان (کی حالت) پر غم کھائیں اور اپنے (پُر شفقت) بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں۔''

(الحجر 88:15)

نیز فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''اور جو مومنوں میں سے آپ کی اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں۔''

(الشعرآء 215:26)

نبی ﷺ رحمت وعطا کا مرقع اور حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آغاز وحی کے بعد آپ کو گھبراہٹ ہوئی تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے اوصاف حمیدہ کا یوں تذکرہ کیا:

''ہرگز نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں، بے سہارا لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور ناگہانی آفات میں لوگوں کی نصرت ومدد کرتے ہیں۔'' (صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 3)

اس میں پوری امت کے لیے وعظ وتاکید ہے کہ مکارم اخلاق اور اعلیٰ صفات وخوبیاں انسان کو برے انجام سے بچاتے ہیں۔ (أخلاق النبي ﷺ في القرآن و السنة، لأحمد بن عبدالعزيز الحداد) آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو بھی عجز وانکساری کا پیکر بن کر، سر مبارک جھکا ہوا تھا اور غرور وتکبر سے کوسوں دور تھے۔

(دیکھیے اسی کتاب کا عنوان ''فتح مکہ'')

آپ کو معاشرے کی عام غریب عورت راستے میں روک لیتی تو اسی کی بات سننے کے لیے ٹھہر جاتے۔ بچوں

کی باتیں سنتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے۔ (صحيح مسلم، باب قرب النبي ﷺ من الناس)

شاید حدیث انس سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے، فرماتے ہیں:

رسول اکرم ﷺ مریض کی تیمار داری کرتے، جنازے میں شریک ہوتے، گدھے پر سوار ہو جاتے اور غلام کی دعوت بھی قبول کر لیتے تھے۔ کہتے ہیں: غزوۂ بنوقریظہ کے روز آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس کی لگام کھجور کی چھال کی تھی اور اس کی زین بھی چھال ہی کی تھی۔''

(جامع الترمذي، الجنائز، حديث: 1017)

آپ کسی دوسرے آدمی یا بچے کو اپنے ساتھ سوار کرنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ اکثر و بیشتر سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اپنے پیچھے سوار کرتے اور کبھی کبھار اپنی کسی بیوی کو بھی اپنے پیچھے سوار کر لیتے تھے۔

(صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6185)

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ»

''اللہ عزوجل نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم عجز وانکساری سے کام لو حتی کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر برتری کا اظہار نہ کرے۔'' (سنن ابن ماجه، الزهد، حديث: 4179)

رسول اکرم ﷺ سفر میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ہاتھ بٹاتے، لکڑیاں اکٹھی کرتے، دوسرے ساتھیوں کی طرح کام کرتے۔ آپ مسجد نبوی کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ شریک ہوئے۔ اسی طرح آپ گھر کے کام کاج میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے۔ حدیث میں ہے:

''(گھر میں) گھر والوں کے کام کاج میں مشغول رہتے۔'' (صحيح البخاري، النفقات، حديث: 5363)

آپ نہایت باحیا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفت حیا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا

رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝

''اے ایمان والو! تم نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو اِلّا یہ کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے، اس حال میں کہ (وہاں جا کر) کھانا پکنے کا انتظار نہ کرتے رہو اور لیکن جب تمھیں دعوت دی جائے تب تم داخل ہو جاؤ، پھر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور (وہیں) باتوں میں نہ لگے رہو، بلاشبہ تمھاری یہ بات نبی (ﷺ) کو تکلیف دیتی ہے تو وہ تم سے شرماتے ہیں اور اللہ حق بات سے نہیں شرماتا اور جب تم ان (ازواج نبی) سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ بات تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ (جائز ہے) کہ تم اس کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو، بے شک تمھارا یہ فعل اللہ کے نزدیک بہت بڑا (گناہ) ہوگا۔'' (الأحزاب 53:33)

آپ ﷺ نے دین و دنیا کا توازن قائم رکھنے کی دعوت دی اور اس بات کا درس دیا کہ دنیا اور اس کی زیب وزینت ہی انسان کا مطمح نظر اور پہلی ترجیح نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

''لوگوں کے لیے خواہشات نفس کی محبت مزین (پرکشش) کر دی گئی ہے، یعنی عورتوں سے، بیٹوں، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں، نشان لگائے ہوئے (عمدہ) گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی سے، یہ سب دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اچھا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے۔'' (آل عمران 14:3)

نیز فرمایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا

کی ہیں، وہ کس نے حرام کی ہیں؟ کہہ دیجیے: یہ (پاکیزہ چیزیں) دنیا کی زندگی میں بھی ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے، جبکہ قیامت کے دن یہ خالص مومنوں ہی کے لیے ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔'' (الأعراف 32:7)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾

''اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے تو اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور تو دنیا میں بھی اپنا حصہ مت بھول اور تو (لوگوں سے) ایسے احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور تو زمین میں فساد نہ کر، بے شک اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (القصص 77:28)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾

''پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر لو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اللہ کو) یاد کرو، پھر کچھ لوگ تو وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں (سب کچھ) دے دے، ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ انھی لوگوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔'' (البقرة 200:2-202)

رسول اکرم ﷺ کی خواہش ہوتی کہ اپنے صحابہ سے محبت کا اظہار کریں، اس لیے ایک دن معاذ بن

جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«يَا مُعَاذُ! وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ لَا تَدَعَنَّ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ أَنْ تَقُولَ اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»

''اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اے معاذ! میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا ہرگز نہ چھوڑنا: اَللّٰهُمَّ... اے اللہ اپنے ذکر، شکر اور حسن عبادت پر میری مدد فرما۔''

(مسند أحمد: 245/5)

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا أَحَبَّ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُعْلِمْهُ»

''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اسے آگاہ کر دے۔'' (مسند أحمد: 30/4)

اسی طرح آپ ہر وہ کام کرنے کی ترغیب دیتے جو محبت بڑھانے کا باعث ہو، جیسے دوسروں کی زیارت کے لیے جانا، تحائف کا تبادلہ وغیرہ۔ (جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1953) اور دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَتَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ»

''تیرا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی صدقہ ہے۔''

(جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1956، وابتسامات نبوية، لعبد الله نجيب سالم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو تعلیم دی کہ وہ ایک دوسرے کو بہتر انداز سے سلام کا جواب دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا﴾

''اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا خوب حساب لینے والا ہے۔'' (النسآء 86:4)

محدثین نے اپنی کتابوں میں سلام کی فضیلت و اہمیت اور اس کا اسلام کا حصہ ہونے پر مستقل ابواب قائم کیے ہیں۔

قرآن کریم نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ رنگ و نسل کی بنا پر ایک دوسرے پر فخر کریں اور دوسرے کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنی برتری کا احساس جتلائیں کیونکہ ان کی اصل ایک ہی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے کا مذاق اڑانے

سے بھی منع کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾

”اے ایمان والو! مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا (مذاق اڑائیں)، ہوسکتا ہے کہ وہ (عورتیں) ان سے بہتر ہوں اور تم آپس میں (ایک دوسرے پر) عیب نہ لگاؤ اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو، ایمان (لانے) کے بعد فاسقانہ نام (سے پکارنا) برا ہے۔ اور جس نے توبہ نہ کی تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو، بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔ اور تم ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، پس (ظاہر ہے کہ) تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔“ (الحجرات 49:11-13)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی باہمی اخوت اور بھائی چارے پر زور دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ ﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو اور تم اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (الحجرات 10:49)

باہمی اختلاف کی صورت میں فریقین میں صلح کرانے اور زیادتی کرنے والے کے خلاف اس وقت تک کھڑے رہنے کا حکم دیا جب تک وہ باز نہیں آ جاتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو تم ان دونوں کے درمیان عدل (حق) کے ساتھ صلح کرا دو اور تم انصاف کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (الحجرات 9:49)

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے غیبت سے بھی منع فرمایا۔ (سنن أبي داود، الأدب، حديث: 4880)

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو حقیر جاننے کو بھی بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ ارشاد نبوی ہے:

«بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ»

''کسی آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔''

(صحيح مسلم، البروالصلة، حديث: 2564)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ ﴾

''اور تو تکبر وغرور سے اپنے رخسار کو لوگوں سے نہ پھیر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ کسی مغرور، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (لقمان 18:31)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے عفو ودرگزر کرنے کا حکم بھی دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! قتل ہو جانے والوں (کے معاملے) میں تم پر برابر کا بدلہ لینا فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے اور عورت، عورت کے بدلے، پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (مقتول کے ولی) کی طرف سے کچھ (قصاص) معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے اتباع (دیت کا مطالبہ) ہو اور اچھے طریقے سے اسے (دیت کی) ادائیگی ہو۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک قسم کی آسانی اور رحمت ہے، پھر اس کے بعد جس شخص نے زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' (البقرۃ 178:2)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۡ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (النور 22:24)

ایک مقام پر یوں فرمایا:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بلاشبہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (الشوریٰ 40:42)

درج ذیل ارشاد باری میں بھی یہی درس دیا گیا:

﴿ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ ﴾

''اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکا یک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہوجائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔'' (فصلت 34:41)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ﴾

''وہ لوگ جو خوشی اور سختی کے موقع پر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصہ پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کردینے والے ہیں۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔'' (آل عمران 134:3)

مساوات، دوسروں کی عزت وتوقیر، جھگڑنے والوں میں صلح وصفائی کا مقصد ایک متحد اور باہم شیر وشکر اسلامی معاشرے کا قیام ہے جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ ﴾

''ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے (تو یہ اچھی بات ہے) اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے تو ہم اسے جلد بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔'' (النسآء 114:4)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو رحمت کرنے کا خصوصی حکم دیا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ ایک دوسرے کو رحمت کی وصیت کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ ﴾

''پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور انھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی۔'' (البلد 17:90)

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «وَ إِنَّمَا يَرْحَمُ اللهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ»

''اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف رحم کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے۔''

(صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1284)

نیز فرمایا: «اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ»

''تم اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔'' (جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1924)

نبی ﷺ نے مسلمانوں کو باہم رحمت وشفقت کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا، نیز تنبیہ فرمائی کہ مسلمان معاشرے کا یہ شعار ہونا چاہیے۔ ارشاد نبوی ہے:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى»

''باہمی مودت، رحمت اور شفقت میں اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کا کوئی ایک حصہ متاثر ہو تو پورا جسم بے چینی اور بخار کا شکار ہو جاتا ہے۔'' (صحيح مسلم، البر والصلة، حديث: 2586)

نماز اسلام کا بنیادی رکن اور بہت اہم فریضہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود دوران نماز اگر کوئی بچہ روتا تو رسول اکرم ﷺ نماز مختصر کر دیتے۔ سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ فَأُرِيدُ إِطَالَتَهَا ، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ»

''میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا ارادہ لمبی قراءت کا ہوتا ہے، پھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو قراءت اس لیے مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو اس کے رونے سے رنج پہنچے گا۔''

(صحيح البخاري، الأذان، حديث: 710)

نبی ﷺ غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ نہایت رحمت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی

آزادی کو قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا۔ کئی امور کے کفارے کے لیے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت تمام شریعتوں اور قوانین میں غلام رکھنے کی عام اجازت تھی۔ اسلام نے اس کے لیے کڑی شرائط لگا کر تقریباً یہ دروازہ بند کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ»

''تمھارے غلام بھی تمھارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے ماتحت کر دیا ہے، اس لیے جس کا کوئی بھائی اس کے قبضے میں ہو۔ اسے چاہیے کہ اسے بھی وہی کھلائے جو خود کھائے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ اور ان پر ایسے کاموں کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالو تو پھر ان کی خود بھی مدد کر دیا کرو۔'' (صحيح البخاري، الإيمان، حديث: 30)

اسلام نے رحمت وشفقت کو صرف انسانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلام کے قوانین جانوروں کے حقوق کا بھی تحفظ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں چارہ ڈالنے، ان پر رحم کرنے، انھیں اذیت نہ دینے، بلاوجہ قتل نہ کرنے کا حکم دیا اور تاکید کی کہ اگر بوقت ضرورت انھیں ذبح کرنا پڑے تو بھی رحمت کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ أَجْرٌ»

''ہر زندہ جگر کی خدمت میں اجر وثواب ہے۔'' (صحيح البخاري، المظالم و الغضب، حديث: 2465)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِي هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا، فَلَمْ تُطْعِمْهَا، وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خِشَاشِ الْأَرْضِ»

''ایک عورت محض ایک بلی کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دی گئی جس نے اسے باندھ رکھا تھا، نہ تو اس کو خود کچھ کھلایا اور نہ اسے آزاد ہی کیا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر اپنی جان بچا لیتی۔''

(صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث: 3318)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللهُ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئًا فِيهِ رُوحٌ غَرَضًا»

''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس آدمی پر جس نے کسی ذی روح کو باندھ کر نشانہ بنایا۔'' (مسند أحمد: 216/1)

یہ وہ تعلیمات ہیں جو اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جانوروں کے حقوق کے حوالے سے اس وقت دیں جب دنیا کی تہذیبوں میں اس کا تصور تک نہ تھا۔ جانوروں کے ساتھ اس قدر رحمت وشفقت کا درس یہ اسلام ہی کا خاصا ہے۔ جو مذہب جانوروں کے حقوق کا محافظ ہو، انسان کی قدر و قیمت اس کے نزدیک کتنی زیادہ ہوگی؟!

اسلام نے لوگوں کی مدد کرنے اور محتاجوں کا دست بازو بننے کی خوب تاکید کی اور بلا امتیاز مرد وخواتین کسی کو بھی اذیت نہ پہنچانے کا درس دیا۔ سورۂ نور میں اس موضوع کو بڑے مؤثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے، (حق) بیان کرنے والا ہے۔'' (النور 24:22-25)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئًا فِيهِ رُوحٌ غَرَضًا»

''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس آدمی پر جس نے کسی ذی روح کو باندھ کر نشانہ بنایا۔'' (مسند أحمد: 216/1)

یہ وہ تعلیمات ہیں جو اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جانوروں کے حقوق کے حوالے سے اس وقت دیں جب دنیا کی تہذیبوں میں اس کا تصور تک نہ تھا۔ جانوروں کے ساتھ اس قدر رحمت وشفقت کا درس یہ اسلام ہی کا خاصا ہے۔ جو مذہب جانوروں کے حقوق کا محافظ ہو، انسان کی قدر و قیمت اس کے نزدیک کتنی زیادہ ہوگی؟!

اسلام نے لوگوں کی مدد کرنے اور محتاجوں کا دست بازو بننے کی خوب تاکید کی اور بلا امتیاز مرد وخواتین کسی کو بھی اذیت نہ پہنچانے کا درس دیا۔ سورۂ نور میں اس موضوع کو بڑے مؤثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے، (حق) بیان کرنے والا ہے۔'' (النور 24:22-25)

قرآن کریم نے پڑوسی سے اچھا برتاؤ کرنے اور اس سے حسن سلوک سے پیش آنے کی خصوصی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝﴾

''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، ساتھ رہنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنی ملکیت کنیزوں اور غلاموں سے بھی نیکی کرو۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے، غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (النسآء 4:36)

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِي جَارَهُ»

''جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے۔''

(صحيح البخاري، النكاح، حديث: 5185)

ایک حدیث میں فرمایا: «مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ»

''جبریل مجھے ہمسائے کے بارے میں مسلسل نصیحت و تاکید کرتے رہے حتی کہ مجھے خدشہ گزرا کہ وہ اسے وارث ہی قرار دے دیں گے۔'' (صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6015)

اسی طرح فرمایا:

«وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، فَقِيلَ وَمَنْ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ»

''اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ ایمان دار نہیں۔'' پوچھا گیا: کون اللہ کے رسول! فرمایا: ''جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں۔'' (صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6016)

شریعت مطہرہ میں صرف مسلمان پڑوسی ہی کا خیال رکھنے کا حکم نہیں ہے بلکہ بڑے واضح اور دوٹوک

احکامات کے ذریعے سے غیر مسلم پڑوسیوں کا بھی خیال رکھنے اور ان سے اچھا برتاؤ کرنے کی ترغیب ہے، بشرطیکہ وہ حربی کافر (جن کے ساتھ جنگ ہو) نہ ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''اللہ تمھیں ان لوگوں سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، کہ تم ان سے بھلائی کرو اور ان سے انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بس اللہ تو صرف تمھیں ان لوگوں سے روکتا ہے جو تم سے دین پر لڑے اور انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، کہ تم ان سے دوستی کرو اور جو کوئی ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔'' (الممتحنة 9,8:60)

اسی طرح دشمن اگر قیدی بن کر مسلمان کے پاس آجائے تو اس سے بھی حسن سلوک کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝﴾

''اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں:) بس ہم تو تمھیں اللہ کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی جزا اور شکریہ نہیں چاہتے۔'' (الدھر 9,8:76)

نبی ﷺ نے غزوۂ بدر میں قید ہونے والے مشرکین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا تو مسلمان جو خود کھاتے وہی انھیں کھلاتے۔ اور ان کے ساتھ ایسا عمدہ برتاؤ کیا جو بعد ازاں ان کے مسلمان ہونے کا باعث بنا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے: اسی کتاب کا عنوان ''غزوۂ بدر'')

جن بہترین اخلاقیات پر اس امت کی تعمیر وترقی ہوئی وہ سخاوت، عطا کرنے اور نوازنے کی خوبیاں ہیں۔ امت مسلمہ کا فیضان کئی شعبوں میں معروف ہے۔ مالی عطیات زکاۃ کی صورت میں ہوں یا صدقات کی صورت

میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اسے نماز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

”بے شک انسان کو نہایت بے صبرا (تُھڑ دِلا) پیدا کیا گیا۔ جب اسے شر پہنچے تو بہت گھبرا جاتا ہے۔ اور جب اسے خیر ملے تو نہایت روکنے والا (کنجوس) بن جاتا ہے۔ مگر وہ نمازی۔ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں۔ اور وہ جن کے مالوں میں ایک حق مقرر ہے۔ سوالی اور محروم کا۔ اور وہ جو یوم جزا کی تصدیق کرتے ہیں۔“ (المعارج 70:19-26)

نیز فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝﴾

”پس جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور ڈرتا رہا۔ اور اس نے نیک بات کی تصدیق کی۔ تو یقیناً ہم اسے آسان (راہ) کی توفیق دیں گے۔ اور لیکن جس نے کنجوسی کی اور بے پروا ہوا۔ اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا تو یقیناً اسے ہم تنگی کی (راہ کی) سہولت دیں گے۔ اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا۔ بے شک ہدایت دینا ہمارے ہی ذمے ہے۔ اور بے شک آخرت اور دنیا ہمارے ہی اختیار میں ہے۔“ (اللیل 92:5-13)

ایک مقام پر فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور تم اپنے مال میں سے جو خرچ کرو، وہ تمھارے اپنے فائدے کے لیے ہے اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے ہی کے لیے کرتے ہو اور تم اپنے مال میں سے جو خرچ کرو گے اس کا تمھیں پورا پورا صلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''(البقرة 272:2)

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ہم نے تمھیں جو کچھ دیا اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید وفروخت ہو گی اور نہ کوئی دوستی یا سفارش ہی کام آئے گی اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں۔''(البقرة 254:2)

سخاوت وفیاضی کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللهَ جَوَّادٌ يُّحِبُ الْجُودَ»

''اللہ تعالیٰ بہت سخی ہے اور سخاوت کو پسند کرتا ہے۔''

(جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2799، وصحيح الجامع الصغير، حديث: 1744)

کینہ، بغض، حسد اور مال کی خاطر لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کے لیے فرمایا:

«اِتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰى أَنْ سَفَكُوا دِمَآءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ»

''انتہائی درجہ بخل سے بچو کیونکہ اسی بخل نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کیا۔ اسی نے ان کو ایک دوسرے کا خون بہانے اور حرمتیں پامال کرنے پر آمادہ کیا۔''(صحيح مسلم، البر و الصلة، حديث: 2578)

یہ ہدایات جو نبی کریم ﷺ نے امت کی تعمیر اور جود وسخا کی اعلیٰ صفات پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے دیں، ان کا عملی مظہر آپ کی سیرت طیبہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ آپ روئے زمین کے سب سے بڑے فیاض تھے۔ آپ نے ہمیشہ صدقہ کرنے کی ترغیب دی خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ»

''آگ سے بچو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقے) کے ذریعے سے ہو۔''

(صحيح البخاري، الزكاة، حديث: 1417)

رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں مسلمان ایک دوسرے سے بڑھ کر صدقہ وخیرات کرتے اور ضرورت مندوں پر خرچ کرنا، لشکروں کو تیار کرنا اور انھیں سامان مہیا کرنا اور آپ ﷺ کے مہمانوں کی عزت وتکریم کرنا، ان سب امور کو باعث شرف سمجھا جاتا تھا۔ سخاوت میں سرفہرست سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے، جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر لشکر کے ایک بڑے حصے کے لیے ساز وسامان مہیا کیا تھا۔ (دیکھیے اس کتاب کا عنوان ''غزوۂ تبوک'')

اسی طرح عہد کی پاسداری رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا روشن پہلو تھا اور عام مسلمان بھی اس خوبی سے متصف تھے۔ رسول اکرم ﷺ اپنے دوستوں اور دشمنوں، سب سے وفائے عہد کرتے تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، (آسمانی) کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود اُسے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور گردنیں چھڑانے کے لیے خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکاۃ دے اور (نیکی ان کی بھی ہے جو) جب عہد کر لیں تو اپنا عہد پورا کریں اور تنگدستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کریں، وہی لوگ سچے اور وہی پرہیزگار ہیں۔''

(البقرة 2:177)

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! معاہدے پورے کرو، تمھارے لیے چوپائے مویشی حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جن کے نام تمھیں پڑھ کر سنا دیے جائیں گے، جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار کو حلال نہ جانو، بے شک اللہ جو چاہتا ہے، فیصلہ کرتا ہے۔'' (المآئدة 1:5)

امانت کو بروقت اور صحیح ادا کرنا بھی اخلاق اعلیٰ کی وہ اساس اور بنیاد ہے جس کی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو تاکید کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ ﴾

''بلاشبہ ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور وہ (امانت) انسان نے اٹھالی، یقیناً وہ بڑا ظالم اور بہت جاہل ہے۔'' (الأحزاب 72:33)

بعثت سے قبل رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات مشرکین مکہ کے ہاں صداقت و امانت کے لیے ضرب المثل کا درجہ رکھتی تھی۔ لوگ آپ کو صادق و امین کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ ﷺ کی سچائی اور کردار اور حسن اخلاق کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾

''اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہی لوگ متقی ہیں۔'' (الزمر 33:39)

رسول اکرم ﷺ سچائی اختیار کرنے پر زور دیتے اور اسی پر لوگوں کی تربیت کرتے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ، حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ

صِدِّيقًا، وَّإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَ إِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَ يَتَحَرَّى الْكَذِبَ، حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا»

''تم صدق پر قائم رہو کیونکہ صدق نیکی کے راستے پر چلاتا ہے اور نیکی جنت کے راستے پر چلاتی ہے۔ انسان مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور کوشش سے سچ پر قائم رہتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے ہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ سے دور رہو کیونکہ جھوٹ کج روی کے راستے پر چلاتا ہے اور کج روی آگ کی طرف لے جاتی ہے، انسان مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔''(صحيح مسلم، البر و الصلة، حديث: 2607)

اسی طرح نبی ﷺ نے جھوٹ سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

«آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ»

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔''(صحيح البخاري، الإيمان، حديث: 33)

جہاں تک خاندانی معاشرتی اخلاق وآداب کا تعلق ہے تو اسلام نے اس بارے میں اختلاف کے امکانات اور رشتہ داریوں کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر قوانین وضع کیے ہیں۔ اور اس بارے میں قوانین اور ان کے انطباق کے لیے ذاتی اور خاندانی احوال کا لحاظ رکھا ہے، لہٰذا نکاح، طلاق، نان ونفقہ، تربیت اولاد اور ذمہ داریوں کے تعین میں بڑے واضح اور شفاف اصول وضوابط مقرر کیے۔ اس میں فریقین کے حقوق کا اس طرح لحاظ رکھا گیا کہ کوئی کسی دوسرے پر ظلم وزیادتی نہ کر سکے اور کسی فریق کے حقوق متاثر نہ ہوں۔ ان قوانین اور اصول و ضوابط کو توڑنے اور ان سے تجاوز کرنے سے بڑی سختی سے منع کیا۔

سورۂ بقرہ آیت 226 تا 237 میں ان قوانین اور ضابطوں کو بڑی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اسی طرح شادی کی ابتدا، یعنی منگنی سے لے کر علیحدگی تک کے تمام قواعد وضوابط جو رشتہ ازواج سے متعلق

ہیں، سب بیان کر دیے گئے ہیں اور میاں بیوی کو حسن معاشرت کا حکم دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے لیے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور تم انھیں اس لیے نہ روک رکھو کہ تم نے انھیں جو مہر دیا ہو، اس کا کچھ حصہ واپس لے لو مگر اس صورت میں (انھیں روکنا جائز ہے) اگر وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو، پھر اگر تم ان کو ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی ڈال دے۔'' (النسآء 19:4)

اللہ تعالیٰ نے معاشرے میں عورت کے تقدس اور مقام و مرتبہ کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن مجید کی ایک سورت کا نام سورۂ نساء رکھا۔ اسی طرح عورت کو ماں کے روپ میں سب سے قیمتی متاع قرار دے کر اسے انسان کے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار قرار دیا۔ بیوی کی صورت میں باعث سکون قرار دے کر زوجین میں محبت و مَودّت اور رحمت و شفقت پیدا فرمائی جو محض محبت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کر دی، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً عظیم نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' (الروم 21:30)

خاوند کو بیوی سے الفت کرنے اور بیوی کو خاوند کی اطاعت کرنے کا حکم دیا۔ (فن تعامل النبيﷺ في الحياة

الزوجية، للكمداني، ص: 60) شریعت اسلامیہ نے رشتہ ازواج سے باہر جنسی تعلق کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح مرد پر ایک ایسے بچے کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جو درحقیقت اس کا نہیں ہے۔ اور رشتہ ازواج بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ جسمانی بیماریوں کے علاوہ میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہے جس وجہ سے اس رشتے کو قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ صرف زنا کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے بلکہ مرد وعورت ہر ایک کو نگاہ نیچی رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ اور صرف اپنے خاوند یا بیوی اور محرم رشتوں کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾

”(اے نبی!) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، بلاشبہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو (ازخود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوندوں پر یا اپنے باپ دادا پر، یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر، یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر، یا اپنے بھائیوں پر، یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر، یا اپنے دائیں ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر، یا عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر، یا ان لڑکوں پر جو عورتوں

کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور سے زمین پر) مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے وہ (لوگوں کو) معلوم ہو جائے اور اے مومنو! تم سارے ہی اللہ سے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (النور 24:30، 31)

ان آیات میں جس طرز عمل اور اخلاق کو اپنانے کا درس ہے۔ یہ میاں بیوی کو اس قدر پاکیزہ بنا دیتے ہیں کہ وہ کسی غیر کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ غیر محرم کو دیکھنے سے اس لیے منع کیا تاکہ یہ نظر بازی حرام تعلقات کا سبب نہ بن جائے۔ میاں بیوی کے رشتے میں اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے یہ سب حفاظتی تدابیر ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے جہاں مسلم معاشرے کی عمدہ اور اعلیٰ اخلاق پر تشکیل کی وہیں انھیں برے اخلاق سے دور رہنے کا حکم بھی دیا۔ ان برے اخلاق میں سے لوگوں پر ظلم کرنا بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ﴾

''(اللہ فرمائے گا: اے کافرو!) یقیناً انھوں نے تو تمھیں، جو تم کہتے تھے، جھٹلا دیا، لہٰذا اب نہ تم (اپنے آپ سے عذاب) ٹالنے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ (کسی سے) مدد (لے سکتے ہو) اور تم میں سے جو شخص ظلم کرے گا تو اسے ہم بہت بڑا عذاب چکھائیں گے۔'' (الفرقان 19:25)

اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ»

''مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کی دعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔''

(صحيح البخاري، المظالم، حديث: 2448)

اسی طرح اسلام نے حسد سے ڈرایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴾

''کیا وہ اس پر لوگوں سے حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے؟ تو یقیناً ہم نے آل

ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور انھیں بہت بڑی بادشاہی دی۔'' (النسآء 54:4)

اسی طرح دھوکا اور خیانت سے منع کرتے ہوئے فرمایا: «مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»

''جس نے ہمارے ساتھ دھوکا اور خیانت کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

(صحيح مسلم، الإيمان، حديث:101)

اسی طرح قرآن مجید میں ریاکاری کی تباہ کاریاں ذکر کی گئی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝﴾

''چنانچہ بہت بڑی تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے۔ وہ جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔ اور (لوگوں کو) استعمال کی معمولی چیزیں بھی دینے سے انکار کرتے ہیں۔''

(الماعون107:4-7)

رسول اکرم ﷺ نے ریاکاری سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ، قَالُوا: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ يَا رَسُولَ اللهِ ﷺ؟ قَالَ: الرِّيَاءُ»

''مجھے تم پر جس چیز کا سب سے زیادہ خدشہ ہے، وہ شرک اصغر ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! شرک اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ریاکاری۔'' (مسند أحمد: 428/5)

اسی طرح غرور کرنے اور اترانے سے منع کیا کیونکہ انسان کی تباہی میں اس کا بہت بڑا عمل دخل ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«ثَلَاثٌ مُّهْلِكَاتٌ، شُحٌّ مُّطَاعٌ، وَّهَوًى مُّتَّبَعٌ، وَّإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ»

''تین چیزیں تباہ کرنے والی ہیں: ایسا بخل جو حقوق وفرائض سے غافل کر دے، اندھا کر دینے والی خواہشات اور عجب (خود پسندی) کا شکار ہونا۔'' (السلسلة الصحيحة للألباني، حديث: 1802)

اس کے علاوہ رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی آدمی اپنے مال، عبادت، قوت وطاقت، عزت وشرف اور

محنت سے ہرگز دھوکا نہ کھائے۔ اسی سلسلے میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَنْ يُّنْجِيَ أَحَدًا مِّنْكُمْ عَمَلُهُ، قَالَ رَجُلٌ: وَلَا إِيَّاكَ يَارَسُولَ اللهِ؟! قَالَ: وَلَا إِيَّايَ، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ»

''تم میں سے کسی کو محض اس کا عمل نجات نہیں دے سکتا۔'' ایک آدمی نے عرض کیا: آپ کو بھی نہیں، اللہ کے رسول؟! فرمایا: ''مجھے بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سائے میں لے لے۔''

(صحيح مسلم، صفة القيامة، حديث: 2816)

اسی طرح آپ ﷺ سستی کو ناپسند کرتے اور اس سے اللہ کی پناہ طلب کرتے تھے، فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْبُخْلِ»

''اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں بے بسی سے، سستی سے، بزدلی سے، بڑھاپے اور بخل سے۔''

(صحيح مسلم، صفة القيامة، حديث: 2706)

سب سے اہم بات جو اسلام نے انسانی معاشروں کو دی وہ وقت کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کی درجہ بندی ہے۔ اسلام دن کو کام کاج اور رات کو آرام وسکون کا وقت قرار دیتا ہے۔ اوقات سے فائدہ اٹھانے اور انھیں ضائع نہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ نمازوں کے اوقات کار کی تقسیم اور ہر نماز کے وقت کی تحدید بتاتی ہے کہ اسلام وقت کے حوالے سے کس قدر محتاط ہے کیونکہ وقت ہی زندگی ہے۔ اسلام نے دن اور اس سے متعلقہ کاموں کی تقسیم اس انداز سے کی ہے کہ عبادات، کام کاج اور جسم ہر ایک کو اس کا حق مل جائے۔ ہر ذی شعور اور عقل و بصیرت رکھنے والا یہ جانتا ہے کہ ان قوانین اور اخلاقی ضابطوں نے، جو رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں تشکیل پائے یا آپ کی سیرت طیبہ سے اخذ کیے گئے، طبقاتی ہم آہنگی اور رابطے میں اہم کردار ادا کیا، نیز اس سے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دین اسلام کی محبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوئی۔

پھر اس کی تاثیر اسی دور تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے فیوض و برکات اس امت اور انسانیت میں ابھی تک چلے آ رہے ہیں۔

فوج کی بنیاد

رسول اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اور بعثت کے تقریباً تین سال بعد اعلانیہ دعوت شروع کی۔ دعوت توحید پیش کرتے ہی آپ قریش کے ظلم وستم کا نشانہ بننا شروع ہوگئے۔ مشرکین مکہ نے آپ کے علاوہ آپ کے پیروکاروں کو بھی سخت اذیتیں پہنچائیں۔ بعض ان کے ظلم وستم کی تاب نہ لاتے ہوئے شہادت سے سرفراز ہوئے، جیسے سیدنا عمار کے والدین، یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما۔

رسول اکرم ﷺ مسلمانوں کو تسلی دیتے، ان کے لیے دعا کرتے، انھیں صبر کی تلقین کرتے، اللہ کی مدد و نصرت اور غلبے کا یقین دلاتے اور لڑائی سے منع کرتے۔

سیدنا عمر بن خطاب اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہما کے قبولِ اسلام کے بعد مسلمان قدرے مضبوط ہو گئے لیکن پھر بھی انھیں جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔ مشرکین کی ایذا رسانیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ رسول اکرم ﷺ اور عام مسلمانوں کو اذیت پہنچانے سے باز نہ آئے۔ حتی کہ قریش مکہ نے ہجرت کی رات رسول اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا۔

مدینہ طیبہ ہجرت کرنے کے بعد مہاجرین وانصار کی مجموعی تعداد اگرچہ کافی بڑھ گئی تھی اور وہ ذہنی طور پر جنگ کے لیے تیار تھے اور رسول اکرم ﷺ کے حکم کے منتظر تھے لیکن اس کے باوجود پہلے مرحلے میں جنگ کرنے کی اجازت نہ ملی۔ بلکہ اس سے قبل انصار بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان الفاظ میں اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔

«وَالَّذِي بَعَثَكَ إِنْ شِئْتَ لَنُمِيلَنَّ عَلَى أَهْلِ مِنًى غَدًا بِأَسْيَافِنَا فَأَجَابَ ﷺ: لَمْ نُؤْمَرْ بِذٰلِكَ وَلٰكِنِ ارْجِعُوا إِلَى رِحَالِكُمْ»

''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا اگر آپ چاہیں تو ہم کل ہی اہل منیٰ پر اپنی تلواروں سے چڑھ دوڑیں گے۔ رسول اکرم ﷺ نے جواب دیا: ہمیں ابھی تک اس کا حکم نہیں ملا لیکن تم اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔'' (السيرة النبوية لابن هشام: 448/1)

اکثر مہاجرین و انصار نہایت دلیر جنگجو تھے اور لڑائی کا خوب تجربہ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی تعداد معقول ہو چکی اور وہ شان و شوکت بھی رکھتے تھے، نیز رسول اکرم ﷺ کے حکم پر کٹ مرنے کے لیے تیار بھی تھے تو اللہ تعالیٰ نے قتال کی اجازت دیتے ہوئے درج ذیل آیات نازل فرمائیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان دفاع کرتے ہوئے اپنے آپ کو ظلم سے بچائیں اور اپنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشتے ہوئے مستقبل میں اس قوت کو بڑھا کر بھرپور طریقے سے منظم کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾

''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔ وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ راہبوں کے خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے، ڈھا دی جاتیں اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔'' (الحج 22:39-41)

اس کے بعد سورۂ انفال نازل ہوئی جو سورۂ قتال کے نام سے معروف ہے۔ اس میں جہاد کے متعلق اہم قوانین ذکر کیے گئے اور بعدازاں مسلسل آیات نازل ہوتی رہیں، جن میں دشمن کے خلاف مسلمانوں کو قوت بڑھانے اور تیاری رکھنے کا حکم ملا۔ اسی ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت (ہتھیار) اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈراؤ گے، جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے۔ اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا (ثواب) دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' (الأنفال 60:8)

میدان جہاد میں شہادت کے امکانات کافی حد تک بڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے حوصلے بڑھانے کے لیے شہداء کے اچھے انجام کی گارنٹی کے لیے قرآن نازل فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾

''اور ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان (مومنوں) کے بارے میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں کہ انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (آل عمرٰن 170,169:3)

میدان جہاد میں جوش و جذبہ ضروری ہے لیکن اسلام نے اس موقع پر بھی زیادتی سے منع فرما کر جہاد کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ ﴾

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (البقرۃ 190:2)

رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی میں مشرکین و کفار سے جہاد کے متعلق تواتر سے قانون سازی ہوتی رہی۔ یہ موضوع مسلمانوں کے ہاں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر علمائے اسلام نے مستقل کتابیں تصنیف کیں اور جہاد کی فقہ اور اس کے احکام پر خصوصی مباحث لکھے گئے۔ (التراث العسکری عن العرب، کورکیس عواد)

رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں فوج کی تشکیل اور ساخت بہت آسان، سادہ اور مضبوط و منظّم تھی۔ اکثر افراد اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان ذاتی حیثیت ہی سے مہیا کرتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے فوج اور لشکر کی تیاری میں سب سے بہترین اور جدید طریقہ اختیار فرمایا۔ پھر جو لشکر آپ مدینہ طیبہ سے روانہ کرتے دوران سفر اور دوران معرکہ بھی ان کی تربیت کا عمل جاری رہتا۔ لشکر کے افراد اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف فوجی کارروائیوں میں مخصوص مقاصد اور طریقوں سے حصہ لیتے۔ کچھ دشمنوں کو دھوکے دیتے، کچھ لڑائی کرتے اور کچھ دشمن کی امداد اور کمک روکنے کے لیے کارروائی کرتے۔ سب کے سب اپنے اپنے اطراف سے مخصوص اہداف کی تکمیل کے لیے کوشش کرتے۔ اس سے صحابہ کرام کی تربیت اور فوجی صلاحیتوں کو بڑھانا مقصود ہوتا۔ اس مسلسل تربیت اور عملی مشق سے ان کی جنگی اور قائدانہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آ گئیں۔ مصائب برداشت کرنے، قربانی دینے اور حصول شہادت کا جذبہ بھی پروان چڑھا۔

انھوں نے رسول اکرم ﷺ کی معیت میں بدر، احد، خندق اور دیگر کئی غزوات میں مشرکین اور ان کے ہمنواؤں سے لڑائی لڑی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کر دیا۔ اسی طرح یہود سے بھی جنگ کی یہاں تک کہ ان کی دھوکا دہی کی وجہ سے انھیں مدینہ طیبہ سے نکال دیا، پھر خیبر کو فتح کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے جزیرہ عرب سے باہر کارروائیاں شروع کیں۔ اس سلسلے میں معرکہ مؤتہ اور تبوک پیش آیا۔ یہ رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کا مظاہرہ تھا جس نے بعدازاں تاریخ انسانی کا دھارا بدل دیا۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے ادوار میں آپ کے تربیت یافتہ جرنیلوں نے بڑی

بڑی فتوحات کیں جس کا اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں ان سے وعدہ کر رکھا تھا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین مضبوط کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (النور 55:24)

رسول اکرم ﷺ کی ریاست کے فوجی نظام کی خصوصیات کو درج ذیل نکات میں پیش کیا جاسکتا ہے:

◎ رسول اکرم ﷺ بذات خود لشکروں کی قیادت کر کے عملی جہاد میں حصہ لیتے۔ اس راہ میں آپ کو زخم بھی لگے۔ آپ کو وہی خطرات لاحق ہوتے جن سے آپ کے صحابہ دوچار ہوتے۔ آپ تھکان بھی محسوس کرتے۔ اپنے ساتھیوں کو تسلی دیتے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ تکبر کرتے نہ جابر حکمرانوں کا سا رویہ ہوتا۔ آپ اپنے ساتھیوں سے بہت اچھا برتاؤ کرتے اور اپنے فوجیوں کے ساتھ رحمت و شفقت سے پیش آتے۔

◎ رسول اکرم ﷺ کسی کو فوج میں شامل ہونے کے لیے مجبور کرتے نہ کسی پر زبردستی کی جاتی، البتہ مال اور جان سے جہاد کرنے کی ترغیب دیتے اور جہاد میں عملی شرکت کر کے صحابہ کے نمونہ ضرور بنتے تھے۔ مجاہدین کے لیے اللہ تعالیٰ کے انعامات کی خوشخبری دیتے اور خصوصاً شہداء کے بلند درجات کا تذکرہ کرتے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے سپاہی روئے زمین کے فوجیوں سے بڑھ کر اعلیٰ اخلاق کے مالک، بلند اہداف رکھنے والے، مخلوق خدا پر سب سے زیادہ ترس کھانے والے اور جوش و خروش سے واجبات و فرائض کی ادائیگی کرنے والے تھے۔

◎ نبی ﷺ فوجی کارروائیوں کے لیے اہل اور قابل فوجی قیادت کا انتخاب فرماتے خواہ اس لشکر میں کوئی بزرگ یا قدیم الاسلام ہی کیوں شامل نہ ہوتا۔ آپ جنگی تجربہ اور بصیرت رکھنے والے کو قوم کا امیر مقرر کر دیتے جبکہ

دین داری کے اعتبار سے اس سے افضل لوگ موجود ہوتے۔

(السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية لابن تيمية، ص: 25)

◎ رسول اکرم ﷺ کے تمام سپاہی رضا کارانہ جہاد کرتے۔ وہ ایمان کی بیعت کے ساتھ جہاد کی بیعت بھی کرتے۔ جہاد کے بدلے میں وہ کسی تنخواہ یا دنیاوی معاوضے کے ہرگز طلب گار نہ تھے۔ وہ جہاد کے لیے اپنے اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کا بھی خود ہی بندوبست کرتے۔ ان کا مقصد رضائے الٰہی کا مقصود ہوتا۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری دی جاتی۔ کوئی شہسوار ہوتا تو کوئی پیدل ہی دشمن پر ٹوٹ پڑتا۔ کسی کے ہاتھ میں تیر کمان ہوتی تو جھنڈا اٹھانے کی ذمہ داری پوری کرتا۔ کوئی دشمن کی جاسوسی کرتا تو کوئی پانی لانے کا فریضہ سرانجام دیتا اور کوئی جانور چراتا۔ الغرض ہر ایک اپنی جگہ پر اہم اور دوسرے کے کردار کو مکمل کرنے والا تھا۔ ہر ایک دشمن سے جہاد کی پوری کوشش کرتا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس کی راہ میں قربانی دینے کے لیے تیار رہتا۔ اسی طرح میدان جنگ سے بھاگنے کو بہت بڑا کبیرہ گناہ قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

''اور جو شخص اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس شخص کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو یا (اپنے) کسی گروہ کی پناہ لینے والا ہو تو یقیناً وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔'' (الأنفال 16:8)

اگرچہ عمومی طور پر سپاہی اپنے مالی معاملات کو ذاتی طور پر ہی پورا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود رسول اکرم ﷺ نے مجاہدین پر خرچ کرنے اور مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے کی ترغیب دی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ تم اللہ

اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔'' (الصف 11,10:61)

اس لیے کئی صحابۂ کرام مجاہدین پر بکثرت خرچ کرتے تھے حتی کہ ان کے صدقات و خیرات ہی ان کی شہرت کا باعث بنے۔ ان میں سرفہرست سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر پھر بے پناہ مال راہ جہاد میں خرچ کیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے اس کا کتاب کا عنوان ''غزوۂ تبوک'') اسی طرح طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے ایک غزوہ میں اس کثرت سے مال خرچ کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام طلحۃ الجود (جود وسخا کا پیکر) رکھ دیا۔

اسی طرح مردوں کے علاوہ خواتین نے بھی مالی امداد، ساز و سامان مہیا کرنے، مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ (دیوان الجند لعبدالعزیز السلومی، ص:373)

◎ دشمن سے حاصل ہونے والے مال کی تقسیم کا بھی ایک طریقہ کار اور نظام تھا۔ دشمن سے حاصل ہونے والے مال کی ایک صورت غنیمت تھی، یعنی دشمن سے لڑائی کر کے ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد حاصل ہونے والا مال۔ (الخراج لیحی بن آدم، ص: 17)

دشمن سے حاصل ہونے والے مال کی دوسری قسم مال فے کی تھی جس پر مسلمانوں نے گھوڑے اور سواریاں نہ دوڑائی ہوں، یعنی بغیر جنگ کے حاصل ہونے والا مال، جیسے دشمن جزیہ دے کر صلح کر لیں۔ (الخراج لحیی بن آدم، ص: 17) شریعت نے دشمن سے حاصل ہونے والے مال کی تقسیم کے حوالے سے واضح ہدایات جاری فرمائیں۔ غنیمت لڑنے والوں کا حق قرار دیا۔ اور اس کی تقسیم اس طرح کی کہ اگر کسی کافر کے بارے میں معلوم ہے کہ اسے فلاں مسلمان نے قتل کیا ہے تو اس کے جسم پر موجود تمام سامان، کپڑے اور اسلحہ وغیرہ قتل کرنے والے کو دیے جاتے۔ (صحیح البخاري، فرض الخمس، حدیث: 3142) پھر اس کے بعد بچ جانے والے مال سے پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق نکالا جاتا۔ یہ صوابدیدی فنڈ تھا جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے خرچ کرنے کے مجاز تھے۔

اس کے بعد باقی مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا (اس طرح کہ شہسوار کو تین اور پیادہ کو ایک حصہ۔ اسی بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ بلاشبہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو تو اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے (بدر) کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔'' (الأنفال 41:8)

اسی طرح فرمایا: ﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾

''پھر جو حلال، پاکیزہ غنیمت تم نے حاصل کی ہے اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 69:8)

مال فے کا ذکر درج ذیل ارشاد باری میں ہے:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآىِٕمَةً عَلٰۤی اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

''تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ سب) اللہ کے حکم سے ہے تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس پر تم نے کوئی گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اللہ نے اپنے رسول پر ان بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور

مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الحشر 59:5-7)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد دشمنان اسلام سے ٹیکس کی صورت میں حاصل ہونے والی رقم بھی مال فے کی طرح خلیفہ کی صوابدید کے مطابق عدل و انصاف اور نظام کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ خلیفہ اس میں ذاتی مصلحت کو ہرگز ترجیح نہ دیتا بلکہ مفاد عامہ کا لحاظ رکھتا۔ یہ سب کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں ہوتا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر سے حاصل ہونے والے مال کے بارے میں کیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 1845/2) اس حوالے سے خلفائے راشدین اور بعد کے ادوار میں امت کا جو طرز عمل رہا اس بارے میں احکام و مسائل پر کئی کتابیں تالیف کی جا چکی ہیں۔

(الخراج لأبي يوسف، كتاب الخراج لحيى بن آدم، الاستخراج لابن رجب، الأحكام السلطانية للماوردى)

◎ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ کے حصول اور اس کے چلانے کی تربیت حاصل کرنے پر خصوصی زور دیا۔ آپ خود اسلحہ خریدتے اور استعمال کرتے تھے۔ آپ نے تلوار اور نیزے کا استعمال کیا۔ کمان کے ذریعے تیر پھینکے۔ زرہ اور خود کا استعمال کیا۔ اور فرمایا:

«جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي وَجُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصَّغَارُ عَلَى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي»

''میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں رکھ دیا گیا ہے اور جو میرے حکم کی مخالفت کرے ذلت و بدبختی اس کا مقدر کر دی گئی ہے۔'' (صحيح البخاري، الجهاد والسير، قبل حديث: 2914)

اسلحہ سازی کی ترغیب دیتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يُدْخِلُ الثَّلَاثَةَ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ الْجَنَّةَ، صَانِعَهُ يَحْتَسِبُ فِي صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ، وَالْمُمِدَّ بِهِ، وَالرَّامِيَ بِهِ»

''بے شک اللہ عزوجل ایک تیر کے ذریعے سے تین لوگوں کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ بنانے والے کو جس کی نیت بناتے وقت خیر کی ہو، تھمانے والے کو اور اسے پھینکنے والے کو۔'' (سنن الدارمي: 24/2)

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «تَعَاهَدُوا قَرْنَكُمْ فَلَا تَزَالُ مَمْلُوءَةً نَبْلًا أَبَدًا»

''اپنے میانوں کا خیال رکھو، وہ ہمیشہ تیروں سے بھرے ہونے چاہئیں۔''

(الحرف والصناعات في الحجاز في العصر النبوي، لعبدالعزيز العمرى، ص: 207)

اسلحہ سازی اس قوت کی تیاری کا حصہ ہے۔ جس کا اللہ تعالیٰ نے درج ذیل فرمان میں حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت (ہتھیار) اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈراؤ گے، جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا (ثواب) دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' (الأنفال 8:60)

بعض چھوٹی عمر کے صحابہ کرام تیروں کو سیدھا کرتے اور ان کو تیار کرتے۔ جب ان میں سے کسی سے کہا جاتا کہ تمھاری عمر کتنی ہے؟ تو وہ کہتا: میں تیروں کو سیدھا کر لیتا ہوں اور ان کے چلانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

(تاريخ الطبري: 3/187)

بعض صحابۂ کرام تیر بنا کر مسجد لاتے اور اس کا صدقہ کرتے تھے۔ (القول التام للسخاوى ورقه: 93)

رسول اکرم ﷺ کے صحابہ آپ کی ہدایات کے مطابق اسلحہ چلانے کی مسلسل مشق کرتے اور آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے، خصوصاً تیراندازی میں ضرور شریک ہوتے اور بعض اوقات پورا دن تیراندازی کرتے۔ (القول التام للسخاوي ورقه: 82)

آپ نے جہادی تربیت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

«كُلُّ شَيْءٍ يَلْهُو بِهِ الرَّجُلُ بَاطِلٌ إِلَّا رَمْيَ الرَّجُلِ بِقَوْسِهِ، وَتَأْدِيبَهُ فَرَسَهُ، وَمُلَاعَبَتَهُ أَهْلَهُ، وَقَالَ: مَنْ تَرَكَ الرَّمْيَ بَعْدَ مَا عَلِمَهُ فَقَدْ كَفَرَ الَّذِي عَلِمَهُ»

’’آدمی کا ہر کھیل کود باطل ہے، سوائے تیراندازی، گھوڑے کی تربیت اور بیوی سے دل لگی۔‘‘ نیز فرمایا: جس نے تیراندازی سیکھنے کے بعد چھوڑ دی اس نے اس فن کی ناقدری کی۔‘‘

(سنن الدارمي: 205/2، جامع الترمذي، فضائل الجهاد، حديث: 1637)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصر نبوی میں عسکری نظم وضبط اور اس سے متعلقہ استعداد کار جیسے فوج اور اسلحہ وغیرہ، مکمل فوجی انجینئرنگ پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ حالات وظروف کے مطابق فوجی عمارتیں اور مختلف طرح کے قلعے تعمیر کیے گئے۔

◎ مدینہ طیبہ میں کئی قلعے تھے جو انصار کے حامیوں کے تھے۔ جن غزوات میں دشمن نے مدینہ شہر کو نشانہ بنایا ان میں ان قلعوں کا عورتوں اور بچوں کی حفاظت میں بڑا اہم کردار تھا، جیسے قلعہ فارغ وغیرہ۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 228/3، وعمدة الأخبار، لأحمد بن عبدالحميد العباسي، ص: 232) مدینہ طیبہ کی کوئی حفاظتی دیوار نہیں تھی جس کے ذریعے سے دشمن سے بچاؤ ہوسکتا، اس لیے قلعوں اور ٹیلوں کا سہارا لیا جاتا۔ یہود مدینہ کے بہت سے قلعے تھے جن پر دوران جنگ رسول اکرم ﷺ نے قبضہ کرلیا۔ یہود کو ان کے مضبوط قلعے بھی اللہ کی پکڑ سے نہ بچا سکے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی مدد اور نصرت فرمائی۔ اسی بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾

’’وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلا وطنی کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا۔ تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔‘‘ (الحشر 2:59)

بنوقریظہ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴾

''اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی انھیں اللہ نے ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، تم ان (بنوقریظہ) کے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے تھے۔'' (الأحزاب 26:33)

جب قریش اور ان کے اتحادی لشکروں نے مدینہ طیبہ پر چڑھائی کی تو رسول اکرم ﷺ نے ان کے حملہ کرنے سے پہلے مدینہ کے اردگرد سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھود کر دفاع کیا۔ آپ ﷺ نے خود ان کی جغرافیائی صورت حال کا جائزہ لیا۔ صحابۂ کرام کو نشانات لگا کر دیے اور پورے طریقہ کار سے آگاہ کیا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کے فوجی دستوں کو مدینہ طیبہ سے باہر روک کر دفاع کیا جا سکے۔

(الحرف والصناعات)

نبوی ریاست اور عالمی امن

ریاست نبوی کا قیام عدل وانصاف اور امن وامان کے اصولوں پر ہوا۔ اس کے تحت رہنے والے مسلمان تھے یا کافر، سب کے لیے یکساں امن کی ضمانت تھی۔ ان کے لیے یہ گارنٹی تھی کہ کوئی شخص اللہ کے دین کے حوالے سے ان پر زیادتی نہیں کرے گا۔ تدریجاً ریاست مدینہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی حتی کہ پورا جزیرۂ عرب اس میں شامل ہوگیا۔ خارجی تعلقات میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ ریاست سے خارج عرب قبائل اور اس سے ملحقہ ریاستوں سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ آپ ﷺ بعثت کے وقت سے بلکہ اس سے بھی پہلے عالمی طاقتوں اور ہمسایہ ملکوں کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے صحابہ کو مدینہ طیبہ سے حبشہ ہجرت کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ آپ وہاں کے باشندوں، نظام اور حکومت کے حوالے سے مکمل معلومات رکھتے تھے۔ آپ نے صحابۂ کرام کو ہجرت حبشہ کے وقت بتایا: «إِنَّ بِهَا مَلِكاً لَّا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ»

''وہاں ایسا بادشاہ برسر اقتدار ہے کہ اس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔''

(تفصیل کے لیے دیکھیے اس کتاب کا عنوان ''ہجرت حبشہ'')

بعدازاں آپ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوا۔

اسی طرح آپ نے ہجرت مدینہ سے قبل مختلف مواقع پر مکہ اور گرد ونواح کے قبائل سے حمایت کرنے کا کہا۔ (تفصیل کے لیے، اس کتاب کا عنوان ''رسول اکرم ﷺ کا خود کو قبائل پر پیش کرنا۔) اسے مقصد خارجی تعلقات کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ نے مختلف بادشاہوں اور روسائے قبائل، جیسے قیصر وکسریٰ وغیرہ سے خط وکتابت کی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، اس کتاب کا عنوان ''بادشاہوں اور رؤساء کو خطوط'') ان خطوط میں آپ نے دعوت اسلام پیش کی۔ اپنے خطوط کے سرورق پر امن وسلامتی کا پیغام یوں دیا:

اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ''جو ہدایت کی پیروی کرے اس کے لیے امن وسلامتی ہے۔''

آپ اپنے صحابہ کو مسلسل بتاتے رہے کہ آپ کی دعوت ہر جگہ پہنچے گی اور یہ دین وہاں تک پہنچے گا جہاں تک دن رات کا تصور موجود ہے۔ یہ بات آپ نے اپنی رسالت کے عالمگیر ہونے کی تاکید کے طور پر کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں پر رحمت کرنے کے لیے ہی بھیجا ہے۔'' (الأنبياء 107:21)

رسول اکرم ﷺ کے خطوط جو آپ نے مختلف بادشاہوں اور قبائل کے عمائدین کو لکھے، ان سے واقف کار بآسانی جان سکتا ہے کہ آپ کس قدر دور اندیش تھے اور عالمی امن کے کس شدت سے خواہاں تھے۔

(رسائل و رسل رسول اللّٰه ﷺ إلى الملوك والأشراف لابن الجوزي ـ الرسول المبلغ ﷺ لصلاح عبد الفتاح)

اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل فرمائی اور اس کے رسول نے جو قوانین اور نظام وضع فرمایا وہ تمام انسانیت یعنی مسلمانوں اور کافروں سب کے لیے امن کا ضامن ہے۔ بشرطیکہ کافر مسلمانوں پر زیادتی نہ کریں اور اگر کوئی اپنی مرضی سے اسلام قبول کرے تو اسے اسلام کی تعلیمات حاصل کرنے اور مسلمانوں کی پیروی سے نہ روکیں۔ یہ رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ریاستی قوانین تھے۔

(الشرح الدولي في عهد الرسول للدكتور عبد الوهاب كلزية)

آپ ﷺ نے دو بنیادوں پر دنیا سے تعلقات استوار کیے:

① دنیا میں امن وامان ہو۔ ② دعوت اسلام تمام لوگوں تک پہنچے۔

آپ نے انسانی معاشروں سے کٹ کر رہنے کی پالیسی اختیار نہیں کی بلکہ مل جل کر رہنے کو اہمیت دی۔ (الشرح الدولي في عهد الرسول للدكتور عبد الوهاب كلزية، ص: 6) اسلام کے لائے ہوئے اخلاق وآداب، خیر و برکات اور امن وسلامتی کو دوسروں تک پہنچانے کو ترجیح دی۔ (قراءة سياسية للسيرة النبوية، لمحمد رواس، ص: 304) مذہبی اختلافات کے باوجود سب کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے امکانی حد تک مل جل کر رہنے کے نظریے کو فروغ دیا۔ اس طرح کہ مسلمانوں پر زکاۃ لاگو کی اور اسلامی ریاست میں رہنے والے کفار پر ٹیکس لاگو کیا، لہٰذا جو زکاۃ کا انکار کرے گا وہ شریعت اور نظام دونوں کا مخالف گردانا جائے گا، اسی طرح ٹیکس نہ دینے

والا بھی قانون شکن شمار ہوگا۔

ظلم کو ختم کرنے کے لیے باہمی تعاون پر زور دیا۔ اس کے علاوہ آپ نے دوسرے ممالک اور علاقوں سے تجارتی اور اقتصادی مقاصد کے لیے پلوں اور راستوں کی تعمیر کی طرف توجہ دی۔ تجارتی راستوں کو محفوظ بنایا۔ لوگوں کی مصلحت اور معیشت کی بہتری کے لیے دیگر ملکوں، گروہوں اور قبائل کے درمیان لین دین کے معاہدے کیے جو قانونی اور مذہبی نقطۂ نظر سے مختلف متفقہ شرائط کے ساتھ نافذ العمل تھے۔

(الشرع الدولي في عهد الرسولﷺ للدكتور عبد الوهاب كلزية، ص: 86)

نبی ﷺ کے معاہدوں اور وثیقوں پر کئی کتابیں تالیف ہوچکی ہیں، جن کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(دیکھیے: الوثائق السياسية للعصر النبوي والخلافة الراشدة، للدكتور محمد حميد الله)

وفات مصطفیٰ ﷺ

رسول اکرم ﷺ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی تعلیم دینے، آخرت کے دن کی تیاری اور اللہ کی ملاقات کا یقین دلانے کے لیے تشریف لائے۔ آپ انھیں موت اور دوبارہ جی اٹھنے کی یاددہانی کراتے۔ لفظ موت اور اس کے مشتقات کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً پچاس بار آیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو آغاز بعثت اور نزول قرآن کے آغاز ہی سے فکر آخرت کا درس دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ ﴾

''اور یقیناً آپ کے لیے آخرت، دنیا سے بہت بہتر ہے۔ اور یقیناً جلد آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' (الضحیٰ 93:4,5)

قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی وفات کا اعلان بڑی صراحت سے کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) بلاشبہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں، پھر بلاشبہ تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑو گے۔'' (الزمر 39:30,31)

کفار قریش اس بات کے منتظر تھے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی آپ کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی موت کا اثبات اور ان کی خواہش کی تکمیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاْىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، پھر اگر آپ مر جائیں تو کیا وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟'' (الأنبياء 34:21)

اور یہ تمام بنی نوع انسان اور مخلوق کے لیے عمومی اصول اور ضابطہ ہے کہ اس نے فنا ہونا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۗ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝﴾

''ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے۔ اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں اور آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔'' (الأنبياء 35:21)

ایک مقام پر فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾

''ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے۔ اور آپ کے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی عظمت اور احترام والا ہے۔'' (الرحمٰن 27,26:55)

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾

''اور آپ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکاریں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے چہرے کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، اسی کی حاکمیت و فرمانروائی ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' (القصص 88:28)

نیز فرمایا:

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝﴾

''تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو اور اگر انھیں کوئی بھلائی

پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف سے ہے۔ کہہ دیجیے: یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، پھر کیا حال ہے ان لوگوں کا جو بات سمجھنے کے قریب نہیں پھٹکتے!'' (النسآء 78:4)

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے سیدنا معاذ کو یمن روانہ کرنے سے پہلے فرمایا:

«يَا مُعَاذُ! إِنَّكَ عَسٰى أَنْ لَّا تَلْقَانِي بَعْدَ عَامِي هٰذَا وَلَعَلَّكَ أَنْ تَمُرَّ لِمَسْجِدِي هٰذَا وَقَبْرِي، فَبَكٰى مُعَاذٌ رضی اللہ عنہ»

''اے معاذ! ہوسکتا ہے تو اس سال کے بعد مجھ سے نہ مل پائے اور تو میری قبر اور مسجد کے پاس سے گزرے۔'' یہ سن کر سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ (مسند أحمد: 235/5، والسلسلة الصحيحه، حديث: 2497)

جب رسول اکرم ﷺ نے خود کو اپنے رب کی ملاقات کے لیے تیار کر لیا اور اس کے لیے آمادہ ہو گئے تو قرآن نے آپ کے صحابہ اور امت کی ذہن سازی شروع کر دی کہ اللہ کے رسول تم سے جدا ہو کر جانے والے ہیں، اس لیے تمھیں دینِ اسلام پر کاربند رہنا ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ یقیناً ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں تو کیا تم (اسلام سے) اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔''

(آل عمرٰن 144:3)

یہی وہ آیت ہے جسے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کے سامنے پڑھا اور ان کی دین پر ثابت قدمی کا باعث بنی۔

ایک موقع پر آپ نے اپنی لختِ جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«إِنَّ جِبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُنِي الْقُرْآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَّرَّةً وَّأَنَّهُ عَارَضَنِي بِهِ الْعَامَ مَرَّتَيْنِ، وَلَا أُرَاهُ إِلَّا حَضَرَ أَجَلِي»

''بلاشبہ جبریل ہر سال میرے ساتھ ایک دفعہ قرآن مجید کا دور کرتے تھے اور اس سال انھوں نے دو مرتبہ دور کیا ہے۔ میں تو اس سے یہی سمجھا ہوں کہ میری موت کا وقت قریب ہے۔''

(صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3624)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ وفات سے قبل اکثر یہ پڑھا کرتے تھے:

«سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ»

''(اے اللہ) تو پاک ہے اپنی تعریفوں کے ساتھ۔ میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں۔''

فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ نئے کلمات کیا ہیں جو آپ (کثرت سے) کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

«جُعِلَتْ لِي عَلَامَةٌ فِي أُمَّتِي إِذَا رَأَيْتُهَا قُلْتُهَا» ﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾

''مجھے میری امت کی ایک نشانی بتائی گئی کہ جب اسے دیکھوں تو یہ کہوں: إِذَا جَاءَ ..... (اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (تفسير ابن كثير، تفسير سورة النصر: 2043/2)

جس طرح آپ زندوں کو الوداع کہنے کے خواہاں تھے اسی طرح آخری ایام میں آپ نے فوت شدگان کو ان کی قبروں پر جا کر الوداع کیا، چنانچہ آپ نے شہدائے احد کی قبروں کی اس طرح زیارت کی گویا انھیں الوداع کہہ رہے ہیں۔ (صحيح السيرة، ص: 554، المغازي لابن أبي شيبة، ص: 418)

اسی طرح (آخری ایام میں) آپ بقیع القرقد کے مدفونین کی زیارت اور ان کے لیے دعا کے آرزو

مند تھے۔(صحيح السيرة، ص: 553، والسيرة النبوية لابن هشام: 662/2)

رسول اللہ ﷺ کی بیماری

صفر کے آخر میں وفات سے تقریباً پچیس دن پہلے رسول اکرم ﷺ بیمار ہوئے۔ آپ نہایت صابر تھے۔ اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے زبان پر شکوہ نہ لاتے لیکن ایک موقع پر آپ نے بیماری کا اظہار فرمایا۔ آپ بقیع الغرقد کی زیارت سے واپس آئے تو ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سر درد کی شکایت کی اور کہا: ہائے میرا سر گیا! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ أَنَا وَاللهِ يَا عَائِشَةُ وَا رَأْسَاهُ»

''بلکہ میں اللہ کی قسم عائشہ! میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''(صحيح البخاري، الأحكام، حديث: 7217)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَمَا ضَرَّكِ لَوْ مِتِّ قَبْلِي فَغَسَّلْتُكِ وَكَفَّنْتُكِ، وَصَلَّيْتُ عَلَيْكِ وَدَفَنْتُكِ؟»

''تجھے کیا نقصان ہے، اگر تو مجھ سے پہلے مر گئی تو میں تجھے غسل دوں گا، تجھے کفن دوں گا اور تیری نماز جنازہ پڑھا کر تجھے دفن کر دوں گا؟''

سیدہ عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: اللہ کی قسم اگر ایسے ہو گیا تو لگتا ہے آپ پل بھر بھی انتظار نہیں کریں گے مجھے دفنانے کے بعد میرے گھر میں اپنی کسی بیوی کے ساتھ رات گزاریں گے۔ کہتی ہیں: یہ سن کر آپ مسکرائے، پھر آپ اپنی بیویوں کے پاس باری باری جا رہے تھے کہ درد میں تیزی آنی شروع ہو گئی حتی کہ آپ سیدہ میمونہ کے گھر تھے کہ درد نے شدت اختیار کر لی۔ آپ نے اپنی تمام بیویوں کو بلایا اور ان سے بیماری کے ایام میرے گھر میں گزارنے کی اجازت مانگی تو سب نے اجازت دے دی۔(السيرة النبوية لابن هشام: 643/4)

ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو مغرب کی نماز میں سورۂ مرسلات پڑھتے ہوئے سنا، اس کے بعد آپ نے فوت ہونے تک ہمیں کوئی نماز نہ پڑھائی۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4429)

شاید ام فضل رضی اللہ عنہا کا اشارہ اس مغرب کی نماز کی طرف ہے جس میں آپ کی تکلیف شدت اختیار کر گئی تھی

جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کی وفات سے دو ہفتے پہلے پیر کے دن کا واقعہ ہو جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے۔ (فتح الباري)

رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی شدت

وفات کے وقت نو امہات المومنین نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں تھیں۔ آپ ﷺ سیدہ عائشہ کے گھر زیادہ سکون محسوس کرتے تھے۔ بیماری کے باوجود بھی آپ کی پوری کوشش تھی کہ ہر بیوی کی باری پر اس کے ہاں رات گزاریں اگرچہ آپ کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ بیماری شدید ہوگئی تو آپ پوچھتے: میں کل کہاں ہوں گا، میں کل کس کے گھر ہوں گا، آپ سیدہ عائشہ کے گھر منتقل ہونا چاہتے تھے۔ آپ کی بیویوں نے آپ کو اجازت دے دی کہ آپ جہاں پسند کریں قیام کریں، چنانچہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر رک گئے اور وہیں پر وفات ہوئی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4450)

بعض روایات میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر منتقل ہونے کی پوری تفصیل موجود ہے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4433,4432)

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوری ایمانداری اور عدل سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مقام و مرتبہ ذکر کیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے ہاں ان کا خصوصی مقام اور آپ کی ان سے راز دارانہ گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا چلتی ہوئی آئیں اور ان کی چال رسول اکرم ﷺ کے مشابہ تھی۔ نبی نے ان سے فرمایا:

«مَرْحَباً بِابْنَتِي» ''میری بیٹی کو خوش آمدید۔''

پھر آپ نے انھیں دائیں طرف بٹھایا پھر بائیں طرف، پھر ان سے چپکے سے بات کی تو وہ رو پڑیں۔ میں نے ان سے کہا: روتی کیوں ہیں؟ پھر آپ نے ان سے راز دارانہ بات کی تو وہ ہنس پڑیں۔ میں نے کہا: میں نے خوشی اور غم کا یہ امتزاج آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا: میں اللہ کے رسول ﷺ کے راز کو فاش نہیں کروں گی۔ پھر رسول اکرم ﷺ فوت ہوگئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اکرم ﷺ نے مجھ سے خفیہ بات یہ کی تھی کہ جبریل ہر سال میرے ساتھ ایک دفعہ قرآن کا دور کرتے تھے اور اس سال انھوں نے دو دفعہ دور کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری موت کا وقت

قریب ہے اور تم میرے اہل بیت میں سے سب سے پہلے مجھ سے ملو گی۔ یہ سن کر میں رو پڑی تو آپ نے فرمایا:

«أَمَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةَ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ أَوْ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ؟»

''کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم جنت کی عورتوں یا مومن عورتوں کی سردار ہو۔'' میں یہ سن کر ہنس پڑی۔ (صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3623-3625)

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخذ حدیث میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خصوصی مقام حاصل تھا، نیز ان کے فضل و منقبت بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث رسول نقل کرنے میں صداقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کتاب المناقب میں سیدہ فاطمہ کی فضیلت میں جو حدیث لائے ہیں وہ بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے جس سے امہات المومنین اور دیگر اہل بیت کے باہمی تعلق کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہ روایات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ان کے درمیان محبت و الفت کا رشتہ قائم تھا۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سیدہ فاطمہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے فضائل میں وارد بیشتر احادیث کو روایت کرنے والی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا بیماری کے ایام سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزارنا متعدد فوائد اور حکمتوں کی بنا پر تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ رسول اکرم ﷺ ان کے ساتھ رہ کر راحت اور سکون محسوس کرتے تھے۔ آپ کے ان کے ہاں قیام میں یہ حکمت تھی کہ وہ باقی امہات المومنین کی نسبت آپ کی زندگی کے آخری لمحات کو زیادہ محفوظ رکھنے والی تھیں۔ حقیقت یہی ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کی بیماری میں کہی گئی ایک ایک بات کو یاد رکھا۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور موقع پر آمد اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتی ہیں کہ جب نبیٔ اکرم ﷺ کی طبیعت نڈھال ہوگئی تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہائے ابا جان کی تکلیف! یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَيْسَ عَلَى أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ»

''آج کے بعد تیرے باپ پر کبھی تکلیف نہیں آئے گی۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4462)

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں فرمایا:

«وَدِدْتُّ أَنَّ عِنْدِي بَعْضَ أَصْحَابِي» ''میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس میرا ایک صحابی ہو۔''

ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجیں؟ آپ خاموش ہوگئے۔ ہم نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ کو بلا لیں؟ آپ خاموش رہے۔ ہم نے کہا: عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا لیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ حاضر ہوگئے۔ نبی ﷺ نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی۔ آپ ﷺ گفتگو کرتے جاتے تھے اور عثمان رضی اللہ عنہ کے چہرے کے تأثرات تبدیل ہوتے جاتے تھے۔ (سنن ابن ماجة، المقدمة، حديث: 113)

یہ بات منقول ہے کہ جس دن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں ان کا محاصرہ ہوا تو انھوں نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا میں تو اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اور اسی (ان کی شہادت) کو وہ یہ دن سمجھتے تھے (جس میں ثابت قدمی کا آپ نے عہد لیا تھا)۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

«يَا عُثْمَانُ إِنَّهُ لَعَلَّ اللهَ يُقَمِّصُكَ قَمِيصًا فَإِنْ أَرَادُوكَ عَلَى خَلْعِهِ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ»

''اے عثمان! امید ہے اللہ تجھے ایک قمیص پہنائے گا (خلافت دے گا) اگر لوگ تجھ سے اس کے اتارنے کی خواہش کریں تو ان کی خاطر اسے نہ اتارنا۔'' (جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3705)

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بیماری نے شدت اختیار کی تو میں اور دیگر لوگ مدینہ اتر آئے۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ گفتگو کرنے سے رک چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ مجھ پر رکھ کر انھیں بلند کرنے لگے تو میں سمجھ گیا کہ آپ (میری کامیابی) کی دعا فرما رہے ہیں۔ (جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3817)

اور یہ معروف ہے کہ ان دنوں سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بلقاء کے لشکر کی قیادت کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نبی ﷺ کی بیماری میں حاضر خدمت ہوا جبکہ آپ کو سخت تیز بخار تھا۔ میں نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ آپ کو بہت سخت بخار ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آپ کو سخت تیز بخار اس لیے کہ آپ کو دوگنا ثواب ہوگا۔ آپ نے فرمایا:

«أَجَلْ، مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُّصِيبُهُ أَذًى إِلَّا حَاتَّ اللّٰهُ عَنْهُ خَطَايَاهُ كَمَا تَحَاتُّ وَرَقُ الشَّجَرِ»

''درست ہے، جب کوئی مسلمان کسی بھی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس وجہ سے اس کے گناہ جھاڑ دیتا ہے، جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔'' (صحيح البخاري، المرض، حديث: 5647)

سیدنا ابوبکر اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہما کا گزر انصار کی مجلس سے ہوا جبکہ وہ رو رہے تھے۔ ان دونوں حضرات نے رونے کی وجہ پوچھی تو انصار کہنے لگے: ہمیں نبی ﷺ کا اپنے پاس بیٹھنا یاد آ رہا ہے۔ (آپ بیمار تھے) یہ سن کر وہ نبی ﷺ کے پاس گئے اور آپ کو اس بات کی اطلاع دی۔ پھر نبی ﷺ باہر تشریف لائے جبکہ چادر کے کنارے سے اپنا سر مبارک باندھا ہوا تھا۔ پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے۔ یہ آخری مرتبہ آپ کا منبر پر جلوہ افروز ہونا تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، پھر فرمایا:

«أُوصِيكُمْ بِالْأَنْصَارِ فَإِنَّهُمْ كَرِشِي وَعَيْبَتِي، وَقَدْ قَضَوُا الَّذِي عَلَيْهِمْ وَبَقِيَ الَّذِي لَهُمْ، فَاقْبَلُوا مِنْ مُّحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ»

''لوگو! میں تمھیں انصار کی بابت وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ میری جان اور جگر ہیں۔ انھوں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، البتہ ان کا حق باقی رہ گیا ہے، لہٰذا تم ان کے نیکوکار کی نیکی قبول کرو اور ان کے خطا کار سے درگزر کرو۔'' (صحيح البخاري، المناقب الأنصار، حديث: 3799)

بیماری کے ایام میں آپ سے جو خطبے منقول ہیں ان میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان کردہ خطبہ بھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ اپنے مرض وفات میں ایک پٹی سے اپنے سر کو باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر فروکش ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

«إِنَّهُ لَيْسَ مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ أَمَنَّ عَلَيَّ فِي نَفْسِهِ وَمَالِهِ مِنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِّنَ النَّاسِ خَلِيلًا لَّاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا، وَلٰكِنْ

خُلَّةُ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ، سُدُّوا عَنِّي كُلَّ خَوْخَةٍ فِي هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرَ خَوْخَةِ أَبِي بَكْرٍ»

''اپنی جان اور مال کو مجھ پر ابوبکر سے زیادہ اور کوئی خرچ کرنے والا نہیں ہے۔ اور میں لوگوں میں سے اگر کوئی دلی دوست بناتا تو یقیناً ابوبکر کو بناتا لیکن اسلامی دوستی سب سے بڑھ کر ہے۔ (دیکھو!) میری طرف سے ہر وہ کھڑکی جو اس مسجد میں کھلتی ہے، بند کر دو، صرف ابوبکر کی کھڑکی رہنے دو۔''

(صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 467)

بلاشبہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو سیدنا ابوبکر اور اہل بیت کی دشمنی کے دعویدار ہیں۔ یہ اہل بیت ہی کے ایک فرد ہیں جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کر رہے ہیں اور یہ فضیلت بھی آپ ﷺ کے امت کو آخری وعظ میں بیان ہوئی ہے۔

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللهِ، فَبَكَى أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَقُلْتُ فِي نَفْسِي: مَا يُبْكِي هٰذَا الشَّيْخَ؟ إِنْ يَكُنِ اللهُ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللهِ، فَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ هُوَ الْعَبْدَ، وَكَانَ أَبُوبَكْرٍ أَعْلَمَنَا، فَقَالَ: 'يَا أَبَابَكْرٍ! لَا تَبْكِ، إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ أَبُوبَكْرٍ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا مِّنْ أُمَّتِي لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ، وَلٰكِنْ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهُ، لَا يَبْقِيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ إِلَّا سُدَّ إِلَّا بَابُ أَبِي بَكْرٍ»

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہے یا جو اللہ کے پاس ہے اسے اختیار کرے۔ تو اس نے وہ پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے۔'' یہ سن کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ بوڑھا کس لیے روتا ہے؟ بات تو صرف یہ ہے کہ اللہ نے اپنے

ایک بندے کو دنیا یا آخرت دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرنے کا اختیار دیا ہے اور اس نے آخرت کو پسند کیا ہے۔ (تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟) مگر بعد میں یہ راز کھلا کہ بندے سے مراد خود رسول اللہ ﷺ تھے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر تم مت روو، میں لوگوں میں سے کسی کے مال اور صحبت کا اتنا زیر بار نہیں جتنا ابوبکر کا ہوں۔ اگر میں اپنی امت سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلامی اخوت و محبت ضرور ہے۔ دیکھو! مسجد میں ابوبکر کے دروازے کے سوا سب کے دروازے بند کر دیے جائیں۔''

(صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 466)

ایک روایت میں ہے کہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کی گفتگو کو سمجھ گئے تو رونے لگ پڑے اور عرض کیا: نہیں اللہ کے رسول! ہم آپ پر اپنے ماں باپ، اولاد اور اپنی جان بھی قربان کرتے ہیں، پھر آپ ﷺ منبر سے نیچے اترے اور اس کے بعد کبھی منبر پر کھڑے نہ ہوئے۔

(سنن الدارمي، المقدمه، باب وفاة النبي ﷺ: 36/1)

رسول اکرم ﷺ کے اس خطبے اور اشارے کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ آپ ہمیں الوداع کہہ رہے ہیں اور آپ کا آخری وقت قریب آ گیا ہے، اس لیے وہ رو پڑے اور ہر ممکن اپنی جانثاری کا اعلان کیا۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے ان کی تعریف فرمائی اور تمام لوگوں سے ہٹ کر آپ کو اعزاز بخشا کہ مسجد کی طرف کھلنے والی تمام کھڑکیاں اور دروازے سوائے ابوبکر صدیق کے دروازے کے بند کرا دیے۔ اس میں اشارہ تھا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے امام ہوں گے۔ اور بالفعل ایسا ہی ہوا۔ آپ ﷺ کے اہل خانہ جمع تھے اور آپ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ (وفاة الحبيب، لأحمد جاد، ص: 64) انھوں نے مشورہ کیا کہ آپ کو حبشہ سے لائی گئی ایک دوا پلائی جائے۔ یہ نمونیے کی دوا تھی جو مریض کے منہ میں ایک طرف ڈالی جاتی تھی۔ نبی ﷺ نے اشارہ کیا کہ آپ کو دوا نہ دی جائے۔ اہل خانہ سمجھے کہ مریض تو کہتا ہی ہے کہ اس نے دوا نہیں لینی، چنانچہ انھوں نے دوا آپ کے منہ میں ڈال دی۔ رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ یہاں موجود ہر بندے کے منہ دوا ڈالی جائے۔ آپ نے فرمایا:

«لَا يَبْقَى أَحَدٌ فِي الْبَيْتِ إِلَّا لُدَّ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ إِلَّا الْعَبَّاسَ، فَإِنَّهُ لَمْ يَشْهَدْ كُمْ»

''گھر میں موجود ہر شخص کے منہ میں میرے سامنے دوا ڈالی جائے سوائے عباس کے کیونکہ وہ تمھارے ساتھ شریک نہیں تھا۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4458)

رسول اکرم ﷺ نے انھیں پاک صاف کرنے کے لیے ان سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ رسول اکرم ﷺ کے حق میں خطا بڑا جرم ہے۔ آپ نے سوچا کہ رسول ﷺ کی مخالفت کی وجہ سے روز قیامت کہیں ان کا محاسبہ ہی نہ ہو جائے اس لیے ان پر رحمت کرتے ہوئے ان سے بدلہ لیا، انتقام مقصود نہیں تھا جیسا کہ کچھ لوگوں نے سمجھا ہے۔ (المواهب اللدنية بالمنح المحمديه، لزرقاني:379/3)

ایک روایت میں ہے کہ جب آپ کی تکلیف بڑھ گئی تو آپ نے فرمایا:

«هَرِيقُوا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَّمْ تُحْلَلْ أَوْكِيَتُهُنَّ لَعَلِّي أَعْهَدُ إِلَى النَّاسِ، فَأَجْلَسْنَاهُ فِي مِخْضَبٍ لِّحَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ طَفِقْنَا نَصُبُّ عَلَيْهِ مِنْ تِلْكَ الْقِرَبِ حَتّٰى طَفِقَ يُشِيرُ إِلَيْنَا بِيَدِهِ أَنْ قَدْ فَعَلْتُنَّ، قَالَتْ: ثُمَّ خَرَجَ إِلَى النَّاسِ فَصَلّٰى بِهِمْ وَخَطَبَهُمْ»

''میرے اوپر سات مشکیزے بہاؤ جن کے تسمے نہ کھولے گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ میں لوگوں کو وصیت کروں۔'' چنانچہ ہم نے آپ کو نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے ایک بڑے برتن میں بٹھا دیا، پھر ہم نے آپ پر سات مشکیزوں کا پانی بہانا شروع کیا حتی کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے ہماری طرف اشارہ فرمایا کہ تم نے تعمیل کر دی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر آپ لوگوں کی طرف تشریف لے گئے اور انھیں نماز پڑھا کر خطبہ دیا۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4442)

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو آپ اپنے چہرے پر چادر ڈالتے تھے، پھر جب سانس گھٹنے لگتا تو اسے چہرے سے ہٹا دیتے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4443)

رسول اکرم ﷺ کی سنت تھی کہ آپ صحت اور بیماری کی حالت میں خود کو دم کرتے رہتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوتے تو معوّذات سے اپنے بدن پر دم کرتے اور اپنا ہاتھ اپنے بدن پر پھیرتے تھے۔ جب آپ اس بیماری میں مبتلا ہوئے جس میں آپ کی وفات ہوئی تو میں معوّذات پڑھ کر آپ پر دم کرتی تھی جس طرح آپ کرتے تھے، پھر نبی ﷺ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4439)

ایک روایت میں ہے کہ اس بیماری میں آپ اس زہر کے اثرات بھی محسوس کرتے تھے جو ایک یہودی عورت نے فتح خیبر کے موقع پر آپ کے کھانے میں ملا کر آپ کو شہید کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے جس بیماری میں وفات پائی، اس میں فرماتے تھے:

«يَا عَائِشَةُ! مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ، فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِي مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ»

''اے عائشہ! اس کھانے کا درد میں برابر محسوس کر رہا ہوں جو میں نے غزوۂ خیبر کے وقت کھایا تھا۔ اس وقت میں اس زہر کے سبب اپنی شہ رگ کٹتی ہوئی محسوس کرتا ہوں۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4428)

آخری ایام میں جب آپ ﷺ کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو لوگ بالخصوص قریبی ساتھی آپ کے گھر والوں کے پاس سلام کے لیے اور تسلی دینے کے لیے حاضر ہوتے اور جو گھر نہ آتا، وہ آپ کے پاس سے ہو کر جانے والے سے رسول اکرم ﷺ کا حال دریافت کر لیتا۔ ایک دن سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے باہر آئے جبکہ آپ مرض وفات میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے پوچھا: اے ابوالحسن! رسول اللہ ﷺ اب کیسے ہیں؟ انھوں نے کہا: الحمدللہ اب اچھے ہیں۔ سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اللہ کی قسم! تم تین (دن) کے بعد محکوم اور لاٹھی کے غلام بن جاؤ گے کیونکہ اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب آپ اس مرض سے وفات پا جائیں گے۔ میں بنومطلب کے چہرے ان کی موت کے وقت پہچانتا ہوں۔ آؤ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر اس امر کے متعلق دریافت کریں کہ آپ کے بعد کون

آپ کا خلیفہ ہوگا؟ اگر آپ نے ہم لوگوں کو خلافت دی تو معلوم ہو جائے گا اور اگر آپ نے کسی دوسرے کو خلافت سونپی تو بھی معلوم ہو جائے گا اور تب آپ ہمارے متعلق حسن سلوک کی اسے وصیت فرمائیں گے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم اگر ہم نے آپ سے اس امر سے متعلق دریافت کیا اور آپ نے ہمیں محروم فرما دیا تو آپ کے بعد لوگ ہمیں کبھی خلیفہ نامزد نہیں کریں گے۔ اللہ کی قسم! میں تو رسول اللہ ﷺ سے خلافت کے متعلق سوال نہیں کروں گا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4447)

یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے محسوس کر لیا تھا کہ رسول اکرم ﷺ اس بیماری سے جانبر نہیں ہوسکیں گے۔ اور آپ کی وفات کے بعد اہل بیت کے بارے میں بھی خوف زدہ تھے۔ نیز معلوم ہوا کہ انھیں اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اس بارے میں رسول اکرم ﷺ سے پوچھنا چاہتے تھے لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس خدشے کے پیش نظر یہ تجویز رد کر دی کہ اگر آپ نے منع کر دیا تو لوگ ہمیں کبھی اقتدار میں شریک نہیں کریں گے۔

اس سے یہ بھی پتا چلا کہ خلافت کا واضح حکم سیدنا عباس یا سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں سے کسی ایک کے لیے بھی نہ تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ایک نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن آپ کے پاس موجود لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آیا اور گھر میں کچھ لوگ موجود تھے تو نبی ﷺ نے فرمایا: «هَلُمُّوا أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَّا تَضِلُّوا بَعْدَهُ»

''آؤ میں تمھیں ایسی دستاویز لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے۔''

بعض حضرات نے کہا: رسول اللہ ﷺ پر بیماری کا غلبہ ہے جبکہ تمھارے پاس قرآن مجید موجود ہے اور اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے، چنانچہ گھر والوں میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا جس کی بنا پر وہ جھگڑنے لگے۔ ان میں سے کچھ کہتے تھے کہ کاغذ اور دوات کو آپ کے قریب کر دیا جائے تاکہ تمھارے لیے ایسی دستاویز لکھ دیں جس کے بعد گمراہی کا اندیشہ نہ رہے جبکہ کچھ حضرات اس کے خلاف تھے۔ جب لوگوں کی بے فائدہ باتیں زیادہ ہونے لگیں اور اختلاف کا آغاز ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔'' عبیداللہ کہتے ہیں

کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: یہ کیسی مصیبت ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تحریر کرنے کے درمیان ان کی بے فائدہ گفتگو اور اختلاف کے سبب حائل ہوئی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4432)

ایک دوسری روایت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے وضاحت مروی ہے کہ آپ کیا لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے جمعرات کے دن کا ذکر کیا اور فرمایا تمھیں معلوم بھی ہے کہ جمعرات کے دن کیا ہوا تھا؟ اس دن رسول اللہ ﷺ کے مرض میں شدت پیدا ہوئی۔ اس وقت آپ نے فرمایا:

«اِئْتُونِي أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَّنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا»

''تم میرے پاس آؤ، میں تمھیں کوئی دستاویز لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی صحیح راستے کو نہ چھوڑو گے۔''

لیکن وہاں اختلاف ہوگیا، حالانکہ نبی ﷺ کے سامنے اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا: آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ شدتِ مرض کی وجہ سے بے معنی کلام کر رہے ہیں؟ آپ سے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا:

«دَعُونِي فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِّمَّا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ'، وَأَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ، قَالَ: 'أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ، وَأَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ'، وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ - أَوْ قَالَ: فَنَسِيتُهَا -»

''جاؤ، میں جس کام میں مشغول ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو۔'' اس کے بعد آپ نے صحابۂ کرام کو تین چیزوں کی وصیت فرمائی: آپ نے فرمایا: ''مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ آنے والے وفود کی اسی طرح خاطر تواضع کرنا جس طرح میں کرتا آیا ہوں۔'' تیسری بات کو راوی نے بیان نہیں کیا یا اس نے کہا کہ میں تیسری بات بھول گیا ہوں۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4431)

اس روایت سے جس کے راوی اہل بیت کے ایک عالم ہیں، واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کیا وصیت کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ وصیت کا موضوع کم از کم خلافت نہیں تھا۔ اس سے سیدنا علی یا ابوبکر رضی اللہ عنہما میں کسی ایک کی تعیین نہیں ہوتی۔ اگر آپ کسی ایک کو نامزد کرنا چاہتے تو وفات کے آخری لمحات تک بھی کر دیتے

اور اس اہم معاملے کا بار بار ذکر کرتے۔ دیگر روایات سے یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس کے بعد آپ نے ایک سے زائد بار خطبہ دیا اور ان خطبوں میں اس معاملے کا اشارہ تک نہیں کیا، حالانکہ اس کا امکان تھا اور آپ بآسانی ایسا کر سکتے تھے۔

خصوصاً اس کے بعد بھی آپ نے ایسے معاملات کے بارے میں گفتگو کی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا دوسرے کے لیے وصیت کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک نہایت معمولی نوعیت کے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں مجھ سے فرمایا:

«اُدْعِي لِي أَبَا بَكْرٍ أَبَاكِ وَأَخَاكِ، حَتَّى أَكْتُبَ كِتَاباً، فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَمَنَّى مُتَمَنٍّ وَيَقُولُ قَائِلٌ: أَنَا أَوْلَى وَيَأْبَى اللهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ»

''اپنے والد ابوبکر اور اپنے بھائی کو میرے پاس بلاؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھ دوں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا خواہش کرے اور کہنے والا کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حق دار ہوں، جبکہ اللہ ابوبکر کے سوا کسی پر راضی نہیں ہوگا اور اہل ایمان بھی اس کے سوا کسی کو قبول نہیں کریں گے۔''(صحيح مسلم، فضائل الصحابة، حديث: 2387)

اس کے باوجود یہ بات حتمی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے وصیت نہیں لکھی۔ اس حدیث اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث کے درمیان تطبیق بھی ممکن ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق جس وصیت کا آپ نے ارادہ کیا اور لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے اسے لکھوانا ترک کر دیا اس کا اظہار حدیث عائشہ میں دوسرے موقع پر کیا کہ میں ابوبکر کی نامزدگی کو تحریری شکل دینا چاہتا ہوں، خصوصاً لوگوں کی امامت ان کے سپرد کرنا اس کی قوی دلیل ہے۔ لیکن امت اس امر پر متفق ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کی حتمی نامزدگی ثابت نہیں۔

اس بات کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی وفات سے پہلے کم و بیش سترہ نمازیں پڑھائیں اور ان میں سے پہلی نمازِ عشاء تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ

کی بیماری کی شدت بڑھ گئی تو آپ نے پوچھا: ''کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟'' ہم نے عرض کیا: نہیں اللہ کے رسول! وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ رسول اکرم نے فرمایا: ''ٹب میں پانی ڈالو۔'' ہم نے ایسا ہی کیا۔ وہ فرماتی ہیں: آپ نے غسل کیا، پھر اٹھنے کی کوشش کی تو بے ہوش ہو کر گر گئے، پھر افاقہ ہوا تو آپ نے فرمایا: ''کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟'' ہم نے عرض کیا: نہیں، اللہ کے رسول! وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ لوگ مسجد میں عشاء کی نماز کے لیے بیٹھے ہوئے نبی اکرم ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بڑے نرم دل انسان تھے، پھر ان دنوں میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 652/4، وكنوز السنة لعثمان الخميس، ص: 421)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مجھے ایک تختی لانے کا حکم دیا تاکہ آپ اس پر ایک تحریر لکھ دیں جس کی وجہ سے آپ کے بعد آپ کی امت گمراہ نہ ہو۔ مجھے ڈر گزرا کہ کہیں رہ نہ جائے تو میں نے عرض کیا: آپ بتائیے میں اسے اچھی طرح رکھوں گا۔ آپ نے فرمایا:

«أُوصِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ»

''میں نماز کی (حفاظت کی) وصیت کرتا ہوں، زکاۃ ادا کرنے کی تاکید کرتا ہوں اور جو تمھارے ماتحت غلام ہیں ان سے حسن سلوک کو ضروری قرار دیتا ہوں۔''

(السيرة النبوية للذهبي، ص: 557، وذهول العقول بوفاة الرسول، لأبي تراب الظاهري، ص: 33)

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے: یہ کلمات آپ کے سینے میں گونج رہے تھے اور زبان ادا کرنے سے قاصر تھی۔ (سنن ابن ماجة، الجنائز، حديث: 1625، وذهول العقول بوفاة الرسول، ص: 33)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهِ»

''تم میں سے کوئی شخص صرف اس حال میں فوت ہو کہ وہ اپنے رب کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہو۔''

(مسند أحمد: 326/3)

رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا آخری دن

رسول اکرم ﷺ کی وفات 12 ربیع الاول 11 ہجری بمطابق 8 جون 633 عیسوی کو ہوئی۔ گرمیوں کا موسم تھا اور چاشت کے وقت آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (أزمنة التاريخ الإسلامي، ص: 29)

رسول اکرم ﷺ وفات سے تین دن پہلے تک نماز پڑھاتے رہے، یعنی جمعہ، ہفتہ اور اتوار آپ نے مسلمانوں کی جماعت نہیں کرائی، حالانکہ آپ کا حجرہ مبارک مسجد سے ملحق تھا اور اس کا حصہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ پیر کی جس صبح آپ فوت ہوئے اس روز آپ نے نماز فجر کے وقت صحابۂ کرام کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز پڑھتے دیکھا تو اطمینان محسوس کیا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسلمان سوموار کے دن نماز فجر میں تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ ظاہر ہوئے۔ آپ نے سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کا پردہ اٹھایا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف دیکھا، جبکہ وہ دورانِ نماز میں صفیں باندھے ہوئے تھے۔ آپ مسکراتے ہوئے ہنس پڑے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایڑیوں کے بل پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ صف میں شامل ہو جائیں، انھوں نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریب تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی صحت یابی کی خوشی میں نماز ہی توڑ دیتے، تاہم آپ نے ان کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا کہ تم اپنی نماز پوری کرو، پھر آپ حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور پردہ لٹکا لیا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4448)

یہ مسلمانوں کی رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آخری ملاقات تھی، اس کے بعد چند لوگوں ہی نے شرف دیدار حاصل کیا۔ ان خوش نصیبوں میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو آپ کی بیماری کے ایام میں سخ کی رہائش چھوڑ کر رسول اکرم ﷺ کے پڑوس میں مقیم ہو گئے تھے۔ سخ میں ان کا دوسرا گھر تھا، جہاں ان کی دوسری بیوی رہتی تھی۔

جس دن رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی، اس روز سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیوی بچوں کا حال دریافت کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے سخ جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ وہیں تھے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات ہو گئی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 654/4، وصحيح البخاري، المغازي، حديث: 4452)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے رسالت مآب صاحب کے گھر آنے اور آپ سے ملاقات کرنے کا جو واقعہ ذکر کیا ہے شاید وہ بھی اسی آخری دن کے حوالے سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جس روز رسول اکرم ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور آپ بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے، اس روز سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آہ! ابا جان کی تکلیف۔ آپ نے ان سے فرمایا:

«لَيْسَ عَلَى أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ»

''آج کے بعد تمھارے باپ کی بے چینی نہیں رہے گی۔'' (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4462)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا تھا کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہے اور اس کے بعد آپ دنیا میں نہیں رہیں گے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیماری کے ایام میں نبی ﷺ کو دم کرتی تھیں۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4439)

ممکن ہے کہ آخری روز جب بیماری نے شدت اختیار کی ہو تو بھی انھوں نے دم کیا ہو۔

بعض صحابۂ کرام نے آپ کا آخری کلام بھی نقل کیا ہے، ہوسکتا ہے یہ بھی آپ نے وفات کے روز ہی فرمایا ہو۔ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا آخری کلام یہ تھا:

«أَخْرِجُوا يَهُودَ أَهْلَ الْحِجَازِ وَأَهْلَ نَجْرَانَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَاعْلَمُوا أَنَّ شِرَارَ النَّاسِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»

''نجران اور حجاز کے یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ اور جان لو کہ سب سے برے لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' (مسند أحمد: 195/1)

یہ فرمان ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اعتبار سے آخری ہے کہ انھوں نے آخری فرمان یہی سنا جبکہ دیگر صحابہ نے ان کے بعد اس کے علاوہ بھی سنا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کو آخر میں ملنے والوں میں سے تھے اور پھر مملکت اسلامیہ کی تعمیر و ترقی میں ان کا کردار کسی سے مخفی نہیں۔ اسی طرح آپ نے یہودیوں کو جزیرہ عرب سے

نکالنے کا حکم دیا کیونکہ ان کی شر انگیزیوں کی وجہ سے ان سے مسلسل خطرات لاحق تھے۔

اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ آپ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے بھی شدید نفرت کرتے تھے اور سختی سے منع کرتے تھے کیونکہ یہ شرک اکبر ہے۔ جب انبیاء کی قبروں پر ایسا کرنا حرام ہے تو کسی دوسرے کی قبر پر بالاولیٰ ناجائز ہوگا۔ اس معاملے کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے دنیا سے جاتے ہوئے بھی اس بارے میں تنبیہ فرمائی۔

آپ ﷺ کو ڈر تھا کہ کہیں میری امت بھی میری قبر کے ساتھ وہی کچھ نہ کرے جو سابقہ امتوں، یعنی یہود ونصاریٰ نے اپنے انبیاء کی قبروں کے ساتھ کیا۔

قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی مزید قباحت سیدہ عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں: جب نبی ﷺ کا مرض شدت اختیار کر گیا تو آپ اپنی چادر کھینچ کر بار بار اپنے چہرے پر ڈالتے تھے، پھر جب دم گھٹنے لگتا تو چہرے سے ہٹا دیتے اور اسی شدت کے عالم میں فرماتے:

«لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»

''یہودیوں اور عیسائیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4444)

آپ کا مقصد ان کے اس فعل کی مذمت کرنا اور اپنی امت کو اس سے خبردار کرنا تھا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیں گے تو آپ کی قبر کھلی جگہ پر ہوتی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4441) اس لیے جس نے کسی بھی قبر کو سجدہ گاہ بنایا اس نے اللہ کے رسول کی نافرمانی اور آپ کے حکم کی مخالفت کی۔

مسواک

رسول اکرم ﷺ زندگی بھر مسواک کے اس قدر شوقین رہے کہ مسواک سائے کی طرح ہر وقت آپ کے

پاس رہتی۔ آپ خود اہتمام کے ساتھ مسواک کرتے اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیتے۔ آپ سفر و حضر میں ہر وضو اور نماز کے ساتھ مسواک کرتے اور امت کو بھی اس کی ترغیب دلائی۔ آپ ﷺ کے آخری لمحات میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے مسواک لے کر استعمال کی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی آمد اور رسول اکرم ﷺ کے مسواک کرنے کا واقعہ یوں نقل کرتی ہیں:

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نبی ﷺ کے پاس آئے، جبکہ میں آپ کو اپنے سینے کا سہارا دے کر بیٹھی تھی۔ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے پاس تازہ مسواک تھی جس سے وہ اپنے دانتوں کو صاف کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اسے دیر تک دیکھتے رہے۔ میں نے وہ مسواک (ان سے) لے کر چبائی اور اسے جھاڑ کر صاف اور نرم کیا، پھر نبی ﷺ کو پیش کی تو آپ نے اس سے اپنے دانتوں کو صاف کیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی رسول اللہ ﷺ کو ایسے اچھی طرح مسواک کرتے نہیں دیکھا، پھر مسواک سے فارغ ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ یا انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا: «فِي الرَّفِيقِ الْأَعْلَى» ''اے اللہ! میں اچھے رفقاء کی رفاقت چاہتا ہوں۔'' پھر آپ وفات پا گئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ آپ ﷺ کی وفات میرے سینے اور ٹھوڑی کے درمیان ہوئی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4438)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات پر فخر کرتی تھیں کہ آخری لمحات میں میرا لعاب رسول اکرم ﷺ کے لعاب مبارک کے ساتھ مل گیا۔ اور وہ اسی مسواک کی بدولت تھا۔ وہ فرماتی ہیں: اس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا کے آخری دن اور آخرت کے پہلے دن میرے لعاب دہن اور آپ ﷺ کے لعاب دہن کو جمع کر دیا۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4451)

وفات سے قبل رسول اکرم ﷺ کا گلہ بیٹھ گیا اور آواز بھاری ہوگئی تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے آپ کی مرضِ وفات میں سنا، جبکہ آپ کا گلہ بیٹھ گیا تھا، آپ یہ پڑھتے تھے:

﴿ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾

''ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔'' (النسآء 69:4) میں سمجھ گئی کہ اب آپ کو اختیار

دیا گیا ہے۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4435)

رسول اکرم ﷺ حالت صحت میں بیان فرمایا کرتے تھے: «إِنَّهُ لَمْ يُقْبَضْ نَبِيٌّ حَتّٰى يَرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ» ''کوئی نبی فوت نہیں ہوتا حتی کہ وہ اپنی جگہ جنت میں دیکھ لیتا ہے، پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے۔'' چنانچہ جب آپ ﷺ کی وفات قریب ہوئی اور آپ کا سر مبارک میری ران پر تھا تو آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ پھر افاقہ ہوا تو آپ نے گھر کی چھت کی طرف نظر جما دی، پھر آپ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلٰى» ''اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ کا طلبگار ہوں۔'' میں نے کہا: اب ہمیں اختیار نہیں کریں گے۔

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4463)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے آخری کلمات: «اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلٰى» تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کا سر مبارک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ وہ فرماتی ہیں: نبی اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کا سر میری ہنسلی اور ٹھوڑی کے درمیان تھا۔ نبی ﷺ کی موت کی شدت دیکھنے کے بعد اب میں کسی کے لیے بھی نزع کی شدت کو برا نہیں سمجھتی۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4446)

یہ بات یقینی ہے کہ آپ آخری لمحات میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ وہ فرماتی ہیں: وفات سے کچھ پہلے نبی اکرم ﷺ پشت سے ان کا سہارا لیے ہوئے تھے، اس نے کان لگا کر سنا کہ نبی ﷺ دعا کر رہے ہیں:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَأَلْحِقْنِي بِالرَّفِيقِ الْأَعْلٰى»

''اے اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم فرما اور میرے بلند مرتبہ رفیقوں سے مجھے ملا۔''

(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4440)

ایک روایت میں ہے کہ آپ میرے سینے سے ٹیک لگائے ہوتے تھے۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4459) جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ آپ کا سر مبارک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ران پر تھا۔ ان روایات میں تضاد نہیں ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پہلے سر مبارک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ران پر تھا، پھر انھوں نے آپ کے سر مبارک کو اپنے سینے اور گردن کے درمیان کر لیا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی ایک روایت میں ہے: آپ کے سامنے چمڑے یا لکڑی کا ایک بڑا پیالہ تھا..... اس

پیالے میں پانی تھا۔ آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ مبارک بار بار اس پانی والے برتن میں داخل کرتے اور انھیں تر کر کے اپنے چہرۂ انور پر پھیرتے اور فرماتے: ''لا الہ الا اللہ، موت کی بڑی سختیاں ہوتی ہیں۔'' پھر آپ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ''اے اللہ! مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے۔'' حتی کہ آپ کی روح مبارک پرواز کر گئی اور آپ کا ہاتھ نیچے جھک گیا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4449، والسيرة النبوية لابن هشام: 655/4)

رسول اکرم ﷺ جسمانی ڈیل ڈول کے لحاظ سے بھی نہایت خوبصورت تھے۔ آپ کی یہ خوبصورتی وفات تک قائم رہی۔ باوجود اس کے کہ آپ پندرہ دن شدید بیمار رہے لیکن آپ کے حسن میں کوئی فرق نہیں آیا اور بیماری آپ کے حسن و جمال پر ذرہ بھی اثر انداز نہ ہوئی۔ (وفاة الحبيب، لأحمد جاد، ص: 117)

اس پر مستزاد یہ کہ آپ پر بڑھاپے اور کمزوری کے آثار بھی نمایاں نہیں تھے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کے سر اور داڑھی میں گنتی کے بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔ (صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3547)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نو جوان تھیں۔ انھوں نے اس سے پہلے کسی کو فوت ہوتے نہ دیکھا تھا اور نہ انھیں اس کا تجربہ ہی تھا۔ وفات کے وقت جب نبی ﷺ کا سر مبارک ایک طرف جھک گیا تو آپ کے منہ سے ایک ٹھنڈا قطرہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سینے پر گرا۔ وہ فرماتی ہیں: ..... میں رسول اکرم ﷺ کی تیمار داری کرتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی تیمار داری نہیں کی تھی۔ ایک دن آپ کا سر مبارک میرے کندھے پر تھا تو آپ کا سر میرے سر کی طرف جھک گیا۔ میں سمجھی کہ آپ کو میرے سر سے کوئی سروکار ہے۔ اس دوران آپ کے منہ سے ٹھنڈے لعاب کا ایک قطرہ میرے سینے پر گرا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھی آپ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ میں نے آپ کو کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ اس دوران سیدنا عمر اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما تشریف لائے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے انھیں اجازت دے دی اور جلدی سے پردہ کر لیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے: ہائے آپ کی بے ہوشی! رسول اکرم ﷺ پر اس قدر شدید بے ہوشی!! پھر وہ دونوں چلے گئے۔ جب دروازے کے قریب پہنچے تو مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: عمر! اللہ کے رسول فوت ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا: تو غلط کہتا ہے بلکہ تو فتنے کا شکار ہو گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ اس وقت

تک فوت نہیں ہوں گے جب تک اللہ تعالیٰ منافقین کو تباہ نہ کر دے.....(مسند أحمد: 220,219/6)

سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے انھیں اپنی جگہ لوگوں کی امامت پر مامور فرمایا۔ لوگوں نے بھی انھیں نماز اور دیگر امور میں اپنا نائب ہی سمجھا۔ نبی ﷺ کی وفات کے وقت وہ سخ کے مقام پر اپنی بیوی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ یہ مقام مدینہ کے قریب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ رسول اکرم ﷺ فوت ہوئے تو لوگوں نے فوراً سیدنا ابوبکر صدیق کو بلایا۔ وہ گھوڑے پر سوار جلدی جلدی تشریف لائے اور کسی سے بات کیے بغیر سیدھے اپنی بیٹی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں داخل ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک سے کپڑا اٹھایا اور رسول اکرم ﷺ کو دیکھ کر پڑھا: إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. رسول اکرم ﷺ فوت ہوگئے، پھر آپ ﷺ کے سر کی طرف آئے اور آپ کو پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا: ہائے نبی مکرم! پھر آپ کے سر کا بوسہ لیا اور کہا: ہائے برگزیدہ ہستی، پھر بوسہ لیا اور کہا: ہائے میرے خلیل! اللہ کے رسول تو وفات پا گئے۔ (مسند أحمد: 220/6) امام بخاری نے صدیق اکبر کا رسول اکرم ﷺ کا بوسہ لینے کا کئی احادیث میں اشارہ کیا ہے، پھر فرمایا: اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا، بہر حال ایک موت جو آپ کے لیے لکھی جا چکی وہ تو ہو چکی۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4453,4452)

مسجد نبوی لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لوگ رسول اکرم ﷺ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ لوگوں کی محبت کا عالم یہ تھا کہ بعض لوگ تو مسجد چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی وفات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ غم و غصے سے بآواز بلند کہہ رہے تھے: اللہ کے رسول اس وقت تک فوت نہیں ہو سکتے جب تک اللہ تعالیٰ منافقین کو تباہ نہ کر دے۔

(مسند أحمد: 220/6، والسيرة النبوية، لابن هشام: 455/4)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے سے نکل کر مسجد تشریف لائے۔ جب لوگوں نے انھیں دیکھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تا کہ ان کی بات سنیں۔ عمر رضی اللہ عنہ مسلسل گفتگو کیے جا رہے تھے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما جو اس واقعہ کے وقت موجود تھے، بیان کرتے ہیں: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جب آئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! بیٹھ جاؤ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بیٹھنے

سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے۔ آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا: تم میں سے جو بھی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ کی وفات ہو چکی ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: ''محمد (ﷺ) صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں ..... اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔'' (آل عمران 144:3) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا محسوس ہوا جیسے پہلے لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی ہے اور جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی تلاوت کی تو اب سب لوگ اس آیت کو ان سے لے رہے ہیں۔ اب تو یہ حال تھا کہ میں جس شخص کو بھی سنتا وہی اس کی تلاوت کر رہا ہوتا۔ سیدنا سعید بن مسیّب نے کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا کہ نبی ﷺ کی وفات ہو گئی ہے۔ میں تو سکتے میں آ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں لڑکھڑانے لگی ہیں اور میں زمین پر گر جاؤں گا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4454)

اس سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دانائی اور فقاہت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ یقیناً وہ صاحب رائے اور نہایت قابل آدمی تھے۔ انھیں قرآن نہ صرف سب سے زیادہ یاد تھا بلکہ استحضار بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے جب صدیق اکبر کی زبان سے یہ آیت سنی تو انھیں یوں محسوس ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ لوگ مسجد سے نکلے تو مدینہ کی گلیوں میں ان کی زبان پر یہی آیت تھی گویا کہ صرف یہی آیت اتری ہے۔ (المواهب اللدنية للقسطلاني، ص: 391) کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ شدت صدمہ سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ ان کی زبان جیسے بند ہو گئی ہو۔ خاموشی سے کبھی اُدھر جاتے اور کبھی ادھر۔

(الروض الأنف للسهيلي: 468/4)

جہاں تک آپ کی لخت جگر سیدۃ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا تعلق ہے تو آپ کی بیٹیوں میں وہ اکیلی ہی رہ گئی تھیں، اس لیے وہ شدید صدمے سے دوچار ہوئیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نبی ﷺ نے انھیں اپنی وفات سے پیشگی ہی آگاہ کر دیا تھا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی وفات کے وقت ان کے جذبات کا ذکر کرتے

ہوئے کہتے ہیں:

جب نبی ﷺ سخت بیمار ہوئے اور آپ پر غشی طاری ہوئی تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہائے میرے والد کو سخت تکلیف ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: «لَيْسَ عَلَى أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ» ''(اے فاطمہ!) آج کے بعد تمھارے والد کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' پھر جب آپ ﷺ وفات پا گئے تو سیدہ فاطمہ نے فرمایا: اے میرے ابا جان! جس نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اے میرے ابو جان! جنت الفردوس آپ کا ٹھکانا ہے۔ اے والد گرامی! ہم حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ کے انتقال کی خبر دیتے ہیں، پھر جب آپ کو دفن کر دیا گیا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے انس! تمھارے دل رسول اللہ ﷺ پر مٹی ڈالنے کے لیے کیونکر آمادہ ہوئے تھے؟ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4462)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو رسول اکرم ﷺ کے خادم خاص اور شب و روز آپ کے ساتھ گزارنے والے تھے۔ وہ رسول اکرم ﷺ کی وفاتِ پُر ملال پر صدمے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے تو اس کی ہر چیز روشن ہوگئی، پھر جب وہ دن آیا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو اس کی ہر چیز تاریکی میں ڈوب گئی اور ابھی ہم نے آپ کے دفن سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہمارے دلوں کی کیفیت بدل گئی۔ (جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3618)

رسول اکرم ﷺ کا ہر محبّ آپ کی وفات کے سانحہ سے بکھر سا گیا تھا۔ ام ایمن جو رسول اکرم ﷺ کی آیا اور پرورش کرنے والی تھیں۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئیں تو رسول اکرم ﷺ ان کا بہت خیال رکھتے اور ان کو گھر جا کر ملتے۔ جب رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوگئی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے ملنے کا ارادہ کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آئیں سیدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کی طرف چلیں، انھیں مل آئیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ ان سے ملنے جاتے تھے۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو وہ رو دیں۔ ان دونوں نے ان (ام ایمن رضی اللہ عنہا) سے کہا: آپ کس بات پر روتی ہیں؟ جو اللہ کے پاس ہے، اس کے رسول ﷺ کے لیے وہ بہتر ہے۔ وہ کہنے لگیں: میں اس لیے نہیں روتی کہ مجھے علم نہیں کہ جو اللہ کے پاس ہے، اس کے رسول ﷺ کے لیے وہی بہتر ہے بلکہ میں اس لیے روتی ہوں کہ آسمان سے وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ان دونوں کو بھی رلا دیا، وہ

دونوں بھی ان کے ساتھ رونے لگ گئے۔ (صحيح مسلم، فضائل الصحابة، حديث: 2454)

سیدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے درحقیقت روئے زمین کے تمام انسانوں کے احساسات کی ترجمانی کی کیونکہ ہر آدمی ہی وحی الٰہی اور ہدایات نبوی کا محتاج ہے۔ آپ ﷺ کی وفات سے زمین و آسمان کا وہ رابطہ ختم ہوگیا جو رحیم و شفیق اور معلم اور مربی نبی کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان تھا۔ آپ کی وفات سے یہ براہ راست تعلق ختم ہوگیا۔ سب لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کی جدائی کا غم تھا اور وہ ایک دوسرے سے تعزیت کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ پر پہنچے تو مسجد لوگوں کی آہ و بکا اور سسکیوں سے گونج اٹھی۔ اور رسول اکرم ﷺ کی تدفین کے بعد سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہنا چھوڑ دی۔

(المواهب اللدنيه بالمنح المحمدية: 392/3)

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ میری وفات کے بعد میرے بارے میں ایک دوسرے سے تعزیت کریں گے۔'' لوگوں نے کہا: اس کا کیا مطلب ہوا؟ جب رسول اکرم ﷺ فوت ہوگئے تو ہم ایک دوسرے کو ملتے تو رسول اکرم ﷺ کی وفات کی ایک دوسرے سے تعزیت کرتے۔

(مجمع الزوائد للهيثمي: 38/9، والسلسلة الضعيفة للألباني، حديث: 1983)

رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان پر غور کرو:

«إِذَا أُصِيبَ أَحَدُكُمْ بِمُصِيبَةٍ فَلْيَذْكُرْ مُصِيبَتَهُ بِي فَإِنَّهَا أَعْظَمُ الْمَصَائِبِ»

''جب تم میں سے کسی پر مصیبت آئے تو وہ میری وفات کی مصیبت کو یاد کر لے، یہ سب سے بڑی مصیبت اور آزمائش ہوگی۔'' (السلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 1106)

شیخ محمد غزالی رسول اکرم ﷺ کی وفات کی اندوہ ناک خبر کے مدینہ طیبہ میں پھیلنے کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

نبی ﷺ کی وفات کی خوفناک خبر غمزدہ گھر سے اس طرح نکلی کہ کان اس سے بجنے لگے۔ سانسیں تھم گئیں۔ ایک بوجھ تھا کہ ناتواں کندھے اسے سہارنے سے قاصر ہوگئے۔ نگاہیں پتھرا گئیں اور غور وفکر کی تمام صلاحیتیں جواب دے گئیں۔ اہل ایمان کو یوں لگا کر مدینہ کے درودیوار اور فضائیں تاریک ہوگئیں ہیں۔ اس دلی صدمے

نے انھیں اس قدر پریشان کر دیا کہ انھیں سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کریں۔(فقه السيرة لمحمد الغزالی، ص: 519)

تمام مسلمان سانحۂ ارتحال کی وجہ سے شدید صدمے سے دوچار تھے۔خصوصاً اہل مدینہ کے لیے یہ قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا لیکن درج ذیل ارشاد باری سے ان کی ڈھارس بندھ جاتی تھی:

﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ ﴾

''اور یقیناً تمھارے لیے آخرت، دنیا سے بہت بہتر ہے۔اور یقیناً جلد تمھارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔''(الضحٰی 93:4,5)

وہ ایمان رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات رسول اکرم ﷺ کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور آپ کا ٹھکانا جنت الفردوس ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے آپ سے حوض کوثر کا وعدہ کر رکھا ہے۔لیکن اس سب کے باوجود پوری امت آپ کی جدائی سے غمزدہ اور پریشان تھی۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو کئی عرب قبائل مرتد ہوگئے۔ یہودی اور عیسائی متحرک ہوگئے اور منافقوں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا اور رسول اکرم ﷺ کی جدائی پر مسلمانوں کا حال اس بکری کی طرح ہوگیا جو سردرات میں بارش سے بھیگ جائے۔ مسلمان اس کیفیت سے اس وقت نکلے جب اللہ تعالیٰ نے انھیں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جمع کر دیا۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 665/4)

یہ بات ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بطور میراث ایک درہم و دینار بھی نہ چھوڑا تھا۔سیدنا عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ترکے میں کوئی درہم و دینار چھوڑا اور نہ کوئی غلام ولونڈی۔ ہاں ایک سفید خچر تھی جس پر آپ سوار ہوتے تھے اور اسلحہ تھا۔اور جہاں تک زمین کا تعلق ہے تو وہ آپ نے مسافروں کے لیے صدقہ کر دی تھی۔(صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4461)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار غلہ خریدا اور اس کے بدلے لوہے کی ایک زرہ گروی رکھی۔(صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2068)

ایک روایت میں ہے کہ آپ کی وفات کے وقت آپ کی زرہ تیس صاع جو کے عوض گروی رکھی ہوئی تھی۔

(صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 2916)

آپ ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں فرماتے تھے:

«مَا لِي وَلِلدُّنْيَا؟ مَا مَثَلِي وَمَثَلُ الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ سَارَ فِي صَائِفٍ فَاسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا»

''میرا دنیا سے کیا تعلق۔ میری اور دنیا کی مثال تو اس سوار کی طرح ہے جو گرمی کے موسم میں چلا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے کسی سایہ دار درخت کے نیچے ٹھہر گیا، پھر اسے چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔'' (مسند أحمد:302/1)

نبی ﷺ کو مال جمع کرنے کی حرص تھی نہ ورثاء کے لیے اکٹھا کرنے کی فکر اور آپ امت کو بھی اس طرز زندگی سے ڈراتے تھے جس میں مال کی ہوس ہو۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّكُمْ مَّالُ وَارِثِهِ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَّالِهِ»

''تم میں سے کسے اس کے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پسند ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو اپنا ہی مال پسند ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنَّ مَالَهُ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهِ مَا أَخَّرَ»

''بلاشبہ آدمی کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا، یعنی اس کی راہ میں خرچ کر دیا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا وہ وارث کا مال ہے۔'' (صحيح البخاري، الرقاق، حديث: 6442)

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ، إِنَّمَا يَأْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ مِّنْ هٰذَا الْمَالِ»

''ہمارے (ترکہ میں) وراثت جاری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے، البتہ آل محمد کے اخراجات اسی مال سے پورے کیے جائیں۔''

(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3712)

یہ بات معروف ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کی آل کے لیے صدقہ کھانا حرام ہے تو پھر ان کے لیے یہ صدقہ

کیسے جائز ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ خمس میں سے کھائیں گے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات سے لے کر عصر حاضر تک ہر دور میں شعراء بڑی سنجیدگی سے آپ کی مدحت اور موت کے دل گداز تذکرے کرتے چلے آرہے ہیں۔ شاید ان میں سب سے سچا تذکرہ سیدنا حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ملتا ہے۔ انھوں نے آپ کی حیات مبارکہ میں آپ کی مدحت وثناخوانی کی اور آپ کی وفات کے پرحسرت لمحات کو بھی بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ وہی اس کے موجد ہیں۔

رسول اکرم ﷺ سے متعلق ان کا قصیدہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 4/666-669)

رسول اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین اور تدفین

رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ موٹی چادر زیب تن کیے ہوئے تھے۔ سیدنا ابوبردہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یمن کی بنی ہوئی ایک موٹی ازار (تہمد) اور ایک کمبل ان کمبلوں میں سے جسے وہ ملبدہ کہتے ہیں ہمیں نکال کر دکھائے۔ اور ایک روایت میں ہے، انھوں نے فرمایا: اسی کپڑے میں رسول اکرم ﷺ کی روح قبض ہوئی تھی۔ (صحيح البخاري، فرض الخمس، حديث: 3108)

رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مسلمان آپ کے حجرے کے آس پاس جمع ہوگئے اور گھر میں آپ کے قریبی مرد حضرات آگئے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کو چادر سے ڈھانپ کر باہر آگئیں۔ انھوں نے آپ کے حجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ تمام مسلمانوں کو خبر ہونے تک آپ کا جسم اطہر اسی طرح رہا۔ آپ کی وفات سے سب سے زیادہ متاثر آپ کی لخت جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ کی بیٹیوں میں یہ اکیلی ہی زندہ تھیں، اس لیے کچھ لوگ ان کے گھر جمع ہوگئے۔ اسی طرح آپ کے قریبی سیدنا عباس رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے کچھ لوگ ان کے ہاں جمع ہوگئے۔ اس کے علاوہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، زبیر بن عوام اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم بھی آپ کے اقرباء میں سے تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 4/650)

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ وہ غم سے اس قدر نڈھال تھیں کہ بات بھی نہیں کر سکتی تھیں اور کسی

کو کچھ بتاتیں تو ہاتھ میں کپڑا لے کر اس کا اشارہ کرتیں۔(المغازي لابن أبي شيبة، حديث: 414)

تمام صحابہ کرام کے گھر چھوٹے تھے، اس لیے کسی ایک گھر میں سب کا جمع ہونا ممکن نہ تھا، چنانچہ بعض مہاجرین اور انصار سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں جمع ہوگئے۔ حجرۂ مبارکہ کا دروازہ چونکہ بند تھا اور پیر کے روز تقریباً بند رہا اور لوگ خلافت کے معاملے میں مشغول رہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ آپ کی تدفین سے پہلے خلافت کے مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک آپ ﷺ کا جسم اطہر روئے زمین پر موجود ہے، ہم آپ ہی کے زیر امارت ہیں اور تدفین سے پہلے تک سابقہ امور ہی نافذ ہوں گے، چنانچہ لوگ صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں مشغول ہوگئے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 655/4، وتهذيب سيرة ابن كثير لمروان كجك، ص: 683)

منگل کے روز رسول اکرم ﷺ کی آل کے مرد حضرات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سیدنا عباس بن عبدالمطلب، سیدنا علی بن ابی طالب، سیدنا عباس کے بیٹے، فضل، قثم، اسامہ بن زید اور رسول اکرم ﷺ کے مولی صالح رضی اللہ عنہم شامل تھے۔(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 414)

پھر بنوعوف کے بدری انصاری صحابی اوس بن خولی رضی اللہ عنہ نے آواز دی: اے علی! میں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ ہمیں، یعنی انصار کو بھی رسول اکرم ﷺ کے غسل میں شریک کریں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں اجازت دی تو وہ ان کے ساتھ غسل میں شریک ہوئے۔(السيرة النبوية لابن هشام: 662/4) ایک روایت میں ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی نے حکم دیا کہ آپ کو آپ کے علاقی رشتہ دار غسل دیں۔(الشمائل للترمذي، ص: 200)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ حکم نہ دیتے تو بھی دستور کے مطابق ایک فطری امر تھا۔ ایسے مواقع پر گھر والے یقیناً دوست احباب سے مقدم ہوتے ہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ انھوں نے آپ کو چارپائی پر غسل دیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بعدازاں جب لوگ جنازے کے لیے داخل ہوئے تو آپ کا جسد اطہر چارپائی پر تھا۔ غسل دیتے ہوئے انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے کپڑے نہیں اتارے تھے۔

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ صحابۂ کرام نے جب نبی ﷺ کو غسل دینا چاہا تو انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں معلوم نہیں کہ آیا ہم رسول اللہ ﷺ کے کپڑے اتاریں جیسے کہ ہم اپنی میتوں کے اتار

دیتے ہیں یا آپ کو کپڑوں سمیت ہی غسل دیں، چنانچہ جب ان کا اس بارے میں اختلاف ہوا تو اللہ نے ان پر نیند طاری کر دی، ان میں سے کوئی بھی نہ بچا مگر اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا لگی، پھر گھر کی جانب سے ایک بات کرنے والے نے بات کی، کسی کو خبر نہیں کہ وہ کون تھا کہ نبی ﷺ کو کپڑوں سمیت ہی غسل دو، چنانچہ وہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کو آپ کی قمیص سمیت غسل دیا۔ وہ قمیص کے اوپر ہی سے پانی ڈالتے جاتے تھے اور آپ کی قمیص ہی سے آپ کو ملتے جاتے تھے، بغیر اس کے کہ آپ کے جسم کو ان کے ہاتھ لگیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں: اگر مجھے اس معاملے کا پہلے علم ہو جاتا جس کا بعد میں ہوا ہے تو آپ کو آپ کی ازواج ہی غسل دیتیں۔ (سنن أبي داود، الجنائز، حدیث: 3141)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد تھا کہ اگر پردے والے معاملے کا ہمیں پہلے علم ہوتا تو ہم ازواج مطہرات ہی رسول اکرم ﷺ کو غسل دیتیں کیونکہ ان کے لیے آپ ﷺ کے پورے جسد اطہر کو دیکھنا جائز تھا۔

عام طور پر میت کے کچھ پوشیدہ حصے صفائی کے متقاضی ہوتے ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مخصوص حصوں کی صفائی کا ارادہ کیا لیکن انھیں کوئی ایسی ناگوار چیز نہ ملی جس کی صفائی کی ضرورت ہو تو انھوں نے فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ زندگی اور موت ہر دو صورتوں میں پاک ہی ہیں۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 416، والسيرة النبوية لابن كثير: 519/4)

رسول اکرم ﷺ کو بیری کے پتوں ملے پانی سے غسل دیا گیا۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 520/4، والطبقات لابن سعد: 280/2) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے سینے سے آپ کی ٹیک لگائی ہوئی تھی، جبکہ آپ کے جسم اطہر پر قمیص موجود تھی۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ قثم اور فضل آپ کو ادھر ادھر کرنے میں ان کی معاونت کر رہے تھے۔ اسامہ بن زید اور رسول اکرم ﷺ کے مولی صالح رضی اللہ عنہ پانی ڈال رہے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ قمیص کے اوپر ہی سے جسم مل کر غسل دے رہے تھے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 662/4) پھر آپ کو دو سفید کپڑوں میں لپیٹا گیا اور پھر ایک دھاری دار یمنی چادر میں لپیٹا گیا۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 663/4) یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چادر کاٹن کی تھی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو تین سفید یمنی چادروں میں کفن دیا گیا۔ (الطبقات لابن سعد: 281/2، والسيرة النبوية لابن كثير: 522/4) آپ کو جس پانی سے غسل دیا گیا وہ قبا

میں واقعہ بئر سعد بن خیثمہ نامی کنویں کا تھا۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 416) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پانی صاف ستھرا اور دیگر پانیوں سے ممتاز تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو تین سحولی (یمنی) کاٹن کی سفید چادروں میں غسل دیا گیا۔ اس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔

(صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1271)

ایک روایت میں ہے کہ جو قمیص آپ نے پہن رکھی تھی اسے اس کفن کے نیچے ہی رہنے دیا گیا۔ (سنن أبي داود، الجنائز، حديث: 3153 (والحديث ضعيف)) کفن دینے کے بعد رسول اکرم ﷺ کے جسم اطہر کو چارپائی پر رکھا گیا۔ مسلمانوں نے نبی ﷺ کی نماز جنازہ کے حوالے سے مشورہ کیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ رسول اکرم ﷺ کے جسد اطہر کو حجرے سے باہر نہ نکالا جائے۔ لوگوں نے پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھی! کیا رسول اکرم ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہاں۔ لوگوں نے پوچھا: کیسے؟ انھوں نے فرمایا: ایک گروہ داخل ہو، تکبیر کہے، درود پڑھے اور دعا کر کے باہر آ جائے۔ دوسرا گروہ داخل ہو، پھر تیسرا۔ اس طرح تمام لوگ نماز جنازہ ادا کریں، چنانچہ لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ اس کے بعد لوگوں نے کہا: اے رسول اللہ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ کی تدفین بھی ہوگی؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ لوگوں نے پوچھا: کہاں؟ انھوں نے جواب دیا: جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح پاکیزہ جگہ ہی میں قبض کی ہے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ انھوں نے سچ کہا ہے۔

(الشمائل للترمذي، ص: 378، والسيرة النبوية لابن هشام: 663/4)

ایک روایت میں ہے کہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ جب مرد فارغ ہو گئے تو پھر عورتوں کو اندر جانے کی اجازت دی گئی اور آخر میں بچوں نے آپ کا دیدار کیا۔ رسول اکرم ﷺ کی نماز جنازہ میں کسی نے امامت نہیں کرائی۔ (الطبقات لابن سعد: 289/2، والسيرة النبوية: 663/4) آپ کا جسم اطہر سامنے ہونے کی وجہ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امامت کرائی جائے۔

بلاشبہ یہ معاملہ بڑے نظم وضبط کا متقاضی تھا کیونکہ ہر شخص رسول اکرم ﷺ کی نماز جنازہ پڑھنا چاہتا تھا اور جگہ بھی تنگ تھی، اس لیے مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور اسے بھولا نہیں، آپ نے فرمایا:

«مَا قَبَضَ اللهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُدْفَنَ فِيهِ، فَدَفَنُوهُ فِي مَوْضِعِ فِرَاشِهِ»

''اللہ تعالیٰ کسی بھی نبی کی روح اسی جگہ قبض کرتا جہاں وہ دفن ہونا پسند کرتا ہے۔'' چنانچہ انھوں نے آپ کو آپ کے بستر کی جگہ ہی میں دفن کیا۔ (جامع الترمذي، الجنائز، حديث: 1018)

کبھی کوئی مکان اللہ کی طرف سے پسندیدہ ہوتا ہے تاکہ وہاں اس کے نبی کی قبر بنے اور کبھی وہ مکان نبی ﷺ کو پسند ہوتا ہے، بہر حال آپ کی جائے وفات کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا جیسا کہ آپ کی ہجرت گاہ کا انتخاب بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ نبی ﷺ کی قبر تدفین پر تمام صحابۂ کرام کا اتفاق تھا۔ کسی ایک صحابی سے بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس رائے سے اختلاف منقول نہیں۔

جہاں تک قبر کی تیاری کا مسئلہ ہے تو ہجرت مدینہ کے بعد رسول اکرم ﷺ کے کئی صحابۂ کرام کی قبریں کھودی گئیں۔ قبر دو طرح کی بنائی جاتی تھی۔ بغلی قبر، جسے لحد والی قبر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک سیدھا گڑھا کھود کر قبلہ والی دیوار کے اندر پھر ایک گڑھا کھودا جاتا اور اس کے اندر میت کو رکھا جاتا۔ دوسری قبر شق والی تھی۔ ایک گڑھا کھود کر اس کے درمیان میں ایک اور گڑھا کھودا جاتا ہے۔ (صحيح البخاري، الجنائز، باب اللحد والشق في القبر، قبل حديث: 1353) یہ اہل مدینہ کا طریقہ تھا۔ حسب ضرورت و حال ہر طرح کی قبر تیار ہوتی تھی۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام میں لحد یا شق والی قبر کے بارے میں اختلاف کھڑا ہو گیا۔ اس بحث میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں روکا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی اور وفات میں آپ کے پاس شور کرنا درست نہیں، چنانچہ انھوں نے بغلی قبر تیار کرنے والے اور شق والی تیار کرنے والے دونوں کی طرف پیغام بھیجا۔ بغلی قبر تیار کرنے والا پہلے آ گیا تو آپ کے لیے بغلی قبر تیار کی گئی، پھر رسول اکرم ﷺ کو دفن کر دیا گیا۔ (المغازي، لابن أبي شيبة، ص: 414)

ایک روایت میں ہے کہ بغلی قبر سیدنا ابوطلحہ زید بن سہل انصاری رضی اللہ عنہ تیار کرتے تھے اور یہ اہل مدینہ کی قبریں تیار کرتے تھے۔ اور شق والی قبر سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تیار کرتے تھے۔ اور جس کو بلانے کے لیے بھیجا گیا

وہ سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تھے، چنانچہ انصاری پہلے آ گئے اور انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے لیے لحد تیار کی۔(السيرة النبوية لابن هشام: 663/4)

اس لیے لوگ عموماً اور صحابۂ کرام خاص طور پر بغلی قبر ہی کو پسند کرتے ہیں۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا آخری وقت قریب آیا تو انھوں نے کہا: میری قبر بغلی بنانا اور اسے اینٹوں کے ساتھ اسی طرح بند کرنا جس طرح رسول اکرم کی قبر کو بند کیا تھا۔(صحيح مسلم، الجنائز، حديث: 966)

قبر کی تیاری کے لیے دونوں افراد کی طرف پیغام بھیجنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ دعا کرتے رہے: اے اللہ اپنے رسول کے لیے جس طرح کی قبر کو تو پسند کرتا ہے، اسی آدمی کو پہلے بھیج دے۔(الطبقات لابن سعد: 275/2، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 415,414) گویا کہ لحد کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول کے لیے تھا۔

رسول اکرم ﷺ کا جسد اطہر چارپائی پر قبر کے قریب ہی رکھا گیا یہاں تک کہ حضرات وخواتین اور بچوں نے نماز جنازہ ادا کر لی۔ لوگ 11 ہجری 14 ربیع الاول بمطابق 14 جون 632 عیسوی بدھ کی رات جنازے سے فارغ ہوئے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔

پھر چارپائی کو قبر سے ایک طرف کر کے رسول اکرم ﷺ کو قبر میں دفن کیا گیا۔ اس طرح کہ آپ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ، آپ کے چچا، ان کے دونوں بیٹوں قثم اور فضل اور آپ کے آزاد کردہ غلام شقران نے اٹھا کر قبر میں رکھا۔(الطبقات لابن سعد: 275/2، المغازي، لابن أبي شيبة، ص: 415,414) کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی ایک چادر تھی جسے آپ بچھا کر اوپر بیٹھ جاتے تھے۔ تدفین کے وقت شقران رضی اللہ عنہ نے وہ بھی آپ کے نیچے قبر میں ڈال دی تاکہ لوگ اس کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے الجھ نہ پڑھیں اور انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! نبی ﷺ کے بعد اسے کوئی استعمال نہیں کرے گا۔(صحيح مسلم، الجنائز، حديث: 967، والسيرة النبوية: 664/4)

اس سارے عمل میں سیدنا اوس بن خولی انصاری بھی ان کے ساتھ موجود تھے۔ جب رسول اکرم ﷺ کو قبر میں رکھ دیا گیا تو لحد کو اینٹوں سے بند کر دیا گیا جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے تاکہ مٹی براہِ راست جسم پر نہ پڑے۔ اینٹوں کے ساتھ لحد اچھی طرح بند کرنے کے بعد قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔ اب آدھی رات بیت چکی تھی۔

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اکرم ﷺ کی تدفین کا علم اس وقت ہوا جب ہم نے

بدھ کی آدھی رات کو کسیوں سے مٹی ڈالنے کی آواز سنی۔(السيرة النبوية لابن هشام: 664/4)

اگلے روز صبح کی اذان سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے دی۔ جب وہ أشهد أن محمدًا رسول الله پر پہنچے تو ان کی ہچکی بندھ گئی اور لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی وفات کا حزن و ملال دوبارہ تازہ ہو گیا۔

رسول اکرم ﷺ کی قبر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں عام قبروں کی طرح رہی۔ نہ اسے اونچا کیا گیا اور نہ اس پر کوئی عمارت تعمیر کر کے اسے نمایاں کیا گیا۔(السيرة النبوية للندوی، ص: 414) اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کی تربیت ہی یہ کی تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ یہ حدیث صحابۂ کرام کے سامنے تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی آخری بیماری میں فرمایا تھا:

«لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ لَوْلَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ غَيْرَ أَنَّه خَشِيَ أَو خُشِيَ اَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا»

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر کو نمایاں کر دیا جاتا لیکن یہ خدشہ تھا کہ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا دیا جائے گا۔

(صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1390)

اس کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ کے ساتھ دفن کیا گیا، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے وہاں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کی تو انھوں نے وہاں دفن ہونے کی اجازت دے دی۔(تاريخ المدينة لابن شبة: 944/3، والطبقات لابن سعد: 368/3)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قبر رسول اکرم ﷺ کی قبر سے ذرا نیچے ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی قبر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قبر سے ذرا نیچے، البتہ تمام قبریں قبلہ رخ ہیں۔ اس طرح کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سر رسول اکرم ﷺ کے کندھوں کے برابر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا سر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کندھوں کے برابر ہے۔ دوسرے زاویے سے اس طرح کہ رسول اکرم ﷺ قبلے کی طرف، آپ کے پیچھے سیدنا ابوبکر اور ان کے پیچھے سیدنا عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔ جیسے وہ دونوں دنیا میں آپ کے رفیق کار تھے، اسی طرح آخرت میں بھی آپ کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں محو استراحت ہیں۔ قبریں زمین سے چار پانچ انچ بلند ہیں۔(صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1139، والمواهب اللدنية: 401/3)

رسول اکرم ﷺ کی بیماری اور وفات کے وقت آپ کے اقرباء ہی زیادہ تر آپ کے قریب رہے۔ عورتوں میں آپ کی ازواج مطہرات، خصوصاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور آپ کی لخت جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے قریب رہیں اور مردوں میں سیدنا ابوبکر، عمر، اہل بیت کے افراد سیدنا علی، عباس اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم آپ کے قریب رہے۔ ان کے علاوہ سیدنا انس بن مالک اور سیدنا اسامہ بن زید کو قربت کا شرف حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جن وصیتوں اور احادیث کا ذکر کیا ہے، انھیں کوئی دوسرا بیان نہیں کر سکا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ امہات المؤمنین کا امت کی رہنمائی میں کتنا اہم کردار ہے کہ آپ کی بیماری کے ایام کے فرمودات کو کس ایمانداری سے امت تک پہنچایا۔

رسول اکرم ﷺ کا زندگی کے آخری ایام سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزارنا، پھر ان کی گود میں آپ کی وفات اور آخری لمحات تک ان کا ساتھ شاید یہ واضح کرنے کے لیے تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک ان کی فضیلت اور مقام و مرتبہ بہت زیادہ ہے۔ اور آپ ﷺ ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ وہ آپ کے اہل بیت کی معتمد ترین شخصیت تھیں اور انسانیت کی سب سے قیمتی امانت (رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات) کی حفاظت کی اہل تھیں۔ وہ نوجوان اور کمال حافظے کی مالک تھیں، اس لیے انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے ہر قول و فعل کو یاد رکھا۔ رسول اکرم ﷺ کے بیماری کے ایام وہاں گزارنے کی یہی حکمت تھی، پھر رسول اکرم ﷺ باقی بیویوں کی نسبت ان سے زیادہ محبت کرتے تھے اور ان کے ہاں راحت و سکون محسوس کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی بیماری سے متعلقہ اکثر روایات اور وصیتیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہیں۔ اس سے ہر عقل مند بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ان کا مقام و مرتبہ کس قدر بلند تھا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر بیماری کے ایام گزارنے میں یہ بھی حکمت تھی کہ اس طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ کے پاس آنا جانا آسان ہو کیونکہ انھیں دیگر لوگوں سے اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے گھر بھی قریب تھے اور وہ بآسانی آپ کی تیمارداری کر سکتے تھے۔ سیدنا ابوبکر اور اہل بیت ایک ہی خاندان شمار ہوتا تھا اور ان کی باہم محبت مثالی تھی، پھر دیگر مہاجرین و انصار بھی باہم محبت اور الفت رکھتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ جس طرح کا سسرالی رشتہ تھا، کسی دوسرے کے ساتھ نہ تھا، اس

لیے یہ تمام حضرات وفات سے پہلے اور بعد میں بھی آپ کے قریبی اور محبّ تھے، تاہم آپ کی تجہیز و تکفین کے زیادہ حق دار آپ کے اقرباء، یعنی عبدالمطلب کی اولاد تھی۔ انھوں نے اس امانت کو پوری طرح ادا کیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ باقی صحابۂ کرام کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام لوگوں کا اس میں شریک ہونا ممکن نہ تھا اور صحابی ہونے کے لحاظ سے ہر شخص اس کا خواہش مند تھا، اس لیے اقرباء کو مقدم کیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد نے تجہیز و تکفین کا فریضہ سرانجام دیا اور انصار کی نمائندگی سیدنا اوس بن خولی رضی اللہ عنہ نے کی۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت

رسول اکرم ﷺ لوگوں کے امام اور قائد تھے۔ آپ نماز بھی پڑھاتے اور امور سلطنت کی نگرانی بھی فرماتے۔ نبی ﷺ اور پوری امت کی خواہش تھی کہ یہ سلطنت اور نظام قائم رہے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہو اور دین کا قیام بھی یقینی ہو۔ رسول اکرم ﷺ کی خواہش تھی کہ سلطنت اسلامیہ پوری دنیا میں پھیل جائے تاکہ رسالت کا پیغام پوری دنیا میں پہنچ جائے اور ظلم کا خاتمہ ہو کر پوری دنیا میں عدل کا نظام قائم ہو اور لوگ امن و امان سے رہ سکیں۔ اس عزم کا پہلا ہدف عرب کے پڑوسی ممالک ایران اور روم تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے شام کی طرف بھیجنے کے لیے ایک لشکر تیار کیا اور اس کا سربراہ سیدنا اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4669,4668) لیکن پیام اجل نے آپ کو فرصت نہ دی اور لشکر روانہ کرنے سے پہلے ہی آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی وفات کے بعد اس مشن کو جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک شخص کا تعین کیا جائے جو رسول اکرم ﷺ کے احکام کو نافذ کرے اور آپ کی خواہشات کی تکمیل کرے۔ اللہ کی شریعت کا نفاذ کر کے اسلام کی دعوت کو پوری دنیا میں پھیلائے۔

لیکن اس سب کے باوجود رسول اکرم ﷺ نے کسی کو سربراہ نامزد نہیں کیا تھا۔ (صحيح البخاري، المغازي، حديث: 2741,2740) تاہم بعض ارشادات سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی اور اس ذمہ داری کو نبھانے کے اشارے ضرور ملتے تھے۔ انصار مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے۔ مقامی ہونے کے ناتے اس ریاست کی تعمیر و تشکیل میں ان کا اہم کردار تھا، اسی طرح مہاجرین کی قربانیاں سب سے زیادہ تھیں۔ الغرض سلطنت کی تشکیل

میں ہر ایک کا کم یا زیادہ کردار تھا۔

قرآن مجید کی روشنی میں تمام صحابۂ کرام یہ سمجھتے تھے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوگی اور آپ ﷺ کے بعد کسی امیر کی زیر قیادت آپ کے مشن کو جاری رکھنا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد اس دین اور مشن کو ہرگز نہیں چھوڑنا۔ (صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3668)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ یقیناً ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں تو کیا تم (اسلام سے) اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔''

(آل عمرٰن 3:144)

جی ہاں! جنھوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تاکہ مشن نبوی کو جاری رکھنے کے لے نظام قائم اور مرتدین کی سرکوبی ہو، وہ واقعی شکر گزار تھے۔ اس موقع پر اس آیت کے معنی کھل کر سامنے آئے کہ اہل ایمان کو ریاست نبوی کو ایک مستحکم ریاست بنانا ہے۔ اور اس کے خلاف اٹھنے والے مرتدین کا قلعہ قمع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو ان پر غلبہ عطا کیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ

رسول اکرم ﷺ کی وفات کے روز انصار مدینہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں جمع ہوئے۔ یہ مدینہ کے اصل باشندے تھے۔ انھوں نے پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود آپ کو اپنے ہاں جگہ دی۔ اور ان کے بعض لوگ سمجھتے تھے کہ حکومت کے حق دار بھی نبی ﷺ کے بعد وہی ہیں۔ انھیں یہ فکر تھی کہ امت کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے اس کا کوئی حل نکالنا چاہیے۔ عین اسی وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے دیگر حضرات سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جمع ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کچھ مہاجرین اور انصار کے ساتھ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

کے پاس (مسجد میں) جمع تھے۔

حالات کافی پریشان کن تھے۔ انصار اپنی جگہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ جبکہ مہاجرین اور انصار کی اکثریت ایک دوسرے زاویے سے سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ریاست مدینہ کا تعلق صرف مدینہ اور آس پاس کے قبائل سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمگیر ریاست ہے اور رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اس کی ہیئت اور صورت یکسر بدل جائے گی، اس لیے اس کی قیادت کا اہل غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فرد ہی ہوسکتا ہے۔ جو نظام حکومت، شریعت اور احکام کو بخوبی سمجھتا اور جانتا ہو اور تمام اہل عرب کے ہاں قابل قبول بھی ہو۔ اور ایسا یقیناً کوئی مہاجر صحابی ہی ہوسکتا ہے جو مکہ اور مدینہ دونوں کے ماحول سے واقف ہو اور اس نے زیادہ دیر اللہ کے رسول ﷺ سے استفادہ کیا ہو۔ اس میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے ممتاز تھے۔ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس معاملے کے حق دار تھے۔ مہاجرین اور انصار کی اکثریت اسی سوچ کی حامی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب انصار سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے تو بعض انصاریوں نے اس کی اطلاع فوراً سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو دی اور درخواست کی کہ وہ فوراً تشریف لائیں تاکہ ان کے کسی امر پر اکٹھے ہونے سے پہلے معاملے کا صحیح حل نکل سکے۔ اگر وہ کسی معاملے پر متفق ہوگئے تو پھر مشکلات کھڑی ہوسکتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انصار کی خواہش تھی کہ اس اہم معاملے کو حل کرنے کے لیے بزرگ مہاجرین کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ یہ خبر سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ہمیں اپنے انصار بھائیوں کے پاس ضرور جانا چاہیے تاکہ ہمارے علم میں ہو کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ (السيرة النبوية، لابن هشام: 657/4)

سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما انصار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں دو انصاری صحابہ ملے۔ عویمر بن ساعدہ انصاری اور معن بن عدی عجلانی۔ انھوں نے کہا: اے مہاجرین کی جماعت! تم انصاریوں کے پاس جانے کی زحمت نہ کرو جو فیصلہ کرنا ہے کر گزرو۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 424، والروض الأنف: 472)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انصار و مہاجرین میں کوئی مقابلہ بازی نہیں تھی بلکہ دونوں گروہوں کے درمیان ادب و احترام کا رشتہ قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کے باہمی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' (التوبة 100:9)

انصار کے اکٹھا ہونے کی اطلاع سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو انصاری نے دی، جنھوں نے کہا کہ تم خود فیصلہ کرو کہ تمھیں کیا کرنا ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں ہم اپنے انصاری بھائیوں کے پاس جائیں گے۔ یہ سارا سیاق و سباق دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے تھے۔ ان کے درمیان نہ کوئی مقابلہ بازی تھی اور نہ انھیں حکمرانی کی ہوس تھی۔ ان سب کی کوشش تھی کہ صحیح اہل اور افضل شخص کا انتخاب ہو۔ اگرچہ بعض لوگ جن کے دلوں میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں کدورت ہے، وہ صحابہ کرام کے ہر معاملے اور ان کے ہر تصرف کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ.

شاید سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت کے آخر میں یہ بات محسوس کی کہ کچھ لوگ سقیفہ والی بیعت اور بعد کے معاملات میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں تو انھوں نے بذات خود اس واقعہ کے حقائق کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف منی میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اکٹھے تھے۔ میں عبدالرحمٰن بن عوف کو قرآن سکھاتا تھا۔ ایک روز میں ان کی رہائش گاہ پر آیا تو وہ موجود نہیں تھے۔ پتا چلا کہ وہ امیر المومنین کے پاس گئے ہیں۔ میں نے انتظار کیا تو وہ آ گئے۔ پھر مجھ سے کہا: آج میں نے امیر المومنین کو جس قدر غصے میں دیکھا ہے ایسے غضبناک وہ کبھی نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں: میں نے کہا: وہ کیوں؟ انھوں نے کہا: انھیں پتا چلا ہے کہ انصار کے دو آدمیوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر تبصرہ کرتے

ہوئے کہا ہے کہ وہ تو اتفاقی اور اچانک ہوئی تھی۔ سیدنا عمر کی وفات کے بعد آدمی اپنی مرضی سے جس کی چاہے بیعت کر لے۔ کہتے ہیں: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے بات کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا: امیر المومنین! ایسا نہ کیجیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایسے شہر میں ہیں جہاں عرب کے اطراف و اکناف سے لوگ جمع ہیں۔ آپ بات کریں گے اور وہ لوگ سن کر چلے جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کوئی آپ کی بات صحیح نہ سمجھ سکے اور بات آگے منتقل ہوتے ہوتے کچھ اور بن جائے۔ آپ مدینہ طیبہ جا کر یہ بات کیجیے۔ وہاں بات کرنا مفید رہے گا۔ جب ہم مدینہ طیبہ آ گئے تو میں صبح سویرے مسجد میں آیا اور منبر کی دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل آئے اور وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے کہا: آج امیر المومنین ایسی بات کریں گے جو انھوں نے خلافت سنبھالنے سے لے کر آج تک نہیں کی۔ انھوں نے کہا: کیا متوقع ہے، وہ کیا کہیں گے؟ میں نے کہا: تم جلد ہی سن لو گے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب لوگ جمع ہو گئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آ کر منبر پر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد رسول اکرم ﷺ کا ذکر کیا اور آپ پر درود پڑھا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا اپنے رسول کو ہمارے درمیان باقی رکھا۔ آپ پر وحی نازل ہوتی جس کے ساتھ آپ حلال و حرام کے احکامات جاری فرماتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اپنے پاس بلا لیا۔ تو ان کے ساتھ جو چاہا اٹھا لیا اور جو چاہا باقی رکھا۔ ہم نے بعض چیزوں کو تھام لیا اور بعض ہم سے رہ گئیں۔ ہم قرآن میں یہ پڑھا کرتے تھے:

«لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ كُفْرٌ بِكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ»

''اپنے آباء و اجداد سے بے رغبتی نہ کرو کیونکہ یہ تمھارا کفر ہے کہ تم اپنے آباء و اجداد سے بے رغبتی اختیار کرو۔''

اسی طرح آیت رجم نازل ہوئی۔ نبی ﷺ نے رجم کیا اور آپ کے ساتھ ہم نے بھی رجم کیا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، میں نے اسے یاد کیا، سیکھا اور سمجھا۔ اگر اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں وہ داخل کر دیا ہے جو اس میں نہیں ہے تو میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھ دیتا۔ رجم تین مراحل سے گزر کر ہوگا۔ ① واضح حمل ہو۔ ② زنا کرنے والا خود اعتراف کرے۔ ③ عادل گواہ ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ کچھ لوگ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں کہ وہ اچانک تھی۔ بلاشبہ یہ ایسے ہی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا خیر ہمیں عطا کر دیا اور اس کے شر سے بچا لیا۔ تم میں سے ابوبکر جیسا کون ہے جس کے ایک اشارے پر لوگ مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہوں۔

صورت حال یوں تھی کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ہمیں اچانک خبر ملی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کے لیے جمع ہیں۔ میں، سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا ابوعبیدہ بن جراح گھبرا کر ان کی طرف گئے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ راستے میں ہمیں دو انصاری ملے۔ وہ دونوں سچے سُچے کردار کے مالک تھے، میری مراد عویمر بن ساعدہ اور معن بن عدی ہے۔ ان دونوں نے پوچھا: تم کہاں جا رہے ہو۔ ہم نے کہا: تمھاری قوم کے پاس جا رہے ہیں کیونکہ ہمیں اس اس طرح کی بات معلوم ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا: تم واپس چلے جاؤ تمھاری مخالفت ہرگز نہیں ہوگی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہوگا جو تم کو ناپسند ہو۔ لیکن ہم نے ہر صورت وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ میں دل ہی دل میں تقریر تیار کر رہا تھا کہ مجھے وہاں یہ کہنا ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو لوگ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے اردگرد جمع تھے۔ وہ کیونکہ بیمار تھے، اس لیے ایک چارپائی پر تشریف رکھتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے بات شروع کی اور کہا: اے گروہ قریش! ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے۔ پھر حباب بن منذر نے کہا: میں وہ لکڑی ہوں جس سے اونٹ اپنا بدن رگڑ کر کھجلی کی تکلیف دور کرتے ہیں اور میں وہ باڑ ہوں جو درختوں کے اردگرد حفاظت کے لیے لگائی جاتی ہے۔ اور اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو ہم یہ معاملہ ازسرنو اٹھا سکتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات سن کر کہا: تم رہنے دو۔ میں بات کرنے لگا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بھی فرمایا: عمر چپ ہو جاؤ۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اے انصار کی جماعت! ہم اللہ کی قسم تمھاری فضیلت و منقبت کے انکاری نہیں اور اسلام کے لیے تم نے جو تکالیف برداشت کی ہیں ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے۔ تمھارے ہم پر جو حقوق ہیں۔ ہم ان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس سب کے باوجود تم جانتے ہو کہ اہل عرب کے ہاں قریش کا جو مقام و مرتبہ ہے، وہ کسی دوسرے کا نہیں ہے، اس لیے عرب ان کے کسی آدمی کے سوا کسی پر اکٹھے نہیں ہوں گے، لہٰذا امارت ہمارے پاس ہوگی اور وزارت تمھارے پاس۔ اللہ سے ڈرو، اسلام میں رخنہ اندازی کی کوشش مت کرو اور نہ سب سے

پہلے اسلام میں نئی بدعت جاری کرنے والے بنو۔ میں تمھارے لیے دو آدمی پسند کرتا ہوں ان میں سے ایک کا انتخاب کرلو۔ پھر انھوں نے میرا اور ابوعبیدہ بن جراح کا نام لیا۔ اللہ کی قسم! ان کا ایک ایک کلمہ وہی تھا جو میں کہنا چاہتا تھا سوائے اس کلمے کے۔ اللہ کی قسم میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر پارسائی کی ایسی زندگی گزاروں جس میں نافرمانی نہ ہو، یہ مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسی قوم کا امیر بنوں، جس میں ابوبکر موجود ہوں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے انصار کی جماعت! اے مسلمانوں کے گروہ! رسول اکرم ﷺ کے بعد اس معاملے کے سب سے زیادہ حق دار یار غار ہیں جنھیں اسلام میں سبقت کا نمایاں شرف حاصل ہے اور قرآن نے انھیں ثانی اثنین کے باعزت لقب سے مخاطب کیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، پھر میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا تو ایک انصاری نے مجھ سے جلدی کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بیعت کے لیے سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا، پھر میں نے بیعت کی تو لوگ ان کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ سعد بن عبادہ رش میں لوگوں کے نیچے آ گئے تو لوگوں نے کہا: سعد مر گئے۔ میں نے کہا: مرتے ہیں تو مر جائیں۔ اللہ انھیں ہلاک کرے، پھر ہم واپس آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کے ذریعے سے لوگوں کو جمع کر دیا۔ یہ بیعت اللہ کی قسم واقعی اچانک تھی جیسے تم نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھلائی ہمیں عطا کر دی اور اس میں جو برائی تھی اس سے ہمیں بچا لیا۔ اب جو اس طرح کرے گا تو اس کی بیعت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور نہ وہ خلیفہ تصور ہوگا جس کی بیعت کی گئی۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 422-425، والسيرة النبوية لابن هشام: 659/4)

سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہونے والے مکالمے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انصار و مہاجرین ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے اور باہم مشورہ کرتے تھے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو خلافت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ (صحيح البخاري، حديث: 3668) تمام صحابۂ کرام یہی چاہتے تھے کہ نظام حکومت مستحکم ہو اور تمام مسلمانوں کی مصلحت اسی میں ہے کہ سلطنت مضبوط ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انصار و مہاجرین جنھوں نے اس ریاست کی بنیاد رکھی، پیش پیش تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انصار کو مطمئن کرنا اور دوران گفتگو ان کی تعریف کرنا، ان کا دو امیروں کا مشورہ دینا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اس سے انکار کرنا، یہ سب امور دلالت کرتے

ہیں کہ ان کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ تھا اور وہ سب سلطنت اسلامیہ کی ترقی کے خواہش مند تھے۔(السيرة النبوية لابن هشام: 393/4) ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے روز سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما انصار کے پاس گئے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے انصار کی جماعت! ہمیں تمھارے حق کا انکار ہے اور نہ کوئی مومن اس کا انکار کر ہی سکتا ہے۔ اللہ کی قسم ہمیں جو بھلائی بھی ملی ہے۔ اس میں تمھاری شرکت یقینی ہے۔ لیکن اہل عرب قریش کے علاوہ کسی آدمی کی امارت پر راضی ہوں گے اور نہ اسے تسلیم ہی کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فصیح اللسان ہیں۔ شکل وصورت میں بھی تمام لوگوں سے خوبصورت ہیں، محل وقوع کے اعتبار سے بھی انھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عربوں میں وہ نابغہ روزگار اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہیں، لہٰذا اٹھو اور عمر کی بیعت کر لو۔ راوی کہتے ہیں: انھوں نے کہا: نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں؟ انھوں نے کہا: ہم نظر انداز کیے جانے سے ڈرتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب تک میں زندہ ہوں ایسا نہیں ہوگا، پھر فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ مجھ سے زیادہ قوی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ مجھ سے افضل ہیں۔ دونوں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو تیسری مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری ساری قوتیں اور صلاحیتیں آپ کے فضل کے ساتھ ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر لوگوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو رہی تھی تو کچھ لوگ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انھوں نے کہا: تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو، جبکہ تمھارے درمیان تین میں سے تیسرا موجود ہے۔ ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے محمد سے کہا: تین میں سے تیسرا کون ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

(التوبة 40:9، المغازی لابن أبي شيبة، ص: 429,428)

خیالات کا تبادلہ اور کبھی ان میں اختلاف ہو جانا، اس بارے میں بحث مباحثہ اور دوسروں کی مختلف آراء سننا ایک فطری امر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت کسی سابقہ پروگرام کے بغیر ہوئی ہے اور اس اجتماع میں حاضر تمام لوگوں کا مقصد حق کی تلاش تھا اور ان کے سامنے عام لوگوں کا مفاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی نقطۂ نظر سے اپنی رائے یوں دی:

اے انصار کی جماعت! کیا تمھارے علم میں نہیں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ کہا: پھر ابوبکر سے آگے بڑھنا تم میں سے کون پسند کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ابوبکر سے آگے بڑھیں۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 425، والطبقات لابن سعد: 178/3)

پھر انصار کا ایک خطیب اٹھا اور اس نے کہا: تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین میں سے تھے اور آپ کا خلیفہ بھی مہاجرین میں سے ہوگا۔ ہم اللہ کے رسول ﷺ کے اعوان و انصار ہیں اور اسی طرح آپ کے خلیفہ کی بھی مدد و نصرت کریں گے جس طرح رسول اکرم ﷺ کی کرتے تھے۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 490/4)

اسی طرح ایک انصاری نے بڑھ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 425) پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نہ چاہتے ہوئے بھی بیعت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت کرنے والے تمام حضرات، سوائے سیدنا عمر اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کے، انصاری تھے۔ یہ بیعت صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص تھی جو سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود تھے۔ اس میں حاضر نہ ہونے والے پر ملامت نہیں کی گئی۔ یہ 12 ربیع الاول پیر کا دن تھا جس روز رسول اکرم ﷺ فوت ہوئے۔

بلاشبہ اگر ان بیعت کرنے والوں کو اس کا ادنیٰ سا علم بھی ہوتا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے بعد ابوبکر کے لیے خلافت کی وصیت کی ہے تو یہ منافشہ ہرگز نہ ہوتا۔ وہ مختلف آراء کا اظہار کیے بغیر فوراً سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے۔ اسی طرح اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں وصیت ہوتی تو بھی ان پر مخفی نہ رہتی۔ وہ ضرور اس مجلس میں اس کا اظہار کرتے کیونکہ وہ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتہ تھے اور انھوں نے براہ راست آپ سے فیض پایا تھا اور آپ کے شانہ بشانہ دشمن سے لڑے تھے۔ ان کی منقبت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، پھر ان میں سے بعض نے اپنی نذر پوری کردی (شہادت پاگئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔'' (الأحزاب 23:33)

وہ اتنی آسانی سے اس وصیت کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی کسی وصیت کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس کی بنیاد پر خلافت کا مطالبہ کیا، حالانکہ وہ بہت دلیر تھے اور کسی کی ملامت یا زیادتی سے ڈرنے والے نہ تھے۔

یہ مخصوص بیعت ناکافی تھی۔ خلافت جیسے اہم مسئلہ کے لیے عام بیعت کی ضرورت تھی، چنانچہ اگلے روز منگل کے دن نماز فجر کے لیے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عام بیعت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقرری کی رسمی تقریب تھی جس میں انصار کی بڑی تعداد اور مہاجرین کے سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ انھوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس لیے اپنا امیر منتخب کیا اور ان کی بیعت کی کہ نبی ﷺ نے خود اہتمام سے نماز پڑھانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے لوگوں سے خطاب کیا۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت کے بعد اگلے روز سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بات کرنے سے پہلے کھڑے ہو کر لوگوں سے خطاب کیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس کے شایان شان حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا: لوگو! میں نے کل جو بات کی تھی وہ اللہ کی کتاب میں ہے نہ رسول اکرم ﷺ نے مجھے بتائی تھی۔ میرا اپنا خیال تھا کہ رسول اکرم ﷺ ہمارے تمام معاملات کی تدبیر کر کے ہم سب سے آخر میں دنیا سے جائیں گے۔

بلاشبہ تمھارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی رہنمائی کی۔ اگر تم اس کو تھامے رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں بھی اسی امر کی ہدایت دے گا جو اس نے اپنے رسول کو دی۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں تمھارے سب سے افضل اور بہتر آدمی پر جمع کر دیا ہے۔ وہ رسول اکرم ﷺ کے مصاحب

خاص اور یارِ غار ہیں، لہٰذا اٹھو اور ان کی بیعت کرو، چنانچہ لوگوں نے سقیفہ کی بیعت کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عام بیعت کی۔

(المغازي لابن أبي شيبة، ص: 429، والسيرة النبوية لابن هشام: 656/4، والطبقات لابن سعد: 182/3)

یہ بیعت ان تمام لوگوں نے کی جو اس وقت وہاں موجود تھے اور اس بیعت پر کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیعت کے کسی دوسرے فرد نے بھی تنقید نہ کی بلکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعدازاں مرتدین کی سرکوبی اور ریاست کے امور چلانے میں معاونت کرنے والوں میں اہل بیت کے افراد پیش پیش تھے۔

جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل ہوگئی تو انھوں نے لوگوں سے خطاب کیا۔ یہ گویا ان کی خلافت اور مستقبل میں سیاسی ترجیحات اور طریقہ کار کا رسمی اعلان تھا۔ انھوں نے اس خطاب میں بتایا کہ وہ حکومت کن خطوط پر چلائیں گے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس کے شایان شان حمد وثنا کے بعد فرمایا:

اما بعد! اے لوگو! مجھے تمھارا سربراہ مقرر کر دیا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کروں تو میری معاونت کرو اور اگر برا کروں تو میری اصلاح کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے کمزور میرے نزدیک اس وقت تک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک اللہ کے حکم سے میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق نہ لے لوں، ان شاء اللہ۔ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اور بے حیائی جس قوم میں عام ہو جائے وہ قوم آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس وقت تک میری اطاعت کرو۔ جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور جب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کرنا لازم نہیں ہے۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 661/4، وتاريخ الطبري: 238/2)

آپ نے آغاز تواضع اور انکساری سے کیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ کو پارسا ہرگز نہیں کہتے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب سے افضل ہیں، حالانکہ ہمارے علم میں وہ امت کے سب سے افضل فرد تھے۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کیونکہ یہی ہیں کہ تواضع اختیار کی جائے اور ہر خیر وخوبی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے، اس

لیے انھوں نے ذاتی خوبیوں کو بیان کرنا غیر مناسب سمجھا۔

اسی طرح انھوں نے عدل و انصاف کی اہمیت کو اجاگر کیا اور بتایا کہ شریعت، ریاست اور اس کے اداروں کی نظر میں سب برابر ہیں۔ ان سے مکمل انصاف سے حقوق کا مطالبہ ہوگا۔ اسی طرح انھیں بتایا کہ جہاد اسلامی ریاست کی بنیادی اکائی ہے۔ اسباب کو بروئے کار لانا اور قوت کا مظاہرہ کر کے مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم کرنا رسول اکرم ﷺ کا مشن تھا۔

اسی طرح انھوں نے بے حیائی، اس کے نقصانات اور اس کے سرعام ارتکاب سے خبردار کیا اور بتایا کہ اس سے معاشرے میں نئے امراض جنم لیتے ہیں۔ کاش صدیق اکبر آج کے معاشرے کی برائیاں اور بے حیائی کی وجہ سے پھیلنے والے امراض اور وبائیں دیکھتے تو اس سے بھی کہیں زیادہ سختی سے اسے ختم کرنے کے قوانین وضع کرتے۔

انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ اپنے مشن میں شریعت مطہرہ، یعنی قرآن وسنت کی اتباع کا راستہ اپنائیں گے۔ ان کی اطاعت اسی صورت میں واجب ہوگی جب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اگر وہ اس سے ہٹ کر کوئی حکم دیں گے تو اس کی پیروی لوگوں پر ہرگز لازم نہ ہوگی۔

یہ خطبہ سیاست اسلامی کے خطوط استوار کرنے میں اساس کا درجہ رکھتا ہے جس سے ریاست اسلامیہ کے داخلی اور خارجی معاملات میں مزید راہیں اور نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

(سيرة أبي بكر الصديق للدكتور الصلابي، ص: 168-178)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی وجوہات

رسول اکرم ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بلاشبہ امت کے افضل ترین انسان تھے اور آپ کو سب سے زیادہ رسول اکرم ﷺ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ ہجرت میں تنہا آپ کے ساتھی تھے، جبکہ کوئی دوسرا وہاں موجود نہ تھے۔ صحابۂ کرام نے آپ کی فضیلت کے لیے درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور بات تو اللہ ہی کی سب سے بلند ہے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''

(التوبة 40:9)

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اکرم ﷺ زندگی بھر اور آخری بیماری میں بھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے براہِ راست ان کی خلافت کی وصیت نہیں کی، تاہم بعض قرائن اور اشارے ایسے ضرور ملتے ہیں، جن سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور اس ذمہ داری کی اہلیت ثابت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے یہ معاملہ مسلمانوں کی باہم مشاورت پر چھوڑ دیا تاکہ امت کے لیے ایک مستقل دستور اور قانون بن جائے اور اسے علم ہو جائے کہ مشاورت ایک اخلاقی اور سیاسی اصول ہے اور ایسا نظام ہے جس پر چل کر سعادت اور حق کی راہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اشارے درج ذیل ہیں:

◎ نبی اکرم ﷺ نے اپنے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنے کا حکم دیا۔ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے فرمایا:

«إِنِّي لَا أَدْرِي مَا قَدْرُ بَقَائِي فِيكُمْ، فَاقْتَدُوا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي، وَأَشَارَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَّ عُمَرَ، وَاهْتَدُوا بِهَدْيِ عَمَّارٍ، وَمَا حَدَّثَكُمُ ابْنُ مَسْعُودٍ بِشَيْءٍ فَصَدِّقُوهُ»

''مجھے نہیں معلوم کہ میں تمھارے درمیان کتنی دیر رہوں، تم میرے بعد ان دونوں کی اقتدا کرنا'' آپ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور عمار کے طریقے کو اپنانا اور ابن مسعود تمھیں جو کچھ بتائے اس کی تصدیق کرنا۔'' (جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3799، والمغازي لابن أبي شيبة، رقم: 516، ص: 428,427)

◎ رسول اکرم ﷺ اپنی آخری بیماری میں جب لوگوں کو نماز پڑھانے سے عاجز آ گئے تو آپ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ (بیماری کے دوران میں) میرے گھر تشریف لے آئے تو آپ نے فرمایا: «مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ» ''ابوبکر کو حکم پہنچاؤ کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

وہ کہتی ہیں: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ابوبکر نرم دل انسان ہیں، جب وہ قرآن پڑھیں گے تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکیں گے، لہٰذا اگر آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بجائے کسی اور کو حکم دیں (تو بہتر ہوگا۔) عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اللہ کے قسم! میرے دل میں اس چیز کو ناپسند کرنے کی اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی کہ جو شخص سب سے پہلے آپ کی جگہ کھڑا ہوگا لوگ اسے برا سمجھیں گے، اس لیے میں نے دو یا تین دفعہ اپنی بات دہرائی تو آپ نے فرمایا: «لِيُصَلِّ بِالنَّاسِ أَبُو بَكْرٍ فَإِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ» ''ابوبکر ہی لوگوں کو نماز پڑھائیں، بلاشبہ تم یوسف رضی اللہ عنہ کے ساتھ (معاملہ کرنے) والی عورتیں ہی ہو۔''

(صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 940(418) والسيرة النبوية لابن هشام: 652/4)

◎ نبی ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں واضح الفاظ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف کی۔ اس طرح کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دے دیا۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ ذٰلِكَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللهِ»

''اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا اور جو اللہ کے پاس ہے ان میں سے کسی ایک کا اختیار دیا تو اس بندے نے وہ پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے۔''

یہ سن کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ ہم نے ان کے رونے پر تعجب کیا کہ رسول اللہ ﷺ تو ایک بندے کے متعلق خبر دے رہے ہیں، جسے اختیار دیا گیا ہے! بعد میں پتہ چلا کہ جنھیں اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تھی۔ واقعی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ أَبُو بَكْرٍ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا غَيْرَ رَبِّي لَا تَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا، وَّلٰكِنْ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهُ، لَا يَبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ إِلَّا سُدَّ إِلَّا بَابُ أَبِي بَكْرٍ»

''اپنی رفاقت اور اپنے مال کے ذریعے سے مجھ پر سب سے زیادہ احسانات ابوبکر کے ہیں۔ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن ان سے اسلامی اخوت اور دینی محبت ہے۔ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیے جائیں مگر ابوبکر کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔''

(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3654)

◎ اسی طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے واضح جوازات موجود تھے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت نبی ﷺ کے اس امر خلافت کے سب سے زیادہ آپ ﷺ کے یارِ غار ابوبکر ہیں جنھیں پختہ کار لوگوں میں پہلے پہل اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہے۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 493/4)

◎ رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی لوگ امت کے افضل ترین آدمی کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے تھے اور ان کے نزدیک ابوبکر ہی کا پہلا نمبر ہوتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں جب ہمیں صحابہ کے درمیان انتخاب کے لیے کہا جاتا تو ہم سب سے افضل اور بہتر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے، پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا درجہ آتا تھا۔ (صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3655)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو آپ نے عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کو بلایا اور فرمایا: ''کوئی شانے کی ہڈی یا تختی لاؤ تاکہ میں ابوبکر کے لیے تحریر لکھ دوں جس کی موجودگی میں اس کے بارے کوئی اختلاف نہ کر سکے۔ جب عبدالرحمٰن اس مقصد کے لیے اٹھ کر جانے لگے تو آپ نے فرمایا:

«أَبَى اللهُ وَالْمُؤْمِنُونَ أَنْ يُّخْتَلَفَ عَلَيْكَ، يَا أَبَا بَكْرٍ»

’’اے ابوبکر اللہ تعالیٰ تجھ پر اختلاف نہیں ہونے دے گا اور اہل ایمان بھی تیرے بارے میں اختلاف کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔‘‘(مسند أحمد: 47/6، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، حديث: 2387)

◎ یہ بات یقینی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کے ہرگز متمنی نہ تھے بلکہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ رافع طائی بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ ذات سلاسل میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ میں نے ان سے بیعت سے پہلے کی صورت حال کے متعلق پوچھا تو انھوں نے مجھے انصار اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انصار سے کہا کہ رسول اکرم ﷺ نے خود ابوبکر کو اپنی بیماری میں لوگوں کی امامت کرانے پر مامور کیا ہے، (اس لیے وہی خلافت کے اہل ہیں۔) چنانچہ انھوں نے میری بیعت کر لی اور میں نے بھی اس ڈر سے اسے قبول کر لیا کہ میرے انکار پر کہیں کوئی نیا فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔

(السيرة النبوية لابن هشام: 395/4)

◎ رسول اکرم ﷺ نے اپنے خوابوں کی تعبیر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے کی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«أُرِيتُ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَنْزِعُ بِدَلْوِ بَكْرَةٍ عَلَى قَلِيبٍ، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ فَنَزَعَ ذَنُوبًا أَوْ ذَنُوبَيْنِ نَزْعًا ضَعِيفًا، وَاللهُ يَغْفِرُ لَهُ، ثُمَّ جَاءَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَاسْتَحَالَتْ غَرْبًا، فَلَمْ أَرَ عَبْقَرِيًّا يَفْرِي فَرِيَّهُ، حَتَّى رَوِيَ النَّاسُ وَضَرَبُوا بِعَطَنٍ»

’’میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کنویں پر چرخی سے ڈول کھینچ رہا ہوں۔ اتنے میں ابوبکر آئے تو انھوں نے ایک یا دو ڈول پانی کے بھرے ہوئے کھینچے۔ ان کے پانی بھرنے میں کچھ کمزوری تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، پھر عمر آئے تو وہ ڈول ایک بڑے ڈول کی شکل اختیار کر گیا۔ میں نے کوئی شہ زور اور طاقتور آدمی نہیں دیکھا جس نے اتنی مہارت سے اپنا کام پورا کیا ہو، یہاں تک لوگ خود بھی سیراب ہوئے اور انھوں نے اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے ان کے ٹھکانوں میں باندھ دیا۔‘‘

(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3682)

ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے اس سے فرمایا کہ وہ

پھر آئے۔ اس نے عرض کیا: اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں، اس کی مراد آپ کی وفات تھی۔ آپ نے فرمایا: «إِنْ لَّمْ تَجِدِينِي فَأْتِي أَبَا بَكْرٍ» ''اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر کے پاس چلی جانا۔''

(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3659)

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کے علم کی تعریف کرنے والے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا اور ہم اللہ تعالیٰ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے مغفرت کر رہے تھے، جبکہ ان کا جنازہ چارپائی پر رکھا جاچکا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے میرے پیچھے آ کر اپنی کہنی میرے کندھے پر رکھ دی اور کہنے لگا: اللہ تم پر رحم کرے! میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے ساتھیوں کے ہمراہ رکھے گا کیونکہ میں اکثر رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا: «كُنْتُ وَأَبُو بَكْرٍ وَّ عُمَرُ، وَفَعَلْتُ وَأَبُو بَكْرٍ وَّعُمَرُ، وَانْطَلَقْتُ وَأَبُو بَكْرٍ وَّ عُمَرُ»

''فلاں جگہ پر میں تھا اور ابوبکر و عمر ساتھ تھے۔ میں نے اور ابوبکر و عمر نے یہ کام کیا۔ میں اور ابوبکر و عمر روانہ ہوئے۔'' مجھے اس لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ان کے ساتھ رکھے گا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ (دعائیہ) کلمات کہنے والے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث:3677)

◎ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر صدیق اور ان کی خلافت کی تعریف کی۔ اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت اور کارناموں کو سراہا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ان لوگوں کا براہ راست رد ہے جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر قدغن لگاتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی ﷺ کی وصیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

عبد بن خیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: رسول اکرم ﷺ کی وفات ان اعلیٰ صفات پر ہوئی جن پر اللہ کے کسی نبی کی ہوتی ہے، پھر آپ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر خلیفہ بنے تو انھوں

نے رسول اکرم ﷺ کے طرز عمل اور آپ کی سنت کی پیروی کی، پھر ان کی وفات ہوئی تو کسی بھی انسان کی اعلیٰ صفات پر ہوئی۔ اللہ کے نبی ﷺ کے بعد وہ اس امت کے سب سے بہترین اور افضل انسان تھے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ رسول اکرم ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کے نقش قدم پر چلے، پھر ان کی وفات بھی اس حال میں ہوئی جو کسی بھی انسان کی بہترین حالت ہوسکتی ہے۔ نبی ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد وہ اس امت کے افضل ترین انسان تھے۔ (المغازي لابن أبي شيبة، رقم: 520، ص: 430)

محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل صحابی کون ہیں؟ انھوں نے بتلایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ میں نے پوچھا: پھر کون ہیں؟ انھوں نے بتلایا، اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مجھے اس کا اندیشہ ہوا کہ اب (پھر میں نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ تو) کہہ دیں گے کہ عثمان رضی اللہ عنہ، اس لیے میں نے خود کہا: اس کے بعد آپ ہیں؟ یہ سن کر وہ بولے کہ میں تو صرف عام مسلمانوں کی جماعت کا ایک شخص ہوں۔ (صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3671)

◎ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شان صدیق میں مروی روایات سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے جن میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عباس اور دیگر اہل بیت کے افراد نے رسول اکرم ﷺ کی وفات کے اگلے روز منگل کے دن مسجد میں عام لوگوں کے ساتھ ہی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ (السيرة النبوية لابن كثير: 398/4)

مزید برآں یہ بات بھی ثابت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کبھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے الگ نہیں ہوئے۔ مسلسل ان کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے رہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے بھی ان کے ساتھ نکلے۔

(السيرة النبوية لابن كثير: 495/4)

یہ بات واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ امت کو کسی ایک امیر کا پابند کر کے اس کی خلافت کا اعلان کر کے نہیں گئے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ نے ایسے قواعد ضرور وضع فرمائے جن کی اتباع کر کے امت کے سرکردہ لوگ باہمی مشاورت سے خلیفہ کا تعین کر سکیں۔ (اس موضوع پر بہترین کتب درج ذیل ہیں جن کا مطالعہ مفید رہے گا۔ السياسة الشرعية لابن تيميه، والطرق الحكمية لابن القيم، الأحكام السلطانية للماوردي وغيره)

امت نے اس امر کو اچھی طرح جان لیا اور ان کے ہاں یہ ایک مسلمہ اصول بن گیا، جس کی پیروی سب

سے پہلے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کی۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو ان سے پوچھا گیا: امیر المومنین! آپ کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ مجھ سے بہتر ہستی، یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ نامزد کیا ہے اور اگر نامزد نہ کرو (اور شوریٰ پر معاملہ چھوڑ دوں) تو مجھ سے افضل اور بہتر ہستی، یعنی رسول اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب انھوں نے رسول اکرم ﷺ کا ذکر کیا تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے۔ (صحيح البخاري، الأحكام، حديث: 7218)

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ان سے درخواست کی گئی کہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کر دیں تو انھوں نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے کسی کو نامزد کیا جو میں کسی کو نامزد کروں؟! اگر اللہ تعالیٰ کو لوگوں کی بھلائی مقصود ہوئی تو میرے بعد انھیں ان کے سب سے اچھے آدمی پر جمع کر دے گا جس طرح اس نے اپنے نبی ﷺ کے بعد لوگوں کو سب سے افضل آدمی پر جمع کر دیا تھا۔

(السيرة النبوية لابن كثير: 401/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 653/4)

سیدنا ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما ہی درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے صحیح مصداق تھے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرم ہوں گے اور کافروں پر سخت، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔'' (المائدة 54:5)

وہ یقیناً اللہ سے محبت کرتے تھے اور اس کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات نبوی کے بعد بیماری کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مشغولیت اور باغ فدک کے معاملے کی وجہ سے بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی، چنانچہ اس اشکال کو دور کرنے کے لیے انھوں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد دوبارہ بیعت کی تا کہ لوگوں کو بتلایا جا سکے کہ ان کی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کوئی رنجش نہیں ہے اور پروپیگنڈہ ختم ہو جائے۔

خاتمہ

نبی ﷺ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر خصوصی احسان فرمایا اور آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا۔ آپ ہی کی اتباع سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ اہل بیت اور مومنین کے ساتھ مل کر مختلف واقعات وحوادث کا سامنا کرتے رہے۔ صحابۂ کرام پر آپ کی صحبت کے اثرات تھے اور انھوں نے امت پر اپنے اثرات چھوڑے۔ آپ اپنی زندگی بسر کر کے اللہ کے پاس چلے گئے اور اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک آپ کے ایسے چرچے کیے کہ ایسا شرف وعزت آپ کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوا۔ دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے اور وقت گزرنے سے ان کے نام ونشاں مٹ گئے۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں۔ وقت گزرتا گیا۔ کئی زمانے بیت گئے۔ بہت کچھ نسیاً منسیا ہوگیا لیکن آپ ﷺ ہر دور میں لوگوں کے دلوں میں بستے رہے۔ ہر زمانے کے لوگوں کے لیے آپ قابل اتباع نمونہ رہے۔ جس طرح آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا اور آپ کی سیرت کے ہر گوشے کو پوری امانت و دیانت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا، ایسا اعزاز کسی دوسرے کو نہ ملا۔ مسلمانوں نے آپ کو ہر دور میں دل و جان سے عزیز رکھا۔ آپ کی محبت ہر مسلم کا فرض اور عین ایمان ٹھہری۔ آپ کی سیرت کا ہر پہلو نہایت واضح اور صفحۂ قرطاس کی زینت بنا۔ اس طرح کہ اس میں سچائی اور آپ کی زندگی کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ آپ کے دشمن بھی آپ کے اعلیٰ کردار کے معترف ہیں۔ پوری دنیا اس بات کی معترف ہے کہ سب سے زیادہ رحیم، کامل، متقی، عادل اور محکم انسانی نمونہ آپ ہی کی ذات مجتبیٰ ہے۔ لوگ آپ کی حیات مبارکہ اور سیرت و کردار سے متعلق لکھتے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک لکھتے رہیں گے۔ انسانوں میں آپ کا ہم مرتبہ نہ آج تک وہ پا سکے نہ قیامت تک پائیں گے۔

آپ کی سیرت و کردار نہایت مبارک ہے۔ آپ ایک نبی اور رسول کی زندگی جیے۔ آپ ریاست، معاشرے اور امت کے روح رواں تھے۔ آپ کے دوست احباب بھی تھے۔ آپ نے امن سلامتی کی زندگی بھی گزاری اور پر آشوب دور سے بھی گزرے۔ تمام حالات میں عزت و بلندیوں نے آپ کے قدم چومے۔ آپ پوری کائنات کے لیے سراپا رحمت و احسان تھے۔

ہم نے اپنی اس کتاب میں ہر اس چیز کا جائزہ لیا ہے جو کسی بھی انسان کو رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے جاننا ضروری ہے بلکہ آپ سے متعلق ہر چیز کا ذکر کر دیا ہے۔ وحی الٰہی کی معرفت، اس کے واقعات، اوقات ہر چیز کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ کی ذات بابرکات، اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے ہر شخص کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپ کی سیرت میں نور، ہدایت، بصیرت اور بہترین نمونے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں آپ کے گروہ میں شامل کرے اور آپ ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے۔ آپ کے حوض کوثر سے ہمیں سیراب کرے اور آپ کے بعد کسی فتنے میں مبتلا نہ کرے۔ تمام تعریفیں اس ذات عالی کے لیے ہیں جس کے خاص فضل و احسان ہی سے نیک اعمال اختتام پذیر ہوتے ہیں۔